جلد ۱

پورا منٹو

تحریروں کے مستند متون

تحقیق، تدوین، ترتیب

شمس الحق عثمانی

اوکسفرڈ

پورا منٹو

سعادت حسن منٹو

اردو افسانہ نے بہت جلد عالمی ادب میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کر لیا ہے۔ ایک نسبتاً نئی زبان کے لیے یہ ایک غیر معمولی اعزاز ہے۔ اردو افسانہ کو یہ اعزاز دلانے میں سب سے نمایاں اور کلیدی کردار سعادت حسن منٹو (۱۹۱۲ء تا ۱۹۵۵ء) نے ادا کیا۔ سعادت حسن منٹو فن افسانہ نگاری کی کئی جہات پر حاوی تھے۔ کبھی وہ تاریک و متعفن بالاخانوں میں مجروح انسانیت کی خاموش فریاد کو آواز دیتے ہیں، کبھی وہ نوآبادیاتی استحصال کو جدید روشنی کا نام دینے والی برطانوی حکومت کی ریشہ دوانیوں کو طشت از بام کرتے ہیں اور جب فسادات اپنی ہولناکی کو حاوی کر دیتے ہیں تو ہم سعادت حسن منٹو کو اعلیٰ انسانی اقدار سے لیس پاتے ہیں۔ چونکہ وہ آنتن چیخوف، اور گی دی موپاساں کے مترجم رہے تھے، اس لیے ادب کا آفاقی معیار ان کے شعور میں ابتدا ہی سے داخل ہو چکا تھا۔

ایک بار جب سیاسی احتجاج کی پاداش میں فرانسیسی ناول نگار ژاں پال سارت زیرِ نگرانی تھا تو صدر دی گال نے کہا کہ سارت کو گرفتار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ سارت فرانس ہے۔ سعادت حسن منٹو نشانِ پاکستان تھا مگر اسے عدالت میں پیش ہونا پڑا۔ منٹو کو ان کے صد سالہ جشن پر ''نشانِ امتیاز'' پیش کیا گیا اگرچہ منٹو ان لوگوں میں تھے جنھوں نے نوزائیدہ ملک کو اعزاز کے قابل بنایا۔

پروفیسر شمس الحق عثمانی نے اپنی روایتی مشاقی اور دیدہ ریزی سے سعادت حسن منٹو کے کُل سرمائے کا مستند متن فراہم کیا ہے۔ اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس اردو کے عظیم ترین افسانہ نگار کے کُل سرمائے کو مستند متن کے ساتھ پیش کر کے ایک اخلاقی ذمے داری سے عہدہ برآ ہوتا ہے۔

پورا منٹو

تحریروں کے مستند متون

جلد ۱

تحقیق، تدوین، ترتیب
شمس الحق عثمانی

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس یونیورسٹی آف اوکسفرڈ کا ایک شعبہ ہے۔ یہ دنیا بھر میں
درج ذیل مقامات سے بذریعہ اشاعت کتب تحقیق، علم وفضیلت اور تعلیم میں اعلیٰ معیار کے
مقاصد کے فروغ میں یونیورسٹی کی معاونت کرتا ہے:

اوکسفرڈ نیویارک
اوکلینڈ کیپ ٹاؤن دارالسلام ہونگ کونگ کراچی
کوالالمپور میڈرڈ میلبرن میکسیکوسٹی نیروبی
نیودہلی شنگھائی تائپی ٹورونٹو

درج ذیل ممالک میں اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کے دفاتر ہیں:
ارجنٹائن آسٹریا برازیل چلی چیک ریپبلک فرانس یونان
گوئٹے مالا ہنگری اٹلی جاپان پولینڈ پرتگال سنگاپور
جنوبی کوریا سوئٹزرلینڈ ترکی یوکرین ویتنام

Oxford برطانیہ اور چند دیگر ممالک میں اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کا رجسٹرڈ ٹریڈ مارک ہے۔

پاکستان میں اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس سے شائع ہوئی۔

یہ کتاب اس سے پہلے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، بھارت سے ۲۰۰٦ء میں شائع ہوئی۔

یہ تصحیح شدہ اشاعت پاکستان میں پہلی بار اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس سے شائع ہوئی، ۲۰۱۳ء۔

ISBN 978-0-19-547780-1

پاکستان میں کاغذی پرنٹرز، کراچی میں طبع ہوئی۔
امینہ سیّد نے اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس
نمبر ۳۸، سیکٹر ۱۵، کورنگی انڈسٹریل ایریا، پی او بکس نمبر ۸۲۱۴،
کراچی۔ ۷۴۹۰۰، پاکستان سے شائع کی۔

ترتیب

کتابیں

مقدّمہ

پورا منٹو اردو کے ممتاز ادیب: سعادت حسن منٹو (۱۱رمئی ۱۹۱۲ء تا ۱۸رجنوری ۱۹۵۵ء) کی تمام مطبوعہ کتابوں اور منتشر تحریروں کا مجموعہ ہے۔

ادبی زندگی کی ابتدا میں منٹو نے روس اور فرانس کے بڑے ادیبوں کے افسانے اور ڈرامے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیے جو برصغیر کے معیاری جرائد میں شائع ہوئے؛ حالانکہ وہ ترجمہ نگاری کے دور میں ہی طبع زاد افسانے لکھنے لگے تھے مگر اُن کی اوّلین کتاب: سرگزشتِ اسیر (مطبوعہ: ۱۹۳۴ء) وکٹر ہیوگو کی تصنیف دی لاسٹ ڈے آف اے کنڈیمڈ (The Last Day of a Condemned) کا ترجمہ ہے۔ طبع زاد افسانوں کی اوّلین کتاب آتش پارے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔

ادبی زندگی کے آغاز سے اواخرِ عمر تک منٹو کی تقریباً ۳۷ کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ اُن میں افسانے، خاکے، ریڈیو ڈرامے اور فیچر، مضامین، فلم اسکرپٹ اور ایک ناول شامل ہے۔ منٹو کی وفات کے بعد احمد ندیم قاسمی (۲۰رنومبر ۱۹۱۶ء تا ۱۰رجولائی ۲۰۰۶ء) نے ایک کتاب: منٹو کے خطوط، ندیم کے نام (مطبوعہ: ۱۹۶۲ء) ترتیب دی۔ علاوہ ازیں ایسی متعدد تحریریں، رسالوں اور کتابوں میں شائع ہوئیں جو منٹو کی زندگی میں مرتب نہ ہوسکی تھیں؛ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

منٹو کی تصانیف اپنی ہمہ جہت کشش کے باعث نہ صرف اُن کی زندگی میں بلکہ موت کے بعد، اب تک گزرے ہوئے پچپن برسوں میں بھی بارہا اور طرح طرح سے شائع ہوئی ہیں۔ پچھلے آٹھ دس برس میں منٹو کے کچھ کلیات بھی طبع ہوئے مگر وہ، یا تو بہ لحاظِ تحقیق و ترتیب انتہائی ناقص ہیں، یا بہ لحاظِ طباعت غیر معیاری۔ تاجرانِ کتب کو جلد از جلد منافع کی لپک یہ دیکھنے کا موقع ہی نہیں دیتی کہ کاتب یا کمپوزیٹر، پروف خواں یا کارکنانِ مطبع، متنِ کتاب کے ساتھ کیا کیا سلوک کر گزرے ہیں۔ لہٰذا: کتاب کی ایک اشاعت کے سُقم، دوسری سے تیسری، چوتھی ... ساتویں ... اشاعت تک پھیلتے اور بڑھتے ہوئے، اُس حد کو پہنچ گئے جہاں ادب کے ذی استعداد قاری کے لیے کوئی متن ایسا نہیں رہا جسے وہ پورے اعتماد کے ساتھ: معتبر ترین اور ایمائے مصنف کے مطابق حتمی متن، کہہ سکے؛ یہ غیر معتبر و غیر معیاری متون: انگریزی کتابوں کی منڈی

کے لیے ترجمہ بھی ہو رہے ہیں اور ناگری رسم الخط میں فروخت کرنے کے لیے مرتبین انہیں اپنی فطانت کے گل بوٹوں سے آلودہ بھی کر رہے ہیں۔

منٹو تصانیف کے رائج الوقت اور بالعموم کوتاہیوں بھرے ڈھیر سے، قابلِ اعتبار متن کی تحقیق، تدوین اور ترتیب کے لیے پورا منٹو کے مرتب نے جو طریق کار اختیار کیا ہے وہ حسبِ ذیل ہے:

بنیادی نسخہ

کتاب کی پہلی اشاعت یا منٹو کے حینِ حیات میں کتاب کی آخری اشاعت کو پورا منٹو کے لیے بنیادی نسخہ بنایا ہے۔ اِس بارے میں دوسرے ترجیح اُن کتابوں کو دی ہے جو منٹو کی رحلت کے بعد بیگم صفیہ منٹو کی اجازت سے شائع ہوئیں کیونکہ اُن کے مشمولات اور متن، کتاب کی پہلی یا منٹو کی زندگی میں مطبوعہ آخری اشاعت کے مماثل ہیں۔

منٹو کی کتابوں کے اشاعتِ اوّل کا زمانہ، اُن تاریخوں کے ماہ و سال کے بعد تصوّر کیا گیا ہے جو منٹو نے کتاب کے دیباچے یا پیش لفظ کے اختتام پر درج کی ہیں۔ پورا منٹو میں کتابوں کی بالترتیب شمولیت بھی اُن تاریخوں کے مطابق ہے۔ جن معدودے چند کتابوں میں منٹو یا کسی معاصر ادیب کا تحریر کردہ دیباچہ وغیرہ شامل نہیں، اُن کی اشاعتِ اوّل کا زمانہ دیگر وسائل و شواہد کی مدد سے متعیّن کیا گیا ہے۔

کتابوں کی ترتیب

یہ کلّیات، منٹو کی کتابوں کے زمانۂ اشاعت کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے — لیکن، دیگر اصناف کے مقابلے، افسانوں کی کثیر تعداد کو اور اِس صنف میں منٹو کے مرتبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے — ابتدائی جلدیں اُن کتابوں پر مشتمل ہیں جن میں افسانوں کی تعداد حاوی یا مساوی ہے۔ خاکوں، ڈراموں اور ترجموں وغیرہ کی کتابیں ان اصناف کے لیے مختص جلدوں میں شامل ہیں۔ لٰہذا پورا منٹو کی ترتیب میں پہلی ترجیح: کتابوں کے زمانۂ اشاعت کو اور دوسری ترجیح: منٹو ادب کی اصناف کو دی گئی ہے۔

کتابوں کے مشمولات

پورا منٹو میں شامل ہر کتاب کے مشمولات بنیادی نسخے کی ترتیب کے مطابق ہیں۔ ایک سے زائد کتابوں میں مطبوعہ تحریروں کا حتمی متن (Final Text) بھی بنیادی نسخے کی ترتیب کے مطابق ہے۔ مثلاً: افسانہ ''قاسم''

پہلی بار مجموعہ آتش پارے میں شائع ہوا۔ تقریباً چھ برس بعد، منٹو نے یہ افسانہ مجموعہ دھواں میں بھی شامل کیا تو اس کا عنوان، متعدد جملے اور اختتام تبدیل کر دیے۔ پورا منٹو کے مرتب نے یہ افسانہ آتش پارے ہی میں شامل رکھا ہے لیکن اس کا عنوان اور متن وہ ہے جو منٹو نے دھواں نامی کتاب میں شائع کرایا تھا۔ اب یہ نظرِ ثانی شدہ افسانہ صرف آتش پارے میں شامل ہے، مجموعہ دھواں سے حذف کر دیا ہے۔

متون کا موازنہ اور حواشی

مذکورۂ بالا افسانے کی طرح، منٹو نے دیگر کئی افسانے، ڈرامے اور مضامین ایک سے دوسری کتاب میں منتقل کیے اور اُن کے متن میں ردّوبدل بھی کی۔ پورا منٹو کے مرتب نے ایسی ہر تصنیف کے اوّلین اور آخری متن کا موازنہ کیا ہے۔ جہاں جہاں منٹو نے متن تبدیل کیا، وہاں تبدیلی کا نمبر شمار لکھ دیا ہے۔ اُس نمبر شمار کے مطابق، تصنیف کے اختتام پر حواشی میں، وہ فقرے جملے وغیرہ درج کر دیے ہیں جو منٹو نے تبدیل یا منسوخ کیے تھے۔

منٹو نے جہاں ایک ہی پارے یا مکالمے میں کئی لفظ/فقرے تبدیل کیے ہیں وہاں ہر تبدیلی کے لیے جداگانہ ہندسے کے بجائے تمام تبدیلیوں کو ایک ہی ہندسے کے تحت حواشی میں درج کیا ہے اور پارے یا مکالمے کے منفصل لفظوں/فقروں کی نشان دہی تین نقطوں (...) سے کی ہے۔ مثلاً: افسانہ ''قاسم'' کے ایک پارے میں منٹو نے چار تبدیلیاں کی ہیں۔ وہاں متن میں چوتھی تبدیلی کے بعد حواشی کا نمبر شمار ۱۷ درج ہے اور حواشی میں نمبر کے بعد، وہ تبدیلیاں، ایک تا چار، اس طرح لکھی گئی ہیں:

۱۷۔ بستر بچھایا... ۔ اور لیٹ گیا۔ اور اس سے پہلے کہ ... آرام دہ بازوؤں... ''بوٹ، بوٹ'' کی آوازوں سے

جملوں/فقروں میں لفظی ردّوبدل کی وضاحت کے لیے: جملے یا فقرے کا وہ حصہ حواشی میں درج کیا ہے جس میں منٹو نے کوئی تبدیلی کی تھی — مثلاً، افسانہ ''طاقت کا امتحان'' کے اوّلین متن کا جملہ: یہ کون سا اہم کام ہے؛ اس پر نظرِ ثانی میں، منٹو نے ''یہ'' کے بعد ''بھی'' کا اضافہ کیا تھا، اِس تبدیلی کی وضاحت کے لیے سابق جملے کا ضروری جزو حواشی میں درج کیا ہے — اِس طرح: یہ کون سا اہم کام۔ یعنی، تبدیل شدہ جملہ/فقرہ: متن میں شامل کیا ہے اور سابق جملہ/فقرہ: حواشی میں درج کیا ہے۔

لفظ/الفاظ کی تنسیخ: حواشی میں اِس طرح واضح کی گئی ہے کہ منسوخ لفظ سے پہلے، یا بعد کے، موجود لفظ اُس کے ساتھ لکھ دیے ہیں۔ مذکورۂ بالا افسانے میں ہی ایک فقرہ ہے: ایک انچ موٹی آہنی سلاخ کو خم

دینا۔ اِس سے منٹو نے لفظ ''آہنی'' حذف کیا تھا لہٰذا حواشی میں ''آہنی سلاخ'' لکھا گیا ہے تا کہ قاری متنِ افسانہ اور حواشی کے پیشِ نظر، سمجھ لے کہ فقرے سے لفظ ''آہنی'' حذف ہوا ہے۔

منٹو کے یکسر منسوخ کردہ جملے/ پارے: حواشی میں من وعن درج کیے گئے ہیں۔

متن میں جملوں/فقروں کا اضافہ: حواشی میں، مختصراً، واضح کیا گیا ہے۔

متون کے موازنے اور مفصل حواشی کی بنا پر، قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ منٹو کو بے مثال کفایتِ لفظی اور بہترین لفظ کے بہترین استعمال کی مہارت کس طرح حاصل ہوئی۔ بہترین لفظ کا بہترین استعمال اور جدید فکشن کو بیانیہ عطا کیا۔

متن کی تصحیح

منٹو کی تصانیف کا درست ترین، حتمی، متن پیش کرنے کے لیے مرتب نے ہر کتاب کے تمام دستیاب نسخوں کا موازنہ کیا ہے۔ اس عمل میں وہ معیاری جرائد بھی پیشِ نظر رہے ہیں جن میں منٹو کی تحریریں شائع ہوئیں۔ اُن جعلی مجموعوں پہ بھی نگاہ ڈالی ہے جو نرے منافع پرستوں نے منٹو کی مختلف کتابوں سے افسانے نوچ کھسوٹ کر، یا مجموعوں کے نام بدل کر چھاپے ہیں۔ اِس سب کچھ کے باوجود، بنیادی نسخوں کے جو لفظ یا فقرے مشکوک و غیر درست محسوس ہوئے اُن کی تصحیح درج کی گئی ہے۔ اس غرض سے اغلاط کے درجِ ذیل تین زمرے قائم کیے ہیں:

(الف) واضح اغلاط

اس زمرے کی اغلاط کی نشان دِہی اور تصحیح اس طرح درج کی ہے کہ غلط چھپے ہوئے لفظ یا فقرے سے متصل بڑے بریکٹ میں پہلے سوالیہ نشان، اُس کے بعد ممکنہ درست لفظ یا فقرہ — اس طرح: [؟ ...]

(ب) غیر واضح اغلاط

اس زمرے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ غیر درست یا غیر موجود محسوس ہونے والے لفظ یا فقرے سے متصل بڑے بریکٹ میں پہلے ممکنہ درست لفظ یا فقرہ، اُس کے بعد سوالیہ نشان — اس طرح: [... ؟]

(ج) تکرارِ لفظی

مکرر چھپے ہوئے لفظوں یا فقروں کی تنسیخ کے لیے متعلقہ جملہ، عبارت سے متصل بڑے بریکٹ میں تکرارِ لفظی کے بغیر، مع نشانِ حذف، درج کر دیا ہے — اِس طرح: [وہ دونوں ... ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ گئے]۔

واضح رہے کہ پورا منتو میں جہاں جہاں بڑا بریکٹ استعمال ہوا ہے وہ، کسی باعث، مرتب کی جانب سے ہے۔مزید یہ کہ جو کٹے پھٹے ناقابلِ فہم لفظ،متون یا حواشی میں شامل کرنے لازمی تھے، اُن کے بعد''قیاسی'' کاق بڑے بریکٹ میں درج کیا گیا ہے—اس طرح [ق]

اوقاف ورموز

سعادت حسن منٹو کی بیشتر کتابیں اوقاف ورموز (Punctuation) کے درست استعمال سے تقریباً محروم ہیں۔ کاتب/کمپوزیٹر نے جہاں چاہا کوما لگا دیا، جہاں جی میں آئی ڈیش اور پروف خواں نے غالباً مسودہ پیشِ نظر رکھنا ضروری نہ سمجھا؛ جبکہ سعادت حسن منٹو کے چند ایک مخطوطوں اور اُن کے حینِ حیات میں قدرے احتیاط سے مطبوعہ کچھ کتابوں پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی تحریر میں ختمہ، سکتہ اور طویل خط وغیرہ، پوری فن کارانہ توجہ سے استعمال کرتے تھے۔

منٹو کی تصانیف میں اوقاف ورموز کی نوعیت، دیگر مصنفین کی عام صحافتی یا علمی تحریروں سے نہایت مختلف ہے۔ یہ اوقاف ورموز دراصل افسانوی ادب کے تقاضوں کے مطابق ہیں۔منٹو نے بعض ایسے جملوں کے اختتام پہ بھی ختمہ یا سکتہ لگایا ہے جن کے بعد کا جملہ، عطف یا استدراک وغیرہ کے حروف سے شروع ہوتا ہے۔ایسے موقعوں پر دیگر مصنف، عام طور پر، ختمہ یا سکتہ استعمال نہیں کرتے۔غور کرنے پر کُھلا کہ منٹو کے افسانوں ڈراموں (بالخصوص افسانوں) میں بہ ظاہر ختمہ پر مکمل ہو جانے والا جملہ، حروفِ عطف یا حروفِ استدراک وغیرہ کے بعد شروع ہونے والے جملے سے، مربوط بھی ہوتا ہے؛ کیونکہ بعد کا جملہ، سابقہ جملے میں بیان شدہ صورتِ حال کی کسی تبدیلی کو، یا بیان شدہ خیال میں کسی اضافے کو واضح کرتا ہے۔

مثال کے طور پر ملاحظہ ہوں، افسانہ''انقلابی'' (مشمولہ: پہلی جلد) کے دو مختصر پارے؛ پہلا پارا طویل خط کی اور دوسرا ختمہ کی مثال ہے:

> سلیم کسی متوقع حادثے کا منتظر ضرور تھا۔مگر اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ حادثہ کس شکل میں پردۂ ظہور پر نمودار ہوگا—اس کی نگاہیں ایک عرصے سے دھندلے خیالات کی صورت میں ایک موہوم سایہ سا دیکھ رہی تھیں جو اس کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا۔مگر وہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس تاریک پردے کے پیچھے کیا ہے۔

> سلیم ہرگز پاگل نہیں ہے۔مگر مجھے تسلیم ہے کہ اس کے افکار نے اُسے بے خود اور مجذوب ضرور بنا رکھا ہے۔ دراصل وہ دنیا کو ایک پیغام دینا چاہتا ہے، مگر دے نہیں سکتا۔ایک کم سن بچے کی طرح تتلا تتلا کر وہ اپنے قلبی احساسات بیان کرنا چاہتا ہے، مگر الفاظ اس کی زبان پر آتے ہی بکھر جاتے ہیں، جیسے مٹھی میں سے سوکھی ریت!

پہلے پارے میں جس محل پر منٹو نے طویل خط لگایا ہے اس جیسے متعدد مواقع پر اُنہوں نے، کئی نقطوں پر مشتمل خط (........) بھی استعمال کیا ہے۔ علاوہ ازیں، کسی کردار کی زبان سے مکالمے کی ادھوری ادائیگی یا زبان کی لڑکھڑاہٹ کو واضح کرنے کے لیے منٹو نے، عام اصول کے مطابق، مکالمے کے درمیان تین نقطے (...) لگائے ہیں۔ نقطوں کے استعمال کی ان نوعیتوں کے مابین فرق کو کاتبوں نے بالعموم ملحوظ نہیں رکھا۔ نتیجتاً مرتب کے لیے فیصلہ مشکل تھا کہ منٹو نے کہاں طویل خط لگایا ہوگا اور کہاں متعدد نقطے۔ لہٰذا، یکسانیت کی غرض سے، ایسے تمام مواقع پر طویل خط کو ترجیح دی گئی ہے۔ (اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کے طباعتی ضابطے کی رُو سے، یہ طویل خط چھ باریک نقطوں پر مشتمل ہوگا) جہاں جہاں جملے کی ادھوری ادائیگی کے لیے تین نقطے لگے ہوئے تھے، وہ اُسی طرح برقرار ہیں۔

دیگر اوقاف رموز یعنی سکتہ، رابطہ، سوالیہ اور فجائیہ کے باب میں بھی زیادہ تر متون خلفشار و تہی دامانی کا نمونہ ہیں۔ لہٰذا مرتّب نے کوشش کی ہے کہ منٹو کے زیرِ تدوین ادب پارے میں کردار/ راوی/ مصنف کے لب و لہجے اور ادب پارے کی مجموعی فضا کو ملحوظ رکھتے ہوئے اوقاف و رموز کا استعمال کیا جائے۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ پورا منٹو کے اوقاف و رموز صرف وہ نہیں جو مصنف نے لگائے تھے، اُن میں مرتّب کا دخل بھی ہے۔

پیراگراف

منٹو کے بعض افسانوں اور مضامین میں پیراگرافنگ، نفسِ مضمون کے لحاظ سے درست محسوس نہیں ہوئی۔ اُسے مرتب نے اپنی (اونی پونی) فہم کے مطابق درست کیا ہے؛ اس عمل کی وضاحت حواشی میں لازماً کی ہے۔

توضیحات

پورا منٹو میں شامل ہر کتاب سے قبل ''توضیحات'' کے زیرِ عنوان، کتاب کی اشاعتوں اور دیگر متعلقہ امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ''توضیحات'' اصلاً تو ''مقدمہ'' کا جزو ہیں لیکن عام قاری کی آسانی کے پیشِ نظر، کتابوں کے آغاز میں شامل کی گئی ہیں۔

ضمیمہ

منٹو نے اپنی کچھ کتابوں کی اشاعتِ اوّل کے مشمولات، بعد کی اشاعتوں سے خارج کر دیے تھے۔ مثلاً کتاب منٹو کے افسانے کی اشاعتِ اوّل (۱۹۴۰ء) میں ایک مختصر ''دیباچہ'' شائع ہوا تھا۔ دوسری یا

تیسری اشاعت میں اس کی جگہ منٹو نے اپنا ایک طویل مضمون بطور ''پیش لفظ'' شامل کیا۔ علاوہ ازیں، تین افسانے: شرابی، خودکشی کا اقدام، اور اسٹوڈنٹ یونین کیمپ، بھی کسی اور اشاعت میں شامل نہیں کیے۔ مجموعہ چغد کی اشاعتِ اوّل (۱۹۴۰ء) میں سردار جعفری کا مرقومہ ''دیباچہ'' شائع ہوا تھا جب کہ بعد کی اشاعتوں میں منٹو کا تحریر کردہ ''دیباچہ'' شامل ہے۔ اس نوعیت کی تحریریں، متعلقہ مجموعوں کے اختتام پر ''ضمیمہ'' میں درج کی جائیں گی تاکہ منٹو کی کتابوں کے منسوخ شدہ مشمولات بھی محفوظ ہو جائیں۔

اشاریے

جلد کے اختتام پر منٹو کے افسانوں، ڈراموں اور اپنی کتابوں پر لکھے دیباچوں، مقدموں کے اشاریے شامل ہیں؛ ایسے اشاریے ہر جلد میں ہوں گے۔ منٹو کی کتابوں میں دیگر صاحبانِ قلم کی تحریروں/ ترجموں کا اشاریہ بھی ترتیب دیا جائے گا۔ ہر نئی جلد میں، اُس کے مشمولات کے اشاریوں کے بعد، سابق جلدوں کے اشاریے بھی درج ہوں گے۔ پورا منٹو کی آخری جلد میں اُس کے اشاریے کے علاوہ، دیگر تمام جلدوں کے اشاریے یک جا کر دیے جائیں گے۔

املا اور تراجم

پورا منٹو میں اُردو املا کے آداب اور انگریزی الفاظ و اصطلاحات کے تراجم، زیادہ تر اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری (مرتب و مترجم: شان الحق حقی) کے مطابق برتے گئے ہیں۔

معاون کتب و رسائل:

پورا منٹو میں شامل کتابوں کے بنیادی اور معاون نسخوں کے علاوہ جو کتب و رسائل، متون کی تصحیح وغیرہ کے لیے مرتب کے پیشِ نظر رہے، وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ رسالہ نقوش منٹو نمبر، شمارہ: ۴۹، ۵۰، مرتب: محمد طفیل (ادارۂ فروغِ اردو، لاہور، غالباً اواخر سنہ ۱۹۵۵ء)۔

۲۔ رسالہ شعور، شمارہ: ۴، مرتبین: بلراج مین را، شرددت (شعور پبلی کیشنز، نئی دہلی، اپریل، ۱۹۸۰ء)۔

۳۔ دستاویز، مرتب: بلراج مین را (شعور پبلی کیشنز، نئی دہلی، جون، ۱۹۸۲ء)۔

۴۔ سعادت حسن منٹو—حیات اور کارنامے، ڈاکٹر برج پریمی (مرزا پبلی کیشنز، سری نگر، ۱۹۸۶ء)۔

۵۔ دستاویز: منٹو، ہندی، جلد ا تا ۵، مرتبین: بلراج مین را، شرددت (راج کمل پرکاشن، نئی دہلی و پٹنہ، ۱۹۹۳ء)۔

۶۔ منٹو کتھا۔ ڈاکٹر برج پریمی، (مرتب: پریمی رومانی) (دیپ پبلی کیشنز، جموں، ۱۹۹۴ء)۔

۷۔ منٹو کے نمائندہ افسانے، مرتب: اطہر پرویز (ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۶ء)۔

۸۔ سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور سے مطبوعہ مندرجۂ ذیل کتب:

منٹو ڈرامے	: ۱۹۹۶ء	منٹو باقیات	: ۱۹۹۸ء	منٹو نما	: ۱۹۹۹ء
منٹو کہانیاں	: ۲۰۰۰ء	منٹو نامہ	: ۲۰۰۰ء	منٹو راما	: ۲۰۰۱ء

۹۔ سعادت حسن منٹو (تحقیق)، ڈاکٹر علی ثنا بخاری (ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۶ء)۔

۲۰ر دسمبر ۲۰۱۰ء

۱۸۶، بَلّی ماران، دہلی

ڈاکٹر شمس الحق عثمانی
پروفیسر شعبۂ اُردو
جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی

آتش پارے

توضیحات

آتش پارے سعادت حسن منٹو کے طبع زاد افسانوں کا اوّلین مجموعہ ہے۔ اس کے ''دیباچہ'' پر درج تاریخِ تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منٹو نے امرتسر کے زمانۂ قیام میں ترتیب دیا تھا اور غالباً سنہ ۱۹۳۶ء کے اوائل میں شائع ہوا۔

اس مجموعے میں ''تماشا'' بھی شامل ہے جو، مسلّمہ طور پر، منٹو کا اوّلین طبع زاد افسانہ ہے۔ یہ پہلی بار، منٹو کے ادبی راہ نما باری علیگ (۱۹۰۶ء تا ۱۹۴۹ء) کے ہفتہ وار خلق امرتسر میں شائع ہوا۔ اِس افسانے اور مجموعے کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے:

> ... منٹو کا پہلا طبع زاد افسانہ، جیسا کہ ان کے قریبی دوست ابو سعید قریشی کے بیان اور دوسرے قرائن سے پتہ چلتا ہے، ''تماشا'' ہے۔ تماشا پہلے پہل امرتسر کے ہفت روزہ خلق میں ''آدم'' کے فرضی نام سے پھر عالمگیر میں چھپا تھا، بعد کو یہ منٹو کے مجموعے آتش پارے میں شامل ہوا۔ عام طور پر یہ لکھا گیا ہے کہ منٹو کے افسانوں کا پہلا مجموعہ منٹو کے افسانے ہے اور یہ ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ ہمارے پیش نظر منٹو کے افسانوں کا مجموعہ آتش پارے ہے اسے اردو بک اسٹال بیرون لوہاری دروازہ لاہور نے مجتبائی پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا ہے۔ اس میں ناشر کی طرف سے باقاعدہ سنہ اشاعت تو نہیں دیا گیا ہے لیکن منٹو کا بہت مختصر سا دیباچہ تاریخ کے ساتھ اس طور پر ملتا ہے
>
> یہ افسانے دبی ہوئی چنگاریاں ہیں۔ ان کو شعلوں میں تبدیل کرنا پڑھنے والوں کا کام ہے۔
>
> امرتسر ۵ر جنوری ۱۹۳۶ء
>
> سعادت حسن منٹو
>
> اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ۱۹۳۶ء کے آغاز میں شائع ہوا۔ اس کا انتساب منٹو نے اپنے والد صاحب مرحوم کے نام کیا ہے .. کتاب کے آخر میں منٹو کی دو کتابوں سرگذشتِ اسیر اور دو ڈرامے کا اشتہار بھی دیا ہوا ہے۔ سرگذشتِ اسیر مشہور فرانسیسی ادیب وکٹر ہیوگو کی شاہکار تصنیف لاسٹ ڈے آف اے کنڈیمڈ (The Last Day of a Condemned) کا اردو ترجمہ ہے۔ (اردو افسانہ اور افسانہ نگار، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، اگست، ۱۹۸۲ء)، ص ۱۳۱ تا ۱۳۲۔

آتش پارے میں شامل افسانے ''طاقت کا امتحان'' کے اختتام پر اس کی تاریخ تحریر، ۵ر جنوری ۱۹۳۵ء کے ساتھ یہ حوالہ بھی درج ہے: اشاعتِ اوّل...... ہفتہ وار خلق۔ اس اندراج سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''تماشا'' ۵ر جنوری ۱۹۳۵ء سے قبل تصنیف ہوا اور باری علیگ کا جریدہ خلق ہفت روزہ تھا۔ منٹو اور

باری علیگ سے متعلق اب تک کی تحقیق کے مطابق خلق کے صرف دو شمارے طبع ہوئے تھے، دونوں میں منٹو کے افسانے شامل تھے؛ پہلے میں ''تماشا'' اور دوسرے میں ''طاقت کا امتحان''۔

''تماشا'' منٹو نے روسی افسانے میں بھی (ص: ۱۵۹ تا ۱۷۱) اُس کی آخری تحریر کے طور پر، بہ وضاحتِ ''طبع زاد'' شامل کیا تھا اور آتش پارے میں منتقل کرتے ہوئے اِس میں، انجام سمیت، متعدّد ردّوبدل کیے تھے۔

پورا منٹو کے لیے آتش پارے کی تدوین درج ذیل کتب کے پیشِ نظر کی گئی:

۱۔ آتش پارے (مکتبہ شعروادب، لاہور، سنہ اشاعت نہ دارد)، کل صفحات: ۱۳۶۔

۲۔ آتش پارے، مشمولہ منٹو رامہ، متعلقہ صفحات: ۶۲۱ تا ۶۹۵۔

۳۔ روسی افسانے، مترجم: سعادت حسن منٹو (دارالادب پنجاب، لاہور، ۱۹۳۴ء)، کل صفحات: ۱۷۶۔

آتش پارے کی دونوں اشاعتوں میں آٹھ آٹھ افسانے ہیں، افسانوں کے متن یکساں ہیں لیکن مکتبہ شعروادب کے نسخے میں: انتساب، دیباچہ اور سرورق پر کتاب کے نام کے نیچے فقرہ: چند فکر طلب افسانوں کا مجموعہ، بھی شامل ہے۔ مرتّب نے اسی کو بنیادی نسخہ بنایا ہے۔ اس کے صفحہ ۲ پر درج فقرے ''جملہ حقوق بحق بیگم صفیہ منٹو محفوظ ہیں'' سے یہ چند امور واضح ہوتے ہیں:

یہ اشاعت منٹو کی موت (۱۹۵۵ء) کے بعد عمل میں آئی یعنی یہ کتاب کا اوّلین ایڈیشن تو نہیں لیکن منٹو کی قانونی وارث کی اجازت سے شائع ہوا ہے۔ ''انتساب'' کی نوعیت اور ''دیباچہ'' کے اختتام پر درج تاریخِ تحریر سے باور آتا ہے کہ یہ اشاعتِ اوّل کے عین مطابق ہے..... علاوہ ازیں، نسخے میں بیگم صفیہ منٹو یا ناشر کی جانب سے ایسی کوئی وضاحت نہیں کی گئی کہ یہ اشاعتِ اوّل کے مقابلے میں کچھ مختلف ہے۔ یہ قیاس کہ پیشِ نظر نسخہ اشاعتِ اوّل کے عین مطابق ہے، اس بنا پر بھی قابلِ یقین ہو جاتا ہے کہ اس میں شامل آٹھ میں سے سات افسانے، منٹو نے بعد کی تین کتابوں میں، ترامیم اور اضافوں کے ساتھ، شامل کیے تھے (تفصیل آئندہ سطور میں) لیکن وہ تبدیلیاں آتش پارے کے ان متون میں موجود نہیں۔

افسانہ ''ماہی گیر'' کے علاوہ، آتش پارے کے دیگر سات افسانے، منٹو نے بعد کے تین مجموعوں میں شامل کیے اُن کی مجموعہ وار تفصیل یہ ہے:

منٹو کے افسانے (طبع اوّل: ۱۹۴۰ء) میں: انقلاب پسند (بعنوان انقلابی)، تماشا، طاقت کا امتحان۔

دھواں (طبع اوّل: ۱۹۴۱ء یا ۱۹۴۲ء) میں: جی آیا صاحب (بعنوان قاسم)، دیوانہ شاعر، چوری۔

افسانے اور ڈرامے (طبع اوّل: ۱۹۴۳ء) میں: خونی تھوک۔

ساتوں افسانوں کی مکرّر اشاعت کے وقت منٹو نے ان پر بھرپور نظرثانی کی تھی جس کے نتیجے میں ہر افسانے کے سو سے بھی زیادہ لفظ، فقرے اور جملے؛ کئی افسانوں کے آغاز و اختتام اور دو افسانوں کے عنوان تبدیل ہوگئے لہٰذا پورا منٹو میں مجموعہ آتش پارے کے مذکورہ ساتوں افسانوں کا نظرثانی شدہ متن شامل کیا گیا ہے؛ اوّلین متون کی عبارتیں، افسانوں کے بعد حواشی میں درج ہیں۔ مُدوّن نے یہ افسانے بعد کے مجموعوں سے حذف کردیے ہیں۔

''ماہی گیر'' کی نوعیت دیگر افسانوں سے مختلف ہے۔ اِس کے عنوان کے نیچے قوسین میں شائع شدہ نوٹ: (فرانسیسی شاعر وکٹر ہیوگو کی ایک نظم کے تاثرات) واضح کررہا ہے کہ منٹو نے ایک نظم کی فضا و کیفیت میں رچ بس کر یہ افسانہ لکھا تھا جو اوّلاً، روسی افسانے میں تویں تحریر کے طور پر شائع ہوا۔ طبع زاد افسانوں کے اوّلین مجموعے میں اس کی شمولیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ منٹو اسے اپنا طبع زاد افسانہ شمار کرتے تھے۔ لہٰذا، ایمائے مصنف کے مطابق، یہ افسانہ اِسی مجموعے میں برقرار ہے۔ روسی افسانے میں مطبوعہ متن (صص: ۱۴۴ تا ۱۵۸) سے موازنے پر علم ہوا کہ آتش پارے میں شامل کرتے ہوئے منٹو نے اس میں کچھ تبدیلیاں بھی کی تھیں، وہ افسانے کے بعد حواشی میں درج ہیں۔

آتش پارے میں افسانے کے اختتام (ص: ۷۶) پر ''(یکم فروری سنہ ۱۹۳۵ء)'' درج ہے۔ یہ غالباً افسانے پر نظرثانی کی تاریخ ہے۔

''ماہی گیر'' کتاب روسی افسانے میں شامل نہیں کیا جائے گا۔

بنیادی نسخے میں فہرست نہیں ہے لیکن پورا منٹو کے لیے ترتیب دی گئی ہے۔

آتش پارے

چند فکر طلب افسانوں کا مجموعہ

سعادت حسن منٹو

انتساب

والدِ مرحوم کے نام ______________

دیباچہ

یہ افسانے دبی ہوئی چنگاریاں ہیں۔ ان کو شعلوں میں تبدیل کرنا پڑھنے والوں کا کام ہے۔

امرتسر ۵ رجنوری ۱۹۳۶ء

سعادت حسن منٹو

[فہرست]

---

*۱۔ افسانے اور ڈرامے (۱۹۴۳ء) میں شامل کردہ نظرثانی شدہ متن۔

*۲۔ اوّلین عنوان ''انقلاب پسند'' بدل کر منٹو کے افسانے (۱۹۴۰ء) میں شامل کردہ نظرثانی شدہ متن۔

*۳۔ اوّلین عنوان ''جی آیا صاحب'' بدل کر دھواں (۱۹۴۱ء یا ۱۹۴۲ء) میں شامل کردہ نظرثانی شدہ متن۔

*۴۔ روسی افسانے (۱۹۳۴ء) سے منقول اور نظرثانی شدہ متن۔

*۵۔ منٹو کے افسانے میں شامل کردہ نظرثانی شدہ متن۔

*۶۔ منٹو کے افسانے میں شامل کردہ نظرثانی شدہ متن۔

*۷۔ دھواں میں شامل کردہ نظرثانی شدہ متن۔

*۸۔ دھواں میں شامل کردہ نظرثانی شدہ متن۔

خونی تھوک

گاڑی آنے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔

مسافروں کے گروہ کے گروہ پلیٹ فارم کے سنگین سینے کو روندتے ہوئے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ پھل بیچنے والی گاڑیاں، ربڑ ٹائر پہیوں پر خاموشی سے تیر رہی تھیں۔ بجلی کے سیکڑوں قمقمے اپنی نہ جھپکنے والی آنکھوں سے ایک دوسرے کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔ برقی پنکھے سرد آہوں کی صورت میں اپنی ہوا پلیٹ فارم کی گدلی فضا میں بکھیر رہے تھے۔ دور، ریل کی پٹڑی[1] کے پہلو میں ایک لیمپ، سرخ نگاہوں سے مسافروں کی آمدورفت کا بغور مشاہدہ کررہا تھا...... پلیٹ فارم کی فضا سگریٹ کے تند دھوئیں اور مسافروں کے شور میں لپٹی ہوئی تھی۔

پلیٹ فارم پر ہر ایک اپنی دھن میں مست تھا: تین چار، بینچ پر بیٹھے اپنی ہونے والی سیر کا تذکرہ کررہے تھے۔ ایک، گھڑی کے نیچے خدا معلوم کن خیالات میں غرق گنگنا رہا تھا۔ دور کونے میں نیا بیاہا جوڑا ہنس ہنس کر باتیں کررہا تھا، خاوند اپنی بیوی کو کچھ کھانے کے لیے کہہ رہا تھا اور وہ شرما کر مسکرا دیتی تھی۔ پلیٹ فارم کے دوسرے سرے پر ایک نوجوان، قلیوں کے ساتھ ساتھ لڑکھڑا کر چل رہا تھا جو اُس کی بہن کا تابوت اٹھائے ہوئے تھے۔ پانچ چھ فوجی سپاہی، ہاتھ میں چھڑیاں لیے اور سیٹی بجاتے ہوئے ریفریشمنٹ روم سے شراب پی کر نکل رہے تھے۔ ایک اسٹال پر[2] چند مسافر اپنا وقت ٹالنے کی خاطر یوں ہی کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے میں مشغول تھے۔ بہت سے قلی، سرخ وردیاں پہنے، گاڑی کی روشنی کا امید بھری نگاہوں سے انتظار کررہے تھے ... ریفریشمنٹ روم کے اندر ایک صاحب، انگریزی لباس زیب تن کیے، سگار کا دھواں اڑا کر وقت کاٹنے کی کوشش کررہے تھے۔

''قلیوں کی زندگی بھی گدھوں سے[3] بدتر ہے!''

''مگر میاں کیا کریں۔ آخر پیٹ کہاں سے پالیں۔''

''ایک قلی دن بھر میں کتنا کما لیتا ہے؟''[4]

''یہی آٹھ دس آنے!......''

''یعنی صرف جینے کا سہارا، اور اگر بال بچے ہوں تو اپنا پیٹ کاٹ کر اُن کا منہ بھریں۔ خالد خدا کی

قسم![5] جب ان لوگوں کی تاریک زندگی کا خیال، ایک دفعہ بھی میرے دماغ میں آجائے [آجاتا ہے؟] تو پہروں یہی سوچتا ہوں کہ آیا ان کی مصیبت، ہماری نام نہاد تہذیب پر بدنما داغ نہیں ہے؟"

دو دوست پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

خالد اپنے دوست کی گفتگو سن کر قدرے متعجب ہوا اور مسکرا کر کہنے لگا: "کیوں میاں یہ لینن کب سے بنے ہو تم؟...... [6] تہذیب کس بلا کا نام ہے...... انسانیت کے سرد لوہے پر جما ہوا زنگ!...... جانے دو، ایسی باتوں کو...... جانتے ہو میں پہلے ہی سے اپنے حواس کھوئے بیٹھا ہوں۔"

"خالد سچ کہہ رہے ہو۔ یہ باتیں واقعی دماغ کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔ دو روز ہوئے اخبار میں ایک خبر پڑھی کہ پندرہ مزدور، کارخانے میں آگ لگ جانے سے، جلے ہوئے کاغذ کی مانند راکھ ہو گئے۔ کارخانہ بیمہ شدہ تھا، مالک کو روپیہ مل گیا مگر پندرہ عورتیں بیوہ بن گئیں [ہوگئیں؟] اور خدا معلوم کتنے بچے یتیم ہو گئے۔ کل تین نمبر پلیٹ فارم پر ایک خاکروب کام کرتے کرتے گاڑی تلے آکر مر گیا۔ کسی نے [ایک؟] آنسو تک نہ بہایا...... جب سے یہ واقعہ دیکھا ہے طبیعت سخت مغموم ہے۔ یقین جانو، حلق سے روٹی کا ٹکڑا نیچے نہیں اترتا، جب دیکھو اس خاکروب کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش، آنکھیں نکالے[7] میری طرف گھور رہی ہے ..... مجھے اس کے گھر ضرور جانا چاہیے۔ شاید میں اس کے بچوں کی کچھ مدد کر سکوں۔"

خالد مسکرایا اور اپنے دوست کا ہاتھ دبا کر کہنے لگا: "جاؤ...... پندرہ مزدوروں کی بے کس بیویوں کی مدد بھی کرو۔ یہ ایک نیک اور مبارک جذبہ ہے مگر اس کے ساتھ ہی :شہر سے کچھ فاصلے پر چند ایسے لوگ بھی آباد ہیں جنہیں ایک وقت کے لیے سوکھی روٹی کا نصف ٹکڑا بھی میسر نہیں ...... گلیوں میں ایسے بچے بھی ہیں جن کے سروں پر کوئی دستِ شفقت رکھنے والا نہیں ...... ایسی سیکڑوں عورتیں موجود ہیں جن کا حسن غربت کے [کی؟] کیچڑ میں گل سڑ رہا ہے ..... بتاؤ! تم کس کس کی مدد کرو گے؟ ان پھیلے ہوئے ہاتھوں میں سے کس کی مٹھی[8] بھرو گے؟...... ہزاروں ننگے جسموں میں سے کتنوں کی ستر پوشی کرو گے؟"

"آہ! درست کہتے ہو خالد!! ...... درست کہتے ہو، مگر بتاؤ اس تاریک آندھی کو کس طرح روکا جا سکتا ہے؟...... اپنے ہم جنس افراد کو ذلت کی زندگی بسر کرتے دیکھنا، ننگے سینوں پر چمکتے ہوئے بوٹوں کی ٹھوکریں لگتے[9] دیکھنا...... سخت بھیانک خواب ہے!"

"واقعات کی رفتار کا نتیجہ دیکھنے کا انتظار کرو۔ یہ لوگ اپنی طاقت کے باوجود اس طوفان کو نہیں روکتے، خود اعتمادی نے انہیں برداشت کرنا سکھا دیا ہے ...... [10] چنگاری کو شعلوں میں تبدیل کر دینا آسان

ہے مگر چنگاری پیدا کرنا بہت مشکل ہے ...... بہرحال تمہیں امید رکھنی چاہیے۔ شاید تمہاری زندگی ہی میں" مصائب کے بادل دور ہو جائیں۔"

"میں یہ سہانا وقت دیکھنے کے لیے اپنی زندگی کے بقایا سال نذر کرنے کو تیار ہوں۔"

"کاش یہی خیال باقی لوگوں کے دل میں بھی موجود ہوتا! ..... مگر یار، گاڑی آج کچھ دیر سے آتی معلوم ہوتی ہے۔ دیکھو نا، پٹڑی پر روشنی کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا!"

خالد کا دوست کسی گہری فکر میں غوطہ زن تھا اس لیے اس نے اپنے دوست کے آخری الفاظ بالکل نہ سنے اور اگر اس نے سنے تو کچھ خیال کر کے"[۲] کہنے لگا: "واقعی یہ خیال پیدا کرنا چاہیے اور اگر "

"چھوڑو میاں اب اِس فلسفے کو ...... کچھ پتہ ہے گاڑی کب آنے والی ہے؟" خالد نے اپنے دوست کا بازو[۳] پکڑتے ہوئے کہا۔

"گاڑی" اور پھر سامنے والی گھڑی کی طرف نگاہ اٹھا کر: "نو بج کر پچیس منٹ، بس دس منٹ تک آ جائے گی ..... یعنی دس منٹ کے بعد ہمارا دوست ہمارے پاس ہوگا۔ ذرا خیال تو کرو۔ میں وحید کی آمد اس دردناک گفتگو کی وجہ سے بالکل بھول چکا تھا۔"

یہ کہتے ہوئے خالد کے دوست نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانا شروع کر دیا۔[۴]

پلیٹ فارم پر لوگوں کا ہجوم تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ مسافر بڑی سرعت سے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ قلی، اسباب کے ڈھیروں کے پاس خاموش کھڑے، گاڑی کے منتظر تھے کہ جلدی اپنے کام سے فارغ ہو کر ایک آنہ حاصل کر سکیں۔ خوانچے والے دوسرے پلیٹ فارموں سے جمع ہو کر اپنی مخصوص صدا بلند کر رہے تھے۔ فضا: گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ، مختلف انجنوں کی پھپ پھپ، خوانچے والوں کی صداؤں، مسافروں کی باہم گفتگو کے شور اور قلیوں کی بھدّی آوازوں سے معمور تھی...... برقی پنکھے بدستور آہیں بھر رہے تھے۔

ریفریشمنٹ روم کے اندر بیٹھے ہوئے [ایک ایسے؟] مسافر نے جو ابھی سگار کو دانتوں میں دبائے کش لے رہا تھا،[۵] اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف بڑی بے پروائی کے انداز میں دیکھا اور بازو کو جھٹکا دے کر، مرمریں میز پر سہارا دیتے ہوئے، بلند آواز میں بولا: "بوائے۔"

تھوڑی دیر خادم کا انتظار کرنے کے بعد وہ پھر چیخا "بوائے، بوائے۔" اور پھر آہستہ آہستہ بڑبڑاتے ہوئے [بولا؟]: "نمک حرام۔"

"جی آیا حضور۔" دوسرے کمرے میں سے کسی کی آواز آئی۔ [دوسرے کمرے سے آواز آئی؟]

ساتھ ہی سپید لباس پہنے ایک خادم بھاگ کر اُس مسافر کے قریب مؤدب کھڑا ہوگیا۔

''حضور!''

''ہم نے تمہیں دو دفعہ آواز دی...... سوئے رہتے ہو تم لوگ شاید!''

''حضور میں نے سنا نہیں۔ ورنہ کیا مجال ہے کہ غلام حاضر نہ ہوتا۔''

غلام کا لفظ سن کر مسافر کا غصہ فرو ہوگیا۔

''دیکھو، درجۂ اوّل کے مسافروں سے یہ بے رخی اچھی نہیں۔ ہم تمہارے بڑے صاحب کے بھی کان کھینچ سکتا ہے، سمجھے؟......''

''جی ہاں۔''

''ایجنٹ کے! ...... وہ ہمارا دوست ہے...... خیر! دیکھو، تم ویٹنگ روم میں جاؤ اور ہمارے قلی سے کہو کہ وہ صاحب کا تمام اسباب پلیٹ فارم پر لے جائے۔ گاڑی آنے میں صرف پانچ منٹ باقی ہیں۔''

''بہت اچھا حضور!''

''اور ہاں، ہمارا بل دوسرے آدمی کے ہاتھ بھجوا دو۔''

''بہت اچھا صاحب!''

''دیکھو!...... بل میں پانچ سو پچپن نمبر سگریٹ کے ایک ڈبے کے دام بھی شامل کر لینا...... پانچ سو پچپن نمبر کا ڈبا، خیال رہے!''

''بل اور ڈبا گاڑی میں لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔ وقت تھوڑا ہے۔''

''جو مرضی میں آئے کرنا، مگر اب تم جاؤ اور جلد ہمارے قلی کو اسباب نکالنے کے لیے کہہ دو۔''

مسافر نے یہ کہہ کر ایک انگڑائی لی اور میز پر پڑے ہوئے شراب کے گلاس میں سے آخری گھونٹ ایک ہی جرعے میں ختم کر دیے۔ گیلے ہونٹ ایک بے داغ ریشمی رومال سے صاف کرنے کے بعد وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا۔

صاحب کو دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر ایک خادم نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ مسافر بڑی رعونت سے ٹہلتا ٹہلتا پلیٹ فارم کی بھیڑ میں گم ہوگیا۔

دور، ریل کی آہنی پٹریوں کے درمیان، خیرہ کن روشنی کا ایک دھبا نظر آ رہا تھا جو آہستہ آہستہ آس پاس کی تاریکی کو چیرتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ دھبا روشنی کی ایک لمبی دھاری میں تبدیل

ہوگیا اور دفعتاً انجن کی چوندھیا دینے والی روشنی، ایک لمحے کے لیے پلیٹ فارم کے قمقموں کو اندھا بناتی ہوئی، گُل ہوگئی۔ ساتھ ہی کچھ عرصے کے لیے انجن کے آہنی پہیوں کی بھاری گڑگڑاہٹ تلے پلیٹ فارم کا شور دب کر رہ گیا۔ ایک چیخ کے ساتھ گاڑی اسٹیشن کے چبوترے[18] کے پہلو میں کھڑی ہوگئی۔

پلیٹ فارم کا دبا ہوا شور، انجن کی گڑگڑاہٹ سے آزاد ہوکر ایک نئی تازگی سے بلند ہوا۔ مسافروں کی دوڑ دھوپ، بچّوں کے رونے کی آواز، قلیوں کی بھاگ دوڑ، اسباب نکالنے کا شور، ٹھیوں کی کھڑکھڑاہٹ، خوانچے والوں کی بلند صدائیں، شنٹ کرتے ہوئے انجنوں کی دل خراش چیخیں اور بھاپ نکلنے کی شاں شاں، پلیٹ فارم کی آہنی چھت تلے فضا میں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے تیر رہی تھیں۔

''خالد!...... وحید کو دیکھا تم نے کسی ڈبے میں؟''

''نہیں تو۔''

''خدا جانے اِس گاڑی سے آیا بھی ہے یا نہیں۔''

''تار میں تو اسی گاڑی کا ذکر تھا...... ارے وہ [، اُس؟] ڈبے میں کون ہے؟''

''وحید!''

''ہاں، ہاں وحید۔''

دونوں دوست بھاگتے ہوئے اُس ڈبے کی طرف بڑھے جس میں سے وحید اپنا اسباب اتروا رہا تھا۔

ریفریشمنٹ روم والا مسافر تیزی سے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھا، باہر دروازے کے برابر لگے ہوئے کاغذ کو ایک نظر دیکھنے کے بعد، دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا اور پیتل کی ایک سلاخ پکڑ کر[19] قلی اور اپنے اسباب کا انتظار کرنے لگا۔

قلی اسباب سے لدا ہوا، گاڑی کے ڈبّوں کی طرف دیکھ دیکھ کر دوڑا چلا آ رہا تھا۔ مسافر نے اُسے دیکھا اور جھلاّ کر بلند آواز میں کہا[20]:

''ابے اندھے ادھر آ۔''

قلی نے مسافر کی آواز پہچان کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ مگر بھیڑ میں خود مسافر کو نہ دیکھ سکا۔ وہ ابھی اسی پریشانی میں تھا[21] کہ ایک اور آواز آئی: ''کیوں نظر نہیں آ رہا کیا؟...... ادھر ادھر...... ناک کی سیدھ!''

قلی نے مسافر کو دیکھ لیا اور اسباب لے کر اُس کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔

''صاحب ایک طرف ہٹ جائیے، میں اسباب اندر رکھ دوں۔''

''ہاں رکھو۔'' مسافر دروازے کے قریب ایک گدّے دار نشست پر بیٹھ گیا۔ ''مگر اتنا عرصہ سو رہے تھے کیا؟''[۲۲] خانساماں نے تمہیں یہ نہیں کہا تھا کہ صاحب کا سامان اٹھا کر گاڑی آتے ہی فوراً ڈبے میں رکھ دینا۔''

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کس ڈبے میں سوار ہوں گے۔'' قلی نے ایک بھاری ٹرنک بالائی نشست پر رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ ہمارا ریزرو [ڈبا؟] ہے۔ باہر چٹ پر ہمارا نام بھی لکھا ہوا ہے۔''[۲۳]

''آپ نے پہلے کہا ہوتا تو ہرگز دیر نہ ہوتی۔ ایک، دو، تین ...... آٹھ ...... اور یہ دس۔''[۲۴] قلی نے اسباب کی مختلف اشیا گننا شروع کر دیں۔

سامان قرینے سے رکھنے کے بعد قلی نے اپنے اطمینان کے لیے ایک بار پھر رکھی ہوئی[۲۵] چیزوں پر نگاہ ڈالی اور ڈبے سے نیچے پلیٹ فارم پر اتر گیا۔

''صاحب اپنا سامان پورا کر لیجیے۔''

مسافر نے بڑی بے پروائی سے اپنی جیب سے ایک نفیس بٹوہ نکالا اور ابھی کھول کر مزدوری ادا کرنے والا ہی تھا کہ اسے کچھ یاد آ گیا۔[۲۶]

''ہماری چھڑی کہاں ہے؟''

''چھڑی؟...... چھڑی تو آپ ہی کے پاس تھی۔''[۲۷]

''میرے پاس، بکتا ہے[۲۸]...... وہیں چھوڑ آیا ہو گا تو۔''

چھڑی آپ کے پاس تھی...... مگر صاحب اِس سخت کلامی سے پیش آنا درست نہیں۔ جب میں نے کوئی خطا نہیں کی...''[۲۹]

قلی کی زبان سے اس قسم کے الفاظ سن کر مسافر آگ بگولا ہو گیا اور جگہ سے اٹھ کر[۳۰] دروازے کے پاس کھڑا ہو کر چلّانے لگا:

''سخت کلامی سے پیش آنا درست نہیں!...... کسی نواب کا بچہ ہے! جتنے کی چھڑی ہے اُتنی تو تیری اپنی قیمت بھی نہیں![۳۱] چھڑی لے کر آتا ہے یا نہیں؟ چور کہیں کا!''

چور کے لفظ نے قلی کے دل میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ اُس کے جی میں آئی کہ اِس مسافر کی ٹانگ پکڑ کر نیچے کھینچ لے اور اِسے اس اکڑفوں کا مزا چکھا دے۔ مگر طبیعت پر قابو پا کر خاموش ہو گیا اور نرمی سے کہنے لگا:

''آپ کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے...... چھڑی آپ نے کہیں رکھ دی ہو گی، مجھے بتائیے، میں وہاں

سے[۳۲] لے آؤں۔"

"گویا میں بیوقوف ہوں...... میں کہہ رہا ہوں چھڑی لے کر آ، ورنہ ساری شیخی کرکری کردوں گا۔"

قلی ابھی کچھ جواب دینے ہی والا تھا[۳۳] کہ اُسے چند قدم کے فاصلے پر خانساماں نظر آیا جو ہاتھ میں سگریٹ کا ڈبا اور چھڑی لیے چلا آرہا تھا۔

"چھڑی خانساماں لے کر آرہا ہے اور آپ خواہ مخواہ مجھ پر برس رہے ہیں۔"

"بکومت...... کتے کی طرح چلا رہا ہے۔"[۳۴]

یہ سن کر قلی غصے سے بھرا ہوا مسافر کی طرف بڑھا۔ مسافر نے پورے زور سے اس کے بڑھتے ہوئے سینے میں اپنے نوکیلے بوٹ سے ٹھوکر ماری۔[۳۵] ٹھوکر کھاتے ہی قلی چکراتا ہوا سنگین فرش پر گر کر بے ہوش گیا۔

قلی کو گرتے دیکھ کر بہت سے لوگ اُس کے اردگرد جمع ہوگئے۔

"بے چارے کو سخت چوٹ[۳۶] آئی ہے۔"

"یہ لوگ بہانہ بھی کرتے ہیں۔"[۳۷]

"منہ میں سے شاید خون نکل[۳۸] رہا ہے۔"

"معاملہ کیا ہے؟"

"اِس آدمی نے اِسے بوٹ سے ٹھوکر ماری ہے۔"[۳۹]

"کہیں مر نہ جائے بے چارہ۔"

"کوئی دوڑ کر پانی کا ایک گلاس تو لائے۔"

"بھئی ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو،[۴۰] ہوا تو آنے دو۔"

قلی کے گرد جمع ہوتے ہوئے لوگ آپس میں طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد خالد اور اُس کا دوست، بھیڑ چیر کر گرے ہوئے مزدور کے قریب پہنچے۔ خالد نے اُس کے سر کو اپنے گھٹنوں پر اٹھالیا اور اخبار سے ہوا دینا شروع کردی۔ پھر اپنے دوست سے مخاطب ہو کر بولا:

"مسعود! وحید سے کہہ دو کہ اب ہم اُس سے گھر پر مل سکیں گے اور ہاں اُس ظالم کو دیکھنا،[۴۱] کہاں ہے۔ گاڑی چلنے والی ہے کہیں چلا نہ جائے۔"

یہ سنتے ہی لوگ اُس مسافر کے ڈبے کے پاس جمع ہوگئے جو کھڑکی کے پاس بیٹھا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اخبار پکڑے، پڑھنے کی[۴۲] بے سود کوشش کر رہا تھا۔

مسعود اپنے دوست وحید سے رخصت ہو کر[۴۳] اس مسافر کی طرف بڑھا اور کھڑکی کے قریب جا کر نہایت شائستگی سے کہا: ''آپ یہاں اخبار بینی میں مصروف ہیں اور وہ بے چارہ بے ہوش پڑا ہے۔''

''پھر میں کیا کروں؟''

''چلیے اور کم از کم اُس کی حالت تو ملاحظہ کیجیے۔''[۴۴]

''کم بخت نے میرے سفر کا تمام لطف بدمزہ کر دیا۔''[۴۵] اور پھر دروازے سے باہر نکلتے ہوئے: ''چلیے صاحب...... یہ مصیبت بھی دیکھنا تھی۔''

خالد بے ہوش قلی کا سر تھامے اُسے پانی پلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لوگ جھکے ہوئے خالد اور قلی کے چہرے کی طرف[۴۶] بغور دیکھ رہے تھے۔

''خالد! آپ تشریف لے آئے ہیں۔'' مسعود نے مسافر کو آگے بڑھنے کے لیے[۴۷] [آگے بڑھاتے ہوئے؟] کہا۔

''ہاں جناب...... یہ ہے آپ کے ظلم کا شکار...... کسی ڈاکٹر کو ہی بلوالیا ہوتا آپ نے!'' مسعود نے مسافر سے کہا۔

مسافر، قلی کے زرد چہرے اور لوگوں کا گروہ [لوگوں کے گروہ؟] دیکھ کر بہت خوف زدہ ہوا اور گھبراتے ہوئے جیب سے اپنا بٹوہ نکالا۔

مسافر ابھی بٹوہ نکال ہی رہا تھا[۴۸] [کہ؟] قلی کا جسم متحرک ہوا اور اُس نے اپنی آنکھیں کھول کر ہجوم کی طرف پریشان نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔

''یہ نوٹ آپ اسے میری طرف سے دے دیجیے گا۔ میں جا رہا ہوں، گاڑی کا وقت ہو گیا ہے۔'' مسافر نے مسعود کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ دیتے ہوئے انگریزی زبان میں[۴۹] کہا اور پھر قلی کو ہوش میں آتا دیکھ کر اُس سے مخاطب ہوا: ''ہم نے اس غلطی کی قیمت ادا کر دی ہے۔''

قلی یہ سن کر تڑپا۔ منہ سے خون کی ایک دھار بہہ نکلی۔ بڑی کوشش کے بعد اُس نے یہ چند الفاظ اپنی زخمی چھاتی پر زور دے کر ادا کیے:[۵۰]

''میں بھی انگریزی زبان جانتا ہوں...... دس روپے...... ایک انسان کی جان کی قیمت..... میرے پاس بھی کچھ ہے...... جو...''

باقی الفاظ اُس کے خون بھرے منہ میں بلبلے بن کر رہ گئے۔ مسافر، قلی کی یہ حالت دیکھ کر اس کے

پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اُس کا ہاتھ دبا کر کہنے لگا: ''میں زیادہ بھی دے سکتا ہوں۔''

قلی نے بڑی تکلیف سے مسافر کی طرف رخ پھیرا اور منہ سے خون کے بلبلے نکالتے ہوئے کہا:

''میرے پاس...... بھی ...... کچھ ہے...... یہ لو ''

یہ کہتے ہوئے اس نے مسافر کے منہ پر تھوک دیا۔ تڑپا اور پلیٹ فارم کی آہنی چھت کی طرف مظلوم نگاہوں سے دیکھتا ہوا، خالد کی گود میں سرد ہو گیا... مسافر کا منہ خونی تھوک سے رنگا ہوا تھا۔

خالد اور مسعود نے لاش دوسرے آدمیوں کے حوالے کر کے، مسافر کو پکڑ کر پولیس کے سپرد کر دیا۔

مسافر کا مقدمہ دو مہینے تک متواتر عدالت میں چلتا رہا۔

آخر فیصلہ سنایا گیا۔ فاضل جج نے ملزم کو تھوڑا سا جرمانہ[۵۱] کرنے کے بعد بری کر دیا۔ فیصلے میں یہ لکھا تھا کہ قلی کی موت اچانک تلی پھٹ جانے سے واقع ہوئی ہے۔

فیصلہ سناتے وقت، [؟فیصلے کے وقت،] خالد اور مسعود بھی موجود تھے۔ ملزم اُن کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

''قانون کا قفل طلائی چابی سے[۵۲] کھل سکتا ہے۔''

''مگر ایسی چابی ٹوٹ بھی جایا کرتی ہے۔''

خالد اور اس کا دوست باہر برآمدے میں گفتگو[۵۳] کر رہے تھے۔[۵۴]

حواشی

(اِن حواشی میں ص سے مراد: کتاب آتش پارے کا صفحہ ہے۔
دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ اوّلین متن میں ''دور ریل کی پٹڑی'' (ص ۷) اور نظرثانی شدہ متن میں ''دور سے ریل کی پٹڑی'' (افسانے اور ڈرامے، ص:۱۳۳) شائع ہوا ہے۔ مدوّن کے نزدیک ''دور، ریل کی پٹڑی'' راجح ہے۔

۲۔ ہر ایک شخص اپنی اپنی دھن میں... میں غرق زیرِ لب گنگنا...
نیا بیاہا ہوا جوڑا... کہہ رہا تھا۔ وہ شرما کر... پانچ چھ فوجی گورے... بک سٹال پر — ص:۸

۳۔ قلیوں کی زندگی گدھوں سے بھی — ایضاً

۴۔ کتنا کما لیتا ہوگا؟ — ایضاً

۵۔ اضافہ شدہ فقرہ: خالد خدا کی قسم (افسانے اور ڈرامے، ص:۱۳۴) سوچتا رہتا ہوں — ص:۹
۶۔ کب سے بنے تم؟ — ایضاً
۷۔ آگ لگ جانے کی وجہ سے جلے ہوئے کاغذ کے مانند راکھ... — ایضاً
آنکھیں باہر نکالے — ص:۱۰
۸۔ کی بھی مدد کرو... اوّلین متن میں "جنھیں ایک وقت کے لیے" (ص:۱۰)
اور نظرِ ثانی شدہ متن میں "جن کے پاس ایک وقت کے لیے" (افسانے اور ڈرامے، ص:۱۳۶)
شائع ہوا ہے۔ مدوّن کے نزدیک "جنھیں" راجح ہے... کوئی پیار دینے والا نہیں... کس کس کی مٹھی — ص:۱۰
۹۔ بوٹوں کی ٹھوکریں کھاتے — ایضاً
۱۰۔ آئندہ عبارت، کتاب: افسانے اور ڈرامے (ص:۱۳۶) میں جداگانہ پارے کے طور پر
شائع ہوئی ہے جب کہ آتش پارے (ص:۱۱) میں یہ عبارت مسلسل ہے۔ ایک کردار کے
اظہارِ خیال کی حیثیت سے تسلسل راجح ہے۔ — ص:۱۱
۱۱۔ چنگاریوں کو... مگر چنگاری کا پیدا کرنا... تمھاری زندگی میں ہی — ایضاً
۱۲۔ خالد کا ساتھی... کچھ اور خیال کر کے — ایضاً
۱۳۔ کچھ پتا بھی ہے... دوست کو بازو سے — ایضاً
۱۴۔ سلگانا شروع کیا۔ — ص:۱۲
۱۵۔ کش کھینچ رہا تھا۔ — ایضاً
۱۶۔ [گذشتہ سطر کے تسلسل میں] اور ساتھ ہی سپید لباس پہنے ہوئے ایک خادم — ص:۱۳
۱۷۔ مکالمہ: "بہت اچھا صاحب!" اوّلین متن (ص:۱۳) میں ہے۔ نظرِ ثانی شدہ متن
(افسانے اور ڈرامے، ص:۱۳۹) میں موجود نہیں۔
۱۸۔ اوّلین متن میں نئے پارے کا آغاز۔ تھوڑی دیر کے بعد... اندھا بناتے ہوئے... سٹیشن کے
سنگین چبوترے — صص:۱۴ تا ۱۵
۱۹۔ باہر دروازے کے ساتھ... ڈبّے کے اندر... اور پیتل کی سلاخ تھام کر — ص:۱۶
۲۰۔ مسافر نے اُسے...... جھلّا کے بلند آواز میں پکارا — ایضاً
۲۱۔ اسی پریشانی کی حالت میں ہی تھا — ایضاً
۲۲۔ "ہاں رکھو" دروازے کے ساتھ ایک گدے دار نشست پر بیٹھتے ہوئے۔ "مگر اتنا عرصہ
سوئے رہے تھے کیا؟ — ایضاً
۲۳۔ یہ ڈبہ ہمارا ریزرو کرایا ہوا ہے۔ باہر چٹ پر نام بھی لکھا ہوا ہے۔ — ص:۱۷
۲۴۔ آپ نے پہلے یہ کہا ہوتا تو ہرگز یہ دیر نہ ہوتی...... ایک، دو تین...... آٹھ...... اور، دس — ایضاً
۲۵۔ ایک بار رکھی ہوئی — ایضاً
۲۶۔ کچھ یاد آیا — ایضاً

۲۷۔ چھڑی تو آپ کے پاس ہی تھی ص:۱۷
۲۸۔ میرے پاس، بکتا کیا ہے ایضاً
۲۹۔ کوئی خطا ہی نہیں کی ایضاً
۳۰۔ آگ بھبھوکا ہوگیا۔ اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر ص:۱۸
۳۱۔ کسی نواب کا صاحب زادہ… اتنی تو تیری قیمت بھی نہیں ایضاً
۳۲۔ وہاں سے پتا لے آؤں ایضاً
۳۳۔ جواب دینے ہی لگا تھا ایضاً
۳۴۔ ''بکو نہیں اب…… کتے کی طرح چلائے جا رہا ہے۔'' ص:۱۹
۳۵۔ سینے میں نوکیلے بوٹ سے ٹھوکر لگائی۔ ایضاً
۳۶۔ بے چارے کو بہت سخت چوٹ ایضاً
۳۷۔ یہ لوگ بہانہ بھی کیا کرتے ہیں۔ ایضاً
۳۸۔ منہ سے شاید خون بھی نکل ایضاً
۳۹۔ ٹھوکر لگائی ہے۔ ایضاً
۴۰۔ ہٹ کر کھڑے رہو۔ ایضاً
۴۱۔ کہ ہم اب اسے گھر پر ہی مل سکیں گے …… اور ہاں ذرا اُس ظالم کو تو دیکھنا۔ کہاں ہے……
گاڑی چلنے والی ہے۔ کہیں وہ چلا نہ جائے۔ ص:۲۰
۴۲۔ ہاتھوں سے اخبار پڑھنے کی ایضاً
۴۳۔ رخصت لے کر ایضاً
۴۴۔ حالت کا ملاحظہ تو کیجیے ایضاً
۴۵۔ لطف غارت کر دیا ہے ایضاً
۴۶۔ قلی کے چہروں کی طرف ص:۲۱
۴۷۔ آگے بڑھنے کو ایضاً
۴۸۔ بٹوہ نکال رہا تھ ایضاً
۴۹۔ میں چلتا ہوں… دس روپے کا ایک نوٹ پکڑاتے ہوئے انگریزی میں ایضاً
۵۰۔ بڑی کوشش سے اُس نے… زور دے کر نکالے:- ایضاً
۵۱۔ آخر فیصلہ سنا دیا گیا… معمولی جرمانہ ص ۲۳
۵۲۔ قفل صرف طلائی چابی سے ایضاً
۵۳۔ برآمدے میں باہم گفتگو ایضاً
۵۴۔ اوّلین متن میں افسانے کے اختتام پر، دو سطروں میں، یہ وضاحت درج ہے:
اشاعت اوّلیں:- ساقی ایضاً

انقلابی

میری اور سلیم کی دوستی کو پانچ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس زمانے میں ہم نے ایک ہی اسکول سے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا، ایک ہی کالج میں داخل ہوئے اور ایک ہی ساتھ ایف اے کے امتحان میں فیل ہوئے۔ پھر پرانا کالج چھوڑ کر ایک نئے کالج میں داخل ہوئے ...... اُس سال میں تو پاس ہو گیا مگر سلیم بدقسمتی سے پھر فیل ہو گیا۔

سلیم کی دوبارہ ناکامیابی سے لوگ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ وہ آوارہ مزاج اور نالائق ہے ...... یہ بالکل جھوٹ ہے۔ سلیم کا بغلی دوست ہونے کی حیثیت سے میں یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سلیم کا دماغ بہت روشن ہے۔ اگر وہ کالج کی پڑھائی کی طرف ذرا بھی توجہ دیتا تو' وہ صوبے بھر میں اوّل رہتا۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُس نے پڑھائی کی طرف کیوں توجہ نہ دی؟

جہاں تک میرا ذہن کام دیتا ہے مجھے اس کی تمام تر وجہ، وہ خیالات معلوم ہوتے ہیں جو ایک عرصے سے اُس کے دل و دماغ پر آہستہ آہستہ چھا رہے تھے۔

دسویں جماعت اور کالج میں داخل ہوتے وقت سلیم کا دماغ ان تمام الجھنوں سے آزاد تھا جس نے [کذا] اسے ان دنوں پاگل خانے کی چار دیواری میں بند کر رکھا ہے۔ ایامِ کالج میں وہ دیگر طلبہ کی طرح ہر کھیل کود میں حصہ لیا کرتا تھا۔ لڑکوں میں ہر دل عزیز تھا۔ مگر یکا یک اس کے والد کی ناگہانی موت نے اُس کے متبسم چہرے پر غم کی نقاب الٹ دی ...... اب کھیل" کی جگہ غور و فکر نے لے لی۔

وہ کیا خیالات تھے جو سلیم کے مضطرب دماغ میں پیدا ہوئے؟ ...... یہ مجھے معلوم نہیں۔ سلیم کی نفسیات کا مطالعہ بہت مشکل" کام ہے۔ اس کے علاوہ، وہ خود اپنی دلی آواز سے ناآشنا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ گفتگو کرتے وقت یا یوں ہی سیر کرتے ہوئے اچانک میرا بازو پکڑ کر کہا ہے: ''عباس! جی چاہتا ہے کہ...''

''ہاں، کیا جی چاہتا ہے؟'' میں نے اُس کی طرف تمام توجہ مبذول کر کے پوچھا۔ مگر میرے اس استفسار پر اس کے چہرے کی غیر معمولی تبدیلی اور گلے میں سانس کے تصادم نے صاف طور پر ظاہر کیا کہ وہ اپنے دلی مدعا کو خود بھی نہیں جانتا۔[۵]

وہ شخص جو اپنے احساسات کو کسی شکل میں پیش کر کے دوسرے ذہن پر منتقل کر سکتا ہے، اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکتا ہے اور وہ شخص جو محسوس کرتا ہے، مگر اپنے احساس کو خود آپ اچھی طرح نہیں سمجھتا، اور پھر یہ کمزوری بیان کرنے کی بھی قدرت نہیں رکھتا، اُس شخص کے مرادف ہے جو اپنے حلق میں ٹھنسی ہوئی چیز کو باہر نکالنے کی کوشش کرے مگر وہ گلے سے نیچے اترتی چلی جائے۔ یہ ایک ایسا عذاب ہے[6] جس کی تفصیل لفظوں میں نہیں آ سکتی۔

سلیم شروع ہی سے اپنی آواز سے نا آشنا رہا ہے۔ اس کے سینے میں خیالات کا ایک ہجوم چھایا رہتا تھا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ بیٹھا بیٹھا اٹھ کھڑا ہوا، اور کمرے میں چکر لگا کر لمبے لمبے سانس بھرنے شروع کر دیے ...... غالباً وہ اپنے اندرونی انتشار سے تنگ آ کر اُن خیالات کو جو اُس کے سینے میں بھاپ کے مانند چکر لگا رہے ہوتے، سانسوں کے ذریعے سے باہر نکالنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اضطراب کے ان ہی تکلیف دہ لمحات میں اُس نے اکثر اوقات مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ہے: ''عباس! یہ کشتی کسی روز تند موجوں کی تاب نہ لا کر، چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گی ...... مجھے اندیشہ ہے کہ...'' مگر وہ اپنے اندیشے کو پوری طرح بیان نہیں کر سکتا تھا[7]

سلیم کسی متوقع حادثے کا منتظر ضرور تھا۔ مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ حادثہ کس شکل میں پردۂ ظہور پر نمودار ہو گا ..... اس کی نگاہیں ایک عرصے سے دھندلے خیالات کی صورت میں ایک موہوم سایہ سا دیکھ رہی تھیں جو اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ مگر وہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس تاریک پردے کے پیچھے کیا ہے۔[8]

میں نے سلیم کی نفسیات سمجھنے کی بہت کوشش کی ہے مگر مجھے اُس کی منقلب عادات کی موجودگی میں کبھی معلوم نہ[9] ہو سکا کہ وہ کن گہرائیوں میں غوطہ زن ہے اور وہ اس دنیا میں رہ کر اپنے مستقبل کے لیے کیا کرنا چاہتا ہے جبکہ اپنے والد کے انتقال کے بعد وہ ہر قسم کے سرمائے سے محروم کر دیا گیا تھا۔

میں ایک عرصے سے سلیم کو تبدیل ہوتا[10] دیکھ رہا تھا۔ اُس کی عادات دن بدن بدل رہی تھیں ...... کل کا کھلنڈرا لڑکا، میرا ہم جماعت، ایک مفکر میں تبدیل ہو رہا تھ ...... یہ تبدیلی میرے لیے سخت باعث حیرت تھی۔

کچھ عرصے سے سلیم کی طبیعت پر ایک غیر معمولی سکون چھا گیا تھ۔ جب دیکھو اپنے گھر میں خاموش بیٹھا ہے اور اپنا بھاری سر گھٹنوں میں دیے[11] سوچ رہا ہے ...... وہ کیا سوچ رہا ہوتا، یہ میری طرح خود اسے بھی معلوم نہ تھا۔ ان لمحات میں، میں نے اسے اکثر اوقات اپنی گرم آنکھوں پر دوات کا آہنی ڈھکنا یا گلاس کا

بیرونی حصہ پھیرتے دیکھا ہے...... شاید وہ اِس عمل سے اپنی آنکھوں کی حرارت کم کرنا چاہتا تھا۔

سلیم نے کالج چھوڑتے ہی غیر ملکی مصنفوں کی بھاری بھر کم تصانیف کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ شروع شروع میں مجھے اُس کی میز پر ایک کتاب نظر آئی۔ پھر آہستہ آہستہ اُس الماری میں جس میں وہ شطرنج، تاش اور اِسی قسم کی کھیلنے والی چیزیں رکھا کرتا تھا، کتابیں ہی کتابیں نظر آنے لگیں...... اس کے علاوہ وہ کئی کئی دنوں تک گھر سے باہر رہنے لگا۔[۱]

جہاں تک میرا خیال ہے سلیم کی طبیعت کا غیر معمولی سکون اُن کتابوں کے اَن تھک مطالعے کا نتیجہ تھا جو[۳] اُس نے بڑے قرینے سے الماری میں سجا رکھی تھیں۔

سلیم کا عزیز ترین دوست ہونے کی حیثیت میں اس کی طبیعت کے غیر معمولی سکون سے میں سخت پریشان تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ یہ سکون کسی وحشت خیز طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ اِس کے علاوہ مجھے سلیم کی صحت کا بھی بہت خیال تھا۔ وہ پہلے ہی بہت کم زور تھا۔ اِس پر اُس نے خواہ مخواہ اپنے آپ کو بہت سی الجھنوں میں پھنسا لیا تھا۔ سلیم کی عمر بمشکل بیس سال کی ہوگی مگر اُس کی آنکھوں کے نیچے شب بیداری کی وجہ سے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ پیشانی جو اِس سے قبل بالکل ہموار تھی اب اُس پر کئی شکن پڑے رہتے تھے جو اُس کی ذہنی پریشانی ظاہر کرتے تھے۔ چہرہ جو کچھ عرصہ پہلے بہت شگفتہ ہوا کرتا تھا، اب اُس پر ناک اور بالائی لب کے درمیان گہری لکیریں پڑ گئی تھیں[۴]...... اس غیر معمولی تبدیلی کو میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوتے دیکھا ہے جو مجھے ایک شعبدے سے کم معلوم نہیں ہوتی...... یہ کیا کم تعجب کی بات ہے کہ میری عمر کا لڑکا میری نظروں کے سامنے بوڑھا ہو جائے۔

سلیم پاگل خانے میں ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں مگر اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ وہ سڑی یا دیوانہ ہے۔ اُسے غالباً اس بنا پر پاگل خانے بھیجا گیا ہے کہ وہ بازاروں میں بلند بانگ تقریریں کرتا ہے۔ راہ گزروں کو پکڑ پکڑ کر اُنہیں زندگی کے مشکل مسائل بتا کر جواب طلب کرتا ہے اور امرا کے حریر پوش بچوں کا لباس اُتار کر ننگے بچوں کو پہنا دیتا ہے...... ممکن ہے یہ حرکات ڈاکٹروں کے نزدیک دیوانگی کی علامتیں ہوں مگر میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سلیم پاگل نہیں ہے بلکہ وہ لوگ جنہوں نے اُسے امنِ عامہ میں خلل ڈالنے والا تصوّر کر کے آہنی سلاخوں کے پنجرے میں قید کر دیا ہے، خود دیوانے ہیں۔[۵]

اگر وہ اپنی غیر مربوط تقریر کے ذریعے سے لوگوں[۶] تک اپنا پیغام پہنچانا چاہتا ہے تو کیا اُن کا فرض نہیں کہ وہ اُس کے ہر لفظ کو غور سے سنیں؟

اگر وہ راہ گزروں کے ساتھ فلسفۂ حیات پر تبادلۂ خیالات کرنا چاہتا ہے تو کیا اس سے یہ مطلب نکالا جائے گا[۱۷] کہ اُس کا وجود مجلسی دائرے کے لیے نقصان دہ ہے؟...... کیا زندگی کے حقیقی معانی سے باخبر ہونا ہر انسان کا فرض نہیں ہے؟

اگر وہ متموّل اشخاص کے بچوں کا لباس اتار کر غربا کے برہنہ بچوں کا تن ڈھانکتا ہے تو کیا یہ عمل ان لوگوں[۱۸] کو ان کے فرائض سے آگاہ نہیں کرتا جو فلک بوس عمارتوں میں دوسرے لوگوں کے بل بوتے پر آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں؟...... کیا ننگوں کی ستر پوشی کرنا ایسا فعل ہے کہ اسے دیوانگی پر محمول کیا جائے؟

سلیم ہرگز پاگل نہیں ہے۔ مگر مجھے یہ تسلیم ہے کہ اُس کے افکار نے اُسے بے خود اور مجذوب بنا رکھا ہے۔ دراصل وہ دنیا کو ایک پیغام دینا چاہتا ہے، مگر دے نہیں سکتا۔ ایک کم سن بچے کی طرح تتلا تتلا کر وہ اپنے قلبی احساسات بیان کرنا چاہتا ہے مگر الفاظ اس کی زبان پر آتے ہی بکھر جاتے ہیں، جیسے مٹھی میں سے سوکھی ریت![۱۹]

وہ اس سے قبل [ہی؟] ذہنی اذیت میں مبتلا ہے مگر اب اُسے اور اذیت میں ڈال دیا گیا ہے...... وہ پہلے ہی سے اپنے افکار کی الجھنوں میں گرفتار ہے اور اب اُسے زنداں نما کوٹھری میں قید کر دیا گیا ہے...... کیا یہ ظلم نہیں ہے؟

میں نے آج تک سلیم کی کوئی بھی حرکت ایسی[۲۰] نہیں دیکھی جس سے میں یہ نتیجہ نکال سکوں کہ وہ دیوانہ ہے۔ ہاں البتہ کچھ عرصے سے میں اس کے ذہنی انقلابات کا مشاہدہ ضرور کرتا رہا ہوں۔

شروع شروع میں جب میں نے اس کے کمرے کے تمام فرنیچر کو اپنی جگہ سے ہٹا ہوا پایا تو میں نے اس تبدیلی کی طرف خاص توجہ نہ دی۔ دراصل میں نے اُس وقت یہ خیال کیا کہ شاید سلیم نے فرنیچر کی موجودہ جگہ کو موزوں خیال کیا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ میری نظروں کو جو کرسیوں اور میزوں کو کئی برسوں سے ایک ہی[۲۱] جگہ دیکھنے کی عادی تھیں، وہ غیر متوقع تبدیلی بہت بھلی معلوم ہوئی۔

اس واقعے کے چند روز بعد جب میں کالج سے فارغ ہو کر سلیم کے کمرے میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ فلمی ممثلوں کی وہ تصاویر جو ایک عرصے سے کمرے کی دیواروں پر آویزاں تھیں اور جن کو میں نے[۲۲] اور سلیم نے بہت مشکل کے بعد فراہم کیا تھا، باہر ٹوکری میں پھٹی پڑی ہیں اور ان کی جگہ ان ہی چوکھٹوں میں مختلف مصنفوں کی تصویریں لٹک رہی ہیں...... چونکہ میں خود اُن تصاویر کا اتنا مشتاق نہ تھا اس لیے مجھے سلیم کا یہ انتخاب بہت پسند آیا۔ چنانچہ ہم اُس روز دیر تک اُن تصویروں کے متعلق گفتگو بھی کرتے رہے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے اس واقعے کے بعد سلیم کے کمرے میں ایک ماہ تک کوئی خاص قابلِ ذکر تبدیلی واقع نہیں ہوئی مگر اس عرصے کے بعد میں نے اچانک ایک روز کمرے میں بڑا سا تخت پڑا پایا...... جس پر سلیم نے کپڑا بچھا کر کتابیں چُن رکھی تھیں[۲۳] اور آپ قریب ہی زمین پر ایک تکیے کا سہارا لیے کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ میں یہ دیکھ کر سخت متعجب ہوا اور کمرے میں داخل ہوتے ہی سلیم سے یہ سوال کیا:

''کیوں میاں! اس تخت کے کیا معنی؟''

سلیم، جیسا کہ اس کی عادت ہے،[۲۴] مسکرایا اور کہنے لگا: ''کرسیوں پر روزانہ بیٹھتے بیٹھتے طبیعت اکتا گئی ہے۔ اب یہ فرش والا سلسلہ ہی رہے گا۔''

بات معقول تھی۔ میں چپ ہو رہا۔ واقعی روزانہ ایک ہی چیز استعمال کرتے کرتے طبیعت ضرور اچاٹ ہو جایا کرتی ہے۔ مگر جب پندرہ بیس روز کے بعد میں نے وہ تخت مع تکیے کے غائب پایا تو میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی اور مجھے شبہ سا ہوا کہ میرے دوست کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔[۲۵]

سلیم سخت گرم مزاج واقع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے وزنی افکار نے اُسے معمول سے زیادہ چڑچڑا بنا رکھا تھا۔ اس لیے میں عموماً اُس سے ایسے سوال[۲۶] نہیں کیا کرتا جو اُس کے دماغی توازن کو درہم برہم کر دیں یا جن سے وہ خواہ مخواہ کھج جائے۔

فرنیچر کی تبدیلی، تصویروں کا انقلاب، تخت کی آمد اور پھر اُس کا غائب ہو جانا، واقعی کسی حد تک تعجب خیز ضرور ہیں اور واجب تھا کہ میں ان امور کی وجہ دریافت کرتا مگر چونکہ مجھے سلیم کو آزردہ خاطر کرنا اور اس کے کام میں دخل دینا منظور نہ تھا اس لیے میں خاموش رہا۔

تھوڑے عرصے کے بعد سلیم کے کمرے میں ہر دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی تبدیلی دیکھنا میرا معمول ہو گیا...... اگر آج کمرے میں تخت موجود ہے تو ایک ہفتے کے بعد وہاں سے اٹھا دیا گیا ہے۔ اس کے دو روز بعد وہ میز جو کچھ عرصہ پہلے کمرے کے دائیں طرف پر تھا، رات رات میں وہاں سے اٹھا کر دوسری طرف رکھ دیا گیا ہے۔ انگیٹھی پر رکھی ہوئی تصاویر کے زاویے بدلے جا رہے ہیں۔ کپڑے لٹکانے کی کھونٹیاں ایک جگہ سے اکھیڑ کر دوسری جگہ جڑ دی گئی ہیں۔ کرسیوں کے رخ تبدیل کیے گئے ہیں ...... گویا کمرے کی ہر شے سے ایک قسم کی قواعد کرائی جا رہی ہے۔[۲۷]

ایک روز جب میں نے کمرے کے تمام فرنیچر کو مخالف رُخ میں دیکھا[۲۸] تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے سلیم سے دریافت کر ہی لیا: ''سلیم! میں ایک عرصے اس کمرے کو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیکھ

رہا ہوں۔ آخر بتاؤ تو سہی یہ تمہارا کوئی نیا فلسفہ ہے؟“

سلیم نے جواب دیا: ”تم جانتے نہیں ہو، میں انقلابی ہوں۔“[۲۹]

یہ سن کر مجھے اور بھی تعجب ہوا۔ اگر سلیم نے یہ الفاظ اپنی حسبِ معمول مسکراہٹ کے ساتھ کہے ہوتے تو میں یقیناً[۳۰] یہ خیال کرتا کہ وہ صرف مذاق کر رہا ہے مگر یہ جواب دیتے وقت اُس کا چہرہ اس امر کا شاہد تھا کہ وہ سنجیدہ ہے اور میرے سوال کا جواب وہ اِن ہی الفاظ میں دینا چاہتا ہے۔ لیکن پھر بھی میں تذبذب کی حالت میں تھا۔ چنانچہ میں نے اُس سے کہا: ”مذاق کر رہے ہو یار؟“

”تمہاری قسم، بہت بڑا انقلابی۔“[۳۱] وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

مجھے یاد ہے کہ اس کے بعد اس نے ایسی گفتگو شروع کی تھی کہ ہم دونوں نے کسی اور [ہی؟] موضوع پر اظہارِ خیالات کرنا شروع کر دیا تھا[۳۲] ...... یہ سلیم کی عادت ہے کہ وہ بہت سی باتوں کو دلچسپ گفتگو کے پردے میں چھپا لیا کرتا ہے۔

اِن دنوں جب کبھی میں سلیم کے اُس جواب پر غور کرتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ سلیم درحقیقت انقلابی[۳۳] ہے ...... اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ کسی سلطنت کا تختہ الٹنے کے درپے ہے یا وہ دیگر انقلاب پسندوں کی طرح چوراہوں میں بم پھینک کر دہشت پھیلانا چاہتا ہے بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے وہ ہر چیز میں انقلاب دیکھنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی نظریں اپنے کمرے میں پڑی ہوئی اشیا کو ایک ہی جگہ پر نہ دیکھ سکتی تھیں۔ ممکن ہے میرا یہ قیافہ کسی حد تک غلط ہو مگر میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کی جستجو کسی ایسے انقلاب کی طرف رجوع کرتی ہے جس کے آثار اس [کے؟] کمرے کی روزانہ تبدیلیوں سے ظاہر ہیں۔

بادی النظر میں کمرے کی اشیا کو روز الٹ پلٹ کرتے رہنا، نیم دیوانگی ہے۔ لیکن اگر سلیم کی ان بے معنی حرکات کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو یہ امر روشن ہو جائے گا کہ ان کے پسِ پردہ ایک ایسی قوت کام کر رہی تھی جس سے وہ خود ناآشنا تھا ...... اسی قوت نے جسے میں ذہنی انقلاب[۳۴] کا نام دیتا ہوں، سلیم کے دماغ میں تلاطم بپا کر دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس طوفان کی تاب نہ لا کر از خود رفتہ ہو گیا اور پاگل خانے کی چار دیواری میں قید کر دیا گیا۔

پاگل خانے جانے سے کچھ روز پہلے سلیم مجھے اچانک شہر کے ایک ہوٹل میں چائے پیتا ہوا ملا۔ میں اور وہ دونوں ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ گئے۔ اس لیے کہ میں اُس سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے بازار کے چند دکان داروں سے سنا تھا کہ اب سلیم بازاروں میں پاگلوں کی طرح تقریریں کرتا ہے ......

میں یہ چاہتا تھا کہ سلیم سے فوراً مل کر اُسے اس قسم کی حرکات سے منع کر دوں۔ چونکہ میں سلیم سے فوراً ہی بات کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے ہوٹل ہی میں گفتگو کرنا مناسب سمجھی۔[۳۵]

کرسی پر بیٹھتے وقت میں نے غور سے سلیم کے چہرے کو دیکھا۔ وہ مجھے اس طرح گھورتا دیکھ کر سخت متعجب ہوا اور[۳۶] کہنے لگا...... ''شاید میں سلیم نہیں ہوں۔''

آواز میں کس قدر درد تھا۔ گو یہ جملہ آپ کی نظروں میں بالکل سادہ ہو۔ مگر خدا گواہ ہے میری آنکھیں بے اختیار نم ناک ہو گئیں ''شاید میں سلیم نہیں ہوں''...... گویا وہ ہر وقت اس بات کا متوقع تھا کہ کسی روز اس کا بہترین دوست بھی اسے نہ پہچان سکے گا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بہت[۳۷] تبدیل ہو چکا ہے۔

میں نے ضبط سے کام لیا اور اپنے آنسوؤں کو رومال میں چھپا کر اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر[۳۸] کہا:

''سلیم میں نے سنا ہے کہ تم نے [میرے؟] لاہور جانے کے بعد یہاں بازاروں میں تقریریں[۳۹] شروع کر دی ہیں...... جانتے بھی ہو، اب تمہیں شہر کا بچہ بچہ پاگل کے نام سے پکارتا ہے۔''

''پاگل! شہر کا بچہ بچہ مجھے پاگل کے نام سے پکارتا ہے...... پاگل!...... ہاں عباس، میں پاگل ہوں...... پاگل...... دیوانہ...... خرد باختہ...... لوگ مجھے دیوانہ کہتے ہیں...... معلوم ہے کیوں؟''

[۴۰] وہ میری طرف سرتاپا استفہام بن کر دیکھنے لگا مگر میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ دوبارہ گویا ہوا:

''اس لیے کہ میں اُنہیں غریبوں کے ننگے بچے دکھلا دکھلا کر یہ پوچھتا ہوں کہ اس بڑھتی ہوئی غربت کا کیا علاج ہو سکتا ہے؟...... وہ مجھے کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ اس لیے وہ مجھے پاگل تصور کرتے ہیں...... آہ! اگر مجھے صرف یہ معلوم ہو کہ ظلمت کے اس زمانے میں روشنی کی ایک شعاع کیونکر فراہم کی جا سکتی ہے۔ ہزاروں غریب بچوں کا تاریک مستقبل کیونکر منور بنایا جا سکتا ہے۔

وہ مجھے پاگل کہتے ہیں...... وہ جن کی نبضِ حیات دوسروں کے خون کی مرہونِ منت ہے، وہ جن کی جنت غربا کے جہنم کی مستعار اینٹوں سے استوار کی گئی ہے، وہ جن کے سازِ عشرت کے ہر تار کے ساتھ بیواؤں کی آہیں، یتیموں کی عریانی اور لاوارث بچوں کی صدائے گریہ لپٹی[۴۱] ہے...... کہیں، مگر ایک زمانہ آنے والا ہے جب یہی پروردۂ غربت اپنے دلوں کے مشترکہ لہو میں انگلیاں ڈبو ڈبو کر ان لوگوں کی پیشانیوں پر اپنی لعنتیں لکھیں گے...... وہ وقت نزدیک ہے جب ارضی جنت کے دروازے ہر شخص کے لیے وا ہوں گے۔

میں پوچھتا ہوں کہ اگر میں آرام میں ہوں تو کیا وجہ ہے کہ تم تکلیف کی زندگی بسر کرو؟...... کیا یہی

انسانیت ہے کہ میں کارخانے کا مالک ہوتے ہوئے ہر شب ایک نئی رقاصہ کا ناچ دیکھوں، ہر روز کلب میں سیکڑوں روپے قماربازی کی نذر کردوں، اور اپنی نکمّی سے نکمّی خواہش پر بے دریغ روپیہ بہا کر اپنا دل خوش کروں اور میرے مزدوروں کو ایک وقت کی روٹی نصیب نہ ہو۔ ان کے بچے مٹی کے ایک کھلونے کے لیے ترسیں ...... پھر لطف یہ ہے کہ میں مہذّب ہوں، میری ہر جگہ عزت کی جاتی ہے اور وہ لوگ جن کا پسینہ میرے لیے موتی تیار کرتا ہے، سوسائٹی[۴۲] میں حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ میں خود اُن سے نفرت کرتا ہوں ...... تم ہی بتاؤ، کیا یہ دونوں ظالم ومظلوم اپنے فرائض سے ناآشنا نہیں ہیں؟

میں ان دونوں کو اُن کے فرائض سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں، مگر کس طرح کروں؟ ...... یہ مجھے معلوم نہیں۔''

سلیم نے اِس قدر کہہ کر ہانپتے ہوئے ٹھنڈی چائے کا ایک گھونٹ بھرا اور میری طرف دیکھے بغیر پھر بولنا شروع کر دیا:

''میں پاگل نہیں ہوں ...... مجھے ایک وکیل سمجھو۔ بغیر کسی امید کے، جو اُس چیز کی وکالت کرتا[۴۳] ہے جو بالکل گم ہو چکی ہے ...... میں ایک دبی ہوئی آواز ہوں ...... انسانیت ایک منہ ہے اور میں ایک چیخ۔ میں اپنی آواز دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں مگر وہ میرے خیالات کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے۔

میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر اِسی لیے کچھ کہہ نہیں سکتا کہ مجھے بہت کچھ کہنا ہے۔ میں اپنا پیغام کہاں سے شروع کروں ...... یہ مجھے معلوم نہیں۔ میں اپنی آواز کے بکھرے ہوئے ٹکڑے فراہم کرتا ہوں۔ ذہنی اذیت کے دھندلے غبار میں سے چند خیالات تمہید کے طور پر پیش کرنے کی سعی کرتا ہوں۔ اپنے احساسات کی عمیق گہرائیوں سے چند احساس سطح پر لاتا ہوں کہ دوسرے اذہان پر منتقل کرسکوں ...... مگر میری آواز کے ٹکڑے پھر منتشر ہو جاتے ہیں۔ خیالات پھر تاریکی میں روپوش ہو جاتے ہیں۔ احساسات پھر غوطہ لگا جاتے ہیں ...... میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

جب میں دیکھتا ہوں کہ میرے خیالات منتشر ہونے کے بعد پھر جمع ہو رہے ہیں تو جہاں کہیں میری قوتِ گویائی کام دیتی ہے، میں شہر کے رؤسا سے مخاطب ہو کر یہ کہنا شروع کر دیتا[۴۴] ہوں:

مرمریں محلوں[۴۵] کے مکینو! تم اِس وسیع کائنات میں صرف سورج کی روشنی دیکھتے ہو۔ مگر یقین جانو، اُس کے سائے بھی ہوتے ہیں ...... تم مجھے سلیم کے نام سے جانتے ہو، یہ غلطی ہے ...... میں وہ کپکپی ہوں جو ایک کنواری لڑکی کے جسم پر طاری ہوتی ہے، جب وہ غربت سے تنگ آ کر پہلی دفعہ ایوانِ گناہ کی طرف قدم

بڑھانے لگے ...... آؤ، ہم سب کا نہیں!

تم ہنستے ہو۔ مگر نہیں، تمہیں مجھے ضرور سننا ہوگا ...... میں ایک غوطہ خور ہوں۔ قدرت نے مجھے تاریک سمندر کی گہرائیوں میں ڈبو دیا ...... کہ میں کچھ ڈھونڈھ کر لاؤں ...... میں ایک بے بہا موتی لایا ہوں ...... وہ سچائی ہے ...... اس تلاش میں، میں نے غربت دیکھی ہے، گرسنگی برداشت کی ہے، لوگوں کی نفرت سے دوچار ہوا ہوں، جاڑے میں غریبوں کی رگوں میں خون کو منجمد ہوتے دیکھا ہے، نوجوان لڑکیوں کو عشرت کدوں کی زینت بڑھاتے دیکھا ہے، اس لیے کہ وہ مجبور تھیں ...... اب میں یہی کچھ تمہارے منہ پر تھوک دینا چاہتا ہوں کہ تمہیں اپنی تصویر[۴۶] کا تاریک پہلو نظر آ جائے۔

انسانیت ایک دل ہے۔ ہر شخص کے پہلو میں ایک ہی قسم کا دل[۴۷] ہے۔ اگر تمہارے بوٹ غریب مزدوروں کے ننگے سینوں پر ٹھوکریں لگاتے ہیں۔ اگر تم اپنے شہوانی جذبات کی بھڑکتی ہوئی آگ کسی ہم سایہ نادار لڑکی کی عصمت دری سے ٹھنڈی کرتے ہو۔ اگر تمہاری غفلت سے ہزار ہا یتیم بچے گہوارۂ جہالت میں پل کر جیلوں کو آباد کرتے ہیں۔ اگر تمہارا دل کا جل کے مانند سیاہ ہے تو یہ تمہارا قصور نہیں۔ ایوانِ معاشرت ہی کچھ ایسے ڈھب پر استوار کیا گیا ہے کہ اس کی ہر چھت اپنی ہمسایہ چھت کو دابے ہوئے ہے ...... ہر اینٹ دوسری اینٹ کو۔

جانتے ہو کہ موجودہ نظام کے کیا معنی ہیں، وہ کیا چاہتا ہے؟ ...... یہ کہ لوگوں کے سینوں کو جہالت کدہ بنائے۔ انسانی تعزز کی کشتی، ہوا و ہوس[۴۸] کی موجوں میں بہا دے۔ جوان لڑکیوں کی عصمت چھین کر انہیں ایوانِ تجارت میں کھلے بندوں حسن فروشی پر مجبور کر دے۔ غریبوں کا خون چوس کر انہیں جلی ہوئی راکھ کی مانند قبر کی مٹی میں یکساں کر دے ..... کیا اسی کو تم تہذیب کا نام دیتے ہو ...... بھیانک قصابی! تاریک شیطنیت!!! ......

آہ! اگر تم صرف وہ دیکھ سکو، جس کا میں نے مشاہدہ کیا ہے! ..... ایسے بہت سے لوگ ہیں جو قبر نما جھونپڑوں میں زندگی کے سانس پورے کر رہے ہیں۔ تمہاری نظروں کے سامنے ایسے افراد موجود ہیں جو موت کے منہ میں جی رہے ہیں۔ ایسی لڑکیاں ہیں جو بارہ سال کی عمر میں عصمت فروشی شروع کرتی ہیں اور بیس سال کی عمر میں قبر کی سردی سے لپٹ جاتی ہیں ...... مگر تم ...... ہاں تم، جو اپنے لباس کی تراش کے متعلق گھنٹوں غور کرتے رہتے ہو۔ یہ نہیں دیکھتے بلکہ الٹا غریبوں سے چھین کر امرا کی دولتوں میں اضافہ کرتے ہو۔ مزدور سے لے کر کابل کے حوالے کر دیتے ہو۔ گدڑی پہنے انسان کا لباس اتار کر حریر پوش کے سپرد کر دیتے ہو۔

تم غربا کے غیر مختتم مصائب پر ہنستے ہو مگر تمھیں یہ معلوم نہیں کہ اگر درخت کا نچلا حصہ لاغر و مردہ ہو رہا ہے تو کسی روز وہ بالائی حصے کے بوجھ کو برداشت نہ کرتے ہوئے گر پڑے گا۔"

یہاں تک بول کر سلیم خاموش ہو گیا اور ٹھنڈی چائے کو آہستہ آہستہ پینے لگا۔

میں تقریر کے دوران میں سحر زدہ آدمی کی طرح چپ چاپ بیٹھا اُس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ جو بارش کی طرح برس رہے تھے، بغور سنتا رہا۔ میں سخت حیران تھا کہ وہ سلیم جو آج سے کچھ عرصہ پہلے بالکل خاموش ہوا کرتا تھ، اتنی طویل تقریر کیونکر جاری رکھ سکا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے[۴۹] خیالات کس قدر حق پر مبنی تھے اور آواز میں کتنا اثر تھا..... ۔ میں ابھی اس کی تقریر کے متعلق کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ پھر بولا۔

"خاندان کے خاندان، شہر کے یہ نہنگ نگل جاتے ہیں۔ عوام کے اخلاق، قوانین سے مسخ کیے جاتے ہیں۔ لوگوں کے زخم جرمانوں سے کریدے جاتے ہیں۔ تباہ شدہ ذہنیت کو جہالت کی تاریکی سیاہ بنا دیتی ہے ...... ہر طرف حالتِ نزع کے سانس کی لرزاں آوازیں، عریانی، گنہ اور فریب ہے مگر دعویٰ یہ ہے کہ عوام امن کی زندگی بسر کر رہے ہیں ...... کیا اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہماری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھی جا رہی ہے۔ ہمارے کانوں سے پگھلا ہوا سیسہ اتارا جا رہا ہے۔ ہمارے جسم مصائب کے کوڑے سے بے حس بنائے جا رہے ہیں کہ ہم نہ دیکھ سکیں، نہ سن سکیں اور نہ محسوس کر سکیں!..... انسان جسے بلندیوں میں پرواز کرتا تھا کیا اُس کے بال و پر نوچ کر اُسے زمین پر رینگنے کے لیے مجبور نہیں کیا جا رہا؟..... کیا امرا کی نظر فریب عمارتیں، مزدوروں کے گوشت پوست سے تیار نہیں کی جاتیں؟..... کیا عوام کے مکتوبِ حیات پر جرائم کی مہر ثبت نہیں کی جاتی؟ کیا موجودہ نظام[۵۰] کی رگوں میں بدی کا خون موجزن نہیں ہے؟ کیا جمہور کی زندگی کشمکشِ پیہم، اَن تھک محنت اور قوتِ برداشت کا مرکب نہیں ہے؟..... بتاؤ بتاؤ، بتاتے کیوں نہیں؟"

"درست ہے۔" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"تو پھر اس کا علاج کرنا تمھارا فرض ہے ...... کیا تم کوئی طریقہ نہیں بتا سکتے، کہ اس انسانی تذلیل کو کیونکر روکا جا سکتا ہے ..... مگر آہ! تمھیں معلوم نہیں، مجھے خود معلوم نہیں!!"

تھوڑی دیر کے بعد وہ میرا ہاتھ دبا[۵۱] کر، رازدارانہ لہجے میں یوں کہنے لگا:

"عباس! عوام سخت تکلیف برداشت کر رہے ہیں۔ بعض اوقات جب کوئی سوختہ حال انسان آہ بھرتا ہے تو میں مڑ کر دیکھتا ہوں کہ کہیں شہر میں آگ تو نہیں لگ گئی، کوئی اونچا محل تو نہیں جل گیا۔[۵۲] اچھا اب میں جاتا ہوں، تم لاہور واپس کب جا رہے ہو؟"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور ٹوپی سنبھال کر باہر چلنے لگا۔

''ٹھہرو، میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں ...... کہاں جاؤ گے اب؟'' اسے یک لخت کہیں جانے کے لیے تیار دیکھ کر میں نے اسے [اُس سے؟] فوراً ہی کہا۔

''مگر میں اکیلا جانا چاہتا ہوں ...... کسی باغ میں جاؤں گا۔''

میں خاموش ہو گیا اور وہ ہوٹل سے نکل کر بازار کے ہجوم میں گم ہو گیا۔

اس گفتگو کے چوتھے روز مجھے لاہور میں اطلاع ملی کہ سلیم نے میرے جانے کے بعد بازاروں میں دیوانہ وار شور برپا کرنا شروع کر دیا۔ اس لیے اسے پاگل خانے میں قید کر دیا گیا۔[۵۳-۵۴]

حواشی

(ان حواشی میں ص سے مراد: کتاب آتش پارے کا صفحہ ہے۔
دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ امتحان میں شامل ہو کر... سوئے قسمت سے — ص:۲۵

۲۔ افترا ہے... میں یہ وثوق سے... توجیہ دیتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ صوبے — ص:۲۶

۳۔ میں مقید... سب لڑکوں میں... اُڑھا دی... کھیل کود کی — ایضاً

۴۔ مطالعہ کرنا بہت اہم کام — ایضاً

۵۔ ہاں-ہاں،... پوچھا ہے... ظاہر کیا ہے...
خود نہ پہچانتے ہوئے الفاظ میں ظاہر نہیں کر سکتا۔ — ص:۲۷

۶۔ ''منتقل کر سکتا ہے'' کے بعد کی وہ عبارت جس میں منٹو نے کئی ردّ و بدل کیے:
... وہ دراصل اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی قدرت کا مالک ہے۔ اور وہ شخص جو محسوس کرتا مگر اپنے احساس کو خود آپ اچھی طرح نہیں سمجھتا۔ اور پھر اس اضطراب کو بیان کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، اس شخص کے مرادف ہے جو اپنے حلق میں ٹھنسی ہوئی چیز کو باہر نکالنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مگر وہ گلے سے نیچے اترتی چلی جا رہی ہو — یہ ایک ذہنی عذاب ہے۔ — ص ۲۷

۷۔ اور ہوتا بھی کیونکر، جب... اٹھ کھڑا ہوا ہے... باہر نکالنے کا کوشاں
ہوا کرتا تھا... یہ خاکی کشتی — ص:۲۷ تا ۲۸

ادھورے مکالمے کے بعد کا جملہ اوّلین متن (ص:۲۸) میں، جداگانہ پارے کے طور پر لکھا گیا ہے لیکن نظرِ ثانی شدہ متن میں، لفظ ''مگر'' کے اضافے کے ساتھ،

ما قبل پارے میں شامل ہے۔ منٹو کے افسانے،ص:۱۸۳

۸۔ موہوم سایہ دیکھ... مگر وہ یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس تاریک شکل کے پردے میں کیا نہاں ہے۔ ص:۲۸

۹۔ عادات کے ہوتے ہوئے کبھی معلوم نہیں ہو سکا ص:۲۸

۱۰۔ کو منقلب ہوتے ایضاً

۱۱۔ بیٹھا ہوا ہے۔ اور اپنے بھاری سر کو گھٹنوں میں تھامے کچھ ص:۲۹

۱۲۔ اسی قسم کی دیگر کھیلیں... کہیں باہر چلا جایا کرتا تھا۔ ایضاً

۱۳۔ جنہیں اس نے ایضاً

۱۴۔ ہونے کی حیثیت میں مَیں اس کی طبیعت کے غیر معمولی سکون سے...
... کم زور ہٹنے کا واقع ہوا... خدا معلوم کن کن... پریشانی کو ظاہر...
ناک اور لب... منسوخ جملہ: جنہوں نے سلیم کو قبل از وقت معمر بنا دیا تھا ص:۳۰

۱۵۔ سڑی اور دیوانہ ہے... تیقن کے ساتھ... تصور کرتے ہوئے...
کسی دیوانے حیوان سے کم نہیں ہیں! صص:۳۰ تا ۳۱

۱۶۔ کے ذریعے لوگوں ص:۳۱

۱۷۔ کیا اس کے یہ معنی لیے جائیں گے کہ ایضاً

۱۸۔ تن ڈھانپتا ہے... ان افراد کو ایضاً

۱۹۔ بے خود ضرور... دنیا کو کچھ پیغام... وہ تلملا تلملا کر اپنے قلبی ص:۳۲
اضافہ شدہ جملہ: جیسے مٹھی میں سے سوکھی ریت! منٹو کے افسانے،ص:۱۸۶

۲۰۔ ایسی حرکت نہیں دیکھی ص ۳۲

۲۱۔ کو اپنی اپنی جگہ سے... اس وقت جو خیال کیا
... جگہ کو زیادہ موزوں... سالوں سے ایک جگہ صص:۳۲تا۳۳

۲۲۔ کی دو تصاویر... اور جنہیں میں اور سلیم نے ص:۳۳

۲۳۔ ایک روز اچانک... کتابیں چن رکھیں ایضاً

۲۴۔ عادت تھی ص:۳۴

۲۵۔ میں چپ رہا... چیز کا استعمال... کہیں میرا دوست واقعی خبطی تو نہیں ہو گیا ہے۔ ایضاً

۲۶۔ ایسے سوالات نہیں ایضاً

۲۷۔ تو ہفتے کے بعد... دائیں طرف پڑی تھی... رکھ دی گئی ہے... دوسری جگہ پر جڑ دی... قواعد کرائی جاتی تھی ص.۳۵

۲۸۔ رُخ میں پایا تو ایضاً

۲۹۔ ''تم جانتے نہیں ہو، میں انقلاب پسند ہوں۔'' سلیم نے جواب دیا۔ ایضاً

۳۰۔ میں اور بھی متعجب ہوا... میں یقینی طور پر ایضاً

۳۱۔ بہت بڑا انقلاب پسند۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ص:۳۶

۳۲۔ مگر ہم دونوں کسی اور موضوع پر اظہار خیالات کرنے لگ گئے تھے — ص۔۳۶

۳۳۔ سلیم کے جواب ... انقلاب پسند واقع ہوا ہے — ایضاً

۳۴۔ نیم دیوانگی کے مرادف ہے ... ذہنی تعصب کا — ص۔۳۷

۳۵۔ سلیم ہوٹلوں میں ... کہ اُس سے ... حرکات کرنے سے منع ...
منسوخ جملہ: اس کے علاوہ یہ اندیشہ تھا کہ شاید وہ کہیں سچ مچ مخبوط الحواس
ہی نہ ہو گیا ہو ... میں اُس سے فوراً ... ہوٹل میں گفتگو کرنا مناسب سمجھا۔ — ایضاً

۳۶۔ میں غور سے سلیم کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا ... گھورتے دیکھ کر ... وہ کہنے لگا — ایضاً

۳۷۔ سادہ معلوم ہو ... شاید اسے معلوم تھا ... بہت حد تک تبدیل — ص۔۳۸

۳۸۔ ہاتھ رکھتے ہوئے — ایضاً

۳۹۔ تقریریں کرنی شروع — ایضاً

۴۰۔ یہاں تک کہہ کر وہ میری طرف — ایضاً

۴۱۔ وہ جن کا فردوس ... استوار کیا گیا ہے ... کی عریانی، لاوارث بچوں کی ... صدائے گریہ لپٹی ہوئی ہے — ص۔۳۹

۴۲۔ ناچ دیکھتا ہوں ... کی نذر کر دیتا ہوں ... دل خوش کرتا ہوں ... نصیب نہیں ہوتی ...
کے بے ترستے ہیں ... میرے لیے گوہر تیار ... مجلسی دائرے میں — صص ۳۹ تا ۴۰

۴۳۔ وکالت کر رہا ہے جو — ص۔۴۰

۴۴۔ جب میں یہ دیکھتا ... یہ کہنے لگ جاتا ہوں — ص ۴۱

۴۵۔ مرمریں محلات کے مکینو! — ایضاً

۴۶۔ تصویر زندگی کا — ص:۴۲

۴۷۔ دل موجود ہے — ایضاً

۴۸۔ جانتے ہو، موجودہ نظام کے کیا معنی ہیں؟ ... بعد کا یہ جملہ اضافہ ہے:
وہ کیا چاہتا ہے؟ (منٹو کے افسانے، ص:۱۹۱) ... ہوا اور ہوس — ص۔۴۳

۴۹۔ تقریر کے دوران میں، میں سحر زدہ ... کے علاوہ، خیالات کسی قدر — ص۔۴۴

۵۰۔ منسوخ جملہ: ٹیکسوں کے ذریعے دامنِ غربت کترا جاتا ہے ... ذہنیت، جہالت ...
یہ معنی نہیں ہیں ... انسان جنہیں بلندیوں پر ... کیا مجلسی بدن کی رگوں میں — صص ۴۴ تا ۴۵

۵۱۔ ہاتھ پکڑ کر — ص:۴۶

۵۲۔ کبھی میں کسی سوختہ حال انسان کے سینے سے آہ بلند ہوتے
دیکھتا ہوں تو مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں شہرت جل جائے!... — ایضاً

۵۳۔ کر دیا تھا ... پاگل خانے میں داخل کر لیا گیا ہے۔ — ایضاً

۵۴۔ اوّلین متن میں افسانے کے اختتام پر، تین سطروں میں، یہ وضاحتیں درج ہیں:
(۲۴ر مارچ سنہ ۳۵ء) اشاعتِ اوّلین: علی گڑھ میگزین — ایضاً

قاسم

[1]باورچی خانے کی مٹ میلی فضا میں بجلی کا اندھا سا بلب کم زور روشنی پھیلا رہا تھا۔ اسٹوو پر پانی سے بھری ہوئی کیتلی دھری تھی۔ پانی کا کھولاؤ اور اسٹوو کے حلق سے نکلتے ہوئے شعلے مل جل کر مسلسل شور برپا کر رہے تھے۔ انگیٹھیوں میں آگ کی آخری چنگاریاں راکھ میں سو گئی تھیں۔ دور کونے میں قاسم، گیارہ برس کا لڑکا، برتن مانجھنے میں مصروف تھا۔ یہ ریلوے انسپکٹر صاحب کا بوائے تھا۔

برتن صاف کرتے وقت یہ لڑکا کچھ گنگنا رہا تھا۔ یہ الفاظ ایسے تھے جو اُس کی زبان سے بغیر کسی کوشش کے نکل رہے تھے:

"جی آیا صاحب! جی آیا صاحب! ...... بس ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب!"

ابھی برتنوں کو راکھ سے صاف کرنے کے بعد انہیں پانی سے دھو کر قرینے سے رکھنا بھی تھا اور یہ کام جلدی سے نہ ہو سکتا تھا۔ لڑکے کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ سر سخت بھاری ہو رہا تھا مگر کام کیے بغیر آرام ..... یہ کیونکر ممکن تھا۔

اسٹوو[2] بدستور ایک شور کے ساتھ نیلے شعلوں کو اپنے حلق سے اگل رہا تھا۔ کیتلی کا پانی اسی انداز میں کھل کھلا کر ہنس رہا تھا۔

دفعتاً لڑکے نے نیند کے ناقابلِ مغلوب حملے کو محسوس کر کے اپنے جسم کو ایک جنبش دی اور "جی آیا صاحب" گنگناتا، پھر کام میں[3] مشغول ہو گیا۔

[4]دیوار گیروں پر چنے ہوئے برتن سوئے ہوئے تھے۔ پانی کے نل سے پانی کی بوندیں نیچے میلی سل پر ٹپک رہی تھیں اور اداس آواز پیدا کر رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا پر غنودگی سی طاری ہے۔ دفعتاً آواز بلند ہوئی[5]:

"قاسم! ...... قاسم!"

"جی آیا صاحب!" لڑکا جو ان ہی الفاظ کی گردان کر رہا تھا، بھاگا بھاگا[6] اپنے آقا کے پاس گیا۔

انسپکٹر صاحب نے گرج کر کہا[7] "بیوقوف کے بچے! آج پھر یہاں صراحی اور گلاس رکھنا بھول گیا ہے۔"

"ابھی لایا صاحب ...... ابھی لایا صاحب ......"

کمرے میں صراحی اور گلاس رکھنے کے بعد وہ ابھی برتن صاف کرنے کے لیے بیٹھا ہی تھا کہ پھر اُسی کمرے سے آواز آئی:

"قاسم! ...... قاسم!"

"جی آیا صاحب!" قاسم بھاگتا ہوا پھر[۸] اپنے آقا کے پاس گیا۔

"بمبئ کا پانی کس قدر خراب ہے۔ جاؤ پارسی کے ہوٹل سے سوڈا لے کر آؤ۔ بس بھاگے[۹] جاؤ۔ سخت پیاس لگ رہی ہے۔"

"بہت اچھا صاحب۔"

قاسم بھاگا بھاگا گیا اور پارسی کے ہوٹل سے، جو گھر سے قریباً نصف میل کے فاصلے پر تھا،[۱۰] سوڈے کی بوتل لے آیا اور اپنے آقا کو گلاس میں ڈال کر دے دی۔

"اب تم جاؤ۔ مگر اس وقت تک کیا کر رہے ہو؟ برتن صاف نہیں ہوئے کیا؟"

"ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب!"

"برتن صاف کرنے کے بعد میرے دونوں کالے شو پالش کر دینا۔[۱۱] مگر دیکھنا احتیاط رہے۔ چمڑے پر کوئی خراش نہ آئے ورنہ..."

قاسم کو "ورنہ" کے بعد کا جملہ بخوبی معلوم تھا۔ "بہت اچھا صاحب" کہہ کر وہ باورچی خانے میں[۱۲] چلا گیا اور برتن صاف کرنے شروع کر دیے۔

اب نیند اس کی آنکھوں میں سمٹی چلی آ رہی تھی۔ پلکیں آپس میں ملی جا رہی تھیں۔ سر میں پگھلا ہوا سیسہ[۱۳] اتر رہا تھا...... یہ خیال کرتے ہوئے کہ صاحب کے بوٹ بھی ابھی پالش کرنے ہیں، قاسم نے اپنے سر کو زور سے جنبش دی اور وہی راگ الاپنا شروع کر دیا:

"جی آیا صاحب، جی آیا صاحب! بوٹ ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب۔"

مگر نیند کا طوفان ہزار بند باندھنے پر بھی نہ رکا۔ اب اسے محسوس ہوا کہ نیند ضرور غلبہ پا کے رہے گی۔ پر ابھی برتنوں کو دھو کر انہیں اپنی جگہ پر رکھنا باقی تھا۔ جب اس نے یہ سوچا تو ایک عجیب وغریب خیال اس کے دماغ میں آیا: بھاڑ میں جائیں برتن اور چولھے میں جائیں شو[۱۴] ..... کیوں نہ تھوڑی دیر اسی جگہ پر سو جاؤں اور پھر چند لمحے آرام کرنے کے بعد......

اس خیال کو باغیانہ تصور کر کے[۱۵] قاسم نے ترک کر دیا اور برتنوں پر جلدی جلدی راکھ ملنا شروع کر دی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب نیند پھر غالب آئی تو اس کے جی میں آئی کہ ابلتا ہوا پانی اپنے سر پر انڈیل لے اور اس طرح اس غیر مرئی طاقت سے جو اس کے کام میں حارج ہو رہی تھی، نجات پا جائے۔ مگر پانی اتنا گرم تھا کہ اس کے بھیجے تک کو پگھلا دیتا۔ چنانچہ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار مار کر اس نے باقی ماندہ برتن صاف کیے۔[۱۶] یہ کام کرنے کے بعد اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب وہ آرام سے سوسکتا تھا اور نیند...... وہ نیند، جس کے لیے اس کی آنکھیں اور دماغ اس شدت سے انتظار کر رہے تھے، اب بالکل نزدیک تھی۔

باورچی خانے کی روشنی گل کرنے کے بعد قاسم نے باہر برآمدے میں اپنا بستر بچھا لیا اور لیٹ گیا۔ اس سے پہلے کہ نینداسے اپنے نرم نرم بازوؤں میں تھام لے، اس کے کان ''شوشو'' کی آواز سے[۱۷] گونج اٹھے۔

''بہت اچھا صاحب! ابھی پالش کرتا ہوں۔'' قاسم ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔[۱۸]

ابھی قاسم شو کا ایک پیر بھی اچھی طرح پالش کرنے نہ پایا تھا کہ نیند کے غلبے نے اسے وہیں سلا دیا۔[۱۹]

سورج کی لال لال کرنیں مکان کے شیشوں سے نمودار ہوئیں، مگر قاسم سویا رہا۔[۲۰]

جب انسپکٹر صاحب نے اپنے نوکر کو باہر برآمدے میں اپنے کالے جوتوں کے پاس سویا دیکھا تو اسے ٹھوکر مار کے جگاتے ہوئے کہا: ''یہ سوَر کی طرح یہاں بے ہوش پڑا ہے اور مجھے خیال تھا کہ اس نے شُو[۲۱] صاف کر لیے ہوں گے...... نمک حرام!...... ابے قاسم!''

''جی آیا صاحب!''

قاسم فوراً اٹھ بیٹھا۔ ہاتھ میں اس نے پالش کرنے کا برش دیکھا[۲۲] اور رات کے اندھیرے کی بجائے دن کی روشنی دیکھی تو اس کی جان خطا ہو گئی۔

''میں سو گیا تھا صاحب! مگر... مگر شو ابھی پالش ہو جاتے ہیں صاحب۔'' یہ کہہ کر اس نے جلدی جلدی پالش کرنا[۲۳] شروع کر دیا۔

پالش کرنے کے بعد اس نے اپنا بستر بند کیا[۲۴] اور اسے اوپر کے کمرے میں رکھنے چلا گیا۔

''قاسم!''

''جی آیا صاحب!''

قاسم بھاگا ہوا نیچے آیا اور اپنے آقا کے پاس [سامنے؟] کھڑا ہو گیا۔

"دیکھو آج ہمارے یہاں مہمان آئیں گے اس لیے باورچی خانے کے تمام برتن اچھی طرح صاف کر رکھنا۔ فرش بھی دھلا ہوا ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ تمھیں ڈرائنگ روم کی تصویریں، میزیں اور کرسیاں بھی صاف کرنا ہوں گی ...... سمجھے! خیال رہے، میری میز پر ایک تیز دھار والا چاقو پڑا ہے، اُسے مت چھیڑنا! میں اب دفتر جا رہا ہوں۔ مگر یہ کام دو گھنٹے سے پہلے پہلے ہو جائے"[۲۵]

"بہت بہتر صاحب۔"

انسپکٹر صاحب دفتر چلے گئے۔ قاسم باورچی خانہ صاف کرنے میں مشغول ہو گیا۔

ڈیڑھ گھنٹے کی ان تھک محنت کے بعد اس نے باورچی خانے کا سارا کام ختم کر دیا اور ہاتھ پاؤں صاف کرنے کے بعد جھاڑن لے کر ڈرائنگ روم میں[۲۶] چلا گیا۔

وہ ابھی کرسیوں کو جھاڑن سے صاف کر رہا تھا کہ اس کے تھکے ہوئے دماغ میں ایک تصویر سی کھنچ گئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس کے گرد برتن ہی برتن پڑے ہیں اور پاس ہی راکھ کا ایک ڈھیر لگ رہا ہے۔ ہوا زوروں پر چل رہی ہے جس سے وہ راکھ اڑ اڑ کر فضا کو خاکستری بنا رہی ہے۔ یکا یک اس ظلمت میں ایک سرخ آفتاب نمودار ہوا جس کی کرنیں سرخ برچھیوں کی طرح ہر برتن کے سینے میں گھس گئیں۔ زمین خون سے شرابور ہو گئی۔[۲۷]

قاسم دہشت زدہ ہو گیا اور اس وحشت ناک تصور کو دماغ سے جھٹک کر "جی آیا صاحب، جی آیا صاحب" کہتا، پھر[۲۸] اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس کے تصور میں ایک اور منظر رقص کرنے لگا: چھوٹے چھوٹے لڑکے آپس میں کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔ دفعتاً آندھی چلنے لگی جس کے ساتھ ہی ایک بدنما اور بھیانک دیو نمودار ہوا۔ یہ دیو اُن سب لڑکوں کو نگل گیا .... قاسم نے خیال کیا کہ وہ دیو اُس کے آقا کے [آقا کا؟] ہم شکل تھا۔ گو کہ قد و قامت[۲۹] کے لحاظ سے وہ اُس سے کہیں بڑا تھا۔ اب اُس دیو نے زور زور سے ڈکارنا شروع کیا...... قاسم سر سے پیر تک لرز گیا۔

ابھی تمام کمرہ صاف کرنا تھا اور وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ چنانچہ قاسم نے جلدی جلدی کرسیوں پر جھاڑن مارنا شروع کیے۔ کرسیوں کا کام ختم کرنے کے بعد وہ میز صاف کرنے کے لیے بڑھا تو اسے خیال آیا: آج مہمان آ رہے ہیں۔ خدا معلوم کتنے برتن صاف کرنے پڑیں گے۔ نیند کم بخت پھر ستائے گی۔[۳۰] مجھ سے تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا .....

وہ یہ سوچ رہا تھا اور میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو پونچھ رہا تھا۔ اچانک اسے قلم دان کے پاس ایک کھلا ہوا

چاقو نظر آیا...... وہی چاقو جس کے متعلق اُس کے آقا نے کہا تھا [کہ؟] بہت تیز ہے۔ چاقو کا دیکھنا تھا کہ اُس کی زبان پر یہ لفظ خود بخود جاری ہو گئے ..... ''چاقو، تیز دھار چاقو! یہی تمہاری مصیبت ختم[۳۱] کر سکتا ہے۔''

کچھ اور سوچے بغیر قاسم نے تیز دھار چاقو اٹھا کے اپنی انگلی پر پھیر لیا...... اب وہ شام کو برتن صاف کرنے کی زحمت سے بہت دور تھا اور نیند...... پیاری پیاری نیند، اسے[۳۲] بہ آسانی نصیب ہو سکتی تھی۔

انگلی سے خون کی سرخ دھار بہہ رہی تھی ..... سامنے والی دوات کی سرخ روشنائی سے کہیں چمکیلی۔ قاسم اس خون کی دھار کو مسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا اور منہ میں گنگنا[۳۳] رہا تھا: ''نیند، نیند...... پیاری نیند۔''

تھوڑی دیر بعد وہ بھاگا ہوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا جو زنان خانے میں بیٹھی سلائی کر رہی تھی۔ اور اپنی انگلی[۳۴] دکھا کر کہنے لگا...... ''دیکھیے بی بی جی۔''

''ارے قاسم یہ تو نے کیا کیا؟...... کم بخت، صاحب کے چاقو کو چھیڑا ہو گا تو نے!''

قاسم مسکرا دیا۔ ''بی بی جی...... بس میز صاف کر رہا تھا کہ اُس نے کاٹ کھایا۔''[۳۵]

''سوَر اب ہنستا ہے، ادھر آ، میں اس پر کپڑا باندھ دوں...... پر اب یہ تو بتا کہ آج[۳۶] یہ برتن تیرا باپ صاف کرے گا؟''

قاسم اپنی فتح پر جی ہی جی میں بہت خوش ہوا۔[۳۷]

انگلی پر پٹی بندھوا کر قاسم پھر کمرے میں چلا آیا۔ میز پر سے خون کے دھبے صاف کرنے کے بعد اُس نے خوشی خوشی اپنا کام ختم کر دیا۔ سامنے طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر قاسم نے مسرت بھرے لہجے میں کہا: ''اب اُس نمک حرام باورچی کو برتن صاف کرنے ہوں گے. . . اور ضرور صاف کرنے ہوں گے۔ کیوں میاں مٹھو؟''[۳۸]

شام کے وقت مہمان آئے اور چلے گئے۔ باورچی خانے میں جھوٹے برتنوں کا ایک طومار سا لگ گیا ...... انسپکٹر صاحب، قاسم کی انگلی دیکھ کر بہت برسے اور جی کھول کر اُسے گالیاں دیں۔ مگر اُسے مجبور نہ کر سکے ...... شاید اس وجہ سے کہ ایک بار اُن کی اپنی انگلی میں قلم تراش چبھ جانے سے بہت درد[۳۹] ہوا تھا۔

آقا کی خفگی، آنے والی مسرت نے بھلا دی اور قاسم کودتا پھاندتا اپنے بستر پر جا لیٹا۔ تین چار روز تک وہ برتن صاف کرنے کی زحمت سے بچ رہا۔ مگر اس کے بعد انگلی کا زخم بھر آیا۔ اب وہی مصیبت پھر[۴۰] نمودار ہو گئی۔

''قاسم...... صاحب کی جرابیں اور قمیض دھو ڈالو!''

"بہت اچھا بی بی جی۔"

"قاسم اس کمرے کا فرش کتنا میلا[۳۱] ہو رہا ہے۔ پانی لا کر ابھی صاف کرو۔ دیکھنا کوئی داغ دھبا باقی نہ رہے!"

"بہت اچھا صاحب۔"

"قاسم، شیشے کے گلاس کتنے چکنے ہو رہے ہیں۔ انہیں نمک سے ابھی ابھی صاف[۳۲] کرو!"

"ابھی کرتا ہوں بی بی جی۔"

"قاسم، ابھی بھنگن آ رہی ہے۔ تم پانی ڈالتے جانا، وہ سیڑھیاں دھو ڈالے گی۔"[۳۳]

"بہت اچھا صاحب۔"

"قاسم ذرا بھاگ کے ایک آنے کا دہی تو لے آنا!"

"ابھی چلا بی بی جی۔"

پانچ چھ روز اس قسم کے احکام سننے میں گزر گئے۔ قاسم کام کی زیادتی اور آرام کے قحط سے تنگ آ گیا۔ ہر روز اُسے نصف شب تک کام کرنا پڑتا۔ پھر بھی علی الصباح چار بجے کے قریب بیدار ہو کر ناشتے کے لیے چائے تیار کرنا پڑتی۔ یہ کام قاسم کی عمر کے لڑکے کے لیے بہت زیادہ تھا۔

ایک روز انسپکٹر صاحب کی میز صاف کرتے وقت اس کا ہاتھ خود بخود چاقو کی طرف بڑھا۔ اور ایک لمحے کے بعد اُس کی انگلی سے خون بہنے لگا۔ انسپکٹر صاحب اور اُن کی بیوی قاسم کی اس حرکت پر سخت خفا ہوئے۔ چنانچہ سزا کی صورت میں اُسے شام کا کھانا نہ دیا گیا۔ مگر قاسم خوش تھا..... "ایک وقت روٹی نہ ملی۔ انگلی پر معمولی سا زخم آ گیا۔ مگر برتنوں کا انبار صاف کرنے سے تو نجات مل گئی...... یہ سودا کیا بُرا ہے۔"[۳۴]

چند دنوں کے بعد اُس کی انگلی کا زخم ٹھیک ہو گیا۔ اب پھر کام کی وہی بھرمار تھی۔ پندرہ بیس روز گدھوں کی سی مشقت میں گزر گئے۔ اس عرصے میں قاسم نے بارہا ارادہ کیا کہ چاقو سے پھر اپنی انگلی زخمی کر لے۔ مگر اب میز پر سے وہ چاقو اٹھا لیا گیا تھا[۳۵] اور باورچی خانے والی چھری کند تھی۔

ایک روز باورچی بیمار پڑ گیا۔ اب قاسم کو ہر وقت باورچی خانے میں رہنا پڑا۔ کبھی مرچیں پیستا، کبھی آٹا گوندھتا، کبھی کوئلے سلگاتا۔ غرض صبح سے لے کر شام تک اس کے کانوں میں "ابے قاسم یہ کر![۳۶] ابے قاسم وہ کر!" کی صدا گونجتی رہتی۔

باورچی دو روز تک نہ آیا...... قاسم کی ننھی سی جان اور ہمت، جواب دے گئی۔ مگر سوائے کام کے

اور چارہ ہی کیا تھا۔

ایک روز انسپکٹر صاحب نے اسے الماری صاف کرنے کو کہا جس میں ادویات کی شیشیاں اور مختلف چیزیں پڑی تھیں۔ الماری صاف کرتے وقت اُسے داڑھی مونڈنے کا ایک بلیڈ نظر آیا۔ بلیڈ پکڑتے ہی اُس نے اپنی انگلی پر پھیر لیا۔ دھار تھی بہت تیز،[۴۷] انگلی میں دور تک چلی گئی۔ جس سے بہت بڑا زخم بن گیا۔

قاسم نے بہت کوشش کی کہ خون نکلنا بند ہو جائے مگر زخم کا منہ بڑا تھا۔ سیروں خون پانی کی طرح بہہ گیا۔ یہ دیکھ کر قاسم کا رنگ کاغذ کی مانند سپید ہو گیا۔ بھاگا ہوا انسپکٹر صاحب کی بیوی[۴۸] کے پاس گیا......

''بی بی جی، میری انگلی میں صاحب کا اُسترا لگ گیا ہے۔''

جب انسپکٹر صاحب کی بیوی نے قاسم کی انگلی کو تیسری مرتبہ زخمی دیکھا تو فوراً[۴۹] معاملے کو سمجھ گئی۔ چپ چاپ اٹھی اور کپڑا نکال کر اُس کی انگلی پر باندھ دیا اور کہا: ''قاسم! اب تم ہمارے گھر میں نہیں رہ سکتے۔''

''کیوں[۵۰] بی بی جی؟''

''یہ صاحب سے پوچھنا!''[۵۱]

صاحب کا نام سنتے ہی قاسم کا رنگ اور پیلا پڑ گیا۔[۵۲]

چار بجے کے قریب انسپکٹر صاحب دفتر سے لوٹے[۵۳] اور اپنی بیوی سے قاسم کی نئی حرکت سن کر اُسے فوراً اپنے پاس بلایا۔

''کیوں میاں یہ انگلی کو ہر روز زخمی کرنے کے کیا معنی؟''[۵۴]

قاسم خاموش کھڑا رہا۔

''تم نوکر لوگ یہ سمجھتے ہو کہ ہم اندھے ہیں اور ہمیں بار بار دھوکا دیا جا سکتا ہے...... اپنا بوریہ بستر دبا کر ناک کی سیدھ میں یہاں سے بھاگ جاؤ۔ ہمیں تم جیسے نوکروں کی ضرورت نہیں ہے[۵۵]...... سمجھے!''

''مگر...... مگر صاحب۔''

''صاحب کا بچہ...... بھاگ جا یہاں سے، تیری بقایا تنخواہ کا ایک پیسہ بھی نہیں دیا جائے گا...... اب میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا......''

[۵۶] قاسم کو افسوس نہ ہوا بلکہ اُسے خوشی محسوس ہوئی کہ چلو کام سے کچھ دیر کے لیے چھٹی مل گئی۔ گھر سے نکل وہ، اپنی زخمی انگلی سے بے پروا، سیدھا چوپاٹی پہنچا اور وہاں ساحل کے پاس ایک بنچ پر لیٹ گیا اور خوب سویا۔

چند دنوں کے بعد اُس کی انگلی کا زخم بداحتیاطی کے باعث سپٹک ہوگیا۔ سارا ہاتھ سوج گیا۔ جس دوست کے پاس وہ ٹھہرا تھا اُس نے اپنی دانست کے مطابق اُس کا بہتیرا علاج کیا مگر تکلیف بڑھتی گئی۔ آخر قاسم خیراتی ہسپتال میں داخل ہوگیا جہاں اُس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔

اب جب کبھی قاسم اپنا کٹا ہوا ٹنڈ منڈ ہاتھ بڑھا کر فلورا فاؤنٹین کے پاس لوگوں سے بھیک مانگتا ہے تو اُسے وہ بلیڈ یاد آ جاتا ہے جس نے اُسے بہت بڑی مصیبت سے نجات دلائی۔ اب وہ جس وقت چاہے سر کے نیچے اپنی گدڑی رکھ کر فٹ پاتھ پر سو سکتا ہے۔ اُس کے پاس ٹین کا ایک چھوٹا سا بھبھکا ہے جس کو کبھی نہیں مانجھتا، اس لیے کہ اُسے انسپکٹر صاحب کے گھر کے وہ برتن یاد آ جاتے ہیں جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آتے تھے۔

حواشی

(اِن حواشی میں ص سے مراد: کتاب آتش پارے کا صفحہ ہے۔
دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ تبدیل شدہ آغاز — دھواں، ص: ۱۹۴

اشاعتِ اوّل میں افسانے کا آغاز حسب ذیل ہے:

باورچی خانے کی دھندلی فضا میں بجلی کا ایک اندھا قمقمہ چراغ گور کی مانند اپنی سرخ روشنی پھیلا رہا تھا۔ دھوئیں سے اٹی ہوئی دیواریں ہیبت ناک دیووں کی طرح انگڑائیاں لیتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ چبوترے پر بنی ہوئی انگیٹھیوں میں آگ کی آخری چنگاریاں ابھر ابھر کر اپنی موت کا ماتم کر رہی تھیں۔ ایک برقی چولہے پر رکھی ہوئی کیتلی کا پانی نہ معلوم کس چیز پر خاموش ہنسی ہنس رہا تھا۔ . . دور کونے میں، پانی کے نل کے پاس ایک چھوٹی عمر کا لڑکا بیٹھا برتن صاف کرنے میں مشغول تھا...... یہ انسپکٹر صاحب کا نوکر تھا۔ — ص: ۴۷

۲۔ برقی چولہا — ص: ۴۸

۳۔ محسوس کرتے ہوئے... اور ”جی آیا صاحب، جی آیا صاحب“ گنگناتا ہوا پھر کام میں — ایضاً

۴۔ تبدیل شدہ پارا۔ — دھواں، ص: ۱۹۵

اوّلین متن میں شائع شدہ پارا:

دیوار گیروں پر چنے ہوئے برتن اُس لڑکے کو ایک غیر مختتم ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔ پانی کے نل سے، روزانہ ایک ہی واقعہ دیکھ کر، قطروں کی صورت میں آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ بجلی کا قمقمہ حیرت سے اُس لڑکے کی طرف دیکھ رہا تھا.... کمرے کی

فضا سسکیاں بھرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ ص:۴۸

۵۔ اضافہ شدہ جملہ: دفعتاً آواز بلند ہوئی۔ دھواں ص ۱۹۵

۶۔ بھاگا ہوا ص ۴۹

۷۔ ''پاس گیا'' کے بعد کے منسوخ جملے: انسپکٹر صاحب نے کمبل سے منہ نکالا اور لڑکے پر خفا ہوتے ہوئے کہا۔ ایضاً

۸۔ بھاگتا ہوا اپنے آقا ایضاً

۹۔ بس بھاگے ہوئے ایضاً

۱۰۔ بھاگا ہوا گیا... فاصلے پر واقع تھا ایضاً

۱۱۔ اور ہاں برتن صاف کرنے کے بعد میرے سیاہ بوٹ کو پالش کر دینا۔ ص ۵۰

۱۲۔ باورچی خانے میں واپس ایضاً

۱۳۔ سر میں سیسہ ایضاً

۱۴۔ اب اُسے محسوس ہونے لگا... غلبہ پا کر رہے گی۔ لیکن... اپنی اپنی جگہ... باقی تھا۔ اس وقت ایک عجیب خیال... جائیں بوٹ — ایضاً

۱۵۔ تصور کرتے ہوئے ص ۵۱

۱۶۔ جی میں آیا... ''پا جائے'' کے بعد کے منسوخ جملے:
مگر اتنا حوصلہ نہ پڑا۔ بصد مشکل منہ پر پانی کے چھینٹے مار مار کر اس نے سب برتنوں کو بالآخر صاف کر ہی لیا۔ ایضاً

۱۷۔ بستر بچھایا... اور لیٹ گیا۔ اور اس سے پہلے کہ ... آرام دہ بازوؤں... ''بوٹ، بوٹ'' کی آوازوں سے ایضاً

۱۸۔ بڑبڑاتا ہوا، قاسم بستر پر سے اٹھا... ''اٹھا'' کے بعد کا منسوخ جملہ:
جیسے اُس کے آقا نے ابھی بوٹ روغن کرنے کے لیے حکم دیا ہے۔ ص ۵۲

۱۹۔ قاسم بوٹ کا... وہیں پر سلا دیا۔ ایضاً

۲۰۔ ''سلا دیا'' کے بعد کے منسوخ جملے: سورج کی خونیں کرنیں اُس مکان کے شیشوں سے نمودار ہوئیں — قاسم کی کتابِ حیات میں ایک اور پُر از مشقت باب کا اضافہ ہو گیا۔ ایضاً

۲۱۔ صبح جب انسپکٹر صاحب... بوٹوں کے پاس سویا ہوا دیکھا... اُس نے بوٹ ایضاً

۲۲۔ قاسم کے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا۔ کہ اس نے اپنے ہاتھ میں بوٹ صاف کرنے کا برش دیکھا... ''دیکھا'' کے بعد کا منسوخ جملہ: فوراً ہی اس معاملے کو سمجھتے ہوئے اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا ایضاً

۲۳۔ مگر بوٹ ابھی... یہ کہتے ہوئے اُس نے جلدی جلدی بوٹ کو برش سے رگڑنا شروع صص ۵۲ تا ۵۳

۲۴۔ بوٹ پالش کرنے کے بعد اُس نے اپنا بستر تہ کیا ص ۵۳

۲۵۔ تمہیں ملاقاتی کمرے کی تصویروں، میزوں اور کرسیوں کو بھی صاف کرنا ہوگا۔ سمجھے!
مگر خیال۔۔ تیز دھار چاقو پڑا ہوا ہے۔۔۔ گھنٹے سے پہلے ہو جانا چاہیے۔ ص:۵۳

۲۶۔ باورچی خانے کے تمام کام کو ختم کر دیا۔۔۔ ملاقاتی کمرے میں ص:۵۴

۲۷۔ کرنیں خوں آشام برچھیوں۔۔۔ ''شرابور ہوگئی'' کے بعد کا منسوخ جملہ: فضا خوشی
کے قہقہوں سے معمور ہوگئی۔ ایضاً

۲۸۔ قاسم یہ منظر دیکھ کر گھبرا گیا اور اس وحشت ناک خواب سے بیدار ہو کر۔۔۔ کہتا ہوا پھر ایضاً

۲۹۔ بعد اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک۔۔۔ اب اُس کے سامنے چھوٹے۔۔۔ آندھی
چلنی شروع ہوئی۔۔۔ نمودار ہوا جو اُن سب۔۔۔ گو قد و قامت صص:۵۴ تا ۵۵

۳۰۔ مارنا شروع کر دیا۔ ابھی وہ کرسیوں۔۔۔ میز صاف کرنے جا رہا تھا کہ اُسے
یکا یک خیال آیا۔۔۔ اور یہ نیند کم بخت کتنی ستا رہی ہے ص:۵۵

۳۱۔ یہ سوچتے وقت وہ میز پر۔۔۔ کہ اچانک۔۔۔ مصیبت کو ختم ایضاً

۳۲۔ چاقو اُٹھا،۔۔۔ شام کے وقت برتن۔۔۔ اب اُسے صص:۵۵ تا ۵۶

۳۳۔ مسرت بھری آنکھوں۔۔۔ منہ میں یہ گنگنا ص:۵۶

۳۴۔ دیر کے بعد۔۔۔ زخمی انگلی ایضاً

۳۵۔ اضافہ شدہ فقرہ: قاسم مسکرا دیا۔ دھواں، ص:۲۰۰
۔۔۔ کر رہا تھا۔ اور اُس نے۔۔۔ ''کھایا'' کے بعد کا منسوخ فقرہ: قاسم ہنس پڑا۔ ص:۵۶

۳۶۔ ابے سؤر اب ہنستا ہے۔۔۔ مگر اب بتا تو سہی، آج ایضاً

۳۷۔ فتح پر زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔ ایضاً

۳۸۔ کمرے میں آ گیا اور میز پر پڑے ہوئے خون کے دھبوں کو صاف
''ختم کر دیا'' کے بعد اضافہ: سامنے طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا۔ اُس کی طرف دیکھ
کر قاسم نے مسرت بھرے لہجے میں کہا دھواں، ص:۲۰۰
''میاں مٹھو'' کے بعد کا منسوخ جملہ: قاسم نے انتہائی مسرت میں کھڑکی میں لٹکے
ہوئے طوطے سے دریافت کیا۔ ص:۵۷

۳۹۔ میں صاف کرنے والے برتنوں۔۔۔ قاسم کی زخمی انگلی۔۔۔ جی کھول کر گالیاں۔۔۔ شاید
اس لیے۔۔۔ قلم تراش کی نوک۔۔۔ درد محسوس ایضاً

۴۰۔ پھاندتا ہوا۔۔۔ بستر میں۔۔۔ اب پھر وہی مصیبت ایضاً

۴۱۔ کتنا بدنما ص:۵۸

۴۲۔ نمک سے صاف ایضاً

۴۳۔ ابھی خاکروب آتا ہے۔۔۔ سیڑھیوں کو دھو ڈالے گا۔ ایضاً

۴۴۔ اُس کے ہاتھ۔۔۔ بڑھے۔۔۔ خون بہہ رہا تھا۔۔۔ یہ حرکت دیکھ کر بہت خفا۔۔۔ مگر وہ

اپنی ایجاد کردہ ترکیب کی خوشی میں مگن تھا... کرنے سے نجات... یہ سودا کچھ برا نہ تھا۔ ص:۵۹
۴۵۔ پھر مار شروع تھی... اُٹھا لیا گیا ایضاً
۴۶۔ اب اُسے ہر وقت... میں موجود رہنا پڑتا... کوئلوں کو جلا دیتا... لے کر رات
تک... آ بے قاسم یہ کر ایضاً
۴۷۔ ایک روز اس کے آقا نے... بلیڈ کو پکڑتے ہی... تیز اور باریک ص:۶۰
۴۸۔ "منہ بڑا تھا" کے بعد کا منسوخ فقرہ: وہ نہ تھا... اپنے آقا کی بیوی ایضاً
۴۹۔ دیکھا۔فوراً ایضاً
۵۰۔ وہ کیوں ص:۶۱
۵۱۔ سے دریافت کرنا ایضاً
۵۲۔ اور بھی سپید ہو گیا ایضاً
۵۳۔ سے گھر آئے ایضاً
۵۴۔ کیا معنی ہیں؟ ایضاً
۵۵۔ تم تو کر... بستر بوریہ... ضرورت نہیں ایضاً
۵۶۔ تبدیل شدہ اختتام دھواں، ص: ۲۰۳ تا ۲۰۴

اشاعتِ اوّل میں افسانے کا اختتام حسبِ ذیل ہے:

قاسم روتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ طوطے کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ طوطے نے بھی خاموشی میں اُس سے کچھ کہا اور اپنا بستر لے کر وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ مگر دفعتاً کچھ خیال آیا۔ اور بھاگا ہوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا۔ اور درد انگیز آواز میں اتنا کہہ کر" سلام بی بی جی...... میں ہمیشہ کے لیے آپ سے رخصت ہو رہا ہوں" وہاں سے رخصت ہو گیا۔

خیراتی ہسپتال میں ایک نوخیز لڑکا درد کی شدت سے لوہے کے پلنگ پر کروٹیں بدل رہا ہے۔ پاس ہی دو ڈاکٹر بیٹھے ہیں۔

اُن میں سے ایک ڈاکٹر، اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا...... "زخم خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے...... ہاتھ کاٹنا پڑے گا۔"

"بہت بہتر۔"

یہ کہتے ہوئے دوسرے ڈاکٹر نے اپنی نوٹ بک میں اُس مریض کا نام درج کر لیا...... ایک چوبی تختے پر جو چارپائی کے سرہانے لٹکا ہوا تھا، مندرجۂ ذیل الفاظ لکھے تھے:

نام: محمد قاسم ولد عبدالرحمٰن (مرحوم)

عمر: دس سال ص ۶۱ تا ۶۲

ماہی گیر

(فرانسیسی شاعر وکٹر ہیوگو کی ایک نظم کے تاثرات)

سمندر رو رہا تھا۔

مقیّد لہریں پتھریلے ساحل کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر آہ و زاری کر رہی تھیں۔ دور ...... پانی کی رقصاں سطح پر چند کشتیاں اپنے دھندلے اور کم زور بادبانوں کے سہارے بے پناہ سردی سے ٹھٹھری ہوئی کانپ رہی تھیں۔ آسمان کی نیلی قبا میں چاند کھل کھلا کر ہنس رہا تھا۔ ستاروں کا کھیت اپنے پورے جوبن میں لہلہا رہا تھا۔ .... فضا سمندر کے نمکین پانی کی تیز بو میں بسی ہوئی تھی۔

ساحل سے کچھ فاصلے پر چند شکستہ جھونپڑیاں، خاموش زبان میں ایک دوسرے سے اپنی خستہ حالی کا تذکرہ کر رہی تھیں ...... یہ ماہی گیروں کے سر چھپانے کی جگہیں تھیں۔

ایک جھونپڑی کا دروازہ کھلا تھا جس میں چاند کی آوارہ شعاعیں زمین پر رینگ رینگ کر اُس کی کاجل ایسی فضا کو نیم روشن کر رہی تھیں۔ اس اندھی روشنی میں دیوار پر ماہی گیر کا جال نظر آ رہا تھا اور ایک چوبی تختے پر چند تھالیاں جھلملا رہی تھیں۔

جھونپڑی کے کونے میں ایک ٹوٹی ہوئی چار پائی، تاریک چادروں میں ملبوس اندھیرے میں سر نکالے ہوئے تھی۔ اس کے پہلو میں پھٹے ہوئے ٹاٹ پر پانچ بچے محوِ خواب تھے .... ننھی روحوں کا ایک گھونسلا جو خوابوں سے تھرتھرا رہا تھا۔ پاس ہی اُن کی ماں، نہ معلوم کن خیالات میں مستغرق، گھٹنوں کے بل بیٹھی گنگنا رہی تھی۔

یکا یک وہ لہروں کا شور سن کر چونکی ...... بوڑھا سمندر، کسی آنے والے خطرے سے آگاہ، سیاہ چٹانوں، تند ہواؤں اور نصف شب کی تاریکی کو مخاطب کر کے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا۔ وہ اٹھی اور بچوں کے پاس جا کر ہر ایک کی پیشانی پر اپنے سرد لبوں سے بوسہ دیا اور وہیں ٹاٹ کے ایک کونے میں [کے کونے پر؟] بیٹھ کر دعا مانگنے' لگی۔ لہروں کے شور میں یہ الفاظ بخوبی سنائی دے رہے تھے:

''اے خدا!...... اے بے کسوں اور غریبوں کے خدا! اِن بچوں کا واحد سہارا، رات کا تاریک کفن اوڑھے، سمندر کی لہروں کے ساتھ کھیل رہا ہے...... موت کے عمیق گڑھے پر پاؤں لٹکائے ہے...... صرف ان کی خاطر وہ ہر روز اُس دیو کے ساتھ کشتی لڑتا ہے...... اے خدا! تو اُس کی جان حفاظت میں رکھیو ..... آہ! اگر یہ صرف نوجوان ہوتے، اگر یہ صرف اپنے والد کی مدد کر سکتے!!''

یہ کہہ کر خدا معلوم اُسے کیا خیال آیا کہ وہ سر سے پیر تک کانپ گئی اور ٹھنڈی آہ بھر کر تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہنے لگی: ''بڑے ہو کر اِن کا بھی یہی شغل ہوگا۔ پھر مجھے چھ جانوں کا خدشہ لاحق رہے گا...... آہ، کچھ سمجھ میں نہیں آتا، غربت! غربت!!''

یہ کہتے ہوئے وہ اپنی غربت اور تنگ دامانی کے خیالات میں غرق ہوگئی۔ دفعتاً وہ اس اندھیرے خواب سے بیدار ہوئی اور اُس کے دماغ میں ہوٹلوں کی دیو قامت عمارتیں اور امرا کے راحت کدوں کی تصویریں کھنچ گئیں۔ ان عمارتوں کی دل فریب راحتوں اور امرا کی تعیش پرستیوں کا خیال آتے ہی اُس کے دل پر ایک دھندسی چھا گئی...... کلیجے پر کسی غیر مرئی ہاتھ کی گرفت محسوس کر کے وہ جلدی سے اٹھی اور دروازے سے تاریکی میں آوارہ نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔

اُس کی یہ حرکت خیالات کی آمد کو نہ روک سکی۔ وہ سخت حیران تھی کہ لوگ امیر اور غریب کیوں ہوتے ہیں جبکہ ہر انسان ایک ہی طرح ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سوال کے حل کے لیے اُس نے اپنے دماغ پر بہت زور دیا مگر کوئی خاطر خواہ جواب نہ مل سکا۔ ایک اور چیز جو اُسے پریشان کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ جب اس کا خاوند اپنی جان پر کھیل کر سمندر کی گود سے مچھلیاں چھین کر لاتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ مارکیٹ کا مالک بغیر محنت کیے ہر روز سیکڑوں روپے پیدا کر لیتا ہے۔ اُسے یہ بات خاص طور پر عجیب سی معلوم ہوئی کہ محنت تو کریں ماہی گیر اور نفع ہو مارکیٹ کے مالک کو۔ رات بھر اس کا خاوند اپنا خون پسینہ ایک کر دے اور صبح کے وقت آدھی کمائی اُس کی بڑی توند میں چلی جائے...... ان تمام سوالوں کا کچھ جواب نہ پا کر وہ ہنس پڑی اور بلند آواز میں کہنے لگی:

''مجھ کم عقل کو بھلا کیا معلوم ہو۔ یہ سب کچھ خدا جانتا ہے۔ مگر...''

اس کے بعد وہ کچھ کہنے والی تھی کہ کانپ اٹھی...... ''اے خدا، میں گنہگار ہوں۔ تو جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے...... ایسا خیال کرنا کفر ہے۔''

یہ کہتی ہوئی وہ خاموشی سے اپنے بچوں کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور اُن کے معصوم چہروں کی طرف

دیکھ کر، بے اختیار رونا شروع کر دیا۔

باہر آسمان پر کالے بادل، مہیب ڈائنوں کی صورت میں، اپنے سیاہ بال پریشان کیے، چکر کاٹ رہے تھے۔ کبھی کبھی اگر کوئی بادل کا ٹکڑا چاند کے درخشاں رخسار پر اپنی سیاہی مل دیتا تو فضا پر قبر کی تاریکی چھا جاتی۔ سمندر کی سیمیں لہریں گہرے رنگ کی چادر اوڑھ لیتیں اور کشتیوں کے مستولوں پر ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں اس اچانک[٦] تبدیلی کو دیکھ کر آنکھیں جھپکنا شروع کر دیتیں۔

ماہی گیر کی بیوی نے اپنے میلے آنچل سے آنسو خشک کیے اور دروازے کے پاس کھڑی ہو کر دیکھنے لگی کہ آیا دن طلوع ہوا ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس کا خاوند طلوع کی پہلی کرن کے ساتھ ہی گھر واپس آ جایا کرتا تھا مگر [ابھی تو؟] صبح کا ایک سانس بھی بیدار نہ ہوا تھا۔ سمندر کی تاریک سطح پر روشنی کی ایک دھاری بھی نظر نہ آ رہی تھی۔ بارش کاجل کی طرح تمام فضا پر برس رہی تھی[٧]۔

وہ بہت دیر تک دروازے کے پاس کھڑی اپنے خاوند کے خیال میں مستغرق رہی۔ جو اس بارش میں سمندر کی تند موجوں کے مقابلے میں لکڑی کے ایک معمولی تختے اور کم زور بادبان سے مسلح تھا۔ وہ ابھی اس کی عافیت کے لیے دعا مانگ رہی تھی کہ یکا یک اُس کی نگاہیں اندھیرے میں ایک شکستہ جھونپڑی کی طرف اٹھیں جو تاروں سے محروم آسمان کی طرف ہاتھ پھیلائے لرز رہی تھی[٨]۔

اُس جھونپڑی میں روشنی کا نام تک نہ تھا۔ کم زور دروازہ کسی نامعلوم خوف کی وجہ سے کانپ رہا[٩] تھا۔ تنکوں کی چھت ہوا کے دباؤ تلے دُہری ہو رہی تھی۔

''آہ! خدا معلوم بے چاری بیوہ کا کیا حال ہے...... اسے کئی روز سے بخار آ رہا ہے...... '' ماہی گیر کی بیوی زیرِ لب گنگنائی اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاید کسی روز وہ بھی اپنے خاوند سے محروم ہو جائے...... کانپ اٹھی۔

وہ شکستہ جھونپڑی ایک بیوہ کی تھی۔ جو اپنے دو کم سن بچوں سمیت، روٹی کے قحط میں موت کی گھڑیاں کاٹ رہی تھی۔ مصیبت کی چلچلاتی[١٠] ہوئی دھوپ میں اس پر کوئی سایہ کرنے والا نہ تھا۔ رہا سہا سہارا دو ننھے بچے تھے جو ابھی مشکل سے چل پھر سکتے تھے۔

ماہی گیر کی بیوی کے دل میں ہمدردی کا جذبہ اُمڈا۔ بارش کے [بارش سے؟] بچاؤ کے لیے سر پر ٹاٹ کا ایک ٹکڑا رکھ کر اور ایک اندھی لالٹین روشن کرنے کے بعد، وہ جھونپڑی کے پاس پہنچی اور دھڑکتے ہوئے دل سے دروازے پر دستک دی ... . لہروں کا شور اور تیز ہواؤں کی چیخ پکار، اس دستک کا جواب تھے[١١]۔ وہ

کانپی اور خیال کیا کہ شاید اس کی اچھی ہمسایہ گہری نیند سو رہی ہے۔

اس نے ایک بار پھر آواز دی، دروازہ کھٹکھٹایا مگر جواب پھر خاموشی تھا...... کوئی صدا، کوئی جواب، اس جھونپڑی کے بوسیدہ لبوں سے نمودار نہ ہوا۔ یکا یک دروازہ، جیسے اس بے جان چیز نے رحم کی لہر محسوس کی،[12] متحرک ہوا اور کھل گیا۔

ماہی گیر کی بیوی جھونپڑی کے اندر داخل ہوئی اور اس خاموش قبر کو اپنی اندھی[13] لالٹین سے روشن کر دیا جس میں لہروں کے شور کے سوا مکمل سکوت طاری تھا۔ تپلی چھت سے بارش کے قطرے بڑے بڑے آنسوؤں کی صورت میں سیاہ زمین کو تر کر رہے تھے...... فضا میں ایک مہیب خوف سانس لے رہا تھا۔

ماہی گیر کی بیوی اُس خوف ناک سماں کو دیکھ کر جو جھونپڑی میں[14] سمٹا ہوا تھا، سرتا پا ارتعاش بن کر رہ گئی۔ آنکھوں میں گرم گرم آنسو چھلکے اور بے اختیار اچھل کر بارش کے ٹپکے ہوئے قطروں کے ساتھ ہم آغوش ہو گئے۔ اُس نے ایک سرد آہ بھری اور دردناک آواز میں کہنے لگی:

''آہ!...... تو اُن بوسوں کا جو جسم کو راحت بخشتے ہیں، ماں کی محبت، گیت، تبسم، ہنسی اور ناچ کا ایک ہی[15] انجام ہے...... یعنی قبر!...... آہ میرے خدا!!!''

اُس کے سامنے پھوس کے بستر پر، بیوہ کی سرد لاش اکڑی ہوئی تھی اور اس کے پہلو میں دو بچے محوِ خواب تھے۔ لاش کے سینے میں ایک آہ کچھ کہنے کو رکی ہوئی تھی۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں جھونپڑی کی خستہ چھت کو چیر کر تاریک آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھیں، جیسے انہیں کچھ پیغام دینا ہے۔[16]

ماہی گیر کی بیوی اس وحشت خیز منظر کو دیکھ کر چلا اٹھی۔ تھوڑی دیر دیوانہ وار اِدھر اُدھر گھومی۔ یکا یک اس کی نم ناک آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی اور اس نے لپک کر، لاش کے پہلو سے کچھ چیز اٹھا کر، اپنی چادر میں لپیٹ لی اور اس دار الخطر سے لڑکھڑاتی ہوئی اپنی جھونپڑی میں چلی آئی۔[17]

چہرے کے بدلے ہوئے رنگ اور لرزاں ہاتھوں سے اس نے اپنی جھولی کو میلے بستر پر خالی کر دیا اور اس پر پھٹی ہوئی چادر ڈال دی۔ تھوڑی دیر بیوہ سے چھینی ہوئی چیز کی طرف دیکھ کر، وہ اپنے بچوں کے پاس زمین پر بیٹھ گئی۔

مطلع، سمندر کے افق پر سپید ہو رہا تھا۔ سورج کی دھندلی شعاعیں تاریکی کا تعاقب کر رہی تھیں۔ ماہی گیر کی بیوی بیٹھی اپنے احساسِ جرم کے شکستہ تار چھیڑ رہی تھی۔ ان غیر مربوط الفاظ کے ساتھ، کن سری لہریں اپنی مغموم تانیں چھیڑ رہی[18] تھیں:

"آہ! میں نے بہت برا کیا ہے! اب اگر وہ مجھے مارے تو مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی ...... یہ بھی عجیب ہے کہ میں اُس سے خائف ہوں جس سے محبت کرتی ہوں ...... کیا واپس چھوڑ آؤں ...... نہیں ...... شاید وہ مجھے معاف[19] کر دے!"

وہ اسی قسم کے خیالات میں غلطاں و پیچاں بیٹھی ہوئی تھی کہ ہوا کے زور سے دروازہ ہلا۔ یہ دیکھ کر اُس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اٹھی اور کسی کو نہ پا کر، وہیں[20] متفکر بیٹھ گئی۔

"ابھی نہیں ...... بے چارہ ...... اُسے ان بچوں کے لیے کتنی تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ اکیلے آدمی کو سات پیٹ پالنے پڑتے ہیں ...... مگر یہ[21] شور کیا ہے؟"

یہ آواز چیختی ہوئی ہوا کی تھی جو جھونپڑی کے ساتھ رگڑ کر گزر رہی تھی۔

"اس کے قدموں کی چاپ! ...... آہ! نہیں، ہوا ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھر اپنے اندرونی غم میں ڈوب گئی۔ اب اس کے کانوں میں ہواؤں اور لہروں کا شور مفقود ہو گیا ..... سینے میں خیالات[22] کا تصادم، کیا کم شور [کم پُر شور؟] تھا۔

آبی جانور ساحل کے آس پاس چلا رہے تھے۔ پانی میں گھسے ہوئے سنگ ریزے ایک دوسرے سے ٹکرا کر کھنکنا رہے تھے۔ کشتی کے چپوؤں کی آواز صبح کی خاموش فضا کو مرتعش کر رہی تھی ...... ماہی گیر کی بیوی، کشتی کی آمد سے بے خبر، اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔

دفعتاً دروازہ ایک شور کے ساتھ کھلا ...... صبح کی دھندلی شعاعیں جھونپڑی میں تیرتی ہوئی داخل ہوئیں،[23] ساتھ ہی ماہی گیر، کاندھوں پر ایک بڑا سا جال ڈالے، دہلیز پر نمودار ہوا۔

اُس کے کپڑے رات کی بارش اور سمندر کے نمکین پانی سے شرابور ہو رہے تھے۔ آنکھیں شب بیداری[24] کی وجہ سے اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ جسم سردی اور غیر معمولی مشقت سے اکڑا ہوا تھا۔

"نسیم کے ابا، تم ہو!" ماہی گیر کی بیوی چونک اٹھی اور عاشقانہ بیتابی سے اپنے خاوند کو چھاتی سے لگا لیا۔

"ہاں، میں ہوں پیاری۔"

یہ کہتے ہوئے ماہی گیر کے کشادہ مگر مغموم چہرے پر مسرت کی ایک دھندلی روشنی چھا گئی، وہ مسکرایا ...... بیوی کی محبت نے اُس کے دل سے رات کی کلفت کا خیال محو کر دیا۔

"موسم کیسا تھا؟" بیوی نے محبت بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

"تند!"

''مچھلیاں ہاتھ آئیں؟''

''بہت کم...... آج رات تو سمندر قزاقوں کے گروہ کے مانند تھا۔''

یہ سن کر اُس کی بیوی کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ ماہی گیر نے اُسے مغموم دیکھا اور [دیکھا تو؟] مسکرا کر بولا:

''تو میرے پہلو میں ہے...... میرا دل خوش ہے۔''

''ہوا تو بہت تیز ہوگی؟''

''بہت تیز، معلوم ہو رہا تھا کہ دنیا کے تمام شیطان، مل کر اپنے منحوس پر پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ جال ٹوٹ گیا۔ رسیاں کٹ گئیں اور کشتی کا منہ بھی[۲۵] ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔'' پھر اس گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے [بولا۔]

''مگر تم شب بھر کیا کرتی رہی ہو پیاری؟''

بیوی کسی چیز کا خیال کر کے کانپی اور لرزاں آواز میں جواب دیا: ''میں!...... آہ، کچھ بھی نہیں...... سیتی پروتی رہی، تمہاری راہ تکتی رہی...... لہریں بجلی کی طرح کڑک رہی تھیں۔ مجھے سخت ڈر لگ رہا تھا۔''

''ڈر!...... ہم لوگوں کو ڈر کس بات کا......''

''اور ہاں، ہماری ہم سایہ بیوہ مرگئی ہے۔'' [مرگئی۔؟] بیوی نے اپنے خاوند کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

ماہی گیر نے یہ دردناک خبر سنی مگر اُسے کچھ تعجب نہ ہوا۔ شاید اس لیے کہ وہ ہر گھڑی اُس عورت کی موت کی خبر سننے کا متوقع تھا۔ اُس نے آہ بھری اور صرف اتنا کہا: ''بے چاری سدھار گئی!''[۲۶]

''ہاں، اور دو بچے چھوڑ گئی ہے، جو لاش کے پہلو میں لیٹے ہوئے ہیں۔''[۲۷]

یہ سن کر ماہی گیر کا جسم زور سے کانپا اور اُس کی صورت سنجیدہ و متفکر ہوگئی۔ ایک کونے میں اپنی اونی ٹوپی، جو پانی سے بھیگ رہی تھی، پھینک کر سر کھجلایا اور[۲۸] کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اپنے آپ سے بولا:

''پانچ بچے تھے، اب سات ہو گئے...... اس سے پیشتر ہی اس تند موسم میں ہمیں دو وقت کا کھانا نصیب نہیں ہوتا تھا۔[۲۹] اب؟ مگر خیر...... یہ میرا قصور نہیں۔ اس قسم کے حوادث بہت گہرے معانی رکھتے ہیں۔''

وہ کچھ عرصے تک [دیر تک؟] اسی طرح اپنا سر گھٹنوں میں دبائے سوچتا رہا۔ اسے یہ سمجھ نہ آتا تھا کہ خدا نے ان بچوں سے جو اُس کی مٹھی کے برابر بھی نہیں، ماں کیوں چھین لی ہے؟...... ان بچوں سے جو نہ کام کر سکتے ہیں اور نہ کسی چیز کی خواہش ہی کر سکتے ہیں![۳۰]..... اُس کا دماغ ان سوالوں کا کوئی حل نہ پیش کر سکا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھا:

"شاید ایسی چیزوں کو ایک پڑھا لکھا ہی سمجھ سکتا ہے۔" اور پھر اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر بولا: "پیاری جاؤ انہیں یہاں لے آؤ۔ وہ کس قدر وحشت زدہ ہوں گے اگر وہ صبح اپنی ماں کی لاش کے پاس بیدار ہوئے...... اُن کی ماں کی روح سخت بے قرار ہوگی۔ جاؤ انہیں ابھی لے کر آؤ"۔[31]

یہ کہہ کر وہ دل میں سوچنے لگا کہ وہ اُن بچوں کو اپنی اولاد کی طرح پالے گا۔ وہ بڑے ہو کر اُس کے گھٹنوں پر چڑھنا سیکھ جائیں گے۔ خدا اُن اجنبیوں کو جھونپڑی میں دیکھ کر بہت خوش ہوگا اور انہیں زیادہ کھانے کو عطا کرے گا۔

"تمہیں فکر نہیں کرنی چاہیے، پیاری!...... میں زیادہ محنت سے کام کروں گا۔" اور پھر اپنی بیوی کو چارپائی کی طرف روانہ ہوتے دیکھ کر بلند آواز میں کہنے لگا: "مگر تم سوچ کیا رہی ہو..... اس دھیمی چال سے نہیں چلنا چاہیے تمہیں!"

ماہی گیر کی بیوی نے، چارپائی کے پاس پہنچ کر، چادر کو اُلٹ دیا۔

"وہ تو یہ ہیں۔"

دو بچے، صبح کی طرح مسکرا رہے تھے۔[32]

(یکم فروری ۱۹۳۵ء)

حواشی

(ان حواشی میں ص سے مراد: روسی افسانے (طبع اوّل ۱۹۳۴ء) کا صفحہ ہے۔ دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ مانگنے میں معروف ہوگئی — ص:۱۳۵
۲۔ بیدار ہوئی۔ اُس کے — ص:۱۳۶
۳۔ شروع کر دیا — ص:۱۴۷
۴۔ بات کچھ عجیب سی — ایضاً
۵۔ روسی افسانے میں یہ جملے آئندہ پارے کا حصہ ہیں۔ — ایضاً
۶۔ روشنیاں اچانک — ص:۱۴۸
۷۔ "برس رہی تھی۔" کے بعد کا محذوف جملہ:...... بوڑھا سمندر کھانس رہا تھا۔ — ایضاً
۸۔ جھونپڑی کے سائے کی طرف... لرز رہا تھا۔ — ص:۱۴۹
۹۔ تھر تھر کانپ رہا — ایضاً

۱۰۔ آتش پارے (ص:۶۸) اور روسی افسانے (ص:۱۵۰) میں "چچلتی"
لیکن منٹو باقیات (ص:۲۹۸) میں "چلچلاتی" شائع ہوا ہے۔
مدوّن کے نزدیک "چلچلاتی" راجح ہے۔
۱۱۔ چیخ پکار اُس کا جواب تھی۔ ص:۱۵۰
۱۲۔ لبوں پر نمودار... محسوس کی ہو، ایضاً
۱۳۔ قبر کو اندھی ایضاً
۱۴۔ جھونپڑی کی چار دیواری میں ص:۱۵۱
۱۵۔ "بخشتے ہیں" کے بعد کے جملے جن میں منٹو نے ردّوبدل کی:
ماں کی عبادت، گیت، تبسم، محبت اور ان فلک بوس عمارتوں کا جو ہماری طرف
اپنی بیسیوں منوّر آنکھوں سے دیکھا کرتی ہیں...... ہنسی اور ناچ کا ایک ہی ص:۱۵۱
۱۶۔ چیر کر تاروں سے محروم آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں جیسے
انہیں کچھ پیغام دینا ہو۔ ص:۱۵۲
۱۷۔ ہوئی۔ اور لپک کر...... جھونپڑی کی طرف بھاگ نکلی۔ ایضاً
۱۸۔ طلوع سمندر کے ... سورج کی دھندلی کرنیں ... سنہری لہریں اپنی مغموم تانیں ملا رہی ایضاً
۱۹۔ بہت برا کام کیا... اگر اب مجھے مارے ... اور یہ بھی ... شاید وہ معاف ص:۱۵۳
۲۰۔ ہوا سے دروازہ... دھکا سا... نہ پا کر پھر رو ہیں ایضاً
۲۱۔ تکلیف اٹھانی پڑتی ... اور...... مگر یہ ایضاً
۲۲۔ میں مختلف خیالات ایضاً
۲۳۔ داخل ہوگئیں ص ۱۵۴
۲۴۔ کم خوابی ایضاً
۲۵۔ روسی افسانے (ص:۱۵۵) میں "بھی" سے پہلے کا لفظ غالباً کتابت میں ترک
ہوگیا ہے۔ منٹو باقیات (ص:۳۰۱) میں "تختہ بھی" شائع ہوا ہے۔
۲۶۔ آتش پارے (ص:۷۴) میں "سِدھار گئی ہے" لکھا گیا جبکہ روسی افسانے میں
"سدھار گئی!" شائع ہوا ہے۔ مدوّن کے نزدیک "سِدھار گئی!" راجح ہے۔ ص:۱۵۶
۲۷۔ کے پاس لیٹے ہوئے تھے ایضاً
۲۸۔ پھینک کر سر کھجلانا شروع کر دیا۔ ایضاً
۲۹۔ نصیب نہیں ہوتا ص:۱۵۷
۳۰۔ اضافہ شدہ جملہ: اور نہ کسی چیز کی خواہش ہی کر سکتے ہیں آتش پارے، ص:۷۵
۳۱۔ ایک عالم ہی... اور پھر اپنی... اگر صبح... جاؤ ابھی لے آؤ ص:۱۵۷
۳۲۔ اختتامی تین سطریں روسی افسانے میں واحد پارے کے طور پر شائع ہوئی ہیں۔ ص:۱۵۸

تماشا

دو تین روز سے طیارے سیاہ عقابوں کی طرح پر پھیلائے خاموش فضا میں منڈلا رہے تھے جیسے وہ کسی شکار کی جستجو میں ہوں۔ سرخ آندھیاں وقتاً فوقتاً کسی آنے والے خونیں حادثے کا پیغام لا رہی تھیں۔ سنسان بازاروں میں مسلح پولیس کا گشت ایک عجیب ہیبت ناک سماں پیش کر رہا تھا۔ وہ بازار جو آج[1] سے کچھ عرصہ پہلے لوگوں کے ہجوم سے پُر ہوا کرتے تھے، اب کسی نامعلوم خوف کی وجہ سے سُونے پڑے تھے...... شہر کی فضا پر ایک پُراسرار خاموشی مسلط تھی...... بھیانک خوف راج کر رہا تھا۔

خالد، گھر کی خاموشی اور پُرسکون[2] فضا سے سہا ہوا اپنے والد کے قریب بیٹھا باتیں کر رہا تھا:

''ابا، آپ مجھے اسکول [کیوں؟] نہیں جانے دیتے؟''

''بیٹا آج اسکول میں چھٹی ہے۔''

''ماسٹر صاحب نے تو ہمیں بتلایا[3] ہی نہیں۔ وہ تو کل کہہ رہے تھے کہ جو لڑکا آج اسکول کا کام ختم کر کے اپنی کاپی نہ دکھائے گا اسے سخت سزا دی جائے گی!''

''وہ اطلاع دینی بھول گئے ہوں گے۔''

''آپ کے دفتر میں بھی چھٹی ہے''[4]

''ہاں ہمارا دفتر بھی آج بند ہے۔''

''چلو اچھا ہوا! آج میں آپ سے کوئی اچھی سی کہانی سنوں گا۔''

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ تین چار طیارے چیختے ہوئے اُن کے سر پر سے گزر گئے۔ خالد اُن کو دیکھ کر بہت خوف زدہ ہوا۔ وہ تین چار روز سے ان طیاروں کی پرواز کو بغور دیکھ رہا تھا مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تھا۔ وہ حیران تھا کہ یہ جہاز سارا دن دھوپ میں کیوں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ ان کی روزانہ نقل و حرکت سے سخت[5] تنگ آ کر بولا:

''ابا! مجھے ان جہازوں سے سخت خوف معلوم ہو رہا ہے۔ آپ ان کے چلانے والوں سے کہہ دیں کہ وہ ہمارے گھر پر سے نہ گزرا کریں۔''

''خوف!...... کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے خالد؟''

''ابا، یہ جہاز بہت خوف ناک ہیں۔ آپ نہیں جانتے، یہ کسی نہ کسی روز ہمارے گھر پر گولا پھینک دیں گے۔''

''یہ تم نے کس سے سنا؟''[6]

''کل صبح ماما، امی جان سے باتیں کر رہی تھی کہ ان جہازوں کے پاس بہت سے گولے ہیں۔ اگر انہوں نے اس قسم کی شرارت کی تو یاد رکھیں میرے پاس بھی ایک بندوق ہے...... وہی جو آپ نے پچھلی عید پر لاکر[7] دی تھی۔''

''ماما تو پاگل ہے...... میں اس سے دریافت کروں گا کہ وہ گھر میں ایسی باتیں کیوں کیا کرتی ہے...... اطمینان رکھو، وہ ایسی بات کبھی نہیں کریں گے۔'' خالد کے ابا نے اپنے لڑکے کی غیر معمولی جسارت پر ہنستے ہوئے کہا۔[8]

اپنے والد سے رخصت ہو کر خالد اپنے کمرے میں چلا گیا اور ہوائی بندوق نکال کر نشانہ لگانے کی مشق کرنے لگا تا کہ اُس روز جب کہ ہوائی جہاز والے گولے پھینکیں تو اس کا نشانہ خطا نہ جائے اور وہ پوری طرح انتقام لے سکے...... کاش! یہی ننھا انتقام[9] ہر شخص میں تقسیم ہو جائے۔

اس عرصے میں جبکہ ایک کم سن بچہ اپنا انتقام لینے کی فکر میں ڈوبا ہوا طرح طرح کے منصوبے باندھ رہا تھا، گھر کے دوسرے حصے میں خالد کا ابا اپنی بیوی کے پاس بیٹھا ہوا، ماما کو ہدایت کر رہا تھا کہ وہ آئندہ گھر میں اس قسم کی کوئی بات نہ کرنے پائے[10] جس سے خالد کو دہشت ہو۔[11]

ماما اور بیوی کو اسی قسم کی مزید ہدایات دے کر وہ ابھی بڑے دروازے سے باہر جا ہی رہا تھا کہ خادم ایک دہشت ناک خبر لایا کہ شہر کے لوگ حکومت کے منع کرنے پر بھی شام کے قریب ایک جلسہ کرنے والے ہیں اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور پیش ہو کر[12] رہے گا۔

خالد کا باپ یہ خبر سن کر بہت خوف زدہ ہوا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ فضا کا غیر معمولی سکون، طیاروں کی پرواز، بازاروں میں مسلح پولیس کا گشت، لوگوں کے چہروں پر اداسی کا عالم اور خونی آندھیوں کی آمد کسی خوف ناک حادثے کی [کا؟] پیش خیمہ تھیں۔[13]

وہ حادثہ کس نوعیت کا ہوگا؟...... یہ خالد کے ابا کی طرح کسی کو بھی معلوم نہ تھا مگر پھر بھی سارا شہر کسی نامعلوم خوف میں لپٹا ہوا تھا۔

باہر جانے کے خیال کو ملتوی کر کے خالد کا باپ ابھی کپڑے تبدیل کرنے بھی نہ پایا تھا کہ طیاروں کی

آواز نے اسے خوف زدہ کر دیا...... اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے سیکڑوں انسان ہم آہنگ ہو کر[۱۴] درد کی شدت سے کراہ رہے ہیں۔

خالد طیاروں کا شوروغل سن کر اپنی ہوائی بندوق سنبھالتا ہوا کمرے سے باہر دوڑ آیا اور انہیں غور سے دیکھنے لگا تا کہ وہ جس وقت گولا پھینکنے لگیں، وہ اپنی ہوائی بندوق کی مدد سے انہیں نیچے گرا دے...... اس وقت سات سال کے بچے کے چہرے پر آہنی ارادے اور فوجی[۱۵] استقلال کے آثار نمایاں تھے جو کم حقیقت بندوق کا کھلونا ہاتھ میں تھامے ایک جری سپاہی کو شرمندہ کر رہا تھا...... معلوم ہوتا تھا کہ وہ آج اُس چیز کو جو اُسے عرصے سے خوف زدہ کر رہی تھی، مٹانے پر تُلا ہوا ہے۔

خالد کے دیکھتے دیکھتے ہی ایک جہاز سے کچھ چیز گری جو کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے مشابہ تھی۔ گرتے ہی وہ[۱۶] ٹکڑے ہوا میں پتنگوں کی طرح اڑنے لگے۔ ان میں سے چند خالد کے مکان کی بالائی چھت پر بھی گرے۔

خالد بھاگا ہوا اوپر گیا اور وہ کاغذ اٹھا کر اپنے والد کے پاس لے آیا۔[۱۷]

''ابا جی...... ماما سچ مچ جھوٹ بک رہی تھی۔ جہاز والوں نے گولوں کی بجائے[۱۸] کاغذ پھینکے ہیں۔''

خالد کے باپ نے وہ کاغذ لے کر پڑھنا شروع کیا تو [اس کا؟] رنگ زرد ہو گیا...... ہونے والے حادثے کی تصویر اب اُسے عیاں طور پر نظر آنے لگی۔ اِس اشتہار میں صاف لکھا تھا کہ حکومت کسی [؟ کوئی] جلسہ کرنے کی اجازت نہیں دیتی[۱۹] اور اگر اُس کی مرضی کے خلاف کوئی جلسہ کیا گیا تو نتائج کی ذمے دار خود رعایا ہو گی۔

اپنے والد کو اشتہار پڑھنے کے بعد اس قدر حیران و پریشان دیکھ کر خالد نے گھبراتے ہوئے دریافت کیا:[۲۰] ''اس کاغذ میں یہ تو نہیں لکھا کہ وہ ہمارے گھر پر گولے پھینکیں گے؟''[۲۱]

''خالد، اس وقت تم جاؤ!...... جاؤ اپنی بندوق کے ساتھ کھیلو!''

''مگر اس میں کیا لکھا[۲۲] ہے؟''

''لکھا ہے کہ آج شام کو ایک تماشا ہو گا۔'' خالد کے باپ نے، گفتگو کو مزید طول دینے کے خوف سے، جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

''تماشا ہو گا!...... پھر تو ہم بھی چلیں گے نا؟''

''کیا کہا؟''

''کیا اُس تماشے میں آپ مجھے نہ لے چلیں گے؟''

''لے چلیں گے، جاؤ! اب کہیں جا کر کھیلو۔''[۲۳]

''کہاں کھیلوں؟...... بازار میں مجھے آپ جانے نہیں دیتے، ماما مجھ سے کھیلتی نہیں، ہمارا ہمسایہ جماعت طفیل بھی تو آج کل یہاں نہیں آتا۔ اب آپ ہی بتائیں، کھیلوں تو کس سے ...... شام کے وقت تماشا تو ضرور دیکھیں گے؟''[۲۴]

کسی جواب کا انتظار کیے بغیر خالد کمرے سے باہر چلا گیا اور مختلف کمروں میں آوارہ پھرتا ہوا اپنے والد کی نشست گاہ میں چلا گیا جس کی کھڑکیاں بازار کی طرف کھلتی تھیں۔ کھڑکی کے قریب ہو کر وہ بازار کا مشاہدہ کرنے لگا۔ کیا دیکھتا ہے کہ بازار میں دکانیں تو بند ہیں مگر آمد و رفت جاری ہے ...... (لوگ جلسے میں شریک ہونے کے لیے جا رہے تھے) وہ سخت حیران تھا کہ[۲۵] دکانیں کیوں بند رہتی ہیں۔ اس مسئلے کے حل کے لیے اس نے اپنے ننھے دماغ پر بہتیرا زور دیا مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ کر سکا۔

بہت غور و فکر کے بعد اس نے یہ سوچا کہ لوگوں نے اس تماشا [وہ تماشا؟] دیکھنے کی خاطر جس کے اشتہار جہاز بانٹ رہے تھے، دکانیں بند کر رکھی ہیں۔ اب اِس خیال نے کہ وہ کوئی نہایت ہی دلچسپ تماشا ہوگا جس کے لیے تمام بازار بند ہیں، خالد کو بے چین کر دیا۔ اب[۲۶] وہ اس وقت کا نہایت بے قراری سے انتظار کرنے لگا جب اس کا ابا اسے تماشا دکھلانے کو لے چلے۔

وقت گزرتا گیا...... وہ خونیں گھڑی بھی قریب تر آ گئی۔[۲۷]

سہ پہر کا وقت تھا۔ خالد، اس کا باپ اور ماں، تینوں صحن میں خاموش بیٹھے ایک دوسرے کی طرف[۲۸] تک رہے تھے...... ہوا سسکیاں بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔

تڑ — تڑ — تڑ — تڑ — — — — —

یہ آواز سنتے ہی خالد کے باپ کے چہرے کا رنگ کاغذ کی طرح سفید ہو گیا۔ [وہ؟] زبان سے بمشکل اِس قدر کہہ سکا: ''...... گولی ......''

خالد کی ماں فرطِ خوف سے ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکی۔ گولی کا نام سنتے ہی اسے ایسا معلوم ہوا جیسے خود اس کی چھاتی میں گولی اتر رہی ہے۔

خالد اس آواز کو سنتے ہی اپنے والد کی انگلی پکڑ کر کہنے لگا:

''ابا جی! چلیے ......[۲۹] تماشا تو شروع ہو گیا ہے!''

''کون سا تماشا؟'' خالد کے باپ نے[۳۰] خوف کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"وہی تماشا، جس کے اشتہار آج صبح جہاز بانٹ رہے تھے...... کھیل تو[۳۱] شروع ہو گیا ہے، تبھی تو اتنے پٹاخوں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔"

"ابھی بہت وقت باقی ہے...... تم شور مت کرو! جاؤ ماما کے پاس جاؤ۔"[۳۲]

خالد یہ سنتے ہی باورچی خانے کی طرف روانہ ہو گیا[۳۳] مگر وہاں ماما کو نہ پا کر اپنے والد کی نشست گاہ میں چلا گیا اور کھڑکی سے بازار کی طرف دیکھنے لگا۔

بازار، آمد و رفت بند ہو جانے کی وجہ سے سائیں سائیں کر رہے تھے...... دور فاصلے سے کتوں کی دردناک چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ ابھی تھوڑا عرصہ گزرنے نہ پایا تھا کہ ان چیخوں میں کسی انسان کی چیخ پکار[۳۴] بھی شامل ہو گئی۔

خالد اس آواز کو سن کر بہت حیران ہوا۔ ابھی وہ اس آواز کی جستجو کے لیے کوشش ہی کر رہا تھا کہ چوک میں اسے ایک لڑکا دکھائی دیا جو چیختا، چلاتا، بھاگا[۳۵] چلا آ رہا تھا۔ خالد کے گھر کے عین مقابل وہ لڑکا لڑکھڑا کر گرا اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا...... اُس کی پنڈلی پر ایک گہرا زخم تھا جس سے فواروں خون نکل رہا تھا۔

خالد یہ سماں دیکھ کر بہت خوف زدہ ہوا۔ بھاگا ہوا اپنے والد کے پاس آیا اور کہنے لگا: "ابا، ابا! بازار میں ایک لڑکا گر پڑا ہے جس کی[۳۶] ٹانگ سے بہت خون نکل رہا ہے۔"

خالد کا باپ یہ سنتے ہی کھڑکی کی طرف گیا اور دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکا بازار میں اوندھے منہ پڑا ہے۔ حکومت کے خوف کی وجہ سے کسی کو اتنی جرأت نہیں کہ اُسے[۳۷] سڑک پر سے اٹھا کر سامنے والی دکان کے پٹڑے پر لٹا دے۔[۳۸]

"ابا اس لڑکے کو کسی نے پیٹا ہے؟"[۳۹]

خالد کا باپ اثبات میں سر ہلاتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

جب خالد کمرے میں اکیلا رہ گیا تو سوچنے لگا کہ اس لڑکے کو اتنے بڑے زخم سے کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔ جب کہ اسے ایک دفعہ قلم تراش کی نوک چبھنے سے تمام رات نیند نہ آئی تھی، اور اس کی والدہ اور والد شب بھر اس کے سرہانے بیٹھے رہے تھے۔ اس خیال کے آتے ہی اسے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے وہ زخم خود اس کی پنڈلی میں ہے اور اس میں شدت کا درد ہے...... یک لخت اس نے رونا شروع کر دیا۔[۴۰]

خالد[۴۱] کے رونے کی آواز سن کر اس کی والدہ دوڑی دوڑی آئی اور اسے گود میں لے کر پوچھنے لگی:

"میرے بچے! رو کیوں رہے ہو؟"

"اس لڑکے کو کس نے پیٹا ہے؟"[۴۴]

"اس کے ماسٹر نے پیٹا ہوگا۔"

خالد سوچنے لگا کہ ایسا کون ساجلّاد ماسٹر ہے جس نے اس زور سے پیٹا ہے کہ لہو نکل آیا ہے۔ اُس کو تو کبھی ایسی مار نہیں پڑی تھی۔ چنانچہ رات کو جب وہ بستر میں لیٹا تو اُس نے صدق دل سے دعا مانگی: اللہ میاں! تو اُس ماسٹر سے وہ بید چھین لے جو لہولہان کر دیتا ہے...... اگر تو نے میرا کہا نہ مانا تو یاد رکھیو، میں تجھ سے کبھی نہ بولوں گا۔

حواشی

(ان حواشی میں ص سے مراد: آتش پارے کا صفحہ ہے۔
دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ خونی حادثے... کی گشت... پیش کر رہی تھی... جو صبح سے — ص:۷۷
۲۔ خاموش و پرسکون فضا سے — ایضاً
۳۔ بتایا ہی نہیں — ص:۷۸
۴۔ چھٹی ہوگی — ایضاً
۵۔ وہ ان کی روزانہ... سے تنگ آکر — ایضاً
۶۔ اضافہ شدہ مکالمہ — منٹو کے افسانے، ص:۵۸
۷۔ سے کہہ رہی تھی... جہاز والوں کے پاس... کی کوئی شرارت... عید پر مجھے دی تھی — ص:۷۹
۸۔ اوّلین متن میں یہ جملہ، پارے کے آغاز میں، اِس طور شائع ہوا ہے:
خالد کا باپ اپنے لڑکے کی غیر معمولی جسارت پر ہنسا۔ — ایضاً
۹۔ جب ہوائی جہاز... انتقام کا یہی ننھا جذبہ ہر شخص میں — ایضاً
۱۰۔ ایک ننھا بچہ اپنے انتقام... خالد کا باپ (اسی طرح، پورے افسانے میں منٹو نے کئی جگہ لفظ: ابا، باپ اور والد، ایک دوسرے سے تبدیل کیے ہیں۔ مدوّن نے حواشی میں ہر جگہ کی نشان دہی نہیں کی)... بات نہ کرے جس سے — صص:۷۹ تا ۸۰
۱۱۔ آئندہ تین پاروں کی تقسیم، نظرثانی شدہ متن کی بجائے، بنیادی نسخے (صص:۸۰ تا ۸۱) کے مطابق ہے۔
۱۲۔ باہر جا رہا تھا... لوگ بادشاہ کے منع... ایک عام جلسہ... ضرور پیش آکر — ص:۸۰
۱۳۔ پولیس کی گشت... پیش خیمہ تھے — ایضاً
۱۴۔ کا شور بلند ہوا۔ وہ سہم گیا... ہم آہنگ آواز میں — ایضاً

۱۵۔ باہر دوڑ آیا... لگیں تو وہ اپنی... چھ سال... آہنی ارادہ واستقلال کے آثار — ص:۸۱
۱۶۔ دیکھتے دیکھتے ایک... ٹکڑوں کے مشابہ... ہی یہ ٹکڑے — ایضاً
۱۷۔ اضافہ شدہ فقرہ: کر اپنے والد کے پاس لے آیا۔ — منٹو کے افسانے، ص:۵۹
۱۸۔ نے تو گولوں کے بجائے یہ کاغذ — ص:۸۱
۱۹۔ کہ بادشاہ کسی... اجازت نہیں دیتا — ص:۸۲
۲۰۔ گھبراتے ہوئے کہا — ایضاً
۲۱۔ یہ پارا بھی متن اوّل کے پارے کے مطابق ہے۔ — ایضاً
۲۲۔ اس پر لکھا کیا ہے — ایضاً
۲۳۔ اب جاؤ جا کر کھیلو — ایضاً
۲۴۔ بازار میں آپ... میرا ہم جماعت... اب میں کھیلوں تو کس سے کھیلوں؟—
شام کے وقت تماشا دیکھنے تو ضرور چلیں گے نا؟ — صص:۸۲ تا ۸۳
۲۵۔ نشست گاہ میں پہنچا جس کی... بیٹھ کر وہ بازار کی طرف جھانکنے لگا...
آتش پارے میں، جملے پر قوسین نہیں ہیں۔... کہ دو تین روز سے دکانیں — ص:۸۳
۲۶۔ اب اس نے خیال کیا کہ... اس خیال نے خالد کو سخت بے چین کر دیا اور — ایضاً
۲۷۔ خونی گھڑی قریب تر آتی گئی۔ — ص:۸۴
۲۸۔ اور والدہ صحن میں... کی طرف خاموش نگاہوں سے — ایضاً
۲۹۔ ابا جی چلو چلیں! — ایضاً
۳۰۔ نے اپنے خوف کو — ایضاً
۳۱۔ کھیل شروع — ایضاً
۳۲۔ خدا کے لیے اب جاؤ، اماں کے پاس جا کر کھیلو؟"... — ص:۸۵
۳۳۔ کی طرف گیا — ص:۸۵
۳۴۔ سائیں سائیں کر رہا تھا... چند لحات کے بعد ان چیخوں میں انسان کی دردناک آواز — ایضاً
۳۵۔ خالد کسی کو کراہتے سن کر... بھاگتا چلا آ رہا — ایضاً
۳۶۔ یہ سماں دیکھ کر خالد... بھاگ کر اپنے والد کے... اس کی ٹانگ سے — صص:۸۵ تا ۸۶
۳۷۔ یہ سنتے ہی خالد کا باپ کھڑکی کی طرف... کہ واقعی ایک نوجوان... بادشاہ کے
خوف سے اسے جرأت نہ ہوئی کہ وہ اس لڑکے کو — ص:۸۶
۳۸۔ "لٹادے" کے بعد کے درج ذیل جملے، منٹو نے حذف کر دیے:

—بے ساز و برگ افراد کو اٹھانے کے لیے حکومت کے ارباب حل و عقد نے آہنی گاڑیاں مہیا کر رکھی ہیں مگر اس معصوم بچے کی نعش جوان ہی کی تیغ ستم کا شکار تھی۔ وہ ننھا پودا جو ان ہی کے ہاتھوں مسلا گیا تھا۔ وہ کونپل جو کھلنے سے پہلے ان ہی کی عطا کردہ بادِ سموم سے جھلس

گئی تھی۔ کسی کے دل کی راحت جواُن ہی کے جور و استبداد نے چھین لی تھی۔ اب ان ہی کی تیار کردہ سڑک پر — آہ! موت بھیانک ہے، مگر ظلم اس سے کہیں زیادہ خوفناک اور بھیانک ہے۔ ص:۸۶

۳۹۔ آئندہ عبارت مدوّن کی تقسیم کردہ ہے۔

۴۰۔ اکیلا کمرے میں رہ گیا... جب کہ ایک دفعہ اسے قلم تراش... اور اس کا باپ اور ماں تمام رات اس کے سرہانے... ہونے لگا کہ وہ زخم... یک لخت وہ رونے لگ گیا۔ صص:۸۶ تا ۸۷

۴۱۔ اس کے رونے کی ص:۸۷

۴۲۔ بچے کے اس سوال سے ''نہ بولوں گا'' تک، منٹو نے افسانے کا اختتام از سرِنو تحریر کیا تھا (منٹو کے افسانے۔ طبع اوّل، ۱۹۴۰ء۔ ص:۶۲)۔ بنیادی نسخے میں اختتامی عبارت حسبِ ذیل ہے:

''امی، اِس لڑکے کو کسی نے مارا ہے؟''

''شرارت کی ہوگی اس نے؟''

خالد کی والدہ اپنے خاوند کی زبانی، زخمی لڑکے کی داستان سن چکی تھی۔

''مگر اسکول میں تو شرارت کرنے پر چھڑی سے سزا دیتے ہیں۔ لہو تو نہیں نکالتے۔''

خالد نے روتے ہوئے اپنی والدہ سے کہا۔

''چھڑی زور سے لگ گئی ہوگی!''

''تو پھر کیا اِس لڑکے کا والد اسکول میں جا کر اُس استاد پر خفا نہ ہوگا جس نے اس کے لڑکے کو اس قدر مارا ہے۔ ایک روز جب ماسٹر صاحب نے میرے کان کھینچ کر سرخ کر دیے تھے تو اباجی نے ہیڈ ماسٹر کے پاس جا کر شکایت کی تھی نا؟''

''اِس لڑکے کا ماسٹر بہت بڑا آدمی ہے۔''

''اللہ میاں سے بھی بڑا؟''

''نہیں اُن سے چھوٹا ہے۔''

''تو پھر وہ اللہ میاں کے پاس شکایت کرے گا۔''

''خالد، اب دیر ہوگئی ہے، چلو سوئیں۔''

اللہ میاں! میں دعا کرتا ہوں کہ تو اُس ماسٹر کو جس نے اِس لڑکے کو پیٹا ہے، اچھی طرح سزا دے۔ اور اُس چھڑی کو چھین لے جس کے استعمال سے خون نکل آتا ہے — میں نے پہاڑے یاد نہیں کیے۔ اس لیے مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہی چھڑی میرے استاد کے ہاتھ نہ آجائے — اگر تم نے میری باتیں نہ مانیں، تو پھر میں بھی تم سے نہ بولوں گا۔''

سوتے وقت خالد دل میں دعا مانگ رہا تھا۔ (صص:۸۷ تا ۸۸)

طاقت کا امتحان

''کھیل خوب تھا...... کاش تم بھی وہاں موجود ہوتے۔''

''مجھے کل کچھ ضروری کام تھا، مگر اُس کھیل میں کون سی چیز ایسی قابل دید تھی جس کی تم اتنی تعریف کر رہے ہو؟''

''ایک صاحب نے چند جسمانی ورزشوں کے کرتب دکھلائے جس سے ہوش گم ہوگیا''۔!

''مثلاً؟''

''مثلاً، کلائی پر ایک انچ موٹی سلاخ کو خم دینا......''

''یہ آج کل بچے بھی کر سکتے ہیں۔''

''چھاتی پر چکی کا پتھر رکھوا کر آہنی ہتھوڑوں سے پاش پاش کرانا......''

''میں نے ایسے بیسیوں شخص دیکھے ہیں۔''

''مگر وہ جو اُس نے اتنا بھاری وزن، دو ہاتھوں سے اٹھا کر ایک تنکے کے مانند پرے پھینک دیا، کسی اور شخص کے بس کی بات نہیں...... یہ تمہیں بھی ماننا پڑے گا۔''

''بھلے آدمی، یہ بھی کون سا اہم کام ہے۔ وزن کتنا تھا آخر؟''

''کوئی چار من کے قریب ہوگا، کیوں؟''

''اتنا وزن تو شہر کا ہر فاقہ زدہ مزدور گھنٹوں پشت پر اٹھائے رہتا ہے۔''

''بالکل غلط!''

''وہ کیوں؟''

''غلیظ ٹکڑوں پر پلے ہوئے مزدور میں اتنی قوت نہیں ہو سکتی۔ طاقت کے لیے اچھی غذا کا ہونا لازم ہے...... شہر کا مزدور!...... کیسی باتیں کر رہے ہو!''

غذا والے معاملے کے متعلق میں تم سے متفق ہوں مگر یہ حقیقت ہے...... یہاں ایسے بہتیرے مزدور ہیں جو دو پیسے کے لیے چار من بلکہ اس سے کچھ زیادہ وزن اٹھا کر تمہارے گھر کی دوسری منزل پر چھوڑ سکتے

ہیں...... کہو تو اسے ثابت کر دوں؟''

یہ گفتگو دو نوجوان طلبا میں ہو رہی تھی جو ایک پُر تکلف کمرے کی گدے دار کرسیوں پر بیٹھے سگریٹ کا دھواں اڑا رہے تھے۔

''میں اسے ہرگز نہیں مان سکتا اور باور آئے بھی کس طرح...... قاسم چوب فروش کے مزدور ہی کو لو۔ کم بخت سے ایک من لکڑیاں بھی تو اٹھائی نہیں جاتیں...... ہزاروں میں ایک ایسا طاقت ور ہو تو کوئی اچنبھا نہیں ہے۔''

''پھر وہی ضد! میں جو کہہ رہا ہوں کہ اس کا ثبوت لے لو...... وہ مریل بھی کوئی انسانوں میں ہے؟''

''چھوڑو یار اس قصے کو...... بھاڑ میں جائیں یہ سب مزدور اور چولھے میں جائے ان کی طاقت۔ سناؤ آج تاش کی بازی کب لگ رہی ہے؟''

''تاش کی بازیاں لگتی ہی رہیں گی۔ پہلے اس بحث کا فیصلہ ہونا چاہیے۔''

سامنے والی دیوار پر آویزاں کلاک ہر روز اسی قسم کی لایعنی گفتگوؤں سے تنگ آ کر برابر اپنی ٹک ٹک کیے جا رہا تھا۔ سگریٹ کا دھواں ان کے منہ سے آزاد ہو کر بڑی بے پروائی سے فضا میں چکر لگاتا ہوا کھڑکی کے رستے باہر نکل رہا تھا۔ دیواروں پر لٹکی ہوئی تصاویر کے چہروں پر بے فکری و بے اعتنائی کی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔ کمرے کا فرنیچر سالہا سال سے ایک ہی جگہ پر جما ہوا، کسی تغیر سے ناامید ہو کر بے حس پڑا سوتا تھا۔ آتش دان کے طاق پر رکھا ہوا کسی یونانی مفکر کا مجسمہ اپنی سنگین نگاہوں سے آدم کے ان دو فرزندوں کی بے معنی گفتگو سن کر تعجب سے اپنا سر کھجلا رہا تھا..... کمرے کی فضا ان بھدی اور فضول باتوں سے کثیف ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر تک دونوں دوست تاش کے مختلف کھیلوں، برج کے اصولوں اور روپیہ جیتنے کے طریقوں پر اظہارِ خیالات کرتے رہے۔ دفعتاً ان میں سے وہ جسے مزدور کی طاقت کے متعلق پورا یقین تھا، اپنے دوست سے مخاطب ہوا:

''باہر بازار میں لوہے کا جو گارڈر پڑا ہے، وہ تمہارے خیال میں کتنا وزن رکھتا ہوگا؟''

''پھر وہی بحث؟''

''تم بتاؤ تو سہی!''

''پانچ چھ من کے قریب ہوگا۔''

"یہ وزن تو تمہاری نظر میں کافی ہے نا؟"

"یعنی تمہارا یہ مطلب ہے کہ لوہے کی یہ بھاری بھرکم لاٹھ، تمہارا مزدور پہلوان اٹھائے گا [اٹھا لے گا؟] ...... گدھے والی گاڑی ضرور ہوگی اس کے ساتھ!"

"یہاں کے مزدور بھی گدھوں سے کیا کم ہیں ...... گیہوں کی دو تین بوریاں اٹھانا تو ان کے لیے بالکل معمولی کام ہے ...... مگر تمہیں کیا پتہ ہوسکتا ہے۔ کہو تو، تمہارے کل والے کھیل سے کہیں حیرت انگیز اور بہت ہی سستے داموں میں[۲] ایک نیا تماشا دکھاؤں؟"

"اگر تمہارا مزدور لوہے کا وہ وزنی ٹکڑا اٹھائے گا تو میں تیار ہوں۔"

"تمہاری آنکھوں کے سامنے اور بغیر کسی چالاکی کے!"

دونوں دوست خاک دان میں اپنے اپنے سگریٹ کی گردن دبا کر اٹھے اور باہر بازار کی طرف مزدور کی طاقت کا امتحان کرنے چل دیے ...... کمرے کی تمام اشیا کسی گہری فکر میں غرق ہوگئیں جیسے انہیں کسی غیر معمولی حادثے کا خوف ہو۔ کلاک اپنی انگلیوں پر کسی متعینہ وقت کی گھڑیاں شمار کرنے لگا۔ دیواروں پر آویزاں تصویریں حیرت میں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں ...... کمرے کی فضا خاموش آہیں بھرنے لگی۔[۱۳]

لوہے کا وہ بھاری بھرکم ٹکڑا، لاش کا سا سرد اور کسی وحشت ناک خواب کی طرح تاریک، بازار کے ایک کونے میں کسی بھیانک دیو کی مانند اکڑا ہوا تھا۔ دونوں دوست لوہے کی اس لاٹھ[۱۴] کے پاس آ کر کھڑے ہوگئے اور کسی مزدور کا انتظار کرنے لگے۔

بازار بارش کی وجہ سے کیچڑ میں لت پت تھا جو راہ گزروں کے جوتوں کے ساتھ اُچھل اُچھل کر اُن کا مضحکہ اڑا رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا گویا وہ اپنے روندنے والوں کو خاموش زبان میں کہہ رہی ہے کہ تم اسی آب و گل کی تخلیق ہو جسے تم اس وقت پاؤں سے گوندھ رہے ہو مگر وہ اس حقیقت سے غافل اپنے دنیوی کام دھندوں کی دھن میں مصروف، کیچڑ کے سینے کو مسلتے ہوئے اِدھر اُدھر جلد[۱۵] قدم اٹھاتے ہوئے جا رہے تھے۔

کچھ دکان دار اپنے گاہکوں کے ساتھ سودا طے کرنے میں مصروف تھے اور کچھ بجی ہوئی دکانوں میں تکیہ لگائے اپنے حریف ہم پیشہ دکان دار کی طرف حاسدانہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور اس وقت کے منتظر تھے کہ کوئی گاہک وہاں سے ہٹے اور وہ اسے کم قیمت کا جھانسا دے کر گھٹیا مال فروخت کر دیں۔

ان دکانوں کے ساتھ ہی ایک دوا فروش اپنے مریض گاہکوں کا انتظار کر رہا تھا ...... بازار میں سب لوگ اپنے اپنے خیال میں مست تھے اور یہ دو دوست کسی دنیوی[۱۶] فکر سے بے پروا ایک ایسے مزدور کی راہ

دیکھ رہے تھے جوان کی دلچسپی کا سامان مہیا کر سکے۔

دور، بازار کے آخری سرے پر ایک مزدور، کمر کے گرد رسی باندھے اور پشت پر ٹاٹ کا ایک موٹا سا ٹکڑا لٹکائے، کیچڑ کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھتا[۱۷] چلا آ رہا تھا۔

نانبائی کی دکان کے قریب پہنچ کر وہ دفعتاً ٹھٹکا۔ سالن کی دیگچیوں اور تنور سے تازہ نکلی ہوئی روٹیوں نے اس کے پیٹ میں نوک دار خنجروں کا کام کیا۔ مزدور نے اپنی پھٹی ہوئی جیب کی طرف نگاہ کی اور گرسنہ دانتوں سے اپنے خشک لبوں کو کاٹ کر خاموش رہ گیا۔ سرد آہ بھری اور اسی رفتار سے چلنا شروع کر دیا۔ چلتے وقت اس کے کان بڑی بے صبری سے کسی کی دل خوش کن آواز ''مزدور'' کا انتظار کر رہے تھے مگر اس کے دل میں نہ معلوم[۱۸] کیا خیالات چکر لگا رہے تھے۔

''دو تین دن سے روٹی بمشکل نصیب ہوئی ہے۔ اب چار بجنے کو آئے ہیں مگر ایک کوڑی تک نہیں ملی ...... کاش آج صرف ایک روٹی کے لیے ہی کچھ مل[۱۹] جائے! ...... بھیک؟ ...... نہیں، خدا کارساز ہے!''

اُس نے بھوک سے تنگ آ کر بھیک مانگنے کا خیال کیا مگر اسے ایک مزدور کی شان کے خلاف خیال کرتے ہوئے خدا کا دامن تھام لیا اور اس خیال سے مطمئن ہو کر جلدی جلدی[۲۰] بازار کو طے کرنے لگا کہ شاید دوسرے بازار میں اسے کچھ نصیب ہو جائے۔ دونوں دوستوں نے بیک وقت ایک مزدور کو تیزی سے اپنی طرف قدم بڑھاتے دیکھا ...... مزدور دبلا پتلا نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے فوراً آواز دی:

''مزدور!''

یہ سنتے ہی گویا مزدور کے سوکھے دھانوں میں پانی مل گیا [پانی پڑ گیا؟] بھاگا ہوا آیا اور نہایت ادب سے بولا:[۲۱]

''جی حضور۔''

''دیکھو لوہے کا یہ ٹکڑا اٹھا کر ہمارے ساتھ لے[۲۲] چلو ...... کتنے پیسے لو گے؟''

مزدور نے جھک کر لوہے کی بھاری بھرکم لاٹھ کی طرف دیکھا اور دیکھتے ہی اس کی آنکھوں سے[۲۳] وہ چمک جو ''مزدور'' کا لفظ سن کر پیدا ہوئی تھی، غائب ہو گئی .. وزن بلاشک وشبہ زیادہ تھا۔ مگر روٹی کے قحط اور پیٹ پوجا کے لیے سامان پیدا کرنے کا سوال اس سے کہیں وزنی تھا۔

مزدور نے ایک بار پھر اس آہنی لاٹھ کی طرف دیکھا اور دل میں عزم کرنے کے بعد کہ وہ اسے ضرور اٹھائے گا۔ ان سے بولا: ''جو حضور فرمائیں۔''

"یعنی تم یہ وزن اکیلے اٹھا لو گے؟" اُن دو لڑکوں میں سے اُس لڑکے[24] نے، مزدور کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا جو کل شب جسمانی کرتب دیکھ کر آیا تھا۔

"بولو کیا لو گے؟...... یہ وزن بھلا کہاں زیادہ ہے"[25] دوسرے نے بات کا رخ پلٹ دیا۔

"کہاں تک جانا ہوگا حضور!"

"بہت قریب...... دوسرے بازار کے نکڑ تک۔"

"وزن زیادہ ہے، آپ تین آنے دے دیجیے۔"

"تین آنے!!"

"جی ہاں، تین آنے کچھ زیادہ تو نہیں ہیں۔"

"دو آنے مناسب ہیں بھئی!"

دو آنے...... آٹھ پیسے، یعنی دو وقت کے لیے سامانِ خورد و نوش۔ یہ سوچتے ہی مزدور راضی ہو گیا۔ اس نے اپنی کمر سے رسی اتاری اور اسے لوہے کے ٹکڑے کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا...... دو تین جھٹکوں کے بعد وہ آہنی سلاخ اس کی کمر پر تھی۔

گو وزن واقعی ناقابلِ برداشت تھا مگر تھوڑے عرصے کے بعد ملنے والی روٹی نے مزدور کے جسم میں عارضی طور پر ایک غیر معمولی طاقت پیدا کر دی تھی۔ اب ان کاندھوں میں جو بھوک کی وجہ سے مردہ ہو رہے تھے، روٹی کا نام سن کر تمام طاقت عود کر آئی۔ گرسنہ انسان بڑی سے بڑی مشقت کو[26] فراموش کر دیتا ہے جب اُسے اپنے پیٹ کے لیے کچھ سامان نظر آتا ہے۔

"آیئے۔" مزدور نے بڑی ہمت سے دو قدم اٹھاتے[27] ہوئے کہا۔ دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کی طرف نگاہیں اٹھائیں اور زیرِ لب مسکرا دیے۔ وہ بہت مسرور تھے۔

"چلو .... مگر ذرا جلدی قدم بڑھاؤ۔ ہمیں کچھ اور بھی کام کرنا ہے۔"

مزدور ان دو لڑکوں کے پیچھے ہو لیا...... وہ اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ موت اس کے کاندھوں پر سوار ہے۔

"کیوں میاں! کہاں ہے وہ تمہارا کل والا سینڈو؟"

"کمال کر دیا ہے اس مزدور نے...... واقعی سخت تعجب ہے!"

"تعجب! اگر کہو تو اس لوہے کے ٹکڑے کو تمہارے گھر کی بالائی چھت پر رکھوا دوں۔"

''مگر سوال یہ ہے کہ ہم لوگ اچھی غذا ملنے پر بھی اتنے طاقت ور کیوں[۲۸] نہیں ہیں؟''
''ہماری غذا تو کتابوں اور دیگر علمی چیزوں کی نذر ہو جاتی ہے.. انہیں اس قسم کی دردسری سے کیا تعلق؟...... بےفکری! کھانا پینا[۲۹] اور سو جانا!!!''
''واقعی درست ہے!''
لڑکے مزدور پر لدے ہوئے بوجھ اور اس کی خمیدہ کمر سے غافل آپس میں اظہارِ خیالات[۳۰] کر رہے تھے۔

وہاں سے سو قدم کے فاصلے پر مزدور کی قضا، کیلے کے چھلکے میں چھپی ہوئی، اپنے شکار کا انتظار کر رہی تھی۔[۳۱] مزدور کیچڑ میں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا مگر تقدیر کے آگے تدبیر کی ایک بھی پیش نہ چلی۔ اس کا قدم چھلکے پر پڑا، پھسلا اور چشم زدن میں لوہے کی اس بھاری لاٹھ نے اسے کیچڑ میں پیوست کر دیا۔ مزدور نے مترحم نگاہوں سے کیچڑ اور لوہے کے سرد ٹکڑے کی طرف دیکھا، تڑپا اور ہمیشہ کے لیے بھوک کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔

دھمکے کی آواز سن کر دونوں لڑکوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا...... مزدور کا سر آہنی سلاخ کے نیچے کچلا ہوا تھا۔ اس کی باہر نکلی[۳۲] ہوئی آنکھیں نہ معلوم کس سمت ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھیں۔ خون کی ایک موٹی سی تہہ کیچڑ کے ساتھ ہم آغوش ہو رہی تھی۔
''چلو آؤ چلیں .... ہمیں خواہ مخواہ اس حادثے کا گواہ بننا پڑے گا۔''
''میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ یہ وزن اس سے نہ[۳۳] اٹھایا جائے گا...... لالچی!''
یہ کہتے ہوئے دونوں لڑکے مزدور کی لاش کے گرد جمع ہوتی ہوئی بھیڑ کو کاٹتے ہوئے اپنے گھر کو روانہ ہو گئے۔ سامنے والی دکان پر ایک بڑی توند والا شخص ٹیلی فون کا چونگا ہاتھ میں لیے غالباً گندم کا بھاؤ طے کرنے والا تھا کہ اس نے مزدور کو موت کا شکار ہوتے دیکھا اور اس حادثے کو منحوس خیال کرتے ہوئے بڑبڑا کر ٹیلی فون کا سلسلۂ گفتگو منقطع کر دیا۔[۳۴]
''کمبخت کو مرنا بھی تھا تو میری دکان کے سامنے...... بھلا اِن لوگوں کو اس قدر وزن اٹھانے پر کون مجبور کرتا ہے۔''
تھوڑی دیر کے بعد اسپتال کی آہنی گاڑی آئی اور مزدور کی لاش اٹھا کر عمل جراحی کے لیے ڈاکٹروں کے سپرد کر دی گئی۔ دھندلے آسمان پر ابر کے ایک ٹکڑے نے مزدور کے خون کو کیچڑ میں ملتے ہوئے دیکھا۔

اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ ان آنسوؤں نے سڑک کے سینے پر سے[۳۵] خون کے دھبوں کو دھو دیا۔

آہنی لاٹھ ابھی تک بازار کے ایک کنارے پڑی ہوئی ہے۔ مزدور کے خون کا صرف ایک قطرہ باقی ہے جو دیوار کے ساتھ چمٹا ہوا نہ معلوم کس چیز کا اپنی خونیں آنکھوں سے انتظار کر رہا ہے۔[۳۶]

حواشی

(ان حواشی میں ص سے مراد: آتش پارے کا صفحہ ہے۔
دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ کہ ہوش گم ہوگیا — ص:۸۹
۲۔ آہنی سلاخ — ایضاً
۳۔ وزن جو اُس نے دو ہاتھوں سے اُٹھا کر ایک تنکے کی طرح — ص:۹۰
۴۔ یہ کون سا اہم کام — ایضاً
۵۔ شہر کا فاقہ زدہ — ایضاً
۶۔ پیسے کی خاطر ... چھوڑ آسکتے — ایضاً
۷۔ اضافہ شدہ مکالمہ۔ — منٹو کے افسانے، ص:۱۲۰
۸۔ بازی لگ رہی ہے — ص ۹۱
۹۔ بازیاں تو لگتی ہی — ایضاً
۱۰۔ سے چکر لگاتا... راستے باہر — ایضاً
۱۱۔ اظہار خیال — ص:۹۲
۱۲۔ ان کے نزدیک ... بہت سستے داموں — ایضاً
۱۳۔ اپنے اپنے سگریٹ کی خاک دان میں گردن ... بھرنے لگ گئی — ص.۹۳
۱۴۔ لوہے کے اس ٹکڑے — ایضاً
۱۵۔ راہ گیروں کے ... اضافہ: کو خاموش زبان میں (منٹو کے افسانے، ص:۱۲۲)...
وہ اسی ... ہیں جسے وہ ... رہے ہیں ... دنیاوی کام ... جلد جلد قدم — صص ۹۳ تا ۹۴
۱۶۔ ان میناروں کی دکانوں ... اور یہ دو دوست کسی دنیاوی فکر — ص:۹۴
۱۷۔ رسّی لپیٹے ... دیکھتا ہوا چلا — ایضاً
۱۸۔ نہ معلوم کیا کیا خیالات — ص:۹۵

۱۹۔ کچھ نصیب ہو جائے	ص ۹۵
۲۰۔ خلاف سمجھتے ہوئے... جلدی جلدی اس بازار کو طے کرنے لگا— اس خیال سے	ایضاً
۲۱۔ ادب سے پوچھنے لگا	ص ۹۶
۲۲۔ ہمارے ساتھ چلو	ایضاً
۲۳۔ لوہے کے بھاری بھرکم ٹکڑے... آنکھوں کی وہ چمک	ایضاً
۲۴۔ میں سے اس نے،	ایضاً
۲۵۔ کہاں سے زیادہ ہوا	ص:۹۷
۲۶۔ مشقت فراموش کر دیتا	ص:۹۸
۲۷۔ ہمت سے کام لیتے ہوئے	ایضاً
۲۸۔ سوال ہے کہ ہم... اتنے طاقت ور نہیں ہیں	ایضاً
۲۹۔ اس قسم کی سردردی... کھانا اور سو جانا	ایضاً
۳۰۔ اپنے خیالات کا اظہار	ص:۹۹
۳۱۔ -گو مزدور کیچڑ میں	ایضاً
۳۲۔ آنکھیں باہر نکلی ہوئی	ایضاً
۳۳۔ اس سے نہیں اٹھایا	ایضاً
۳۴۔ اپنے گھر روانہ... منقطع کر لیا	ص ۱۰۰
۳۵۔ سپرد کر دی... آنکھوں میں آنسو... سینے پر اس خون کے	ایضاً
۳۶۔ اولین متن میں افسانے کے اختتام پر، تین سطروں میں، یہ وضاحتیں درج ہیں: (۵ر جنوری ۳۵ء) اشاعتِ اول— ہفتہ وار خلق اشاعتِ ثانی عالمگیر	ص.۱۰۱

دیوانہ شاعر

[1]میں آہوں کا بیوپاری ہوں،
لہو کی شاعری میرا کام ہے،
چمن کی واماندہ ہواؤ!
اپنے دامن سمیٹ لو...... کہ
میرے آتشیں گیت،
دبے ہوئے سینوں میں تلاطم برپا کرنے والے ہیں۔

یہ بے باک نغمہ، درد کی طرح اٹھا اور باغ کی فضا میں چند لمحے تھرتھرا کر ڈوب گیا۔ آواز میں دیوانگی سی تھی .. .. ناقابلِ بیان، میرے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی۔ میں نے آواز کی جستجو میں ادھر اُدھر نگاہیں اٹھائیں: سامنے چبوترے کے قریب گھاس کے تختے پر چند بچے اپنی ماماؤں کے ساتھ کھیل کود میں محو تھے، پاس ہی دو تین گنوار بیٹھے گنا چوس رہے تھے، بائیں طرف نیم کے درختوں کے نیچے مالی زمین کھودنے میں مصروف تھا۔ میں ابھی اسی جستجو ہی میں تھا[2] کہ وہی درد میں ڈوبی ہوئی آواز پھر بلند ہوئی:

میں اُن لاشوں کا گیت گاتا ہوں،
جن کی سردی دسمبر مستعار لیتا ہے۔
میرے سینے سے نکلی ہوئی آہ
وہ لُو ہے جو جون کے مہینے میں چلتی ہے۔
میں آہوں کا بیوپاری ہوں،
لہو کی شاعری میرا کام ہے.....

آواز کنویں کے عقب سے آرہی تھی۔ مجھ پر رقت سی طاری ہوگئی۔ میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ سرد اور گرم لہریں بیک وقت میرے جسم سے لپٹ رہی ہیں۔ اس خیال نے مجھے کسی قدر خوف زدہ کردیا کہ آواز اُس کنویں کے قریب سے بلند ہو رہی تھی جس میں آج سے کچھ سال پہلے لاشوں کا ایک انبار لگا تھا۔ اس

خیال کے ساتھ ہی میرے دماغ میں جلیاں والا باغ کے خونی حادثے کی تصویر سی کھنچ گئی۔ تھوڑی دیر کے لیے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ باغ کی فضا گولیوں کی سنسناہٹ اور بھاگتے ہوئے لوگوں کی چیخ پکار سے گونج رہی ہے۔ میں لرز گیا۔ اپنے کاندھوں کو زور سے جھٹکا دے کر اور اس عمل سے اپنے خوف کو دور کر کے[۴] میں اٹھا۔ اور کنویں کا رخ کیا۔

سارے باغ پر پُراسرار خاموشی چھائی تھی۔ میرے قدموں کے نیچے خشک پتوں کی کھڑکھڑاہٹ، سوکھی ہوئی ہڈیوں کے ٹوٹنے کی آواز پیدا کر رہی تھی۔ کوشش کے باوجود میں اپنے دل سے وہ نامعلوم خوف دور نہ کر سکا جو اس آواز نے پیدا کر دیا تھا۔ ہر قدم پر مجھے یہی معلوم ہوتا کہ گھاس کے سبز بستر پر بے شمار لاشیں پڑی ہیں جن کی بوسیدہ ہڈیاں میرے پاؤں کے نیچے ٹوٹ رہی ہیں۔ یکا یک میں نے اپنے قدم تیز کیے اور دھڑکتے ہوئے دل سے اس چبوترے پر بیٹھ گیا جو کنویں کے ارد گرد بنا ہے۔[۷]

میرے دماغ میں بار بار یہ عجیب سا شعر گونج رہا تھا:

میں آہوں کا بیوپاری ہوں
لہو کی شاعری میرا کام ہے

کنویں کے قریب کوئی متنفس موجود نہ تھا۔ میرے سامنے چھوٹے پھاٹک کی ساتھ والی دیوار پر گولیوں کے نشان تھے۔ جن پر چوکور جالی منڈھی ہوئی تھی۔ میں ان نشانوں کو بیسیوں مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ مگر اب وہ دو نشان جو میری نگاہوں کے عین سامنے تھے دو خونیں آنکھیں معلوم ہوتی تھیں جو دور...... بہت دور، کسی غیر مرئی چیز کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی ہوں۔ بلا ارادہ میری نگاہیں اُن دو چشم نما سوراخوں پر جم کر رہ گئیں۔ میں ان کی طرف، مختلف خیالات میں کھویا، خدا معلوم کتنے عرصے تک دیکھتا رہا کہ دفعتاً پاس والی روش پر کسی کے بھاری قدموں کی چاپ نے مجھے اس خواب سے بیدار کر دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ گلاب کی جھاڑیوں سے ایک دراز قد آدمی سر جھکائے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کے بڑے کوٹ کی جیبوں میں ٹھنسے تھے۔ چلتے ہوئے وہ زیرلب کچھ گنگنا رہا تھا۔ کنویں کے قریب پہنچ کر یکا یک وہ ٹھٹکا۔ اور گردن اٹھا کر مجھ سے[۵] کہا:

"میں پانی پیوں گا۔"

میں فوراً چبوترے پر سے اٹھا اور پمپ کا ہینڈل ہلانا شروع کیا۔[۶] "آیئے۔"

اچھی طرح پانی پی چکنے کے بعد اس نے اپنے کوٹ کی میلی آستین سے منہ پونچھا اور واپس چلنے ہی کو

تھا[۷] کہ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے دریافت کیا:

"کیا ابھی ابھی آپ ہی گا رہے تھے؟"

"ہاں...... پر آپ کیوں پوچھتے ہیں؟" یہ کہہ کر اس نے اپنا سر پھر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں جن میں سرخ ڈورے غیر معمولی طور پر نمایاں تھے، میری قلبی واردات کا جائزہ لینے لگیں۔[۸] میں گھبرا گیا۔

"آپ ایسے گیت نہ گایا کریں...... یہ بڑے خوف ناک[۹] ہیں۔"

"خوف ناک!...... نہیں، انہیں ہیبت ناک ہونا چاہیے۔ جبکہ میرے راگ کے ہر سُر میں رستے ہوئے زخموں کی جلن اور رکی ہوئی آہوں کی تپش مستور ہے۔ معلوم ہوتا ہے میرے شعلوں کی زبانیں آپ کی برفائی ہوئی روح کو اچھی طرح چاٹ نہیں سکیں۔" اس نے اپنی نوکیلی ٹھوڑی کو انگلیوں سے کھجلایا۔ اس کے الفاظ اس شور کے مشابہ تھے جو برف کے ڈھیلے میں، تپی ہوئی[۱۰] سلاخ گزارنے سے پیدا ہوتا ہے۔

میں نے کہا:[۱۱] "آپ مجھے ڈرا رہے ہیں۔"

اس پر اُس[۱۲] مردِ عجیب کے حلق سے ایک قہقہہ نما شور بلند ہوا: "ہا، ہا، ہا...... آپ ڈر رہے ہیں۔ کیا آپ کو یہ معلوم نہیں کہ آپ اس وقت اُس منڈیر پر کھڑے ہیں جو آج سے کچھ عرصہ پہلے بے گناہ انسانوں کے خون سے لتھڑی ہوئی تھی۔ یہ حقیقت میری گفتگو سے زیادہ وحشت خیز ہے۔"

یہ سن کر میرے قدم لڑکھڑائے۔[۱۳] میں واقعی خونیں منڈیر پر کھڑا تھا۔ مجھے خوف زدہ دیکھ کر وہ پھر بولا:

"تھرائی ہوئی رگوں سے بہا ہوا لہو کبھی فنا نہیں ہوتا...... اس خاک کے ذرّے ذرّے میں مجھے سرخ بوندیں تڑپتی نظر آ رہی ہیں۔ آؤ، تم بھی دیکھو!"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی نظریں زمین پر گاڑ دیں۔ میں کنویں پر سے نیچے اتر آیا اور اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ میرا دل دھک کر رہا تھا۔ دفعتاً اس نے اپنا ہاتھ میرے کاندھے پر رکھا اور بڑے دھیمے لہجے میں کہا: "مگر تم اسے نہیں سمجھ سکو گے...... یہ بہت مشکل ہے!!"

میں اس کا مطلب بخوبی سمجھ رہا تھا...... وہ غالباً مجھے اُس خونی حادثے کی یاد دلا رہا تھا جو آج سے سولہ سال قبل اس باغ میں واقع ہوا تھا۔ اس وقت میری عمر قریباً پانچ سال کی تھی۔ اس لیے میرے دماغ میں اُس کے صرف دھندلے نقوش باقی تھے۔ لیکن مجھے اتنا ضرور معلوم تھا کہ اس باغ میں عوام کے ایک جلسے پر گولیاں برسائی گئی تھیں جس کا نتیجہ قریباً دو ہزار اموات تھیں۔ میرے دل میں ان لوگوں کا بہت احترام تھا جنہوں نے مادرِ وطن اور جذبۂ آزادی کی خاطر اپنی جانیں قربان کی تھیں۔ بس اس احترام کے علاوہ میرے

دل میں اس حادثے کے متعلق اور کوئی خاص جذبہ نہ تھا۔ مگر آج اس مردِ عجیب کی گفتگو نے میرے سینے میں ہیجان سا برپا کر دیا۔ میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ گولیاں تڑتڑ برس رہی ہیں اور بہت سے لوگ وحشت کے مارے اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے ایک دوسرے پر گر کر مر رہے ہیں۔[۱۴]

''میں سمجھتا ہوں...... میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔ موت بھیانک ہے۔ مگر ظلم اس سے کہیں خوف ناک اور بھیانک ہے!!''

یہ کہہ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے سب کچھ کہہ ڈالا ہے اور میرا سینہ بالکل خالی رہ گیا ہے۔ مجھ پر مردنی سی چھا گئی۔ غیر ارادی طور پر میں نے اس شخص کا کوٹ[۱۵] پکڑ لیا اور تھرائی ہوئی آواز میں کہا:

''آپ کون ہیں؟...... آپ کون ہیں؟''

''آہوں کا بیوپاری...... دیوانہ[۱۶] شاعر۔''

''آہوں کا بیوپاری!...... دیوانہ شاعر!'' اُس کے الفاظ زیرِ لب گنگناتا، میں کنویں کے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ سامنے سپیدے کے دو درخت ہیبت ناک دیووں کی طرح انگڑائیاں لے رہے تھے۔ پاس ہی چنبیلی اور گلاب کی خاردار جھاڑیوں میں ہوا آہیں بھر [ق] رہی تھی۔ دیوانہ شاعر خاموش کھڑا سامنے والی دیوار کی ایک کھڑکی پر نگاہیں جمائے تھا۔ شام کے خاکستری دھندلکے میں وہ ایک سایہ سا دکھائی دیتا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ[۱۷] گنگنایا:

''آہ! یہ سب کچھ خوف ناک حقیقت ہے...... کسی صحرا میں جنگلی انسان کے پیروں کے نشانات کی طرح خوف ناک!''

''کیا کہا؟''

میں اُن الفاظ کو اچھی طرح سن نہ سکا تھا جو اُس نے منہ ہی منہ میں ادا کیے تھے۔

''کچھ نہیں۔''[۱۸] وہ میرے پاس چبوترے پر بیٹھ گیا۔

''مگر آپ گنگنا رہے تھے۔''

اس پر اُس نے اپنی آنکھیں ایک عجیب انداز سے سکیڑیں اور ہاتھوں کو آپس میں زور زور سے ملنا شروع کیا [ملنے لگا؟]۔ ''سینے میں قید کیے ہوئے الفاظ باہر نکلنے کے لیے مضطرب ہوتے ہیں۔ اپنے آپ سے بولنا اس الوہیت سے گفتگو کرنا ہے جو ہمارے دل کی پہنائیوں میں مستور ہوتی ہے۔'' پھر ساتھ ہی گفتگو کا رخ بدل دیا: ''کیا آپ نے وہ کھڑکی دیکھی[۱۹] ہے؟''

اس نے اپنی انگلی اس کھڑکی کی طرف اٹھائی جسے وہ چند لمحے پہلے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُس جانب دیکھا۔ چھوٹی سی کھڑکی تھی جو سامنے دیوار کی خستہ اینٹوں میں سوئی[۲۰] معلوم ہوتی تھی۔

میں نے کہا: "یہ کھڑکی جس کا ڈنڈا[۲۱] نیچے لٹک رہا ہے؟"

"ہاں ...... یہی، جس کا ایک ڈنڈا نیچے لٹک رہا ہے، کیا تم اس پر اُس معصوم لڑکی کے خون کے چھینٹے نہیں دیکھتے جس کو صرف اس لیے ہلاک کیا گیا تھا کہ ترکش استبداد کو اپنے تیروں کی قوتِ پرواز کا امتحان لینا تھا ..... میرے عزیز! تمہاری اُس بہن کا خون ضرور رنگ لائے گا۔ میرے گیتوں کے زیر و بم میں اس کم سن روح کی پھڑ پھڑاہٹ اور اس کی دل دوز چیخیں ہیں۔ یہ سکون کے دامن کو تار تار کر دیں گی۔ ایک ہنگامہ ہو گا۔ سینۂ گیتی شق ہو جائے گا۔ میری بے لگام آواز بلند سے بلند تر ہوتی جائے گی ...... پھر کیا ہوگا؟ ...... پھر کیا ہوگا؟ ...... پھر کیا ہوگا؟ ......[۲۲] یہ مجھے معلوم نہیں ...... آؤ، دیکھو، اس سینے میں کتنی زبردست آگ سلگ رہی ہے!"

اس نے[۲۳] میرا ہاتھ پکڑا اور اسے کوٹ کے اندر لے جا کر اپنے سینے پر رکھ دیا۔ اس کے ہاتھوں کی طرح اس کا سینہ بھی غیر معمولی طور پر گرم تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں کے ڈورے بہت ابھرے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا: "آپ علیل ہیں، کیا میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں؟"

"نہیں میرے عزیز، میں علیل نہیں ہوں۔" اس نے زور سے اپنے سر کو جنبش دی۔ "یہ انتقام ہے جو میرے اندر گرم سانس لے رہا ہے۔ میں اس دبی ہوئی آگ کو اپنے گیتوں کے دامن سے ہوا دیتا ہوں[۲۴] کہ یہ شعلوں میں تبدیل ہو جائے۔"

"یہ درست ہے مگر آپ کی طبیعت خراب[۲۵] ہے۔ آپ کے ہاتھ بہت گرم ہیں۔ اس سردی میں آپ کو زیادہ بخار ہو جانے کا اندیشہ ہے۔"

اس کے ہاتھوں کی غیر معمولی گرمی اور آنکھوں میں ابھرے ہوئے سرخ ڈورے، صاف طور پر ظاہر کر رہے تھے کہ اسے تیز بخار[۲۶] ہے۔

اس نے میرے کہنے کی کوئی پروانہ کی اور جیبوں میں ہاتھ ٹھونس کر میری طرف بڑے غور سے دیکھا[۲۷]

"یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ آگ جلے اور دھواں نہ دے ...... میرے عزیز ان آنکھوں نے ایسا سماں دیکھا ہے کہ انہیں ابل کر باہر نکل آنا چاہیے تھا۔ کیا کہہ رہے تھے، میں علیل ہوں[۲۸] ..... ہا، ہا، ہا ...... علالت! ...... کاش کہ سب لوگ میری طرح علیل ہوتے ... . جائیے، آپ ایسے نازک مزاج میری آہوں

کے خریدار نہیں ہو سکتے۔''

''مگر...''

''مگر وگر کچھ نہیں۔'' وہ دفعتاً جوش میں چلانے لگا: ''انسانیت کے بازار میں صرف تم لوگ باقی رہ گئے ہو جو کھوکھلے قہقہوں اور پھیکے تبسموں کے خریدار ہو۔ ایک زمانے سے تمہارے مظلوم بھائیوں اور بہنوں کی فلک شگاف چیخیں تمہارے کانوں سے ٹکرا رہی ہیں مگر تمہاری خوابیدہ سماعت میں ارتعاش پیدا نہیں ہوا، آؤ، اپنی روح کو میری آہوں سے آنچ دو۔ یہ انہیں حساس بنا دے گی۔''

میں اس کی گفتگو غور سے سن رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ چاہتا کیا ہے اور اس کے خیالات اس قدر پریشان و مضطرب کیوں ہیں۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ شاید وہ پاگل ہے۔ اس کی گفتگو بامعنی ضرور تھی مگر لہجے میں ایک عجیب قسم کی دیوانگی تھی۔ اس کی عمر یہی کوئی پچیس تیس برس کے قریب ہوگی۔ داڑھی کے بال جو ایک عرصے سے مونڈے نہ گئے تھے، کچھ اس انداز میں اس کے چہرے پر اُگے ہوئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کسی خشک روٹی پر بہت سی چیونٹیاں چمٹی ہوئی ہیں۔ گال اندر کو پچکے ہوئے، ماتھا باہر کی طرف ابھرا ہوا، ناک نوکیلی، آنکھیں بڑی بڑی جن سے وحشت ٹپکتی تھی، سر پر خشک اور خاک آلود بالوں کا ایک ہجوم۔ بڑے سے بھورے کوٹ میں وہ واقعی شاعر معلوم ہوتا تھا...... دیوانہ شاعر، جیسا کہ خود اس نے[29] اس نام سے اپنے آپ کو متعارف کرایا تھا۔

میں نے اکثر اوقات اخباروں میں ایک جماعت کا حال پڑھا تھا، اُس جماعت کے خیالات دیوانے شاعر کے خیالات سے بہت ملتے جلتے[30] تھے۔ میں نے خیال کیا کہ شاید وہ بھی اُسی جماعت کا رکن ہے۔

''آپ انقلابی معلوم ہوتے ہیں۔''

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ ''آپ نے بہت بڑا[31] انکشاف کیا ہے...... میاں، میں تو کوٹھوں کی چھتوں پر چڑھ چڑھ کر پکارتا ہوں: میں انقلابی ہوں...... میں انقلابی ہوں...... مجھے روک لے جس سے بن پڑتا ہے...... آپ نے واقعی بہت بڑا انکشاف کیا ہے۔''

وہ[32] اچانک سنجیدہ ہو گیا۔

''اسکول کے طالب علموں کی طرح، انقلاب کے حقیقی معانی سے تم بھی ناآشنا ہو۔ انقلابی وہ ہے جو ہر ناانصافی اور ہر غلطی پر چلا اٹھے۔ انقلابی وہ ہے جو سب زمینوں، سب آسمانوں، سب زبانوں اور سب وقتوں کا ایک مجسم گیت ہو۔ انقلابی، سماج کے قصاب خانے کی بیمار اور فاقوں مری بھیڑ نہیں، وہ مزدور ہے تومند جو

اپنے آہنی ہتھوڑے کی ایک ضرب ہی سے [ایک ہی ضرب سے؟] ارضی جنت کے دروازے وا کر سکتا ہے۔ میرے عزیز! یہ منطق، خوابوں اور نظریوں کا زمانہ نہیں۔ انقلاب ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ یہ تمہارے سامنے موجود ہے۔ اس کی لہریں بڑھ رہی ہیں۔ کون ہے جو اس کو روک سکتا ہے۔''[۳۳]

اس کا ہر لفظ ہتھوڑے کی اس ضرب کے مانند تھا جو سرخ لوہے پر پڑ کر اس کی شکل تبدیل کر رہا ہو۔ میں نے محسوس کیا کہ میری روح کسی غیر مرئی چیز کو سجدہ کر رہی ہے۔

شام کی تاریکی بتدریج بڑھ رہی تھی۔ نیم کے درخت کپکپا رہے تھے۔ میرے سینے میں ایک نئی دنیا آباد ہو رہی تھی۔[۳۴] اچانک میرے دل سے کچھ الفاظ اٹھے اور لبوں سے باہر نکل گئے:

''اگر انقلاب یہی ہے، تو میں بھی انقلابی ہوں!''

شاعر نے اپنا سر اٹھایا اور میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔[۳۵]

''تو پھر اپنے خون کو کسی طشتری میں نکال کر رکھ چھوڑو کہ ہمیں آزادی کے کھیت کے لیے اس سرخ کھاد کی بہت ضرورت ہے[۳۶] ...... آہ! وہ وقت کس قدر خوش گوار ہوگا جب میری آہوں کی زردی، تبسم کا رنگ اختیار کرلے گی۔''

یہ کہہ کر وہ کنوئیں کی منڈیر سے اٹھا اور میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگا:

''اس دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو حال سے مطمئن ہیں۔ اگر تمہیں اپنی روح کی بالیدگی منظور ہے تو ایسے لوگوں سے ہمیشہ دور رہنے کی سعی کرو۔ ان کا احساس پتھرا گیا ہے۔ مستقبل کے جاں بخش مناظر ان کی نگاہوں سے ہمیشہ اوجھل رہیں گے ...... اچھا، میں اب[۳۷] چلتا ہوں۔''

اس نے بڑے پیار سے میرا ہاتھ دبایا اور پیشتر اس کے کہ میں اس سے کوئی اور بات کرتا، وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا،[۳۸] جھاڑیوں کے جھنڈ میں غائب ہوگیا۔

باغ کی فضا پر خاموشی طاری تھی۔ میں سر جھکائے خدا معلوم کتنے عرصے[۳۹] اپنے خیالات میں غرق رہا کہ اچانک اس شاعر کی آواز رات کی رانی کی دل نواز خوشبو میں گھلی ہوئی میرے کانوں تک پہنچی۔ وہ باغ کے دوسرے گوشے میں گا رہا تھا:

زمین ستاروں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔

اٹھو، اور ان نگینوں کو اس کے ننگے سینے میں جڑ دو۔

ڈھاؤ، کھودو، چیرو، مارو!

نئی دنیا کے معمارو! کیا تمہارے بازوؤں میں قوت نہیں ہے؟
میں آہوں کا بیوپاری ہوں۔
لہو کی شاعری میرا کام ہے۔"[۳۴]

حواشی

(اِن حواشی میں ص سے مراد: آتش پارے کا صفحہ ہے۔
دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ بنیادی نسخے میں افسانے کے آغاز سے قبل درج ذیل سطور بہ طور سرنامہ شامل ہیں:
[اگر مقدس حق دنیا کی متجسس نگاہوں سے اوجھل کر دیا جائے: تو رحمت ہو اُس دیوانے پر جو انسانی دماغ پر سنہرا خواب طاری کر دے۔] (حکیم گورکی) ص:۱۰۳

۲۔ ایک قسم کی دیوانگی... اضافہ: گنا چوس رہے تھے (دھواں، ص:۲۰۵)
... جستجو میں ہی تھا ص:۱۰۴

۳۔ ایک رقت... انبار لگا ہوا تھا... ایک تصویر کھچ گئی... دور کرتے ہوئے صص.۱۰۴تا۱۰۵

۴۔ ایک پُراسرار خاموشی چھائی ہوئی... پتوں کی سرسراہٹ... لاشیں پڑی ہوئی ہیں... اردگرد بنا ہوا تھا ص:۱۰۵

۵۔ نگاہوں کے عین بالمقابل... آنکھیں معلوم ہو رہے تھے... کھویا ہوا... ٹھنسے ہوئے تھے... وہ یکا یک ٹھٹکا... اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ص:۱۰۶

۶۔ ہنڈل ہلاتے ہوئے اُس اجنبی سے کہا ایضاً

۷۔ واپس چلنے کو ہی تھا ایضاً

۸۔ کیوں دریافت کر رہے ہیں؟" یہ کہتے ہوئے اُس نے
... جائزہ لیتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ ص:۱۰۷

۹۔ یہ سخت خوف ناک ایضاً

۱۰۔ ہوتا ہے کہ میرے... انگلیوں سے کھجلاتے ہوئے کہا۔ یہ الفاظ... تپتی ہوئی ایضاً

۱۱۔ ضد فہ: میں نے کہا (دھواں، ص.۲۰۸)

۱۲۔ میرے یہ کہنے پر اُس مردِ عجیب ایضاً

۱۳۔ قدم ڈگمگا گئے۔ ایضاً

۱۴۔ اس حادثے کے وقت میری عمر... اپنی مادرِ وطن

... قربان کر دی تھیں ... ایک، ہیجان سا...
''مررہے ہیں'' کے بعد کا منسوخ فقرہ: اس اثر کے تحت میں چلا اُٹھا۔ — ص:۱۰۸تا۱۰۹

۱۵۔ یہ کہتے ہوئے مجھے ... شخص کے کوٹ کو — ص.۱۰۹

۱۶۔ ایک دیوانہ شاعر — ایضاً

۱۷۔ زیرِ لب گنگناتے ہوئے میں ... ''بیٹھ گیا'' کے بعد کا منسوخ جملہ: اس وقت میرے دماغ میں اس دیوانے شاعر کا گیت گونج رہا تھا... آہیں بکھیر رہی تھی... جمائے ہوئے تھا... سایہ سا معلوم ہو رہا تھا... کچھ دیر خموش...''کے بعد وہ'' کے بعد کا منسوخ فقرہ: اپنے خشک بالوں کو انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے — ایضاً

۱۸۔ ''کچھ بھی نہیں۔'' — ص.۱۱۰

۱۹۔ انداز میں سکیڑیں... زور زور سے ملتے ہوئے کہا
... رُخ بدلتے ہوئے ... اس کھڑکی کو دیکھا — ایضاً

۲۰۔ سوئی ہوئی — ایضاً

۲۱۔ ایک ڈنڈا — ایضاً

۲۲۔ خون کے چھینٹے نہیں دیکھ رہے ہو... فقرہ: پھر کیا ہوگا؟ اوّلین متن کے مقابلے، نظرثانی شدہ متن (دھواں، ص:۲۱۱) میں تین بار لکھا گیا۔ — ص۱۱۱

۲۳۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے — ایضاً

۲۴۔ سر کو ہلایا... دے رہا ہوں — ایضاً

۲۵۔ واقعتاً خراب — ص۱۱۲

۲۶۔ کافی بخار — ایضاً

۲۷۔ غور سے دیکھتے ہوئے کہا — ایضاً

۲۸۔ یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ لکڑی جلے... کہہ رہے تھے کہ میں گفتگو کو... — ایضاً

۲۹۔ میں حیران تھا کہ وہ چاہتا... بیشتر اوقات میں نے خیال کیا کہ شاید وہ پاگل... آنکھیں بڑی جن سے ... معلوم ہو رہا تھا— ایک دیوانہ شاعر، جیسا کہ اس نے خود — ص۱۱۳

۳۰۔ بہت حد تک ملتے جلتے — ایضاً

۳۱۔ اس پر وہ... یہ بہت بڑا — ص ۱۱۴

۳۲۔ یہ کہہ کر ہنستے ہوئے وہ — ایضاً

۳۳۔ ایک طالبِ علم کی طرح... ایک بیمار اور... وہ ایک مزدور ہے...
ضرب سے ہی... یہ یہاں پر موجود ہے... جو آپ اس کو...
''سکتا ہے'' کے بعد کا منسوخ جملہ: یہ بند باندھنے پر نہ رک سکیں گی! — ایضاً

۳۴۔ نیا جہاں آباد ہو رہا تھا — ص ۱۱۵
۳۵۔ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا — ایضاً
۳۶۔ ضرورت محسوس ہوگی — ایضاً
۳۷۔ سعی کرنا۔۔ اب میں — ایضاً
۳۸۔ لمبے قدم اُٹھاتا ہوا — ایضاً
۳۹۔ کتنا عرصہ — ایضاً
۴۰۔ ننگے سینے پر۔۔۔ ”میرا کام ہے“ کے بعد کے منسوخ جملے:
گیت ختم ہونے پر میں باغ میں کتنے عرصے تک بیٹھا رہا؛ یہ مجھے قطعاً یاد نہیں۔
والدہ کا بیان ہے کہ میں اُس روز گھر بہت دیر سے آیا تھا۔ — ص:۱۱۶

چوری

اسکول کے تین چار لڑکے الاؤ کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ گئے اور اُس بوڑھے آدمی سے جو ٹاٹ پر بیٹھا اپنے اُستخوانی ہاتھ تاپنے کی خاطر الاؤ کی طرف بڑھائے تھا، کہنے لگے: ''بابا جی کوئی کہانی سنائیے!''[1]

مردِ معمر نے جو غالباً کسی گہری سوچ میں غرق تھ، اپنا بھاری سر اٹھایا جو گردن کی لاغری کی وجہ سے نیچے کو جھکا ہوا تھا۔ ''کہانی! ...... میں خود ایک کہانی ہوں۔ مگر ...'' اِس کے بعد کے الفاظ اُس نے اپنے پوپلے منہ ہی میں بڑبڑائے ..... شاید وہ اس جملے کو لڑکوں کے سامنے ادا کرنا نہیں چاہتا تھا جن کی سمجھ اس قابل نہ تھی کہ وہ فلسفیانہ نکات حل کر سکے۔[2]

لکڑی کے ٹکڑے ایک شور کے ساتھ جل جل کر[3] آتشیں شکم کو پُر کر رہے تھے۔ شعلوں کی عنابی روشنی لڑکوں کے معصوم چہروں پر ایک عجیب انداز میں رقص کر رہی تھی۔ ننھی ننھی چنگاریاں سپید راکھ کی نقاب الٹ الٹ کر حیرت میں سربلند شعلوں کا منہ تک رہی تھیں۔[4]

بوڑھے آدمی نے الاؤ کی روشنی میں سے لڑکوں کی طرف نگاہیں اٹھا کر کہا: ''کہانی ...... ہر روز کہانی! ...... کل سناؤں گا''۔[5]

لڑکوں کے تمتماتے ہوئے چہروں پر افسردگی چھا گئی۔ ناامیدی کے عالم میں وہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ گویا وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہے تھے: ''آج رات کہانی سنے بغیر سونا ہوگا۔'' یکایک ان میں سے ایک لڑکا جو دوسروں کی بہ نسبت بہت ہوشیار اور ذہین معلوم ہوتا تھا، الاؤ کے قریب سرک کر[6] بلند آواز میں بولا: ''مگر کل آپ نے وعدہ کیا تھا۔ اور وعدہ خلافی کرنا درست نہیں ہے ...: . کیا آپ کو کل والے حامد کا انجام یاد نہیں ہے جو ہمیشہ اپنا کہا بھول جایا کرتا تھا۔''

''درست! ...... میں بھول گیا تھا۔'' بوڑھے آدمی نے یہ کہہ کر اپنا سر جھکا لیا جیسے وہ اپنی بھول پر نادم ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اُس دلیر لڑکے کی جرأت کا خیال کر کے مسکرایا۔ ''میرے بچے! مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے معاف کر دو۔'' ...... مگر میں کون سی کہانی سناؤں؟ ...... ٹھہرو۔ مجھے یاد کر لینے دو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ سر جھکا کر گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔

اُسے جن اور پریوں کی لایعنی داستانوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ بچوں کو ایسی کہانیاں سنایا کرتا تھا جو اُن کے دل و دماغ کی اصلاح کر سکیں۔ اسے بہت سے فضول قصے یاد تھے جو اُس نے بچپن میں سنے تھے یا کتابوں میں[۸] پڑھے تھے مگر اس وقت وہ اپنے بربطِ پیری کے بوسیدہ تار چھیڑ رہا تھا کہ شاید اُن میں کوئی خوابیدہ راگ جاگ اٹھے۔

لڑکے باباجی کو خاموش دیکھ کر آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ غالباً اس لڑکے کی بابت جسے کتاب چُرانے پر بید کی سزا ملی تھی۔ باتوں باتوں میں ان میں سے کسی نے بلند آواز میں کہا: ''ماسٹر جی کے لڑکے نے بھی تو میری کتاب چُرائی تھی مگر اسے سزا و[۹] نہ ملی''۔

''کتاب چُرائی تھی۔'' ان چار لفظوں نے جو بلند آواز میں ادا کیے گئے تھے، بوڑھے کی خفتہ یاد میں ایک واقعے کو جگا دیا۔ اس نے اپنا سپید سر اٹھایا اور اپنی آنکھوں کے سامنے بھولی بسری داستان کو انگڑائیاں لیتے پایا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی مگر وہیں غرق[۱۰] ہو گئی...... اضطراب کی حالت میں اس نے اپنے نحیف جسم کو جنبش دے کر الاؤ کے قریب کیا۔ اس کے چہرے کے تغیر و تبدل سے صاف طور پر عیاں تھا کہ وہ کسی واقعے کو دوبارہ یاد کر کے بہت تکلیف محسوس کر رہا ہے۔

الاؤ کی روشنی بدستور لڑکوں کے چہروں پر ناچ رہی تھی۔[۱۱] دفعتاً بوڑھے نے آخری ارادہ کرتے ہوئے کہا: ''بچو! آج میں اپنی کہانی سناؤں گا۔''

لڑکے فوراً اپنی باتیں چھوڑ کر[۱۲] ہمہ تن گوش ہو گئے۔ الاؤ کی چٹختی ہوئی لکڑیاں ایک شور کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر ابھر کر خاموش ہو گئیں...... ایک لمحے کے لیے فضا پر مکمل سکوت طاری رہا۔

''باباجی اپنی کہانی[۱۳] سنائیں گے؟'' ایک لڑکے نے خوش ہو کر کہا۔ باقی سرک کر آگ کے قریب خاموشی سے بیٹھ گئے۔

''ہاں، اپنی کہانی۔'' یہ کہہ کر بوڑھے آدمی نے اپنی جھکی ہوئی گھنی بھوؤں میں سے کوٹھری کے باہر تاریکی میں دیکھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکوں سے پھر[۱۴] مخاطب ہوا: ''میں آج تمھیں اپنی پہلی چوری کی داستان سناؤں گا۔''

لڑکے حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ انھیں اس بات کا وہم و گمان بھی[۱۵] نہ تھا کہ باباجی کسی زمانے میں چوری بھی کرتے رہے ہیں... باباجی جو ہر وقت انھیں بُرے کاموں سے بچنے کے لیے نصیحت کیا کرتے ہیں۔

لڑکا جو اُن سب میں دلیر تھا، اپنی حیرت نہ چھپا سکا۔ ''پر کیا آپ نے واقعی چوری کی؟''[16]

''واقعی!''

''آپ اس وقت کس جماعت[17] میں پڑھا کرتے تھے؟''

''نویں میں۔''

یہ سن کر لڑکے کی حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ اسے اپنے بھائی کا خیال آیا جو نویں جماعت میں تعلیم پا رہا تھا۔ وہ اس سے عمر میں دگنا بڑا تھا۔ اس کی تعلیم اس سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ انگریزی کی کئی کتابیں پڑھ چکا تھا اور اسے ہر وقت نصیحتیں کیا کرتا تھا۔ یہ کیونکر[18] ممکن تھا کہ اس عمر کا اور اچھا پڑھا لکھا لڑکا چوری کرے؟

...... اُس کی عقل اِس معمے کو حل نہ کر سکی۔ چنانچہ اُس نے پھر سوال کیا: ''آپ نے چوری کیوں کی؟''

اِس مشکل سوال نے بڈھے کو تھوڑی دیر کے لیے گھبرا دیا...... آخر وہ اس کا کیا جواب دے سکتا تھا کہ فلاں کام اُس نے کیوں کیا؟ بظاہر اس کا جواب یہی ہو سکتا تھا: اِس لیے کہ اُس وقت اُس کے دماغ میں[19] یہی خیال آیا۔

اُس نے دل میں یہی جواب سوچا مگر اس نے [سے؟] مطمئن نہ ہو کر یہ بہتر خیال کیا کہ تمام داستان من وعن بیان کر دے۔[20]

''اس کا جواب میری کہانی ہے۔ جو میں اب تمھیں[21] سنانے والا ہوں۔''

''سنائیے!''

لڑکے اس بوڑھے آدمی کی چوری کا حال سننے کے لیے اپنی اپنی جگہ پر جم کر بیٹھ گئے جو الاؤ کے سامنے اپنے سپید بالوں میں[22] انگلیوں سے کنگھی کر رہا تھا اور جسے وہ ایک بہت بڑا آدمی خیال کرتے تھے۔

بڈھا[23] کچھ عرصے تک اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔ پھر اس بھولے ہوئے واقعے کے تمام منتشر ٹکڑے فراہم کر کے بولا:

''ہر شخص خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور کرتا ہے جس پر وہ تمام عمر نادم رہتا ہے۔ میری زندگی میں سب سے بُرا فعل ایک کتاب کی چوری ہے......''

یہ کہہ کر وہ رک گیا۔ اس کی آنکھیں جو ہمیشہ چمکتی رہتی تھیں، دھندلی پڑ گئیں۔ اُس کے چہرے کی تبدیلی سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے زبردست ذہنی تکلیف کا سامنا کر رہا ہے۔ چند لمحات کے توقف کے بعد وہ پھر بولا:[24]

''سب سے مکروہ فعل کتاب کی چوری ہے۔ یہ میں نے ایک کتب فروش کی دکان سے چُرائی۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب میں نویں جماعت میں تعلیم پاتا تھا۔ قدرتی طور پر جیسا کہ اب تمہیں کہانی سننے کا شوق ہے، مجھے افسانے اور ناول پڑھنے کا شوق تھا...... دوستوں سے مانگ کر یا خود خرید کر میں ہر ہفتے ایک نہ ایک کتاب ضرور پڑھا کرتا تھا۔ وہ کتابیں عموماً عشق و محبت کی بے معنی داستانیں یا فضول جاسوسی قصے ہوا کرتے تھے۔ یہ کتابیں میں ہمیشہ چھپ چھپ کر پڑھا کرتا تھا۔ والدین کو اس بات کا علم نہ تھا۔ اگر انہیں معلوم ہوتا تو وہ مجھے ایسا ہرگز ہرگز نہ کرنے دیتے[۲۵] اس لیے کہ اس قسم کی کتابیں اسکول کے لڑکے کے لیے بہت نقصان دہ ہوتی ہیں۔ میں ان کے مہلک نقصان سے غافل تھا۔ چنانچہ مجھے اس کا نتیجہ بھگتنا پڑا۔ میں نے چوری کی اور پکڑا گیا......''

ایک لڑکے نے حیرت زدہ ہو کر کہا: ''آپ پکڑے گئے؟''[۲۶]

''ہاں پکڑا گیا...... چونکہ میرے والدین اس واقعے سے بالکل بے خبر تھے۔ یہ عادت پکتے پکتے میری طبیعت بن گئی۔ گھر سے جتنے پیسے ملتے، میں انہیں جوڑ جوڑ کر بازار سے افسانوں کی کتابیں خریدنے میں صرف کر دیتا۔ اسکول کی پڑھائی سے رفتہ رفتہ مجھے نفرت ہونے لگی۔ ہر وقت میرے دل میں یہی خیال سمایا رہتا کہ فلاں کتاب جو فلاں ناول نویس نے لکھی ہے، ضرور پڑھنی چاہیے یا فلاں کتب فروش کے پاس نئی ناولوں کا جو ذخیرہ موجود ہے، ایک نظر ضرور دیکھنا چاہیے۔ شوق کی یہ انتہا، دوسرے معنوں میں دیوانگی ہے۔ اس حالت میں انسان کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کرنے والا ہے یا کیا کر رہا ہے۔ اس وقت وہ بے عقل بچے کی مانند ہوتا ہے جو اپنی طبیعت خوش کرنے یا شوق پورا کرنے کے لیے جلتی ہوئی آگ میں بھی ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ اسے یہ پتہ نہیں ہوتا کہ چمکنے والی شے[۲۷] جسے وہ پکڑ رہا ہے اس کا ہاتھ جلا دے گی۔ ٹھیک یہی حالت میری تھی۔ فرق اتنا ہے کہ بچہ شعور سے محروم ہوتا ہے اس لیے وہ بغیر سمجھے بُوجھے بری سے بری حرکت کر بیٹھتا ہے مگر میں نے عقل کا مالک ہوتے ہوئے چوری ایسے مکروہ جرم کا ارتکاب کیا...... یہ آنکھوں کی موجودگی میں میرے اندھے ہونے کی دلیل ہے۔ میں ہرگز ایسا کام نہ کرتا..... اگر میری عادت مجھے مجبور نہ کرتی۔

ہر انسان کے دماغ میں شیطان موجود ہوتا ہے جو وقتاً فوقتاً اسے برے کاموں پر مجبور کرتا ہے۔ یہ شیطان مجھ پر اُس وقت غالب آیا جبکہ سوچنے کے لیے میرے پاس بہت کم[۲۸] وقت تھا...... خیر۔''

لڑکے خاموشی سے بوڑھے کے ہلتے ہوئے لبوں کی طرف نگاہیں گاڑے، اس کی داستان سن رہے تھے۔ داستان کا تسلسل اس وقت ٹوٹتا دیکھ کر[۲۹] جبکہ اصل مقصد بیان کیا جانے والا تھا، وہ بڑی بے قراری

سے بقایا تفصیل کا انتظار کرنے لگے۔

''مسعود بیٹا! یہ سامنے والا دروازہ تو بند کر دینا...... سرد ہوا آ رہی ہے۔'' بوڑھے نے اپنا کمبل گھٹنوں پر ڈال لیا۔[۳۰]

مسعود ''اچھا باباجی'' کہہ کر اٹھا اور کوٹھری کا دروازہ بند کرنے کے بعد اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

''ہاں تو ایک دن جبکہ والد گھر سے باہر تھے۔'' بوڑھے نے اپنی داستان کا بقایا حصہ شروع کیا۔''مجھے بھی کوئی خاص کام نہ تھا اور وہ کتاب جو میں ان دنوں پڑھ رہا تھا، ختم ہونے کے قریب تھی۔ اس لیے میرے جی میں آئی کہ چلو اُس کتب فروش تک[۳۱] ہو آئیں جس کے پاس بہت سی جاسوسی ناولیں پڑی تھیں۔

میری جیب میں اس وقت اتنے پیسے موجود تھے جو ایک معمولی ناول کے دام ادا کرنے کے لیے کافی ہوں۔ چنانچہ میں گھر سے سیدھا اس کتب فروش کی دکان پر گیا...... یوں تو اس دکان پر ہر وقت بہت سی اچھی اچھی ناولیں موجود رہتی تھیں مگر اس دن خاص طور پر بالکل نئی کتابوں کا ایک ڈھیر باہر تختے پر رکھا تھا۔ ان کتابوں کے رنگ برنگ سرورق دیکھ کر میری طبیعت میں ایک ہیجان سا برپا ہوگیا۔ دل میں اس خواہش نے گدگدی لی کہ وہ تمام میری ہو جائیں۔[۳۲]

میں دُکان دار سے اجازت لے کر اُن کتابوں کو ایک نظر دیکھنے میں مشغول ہوگیا۔ ہر کتاب کے شوخ رنگ سرورق پر اس قسم کی کوئی نہ کوئی عبارت لکھی ہوئی تھی:

''ناممکن ہے کہ اس کا مطالعہ آپ پر سنسنی طاری نہ کردے۔''

''مصورِ اسرار کا لاثانی شاہ کار۔''

''تمثیل! ہیجان!! رومان!!!...... سب یک جا۔''

اس قسم کی عبارتیں شوق بڑھانے کے لیے کافی تھیں۔ مگر میں نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اس لیے کہ میری نظروں سے اکثر ایسے الفاظ گزر چکے تھے۔ میں تھوڑا عرصہ کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اس وقت میرے دل میں چوری کرنے کا خیال مطلقاً نہ تھا بلکہ میں نے خریدنے کے لیے ایک کم قیمت کی ناول چن کر الگ بھی رکھ لی تھی۔[۳۳]

تھوڑی دیر کے بعد دل میں یہ ارادہ کر کے کہ میں دوسرے ہفتے ان ناولوں کو دوبارہ دیکھنے آؤں گا...... میں نے اپنی چنی ہوئی کتاب اٹھائی... کتاب کا اٹھانا تھا کہ میری نگاہیں ایک مجلد ناول پر گڑ گئیں۔ سرورق کے کونے پر میرے محبوب ناولسٹ کا نام سرخ لفظوں میں چھپا تھا۔[۳۴] اس کے ذرا اوپر کتاب کا نام تھا:

''منتقم شعاعیں..... کس طرح ایک دیوانے ڈاکٹر نے لندن کو تباہ کرنے کا ارادہ کیا۔''

یہ سطور پڑھتے ہی میرے اشتیاق میں طغیانی سی آ گئی...... کتاب کا مصنف وہی تھا[۳۵] جس نے اس سے پیشتر مجھ پر راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ ناول کو دیکھتے ہی میرے دماغ میں خیالات کا ایک گروہ داخل ہو گیا:

''منتقم شعاعیں ..... دیوانے ڈاکٹر کی ایجاد...... کیسا دلچسپ افسانہ ہوگا!''

''لندن تباہ کرنے کا ارادہ...... یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟''

''اِس مصنف نے فلاں فلاں کتابیں کتنی سنسنی خیز لکھی ہیں!''

''یہ کتاب ضرور اُن سب سے بہتر ہوگی!''

میں خاموش اشتیاق کے ساتھ اُس کتاب[۳۶] کی طرف دیکھ رہا تھا اور یہ خیالات یکے بعد دیگرے میرے کانوں میں شور برپا کر رہے تھے۔ میں نے اس کتاب کو اٹھایا اور کھول کر دیکھا تو پہلے ورق پر یہ عبارت نظر آئی: ''مصنف اس کتاب کو اپنی بہترین تصنیف قرار دیتا ہے۔''

ان الفاظ نے میرے اشتیاق میں آگ پر ایندھن کا کام دیا [کام کیا؟]۔ ایکا ایکی میرے دماغ کے، خدا معلوم کس گوشے سے ایک خیال کود پڑا .... وہ یہ کہ میں اس کتاب کو اپنے کوٹ میں چھپا کر لے جاؤں۔ میری آنکھیں بے اختیار کتب فروش کی طرف مڑیں جو کاغذ پر[۳۷] کچھ لکھنے میں مشغول تھا۔ دُکان کی دوسری طرف دو نوجوان کھڑے میری طرح کتابیں دیکھ رہے تھے...... میں سر سے پیر تک لرز گیا۔''

یہ کہتے ہوئے بوڑھے کا نحیف جسم اس واقعے کی یاد سے کانپا ..... تھوڑی دیر تک خاموش رہ کر اس نے پھر اپنی داستان شروع کر دی: ''ایک لحظے کے لیے میرے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ چوری کرنا بہت برا کام ہے۔ مگر ضمیر کی آواز سرورق پر بنی ہوئی لانبی لانبی شعاعوں میں غرق ہو گئی۔ میرا دماغ ''منتقم شعاعیں''، ''منتقم شعاعیں'' کی گردان کر رہا تھا۔ میں نے ادھر اُدھر جھانکا اور جھٹ سے وہ کتاب کوٹ کے اندر بغل میں دبالی[۳۸] مگر میں کانپنے لگا۔

اس حالت پر قابو پا کر میں کتب فروش کے قریب گیا اور اُس کتاب کے دام ادا کر دیے جو میں نے پہلے خریدی تھی [؟ منتخب کی تھی]۔ قیمت لیتے وقت اور روپے میں سے باقی پیسے واپس کرنے میں اُس نے غیر معمولی تاخیر سے کام لیا۔ میری طرف اس نے گھور کر بھی دیکھا جس سے میری طبیعت سخت پریشان ہو گئی۔ جی میں بھی آئی [جی میں آئی بھی؟] کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر[۳۹] وہاں سے بھاگ نکلوں۔

میں نے اس دوران میں[۴۰] کئی بار اس جگہ پر جو کتاب کی وجہ سے ابھری ہوئی تھی، نگاہ ڈالی......
اور شاید اسے چھپانے کی بے سود کوشش بھی کی۔ میری ان عجیب وغریب حرکتوں کو دیکھ کر اسے شک ضرور ہوا۔ اس لیے کہ وہ بار بار کچھ کہنے کی کوشش کر کے پھر خاموش ہو جاتا تھا۔

میں نے باقی پیسے جلدی سے لیے اور وہاں سے چل دیا۔ دوسو قدم کے فاصلے پر میں نے کسی کی آواز سنی۔ مڑ کر دیکھا تو کتب فروش ننگے پاؤں [دوڑا؟] چلا آ رہا تھا اور مجھے ٹھہرنے کے لیے کہہ رہا تھا......[۴۱] میں نے اندھادھند بھاگنا شروع کر دیا۔

مجھے معلوم نہ تھا میں کدھر بھاگ رہا ہوں۔ میرا رخ اپنے گھر کی جانب نہ تھا۔ میں[۴۲] شروع ہی سے اُس طرف بھاگ رہا تھا جدھر بازار کا اختتام تھا۔ اس غلطی کا مجھے اس وقت احساس ہوا جب دو تین آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا۔"

بوڑھا اتنا کہہ کر اضطراب کی حالت میں اپنی خشک زبان لبوں پر پھیرنے لگا۔ کچھ توقف کے بعد وہ ایک لڑکے سے مخاطب ہوا:

"مسعود! پانی کا ایک گھونٹ[۴۳] پلوانا۔"

مسعود خاموشی سے اٹھا اور کوٹھری کے ایک کونے میں پڑے ہوئے گھڑے سے گلاس میں پانی انڈیل کر لے آیا۔ بوڑھے نے گلاس لیتے ہی منہ سے لگا لیا اور ایک گھونٹ میں [؟ ایک سانس میں] سارا پانی پی گیا[۴۴] اور خالی گلاس زمین پر رکھتے ہوئے کہا:

"ہاں میں کیا بیان کر رہا تھا؟"

ایک لڑکے نے جواب دیا: "آپ بھاگے جا رہے تھے۔"

"میرے پیچھے کتب فروش 'چور چور' کی آواز بلند کرتا چلا آ رہا تھا۔ جب میں نے دو تین آدمیوں کو اپنا تعاقب کرتے دیکھا تو میرے ہوش ٹھکانے نہ رہے۔ جیل کی آہنی سلاخیں، پولیس اور عدالت کی تصویریں ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے آ گئیں۔ بے عزتی کے خیال سے میری پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ میں لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ اٹھنا چاہا تو ٹانگوں نے جواب دے دیا۔ اُس وقت میرے دماغ کی عجیب حالت تھی۔ ایک تند دھواں سا میرے سینے میں کروٹیں لے رہا تھا، آنکھیں فرطِ خوف سے ابل رہی تھیں اور کانوں میں ایک زبردست شور برپا تھا جیسے بہت سے لوگ آہنی چادریں ہتھوڑوں سے کوٹ رہے ہیں۔ میں ابھی اٹھ کر بھاگنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ کتب فروش اور اس کے ساتھیوں نے مجھے پکڑ لیا۔ اس وقت میری کیا حالت

تھی۔ اس کا بیان کرنا بہت دشوار ہے ...... سیکڑوں خیالات پتھروں کی طرح میرے دماغ سے ٹکرا ٹکرا کر مختلف آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ جب انہوں نے مجھے پکڑا تو ایسا معلوم ہوا کہ آہنی پنجے نے میرے دل کو مسل ڈالا ہے ...... میں بالکل خاموش تھا۔ وہ مجھے دکان کی طرف کشاں کشاں لے گئے۔[۴۵]

جیل خانے کی کوٹھری اور عدالت کا منہ دیکھنا یقینی تھا۔ اس خیال پر میرے ضمیر نے لعنت ملامت شروع کر دی۔ چونکہ اب جو ہونا تھا ہو چکا تھا اور میرے پاس اپنے ضمیر کو[۴۶] جواب دینے کے لیے کوئی الفاظ [کذا] موجود نہ تھے۔ اس لیے میری گرم آنکھوں میں آنسو اتر آئے اور میں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا۔"

یہ کہتے ہوئے بوڑھے کی دھندلی آنکھیں غم ناک [؟نم ناک] ہوگئیں۔

"کتب فروش نے مجھے پولیس کے حوالے نہ کیا۔ اپنی کتاب لے لی اور نصیحت کرنے کے بعد چھوڑ دیا۔" بوڑھے نے اپنے آنسو کھردرے کمبل سے خشک کیے ...... "خدا اُس کو جزائے خیر دے۔ میں عدالت کے دروازے سے تو بچ گیا مگر اس واقعے کی والد اور اسکول کے لڑکوں کو خبر ہوگئی۔ والد مجھ پر سخت خفا ہوئے لیکن اُنھوں نے بھی آخیر [؟آخر] میں مجھے معاف کر دیا۔[۴۷]

دو تین روز مجھے اس ندامت کے باعث[۴۸] بخار آتا رہا۔ اس کے بعد جب میں نے دیکھا میرا دل کسی کروٹ آرام نہیں لیتا اور مجھ میں اتنی قوت نہیں کہ میں لوگوں کے سامنے اپنی نگاہیں اٹھا سکوں تو میں شہر چھوڑ کر وہاں سے ہمیشہ کے لیے روپوش ہوگیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک میں نے مختلف شہروں کی خاک چھانی ہے۔ ہزاروں مصائب برداشت کیے ہیں۔ صرف اس کتاب کی چوری کی وجہ سے جو مجھے تادمِ مرگ نادم وشرمسار رکھے گی۔

اس آوارہ گردی کے دوران میں، میں نے اور بھی بہت سی چوریاں کیں، ڈاکے ڈالے اور ہمیشہ پکڑا گیا مگر ان پر نادم نہیں ہوں ...... مجھے فخر ہے۔"

[۴۹]بوڑھے کی دھندلی آنکھوں میں پھر پہلی سی چمک نمودار ہوگئی اور اس نے الاؤ کے شعلوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ "ہاں مجھے فخر ہے۔" یہ الفاظ اُس نے تھوڑے توقف کے بعد دوبارہ کہے۔

الاؤ میں آگ کا ایک شعلہ بلند ہوا۔۔ اور ایک لمحے فضا میں تھرتھرا کر وہیں سو گیا۔ بوڑھے نے شعلے کی جرأت دیکھی اور مسکرا دیا۔ پھر لڑکوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: "کہانی ختم ہوگئی ہے اب تم جاؤ۔ تمہارے ماں باپ[۵۰] انتظار کرتے ہوں گے۔"

مسعود نے سوال کیا: ''مگر آپ کو اپنی دوسری چوریوں پر کیوں فخر ہے؟''[۵۱]

''فخر کیوں ہے؟'' ...... بوڑھا مسکرا دیا۔ ''اس لیے کہ وہ چوریاں نہیں تھیں ..... اپنی مسروقہ چیزوں کو دوبارہ حاصل کرنا چوری نہیں ہوتی[۵۲] میرے عزیز! بڑے ہو کر تمھیں اچھی طرح معلوم ہو جائے گا۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''ہر وہ چیز جو تم سے چُرا لی گئی ہے، تمھیں حق حاصل ہے کہ اسے ہر ممکن طریقے سے اپنے قبضے میں لے آؤ۔ پر یاد رہے! تمھاری کوشش[۵۳] کامیاب ہونی چاہیے۔ ورنہ ایسا کرتے ہوئے پکڑے جانا اور اذیتیں اٹھانا عبث ہے۔''

لڑکے اٹھے اور بابا جی کو شب بخیر کہتے ہوئے کوٹھری کے دروازے سے باہر چلے گئے۔ بوڑھے کی نگاہیں ان کو تاریکی میں گم ہوتے دیکھتی رہیں[۵۴] تھوڑی دیر اسی طرح دیکھنے کے بعد وہ اٹھا اور کوٹھری کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولا:

''کاش کہ یہ بڑے ہو کر اپنی[۵۵] کھوئی ہوئی چیزیں واپس لے سکیں!'' بوڑھے کو خدا معلوم ان لڑکوں سے کیا امید تھی؟[۵۶]

حواشی

(ان حواشی میں ص سے مراد: آتش پارے کا صفحہ ہے۔
دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ اوّلین متن میں افسانے کی ابتدائی سطروں کی ترتیب یوں ہے:
''بابا جی، کوئی کہانی سنایئے۔''
سکول کے تین چار... تا... بڑھائے ہوئے تھا۔ ص: ۱۱۷
علاوہ ازیں، مندرجۂ بالا آخری فقرے کا لفظ ''ہوئے'' نظرثانی شدہ متن میں شامل نہیں ہے۔ (دھواں، ص: ۱۸۲)

۲۔ پوپلے منہ میں ہی... کہ وہ اس قسم کے فلسفیانہ نکات حل کر سکیں۔ ایضاً

۳۔ جل جل کر الاؤ کے ص: ۱۱۸

۴۔ بعد کے، درج ذیل، جملے منٹو نے حذف کر دیے:
درختوں کے خشک پتے بڑی دلیری سے آگ کا مقابلہ کرتے ہوئے اس شعلہ

افشاں قبر میں ہمیشہ کے لیے کودرہے تھے۔ سرد ہوا کے جھونکے کوٹھری کی گرم فضا کا
استقبال کرتے ہوئے اس کے ساتھ بڑی گرم جوشی سے بغل گیر ہو رہے تھے
۔۔ کونے میں مٹی کا ایک دیا اپنی کمزور روشنی پر آنسو بہا رہا تھا۔ ص:۱۱۸

۵۔ اوّلین متن میں، اِن جملوں کی ترتیب یہ ہے:
''کہانی ــــ ہر روز کہانی! کل سناؤں گا'' بوڑھے آدمی نے
الاؤ کی روشنی میں سے لڑکوں کی طرف نگاہیں اُٹھا کر کہا۔ ایضاً

۶۔ دوسروں کی نسبت... قریب تر سرک کر ایضاً

۷۔ یہ کہتے ہوئے اپنا سر... تھوڑی دیر بعد... غلطی ہوگئی ہے، معاف کردو۔ ص:۱۱۹

۸۔ وہی کہانیاں... اس نے اپنے ایامِ طفلی میں... یا کتابوں سے ایضاً

۹۔ آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے تھے۔ غالباً وہ کسی لڑکے کا ذکر کر رہے تھے
جسے... سزا وزانہ ملی تھی صص ۱۱۹ تا ۱۲۰

۱۰۔ سامنے اس فراموش کردہ داستان کو انگڑائیاں لیتے ہوئے... مگر ساتھ ہی وہیں غرق ص:۱۲۰

۱۱۔ ''ناچ رہی تھی'' کے بعد کی حذف شدہ سطریں:
دیا اسی طرح اپنے جلے نصیبوں کو رو رہا تھا۔ کوٹھری کے باہر رات سیاہ زُلفیں
بکھیرے روشنی کی طرف اپنی تاریک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ لڑکے
آپس میں سکول کی باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ چھت جھک کر ان کی معصوم
باتوں کو کان لگا کر سن رہی تھی۔ ایضاً

۱۲۔ ... اپنی گفتگو چھوڑ کر صص۔۱۲۰ تا ۱۲۱

۱۳۔ اضافہ: بابا جی دھواں، ص:۱۸۳

۱۴۔ دیکھنا شروع کر دیا... وہ پھر لڑکوں سے ص:۱۲۱

۱۵۔ اُنھیں دراصل یہ وہم وگمان بھی ایضاً

۱۶۔ مگر کیا آپ نے واقعی چوری کا ارتکاب کیا تھا؟ ایضاً

۱۷۔ کون سی جماعت ایضاً

۱۸۔ کتابیں پڑھا ہوا تھا... پھر یہ کیونکر ص ۱۲۲

۱۹۔ یہ مشکل سوال دیکھ کر بوڑھا تھوڑی دیر کے لیے بہت گھبرایا... اس وقت دماغ میں ایضاً

۲۰۔ بوڑھے نے دل میں... یہی بہتر... بیان کر دی جائے... ''جائے'' کے بعد کا
منسوخ جملہ: اس لیے کہ وہ بذاتِ خود اس سوال کا سب سے آسان جواب ہے۔ ص۔۱۲۲

۲۱۔ جو تمھیں ایضاً

۲۲۔ بالوں کو ص۔۱۲۳

۲۳۔ مردِ معمر ایضاً

۲۴۔ یہاں تک پہنچ کر وہ رک... ہمیشہ ایک ناقابل بیان انداز میں چمکتی... وہ پھر گویا ہوا — ص:۱۲۳
۲۵۔ جو میں نے... تعلیم پارہا تھا... افسانے یا ناول... ''شوق تھا'' کے بعد کا منسوخ فقرہ: نہیں خبط تھا... ضرور مطالعہ کیا کرتا تھا... میرے والدین کو میری اس حرکت کی کوئی خبر نہ تھی... مجھے ہرگز ہرگز ایسا نہ کرنے دیتے — صص:۱۲۳تا۱۲۴
۲۶۔ ''آپ پکڑے گئے؟'' ایک لڑکے نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ — ص:۱۲۴
۲۷۔ ''طبیعت بن گئی'' کے بعد کا محذوف جملہ: اب مجھے ہر روز ایک کتاب یعنی ناول کی ضرورت لاحق ہونے لگی... پس ہر وقت... ناولوں کا ایک ذخیرہ موجود ہے۔ وہ ایک نظر... ایک بے عقل بچے... آگ میں بھی... وہ چمکنے والی شے — صص:۱۲۴تا۱۲۵
۲۸۔ اسے بُرے سے بُرے کام کرنے پر... جب کہ مجھے سوچنے کے لیے بہت کم — ص:۱۲۵
۲۹۔ داستان کو سن... ٹوٹتے دیکھ کر — ص:۱۲۶
۳۰۔ گھٹنوں پر ڈالتے ہوئے کہا۔ — ایضاً
۳۱۔ داستان سنانا شروع کر دی... قریب الاختتام تھی... چلو فلاں کتب فروش تک — ایضاً
۳۲۔ کچھ پیسے... کافی تھے... بہت اچھی اچھی... رکھا ہوا تھا... رنگ برنگی سرورق... دل میں یہ خواہش گدگدانے لگی کہ وہ تمام میری ملکیت بن جائیں۔ — صص:۱۲۶تا۱۲۷
۳۳۔ ''الفاظ گزر چکے تھے'' کے بعد کا محذوف جملہ: گو اس کے ساتھ ہی مجھے یہ خواہش ضرور تھی کہ میں ان کتابوں کا مالک بن جاؤں — خیر... ناول چن کر علیحدہ کر رکھی تھی — ص:۱۲۷
۳۴۔ اپنی انتخاب کردہ کتاب اُٹھائی... کے ایک کونے پر... چھپا ہوا تھا۔ — ص:۱۲۸
۳۵۔ ایک قسم کی طغیانی آ گئی۔ کتاب کا وہی مصنف، — ایضاً
۳۶۔ میں خاموش اس کتاب — ایضاً
۳۷۔ اشتیاق کی آگ میں ایندھن... دفعتاً میرے دماغ... جو ایک کاغذ پر — ص ۱۲۹
۳۸۔ ضمیر کی یہ آواز... ''دبالی'' کے بعد کا محذوف جملہ:
یہ کرتے ہوئے میرے دونوں ہاتھ اور ٹانگیں بڑے زور سے کانپ رہے تھے — ایضاً
محذوف جملے کا متبادل فقرہ: مگر میں کانپنے لگا (دھواں، ص:۱۹۰)
۳۹۔ دام ادا کر دیے جو میں نے پہلے منتخب کی تھی... تاخیر لگا دی... ''لگادی'' کے بعد کا محذوف جملہ: اس کے علاوہ وہ میری طرف اُس وقت عجیب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا...
محذوف جملے کا متبادل فقرہ: میری طرف اس نے گھور کر بھی دیکھا (دھواں، ص:۱۹۰)
... پریشان ہو رہی تھی۔ جی یہی چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ کر — ص:۱۳۰
۴۰۔ اس دوران میں میں نے — ایضاً
۴۱۔ جلدی سے پکڑے... ''رہا تھا'' کے بعد کا منسوخ فقرہ: یہ دیکھتے ہی — ایضاً
۴۲۔ کہ میں کدھر... اس کے علاوہ میں اپنے گھر کی جانب رُخ کیے ہوئے نہ تھا بلکہ — ایضاً

۴۳۔ گھونٹ تو — ص:۱۳۱
۴۴۔ گلاس کو پکڑتے ہی... ایک ہی گھونٹ... پی لیا — ایضاً
۴۵۔ کرتا ہوا بھاگا... اپنے قریب پہنچتے ہوئے دیکھا... سامنے رقص کرنے لگیں...
بے عزتی کا خیال آتے ہی... چادروں کو... اس کے ہمراہ دو تین آدمیوں نے
مجھے پکڑ... دماغ کے ساتھ... قسم کی آوازیں... دل کو پکڑ کر... کشاں کشاں
لے جا رہے تھے۔ — ص ص:۱۳۱تا۱۳۲
۴۶۔ یا عدالت کا دروازہ... یہ خیال کرتے ہوئے میری ضمیر نے مجھ پر لعنت و ملامت
کرتا... اپنی ضمیر کو — ص:۱۳۲
۴۷۔ اور تھوڑی دیر نصیحت... اضافہ: کھردرے (دھواں، ص:۱۹۲)...
خشک کرتے ہوئے کہا... "خفا ہوئے" کے بعد کا محذوف جملہ:
اور ہر ممکن طریقے سے مجھے اس مکروہ فعل پر شرم دلانے کے بعد — ص ص:۱۳۲تا۱۳۳
۴۸۔ ندامت میں — ص:۱۳۳
۴۹۔ "بوڑھے" سے قبل کا منسوخ فقرہ: یہ کہتے ہوئے — ایضاً
۵۰۔ منسوخ جملے: آگ کا ایک شعلہ نہ معلوم کیوں بلند ہوا۔ اور ایک لحہ فضا میں
تھرتھرا کر پھر الاؤ کی آغوش میں سو گیا... تمہارے والدین — ص.۱۳۴
۵۱۔ "مگر آپ کو اپنی دوسری چوریوں پر فخر کیوں ہے؟"۔ مسعود نے سوال کیا۔ — ایضاً
۵۲۔ آہ! فخر کیوں ہے؟... سرقہ شدہ... چوری نہیں میرے عزیز! — ایضاً
۵۳۔ چرائی گئی ہو... تمہاری یہ کوشش — ایضاً
۵۴۔ دیکھ رہی تھیں — ص.۱۳۵
۵۵۔ آہ! اگر بڑے ہو کر وہ صرف — ایضاً
۵۶۔ بنیادی نسخے میں، افسانے کے اختتام پر یہ وضاحت درج ہے: اشاعت اوّلیں ساقی — ایضاً

منٹو کے افسانے

توضیحات

پورا منٹو کے لیے مجموعہ منٹو کے افسانے کی تدوین، درج ذیل مطبوعات کے پیش نظر کی گئی۔

۱۔ منٹو کے افسانے، اشاعتِ اوّل (مکتبہ اردو، لاہور، زمانۂ اشاعت: بعد از اگست ۱۹۴۰ء ازروئے ''دیباچہ'')۔

۲۔ منٹو کے افسانے، موسومہ: بانجھ (ساقی بک ڈپو [جدید]، دہلی ۲۰۰۴ء، اشاعتِ دوم/سوم کا عکس)۔

۳۔ منٹو کے افسانے (مکتبہ اردو، لاہور، سالِ اشاعت ندارد، چوتھی بار)۔

۴۔ منٹو کے افسانے، مشمولہ: منٹو راما، متعلقہ صفحات: ۶۹۷ تا ۹۵۴۔

۵۔ لذتِ سنگ، سعادت حسن منٹو (نیا ادارہ، لاہور، سالِ اشاعت: غالباً بعد از اگست ۱۹۵۰ء، طبع دوم)۔

۶۔ افسانے اور ڈرامے، سعادت حسن منٹو (مکتبہ شعر و ادب، لاہور، سالِ اشاعت ندارد، مطابق اشاعتِ اوّل: بعد از نومبر ۱۹۴۳ء، ازروئے ''پیش لفظ'')۔

۷۔ رسالہ شعور، شمارہ: ۴، مرتّب: بلراج مین را، شرد دت۔

۸۔ دستاویز، مرتّب: بلراج مین را۔

منٹو کے افسانے (اشاعتِ اوّل):

منٹو کے افسانے کی اشاعتِ اوّل تقریباً نایاب ہو چکی ہے۔ راقم الحروف کو اس کا ایک نسخہ ہردیال میونسپل پبلک لائبریری، دہلی (قدیم نام: ہارڈنگ میونسپل پبلک لائبریری) میں دستیاب ہوا۔

لائبریری کے مخصوص گہرے سبز بائنڈنگ کلاتھ کی جلد میں اس کے صفحات انتہائی زرد اور خستہ ہو چکے ہیں۔ کنارے چیخ کر گرتے سے کتاب تقریباً گولائی میں آ گئی ہے۔

سرورق اور طباعتی تفصیل پر مبنی ابتدائی دو صفحے ضائع ہو چکے ہیں۔ صفحہ ۳ پر عنوان ''مندرجات'' اور صفحہ ۷ پر عنوان ''دیباچہ'' کے اوپر خالی جگہ میں، لائبریری کی تین سطری مہر ثبت ہے۔ پہلی سطر میں لائبریری کا نام و مقام: ہارڈنگ میونسپل پبلک لائبریری۔ دہلی۶، دوسری سطر میں: نمبر اضافہ 3290 اور تاریخ 1942 درج ہے۔ تیسری سطر ''باب'' اور ''نمبر کتاب'' کے لیے ہے، تیسری سطر کے یہ اندراج دونوں مہروں میں الگ

الگ ڈھنگ سے کیے گئے ہیں اُن کا ماحصل یہ ہے کہ کتاب، باب: قصصِ اردو میں نمبر 1104 کی حامل ہے اور قصصِ اردو کے باب کا نمبر 17 ہے۔ لائبریری کے کیٹلاگ میں کتاب کے نام و نمبر شمار کے ساتھ ''ناشر، مکتبہ اردو، لاہور'' درج ہے۔

عنوان ''مندرجات'' سے قبل مہر کے اوپر، دو زیریں خطوط سمیت: Not to go out اور اس کے نیچے نہایت جلی قلم سے منٹو کے افسانے یعنی کتاب کا نام، لکھا گیا ہے۔ یہ دونوں اندراج، ظاہر ہے کہ انتظامیہ کی جانب سے ہیں۔

صفحہ ۳ پر جلی عنوان ''مندرجات'' کے نیچے مقابلتاً باریک قلم سے ''انتساب ۵'' شائع ہوا ہے۔ اس کے بعد سہ کالمہ فہرست ہے جس میں نمبر شمار، تحریر کا عنوان اور صفحہ نمبر لکھے گئے ہیں۔ صفحہ ۳ پر بارہ اور صفحہ ۴ پر پندرہ تحریروں کا شمار، عنوان اور صفحہ نمبر درج ہیں۔ شمار ایک پر ''دیباچہ'' اور ۲ تا ۲۷ پر کل ۲۶ افسانوں کے عنوان ہیں۔

صفحے کا طول و عرض ۱۸ × ۱۵ سینٹی میٹر، مسطر ۲۲ سطری اور سطر کی طوالت ۱۳ سینٹی میٹر ہے۔ کل صفحات: ۲۷۴۔ آخری صفحہ سادہ۔ طاق صفحات کی پہلی سطر میں دائیں سرے پر افسانے کا عنوان اور بائیں سرے پر صفحہ نمبر؛ جفت صفحات کی پہلی سطر میں دائیں سرے پر مجموعے کا نام اور بائیں سرے پر صفحہ نمبر لکھا گیا ہے۔ چوتھے افسانے کے علاوہ، تمام مشمولات کا آغاز طاق صفحے سے ہوا ہے۔

ہردیال لائبریری کے اِس نسخے میں یہ چودہ صفحے موجود نہیں ہیں: ۱، ۲، ۲۳ تا ۲۶، ۸۳ تا ۸۶ اور ۹۱ تا ۹۴۔

صفحہ ۵ کے نصف اوّل کے تقریباً وسط میں یہ سطر شائع ہوئی ہے:

اخبار ''دین دنیا۔ دہلی'' کے نام جسمیں میرے خلاف سب سے زیادہ گالیاں چھپیں

صفحہ ۷ اور ۸ پر ''دیباچہ'' ہے جس کے اختتام پر جلی قلم سے: سعادت حسن منٹو، اس کے نیچے خفی قلم سے: بمبئی۔ ۳۰ اگست ۱۹۴۰ء لکھا گیا ہے۔ اس تاریخ کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ سعادت حسن منٹو کے افسانوں کا یہ مجموعہ اگست ۱۹۴۰ء کے بعد منظر عام پر آیا۔ اس میں شامل ۲۶ افسانوں کے عنوان حسب ذیل ہیں:

۱۔ نیا قانون	۲۔ شغل	۳۔ پھاہا	۴۔ ٹیڑھی لکیر
۵۔ شرابی	۶۔ تماشا	۷۔ شوشو	۸۔ خوشیا
۹۔ بانجھ	۱۰۔ نعرہ	۱۱۔ شہ نشین پر	۱۲۔ طاقت کا امتحان
۱۳۔ اُس کا پتی	۱۴۔ موسم کی شرارت	۱۵۔ خودکشی کا اقدام	۱۶۔ بیگو

۱۷۔ منتر ۱۸۔ انقلابی ۱۹۔ میرا اور اُس کا انتقام ۲۰۔ اسٹوڈنٹ یونین کیمپ
۲۱۔ موم بتی کے آنسو ۲۲۔ دیوالی کے دیے ۲۳۔ ہتک ۲۴۔ ڈرپوک
۲۵۔ دس روپے ۲۶۔ مسٹر ڈی کوسٹا

بانجھ۔اشاعتِ دوم/اشاعتِ سوم:

ساقی بک ڈپو [جدید] دہلی سے یہ کتاب ۱۹۹۶ء اور ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی۔ ۲۰ × ۱۶/۳۰ سائز کے ۳۲۰ صفحات پر مشتمل، بیس سطری مسطر پر خطِ لاہوری میں کتابت شدہ ہے۔ متعدد وجوہ (جن کا بیان آئندہ سطور میں ہے) کی بنا پر یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہ مکتبہ اردو، لاہور، سے مطبوعہ منٹو کے افسانے کی دوسری یا تیسری اشاعت کا عکس ہے۔ ۱۹۹۶ء کی طباعت میں، گرد پوش کی طرح پہلے صفحے پر بھی اس کا نام بانجھ تحریر کیا گیا۔ یہ نام کتاب کے ساتویں افسانے کی بنا پر ناشر کا وضع کردہ ہے۔ ۲۰۰۴ء کی طباعت میں پہلے صفحے پر بانجھ کے نیچے ''(منٹو کے افسانے)'' کا اضافہ کیا گیا جس سے واضح ہوا کہ یہ اور گذشتہ طباعت، منٹو کی تحریروں کے کس مجموعے پر مبنی ہے۔

بانجھ کے صفحہ ۵ پر مطبوعہ دو کالمہ فہرست کا عنوان منٹو کے افسانے طبع اوّل کی طرح ''مندرجات'' ہی ہے لیکن اِس میں ''انتساب'' اور اس کا صفحہ نمبر شامل نہیں کیونکہ انتساب صفحہ ۳ پر شائع کیا گیا ہے۔ صفحہ ۴ سادہ ہے۔ فہرست کا عنوان خطِ نستعلیق میں لیکن تحریروں کے عنوان خطِ نسخ میں کتابت کیے گئے ہیں۔ پہلے کالم میں تحریر کا عنوان اور دوسرے میں صفحہ نمبر درج ہے۔ اوّلین اندراج ''دیباچہ'' اور اس کے صفحہ نمبر (۷) کا ہے۔ بعدہٗ کتاب میں شامل ۲۱/افسانوں کے حسبِ ذیل عنوان درج ہیں:

۱۔ نیا قانون ۲۔ شغل ۳۔ ٹیڑھی لکیر ۴۔ پہچان
۵۔ شوشو ۶۔ خوشیا ۷۔ بانجھ ۸۔ نعرہ
۹۔ شہ نشین پر ۱۰۔ بلاؤز ۱۱۔ اُس کا پتی ۱۲۔ موسم کی شرارت
۱۳۔ بیگو ۱۴۔ منتر ۱۵۔ میرا اور اُس کا انتقام ۱۶۔ موم بتی کے آنسو
۱۷۔ دیوالی کے دیے ۱۸۔ ہتک ۱۹۔ ڈرپوک ۲۰۔ دس روپے
۲۱۔ مسٹر ڈی کوسٹا

☆

پنجاب یونی ورسٹی، لاہور سے پی ایچ ڈی کی سند کے لیے لکھے گئے مقالے سعادت حسن منٹو (تحقیق) کے مصنف ڈاکٹر علی ثنا بخاری نے منٹو کے افسانے اشاعتِ اوّل وسوم کے تعارف میں لکھا ہے:

"... تیسری دفعہ یہ مجموعہ ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔
انتساب میں منٹو نے لکھا:

ایک بار پھر
اخبار "دین و دنیا—دہلی" کے نام
جس میں میرے خلاف سب سے زیادہ گالیاں چھپیں!

اس کتاب کے کل ۳۱۹ صفحات ہیں اور اس میں اکیس افسانے شامل ہیں۔ پہلے ایڈیشن میں شامل افسانے، پھاہا، شرابی، تماشا، طاقت کا امتحان، خودکشی کا اقدام، انقلابی اور اسٹوڈنٹ یونین کیمپ، اس مجموعے میں شامل نہیں کیے گئے۔ اس میں دو نئے افسانوں "پیچان" اور "بلاؤز" کا اضافہ کر دیا گیا۔ (ص ص ۱۳۵ تا ۱۳۶۔ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ اشاعتِ اوّل۔ ۲۰۰۶ء)

ڈاکٹر بخاری نے مذکورہ ایڈیشن کا ناشر "مکتبہ اردو، لاہور" تحریر کیا ہے (ص: ۱۸۲، حواشی۔ اندراج ۶۵)۔ اس ایڈیشن کے اکیس افسانوں کے عنوانات اور بانجھ کے "مندرجات" قطعاً مساوی ہیں۔ مزید برآں، ڈاکٹر بخاری کے محولہ انتساب کی سطریں اور بانجھ کے صفحہ ۳ پر خطِ نسخ میں کتابت شدہ انتساب کی سطریں، تعداد میں تین تین ہیں۔ دونوں میں معمولی سا فرق یہ ہے کہ محولہ انتساب کی ہر سطر کا آغاز مساوی ہے جب کہ بانجھ میں تیسری، طویل ترین سطر، اس طرح کتابت کی گئی ہے کہ، مساوی آغاز والی، اوّلین دو سطریں، اُس کے اوپر وسط میں آگئی ہیں۔

ڈاکٹر بخاری نے مجموعے کے کل صفحات ۳۱۹ بتائے ہیں جب کہ بانجھ ۳۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۲۰ × ۳۰ / ۱۶ سائز کے بیس فارم بہر طور ۳۲۰ صفحات کے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر بخاری نے آخری، سادے، صفحے کا شمار نہ جانے کیوں ضروری نہیں سمجھا۔ بانجھ کے آخری صفحے پر چھ سطریں شائع ہوئی ہیں لیکن اندرونِ کتاب ۵۴، ۱۴۸ اور ۱۶۴ نمبر کے صفحات سادے چھوڑے گئے ہیں۔ ڈاکٹر بخاری نے اپنی کتاب کے حواشی میں "انتساب" کا صفحہ نمبر، ۵ اور آغازِ "پیش لفظ" کا صفحہ نمبر، ۹ درج کیا ہے (ص: ۱۸۲) جبکہ بانجھ میں، مذکورہ صفحات کے نمبر، ۳ اور ۷ ہیں۔ یعنی ڈاکٹر بخاری کے پیشِ نظر نسخے کے ناشر نے پہلے فارم میں دو صفحے سادے چھوڑے ہیں، اور آخری فارم میں آخری صفحہ۔

منٹو کے افسانے کی مذکورۂ بالا تیسری اشاعت اور بانجھ میں شامل پیش لفظ مساوی ہے؛ یہ اصلاً ایک تقریر ہے اس کے اختتام (بانجھ، ص: ۱۶) پر "یکم جنوری ۱۹۴۴ء" درج ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر بخاری نے لکھا ہے:

۱۹۴۴ء کے ایڈیشن میں پیش لفظ کے طور پر، منٹو نے وہ معرکۃ الآرا تقریر بھی شامل کی ہے جو اُنہوں نے

''ادبِ جدید'' کے عنوان سے یکم جنوری ۱۹۴۴ء کو جوگیشوری کالج، بمبئی کی مجلس ادب میں پڑھ کر سنائی تھی۔ (ص ۱۴۶)

مضمون ''ادبِ جدید'' کے بارے میں دستاویز کے مرتب بلراج مین را نے لکھا ہے کہ اس کو:

... منٹو نے منٹو کے افسانے (پہلا مجموعہ) کی دوسری اشاعت سے ''پیش لفظ'' کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا...
(فٹ نوٹ بقلم مرتب، ص ۵۴)

بلراج مین را نے مجموعے کی اُس اشاعت کو ''دوسری اشاعت'' بتایا ہے جس میں منٹو نے ''ادبِ جدید'' کو پیش لفظ کے طور پر پہلی بار استعمال کیا تھا۔۔۔ جبکہ ڈاکٹر بخاری نے مجموعے کی تیسری اشاعت کے تعارف میں لکھا ہے کہ اس میں پیش لفظ کے طور پر ''ادبِ جدید'' شامل کیا گیا۔

شمارِ اشاعت کی ضمن میں، بلراج مین را اور ڈاکٹر بخاری کے ان متصادم بیانات کے بارے میں راقم کا خیال ہے کہ یہ متصادم ہوتے ہوئے بھی اپنی اپنی جگہ درست ہو سکتے ہیں۔۔۔ کیونکہ منٹو کی بیشتر کتابوں پر ستم ظریف ناشروں نے سنہ اشاعت درج نہیں کیا ہے، صرف ''پہلی بار''، ''تیسری بار''، ''چوتھی بار'' جیسے ادھورے اندراج سے، ایڈیشن کو ہر برس میں 'تازہ ایڈیشن' باور کرایا ہے؛ بھلے ہی تیسرا چوتھا ایڈیشن ہوبہو پہلے ایڈیشن جیسا ہو...... عین ممکن ہے کہ بلراج مین را نے جس ایڈیشن کو ''دوسری اشاعت'' بتایا ہے اُسی کے ہوبہو چھاپے کو ڈاکٹر بخاری نے ''تیسری دفعہ'' کی شکل میں دیکھا ہو اور دونوں نے ''پیش لفظ'' کے اختتام پہ درج تاریخ کی بنا پر اُسے ۱۹۴۴ء کی اشاعت باور کیا ہو۔

ڈاکٹر بخاری نے ''تیسری دفعہ'' شائع شدہ مجموعے کے بارے میں درست لکھا ہے کہ ''اس میں اکیس افسانے شامل ہیں'' (ص:۱۴۶) اُن کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ ''اس میں دو نئے افسانوں ''پہچان'' اور ''بلاؤز'' کا اضافہ کر دیا گیا'' (ص:۱۴۶)... مگر، نہ جانے کیوں، اُنہوں نے افسانہ ''بلاؤز'' کے بارے میں یہ وضاحت نہیں کی کہ یہ افسانہ منٹو نے اپنی چوتھی کتاب افسانے اور ڈرامے سے اس مجموعے میں منتقل کیا تھا۔ اس کتاب کے یک سطری پیش لفظ کے اختتام پر منٹو نے اپنے پورے نام کے نیچے ۲۸ رنومبر ۱۹۴۳ء کی تاریخ درج کی ہے۔ اس تاریخ کے لحاظ سے ڈاکٹر بخاری کے پیشِ نظر ''تیسری دفعہ'' کی طباعت؛ بے شک، نومبر ۱۹۴۳ء کے بعد اور ''ادبِ جدید'' پر مبنی ''پیش لفظ'' کے اختتام پر درج تاریخ کے لحاظ سے، یقیناً، جنوری ۱۹۴۴ء کے بعد منظرِ عام پر آئی ہوگی۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر بلراج مین را کی مبینہ ''دوسری اشاعت'' محلِ نظر ہے کیونکہ وہ اس کی کوئی دلیل پیش نہیں کرتے۔

'' یکم جنوری ۱۹۴۴ء'' کے بارے میں راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ جوگیشوری کالج میں منعقدہ جلسے

کی نہیں بلکہ مضمون ''ادبِ جدید'' کی تاریخ تکمیل ہے۔

دستاویز صفحہ ۵۴ کے فٹ نوٹ کا یہ جملہ:

''منٹو نے ''ادبِ جدید'' یکم جنوری ۱۹۴۴ء کو لکھا تھا۔''

راقم کے خیال کو تقویت دیتا ہے۔ بلراج مین را نے یہ بات غالباً اس بنا پر کہی ہے کہ منٹو، بالعموم، ہر تحریر کے اختتام پر، بہ شکلِ دستخط، اپنا نام لکھنے کے ساتھ تحریر کی تاریخِ تکمیل بھی ثبت کرتے تھے (اواخرِ عمر کے متعدد افسانے تو ایسی ہی تاریخوں سمیت شائع بھی ہوئے ہیں)۔ جس طرح دیگر ناشروں نے منٹو کے تقریباً تمام دیباچوں اور مقدموں وغیرہ کی تاریخِ تکمیل، اُن کے اختتام پر شائع کی ہے اُسی طرح مکتبہ اردو نے بھی اس کتاب کے ہر ایڈیشن میں ''پیش لفظ'' کی تاریخِ تکمیل کو برقرار رکھا ہے اور طباعتی تفصیل میں، ماہ و سال اور تعدادِ اشاعت کے بغیر، صرف ''دوسری بار'' / ''تیسری بار'' / ''چوتھی بار'' لکھنا کافی وشافی تصور کیا ہے۔ ناشر کی یہ 'ثابت قدمی' ہی غالباً ڈاکٹر بخاری اور بلراج مین را کے متصادم بیانات کی وجہ بنی ہے۔ یعنی طبع اوّل کے بعد ''دوسری اشاعت'' بلراج مین را کی نظر سے گزری اور یکسں کتابت وغیرہ پر مبنی ''تیسری دفعہ'' کی اشاعت ڈاکٹر بخاری نے دیکھی تو دونوں نے قیاس کرلیا کہ ''ادبِ جدید'' پہلی بار اِسی ایڈیشن میں بطور ''پیش لفظ'' شامل کیا گیا اور اس ایڈیشن کا سالِ اشاعت ۱۹۴۴ء ہے۔

ضمناً عرض ہے کہ ڈاکٹر برج پریمی نے جوگیشوری کالج میں منعقدہ جلسے کی تاریخ ''۷ ارجنوری'' لکھی ہے۔ ملاحظہ ہو اُن کی کتاب سعادت حسن منٹو ...... حیات اور کارنامے کے صفحہ ۲۹۴ کا فٹ نوٹ؛ مگر انہوں نے اِس اطلاع کا ماخذ درج نہیں کیا۔

☆

منٹو کے افسانے اشاعتِ اوّل، کی نایابی کے باعث، کئی معروف محقق اور مرتب اس کے مندرجات کا مکمل تعارف پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ ڈاکٹر علی ثنا بخاری نے بے شک اِس میں شامل افسانوں کی تعداد اور عنوان درست لکھے ہیں (ص: ۱۴۵) مگر وہ نہ تو اس کا سائز اور صفحات کی تعداد بتا سکے ہیں، نہ ہی یہ کہ اس کے صفحہ ۷ اور ۸ پر ''دیباچہ'' بھی شائع ہوا تھا۔ جبکہ غالباً مجموعے کے زمانۂ اشاعت ''اگست ۱۹۴۰ء'' کا تعین، انہوں نے اس کے اختتام پر درج تاریخِ تکمیل کی ہی بنا پر کیا ہے۔ یہ وضاحت ضروری تھی کہ ''دیباچہ'' کے اختتام پر منٹو کے پورے نام کے نیچے، مقابلتاً باریک قلم سے ''۳۰ ر اگست ۱۹۴۰ء'' لکھا ہوا ہے، مجموعے کے زمانۂ اشاعت کا قیاس اسی کی بنا پر ہے کیونکہ ناشر نے زمانۂ اشاعت، باضابطہ درج نہیں کیا ہے۔

ڈاکٹر برج پریمی نے منٹو کتھا کے آخری باب میں سعادت حسن منٹو کی جملہ تحریریں شمار کی ہیں؛ اس طرح کہ کتاب کے نام اور سنہ اشاعت کو سرخی بنا کر، اُس کے تحت افسانوں، ڈراموں اور مضامین وغیرہ کے عنوان مع نمبر شمار درج کیے ہیں۔ مثلاً اوّلین سرخی ''آتش پارے (۱۹۳۶ء)'' (ص:۲۵۴) کے تحت آٹھ افسانوں کے عنوان بالترتیب درج ہیں...... یعنی سنہ ۱۹۳۶ء میں مطبوعہ کتاب آتش پارے میں حسبِ ذیل آٹھ افسانے، اِس ترتیب سے شامل ہیں۔

محولۂ بالا صفحے پر دوسری سرخی ہے: ''منٹو کے افسانے (۱۹۴۰ء)'' ...... پورے باب میں برتے گئے ضابطے کے پیشِ نظر، اس سرخی سے مراد یہ ہے کہ سنہ ۱۹۴۰ء میں مطبوعہ کتاب منٹو کے افسانے حسبِ ذیل افسانوں پر مشتمل ہے۔

سرخی ''منٹو کے افسانے (۱۹۴۰ء)'' کے تحت ڈاکٹر برج پریمی نے ۲۱/افسانوں کے عنوان درج کیے ہیں (صص:۲۵۴ تا ۲۵۵) ان میں ''پہچان'' اور ''بلاوز'' بھی شامل ہیں مگر یہ سات عنوان شامل نہیں ہیں: پھاہا، شرابی، تماشا، طاقت کا امتحان، خودکشی کا اقدام، انقلابی اور اسٹوڈنٹ یونین کیمپ۔

واضح ہوا کہ ڈاکٹر برج پریمی نے سرخی میں تو مجموعے کا سنہ اشاعت ۱۹۴۰ء لکھا ہے مگر اس کے تحت عنوان وہ درج کیے ہیں جو بانجھ کی فہرست کے ہیں اور جنھیں ڈاکٹر علی ثنا بخاری نے ''مکتبہ اردو لاہور'' سے ''تیسری دفعہ'' ''۱۹۴۴ء'' میں شائع شدہ بتایا ہے۔ یعنی بانجھ کے مندرجات، ڈاکٹر بخاری کی مذکورہ تیسری اشاعت اور ڈاکٹر برج پریمی کے پیشِ نظر ایڈیشن میں، یکساں افسانے ہیں اور تینوں نسخوں میں یکم جنوری سنہ ۱۹۴۴ء کو منٹو کا مکمل کردہ مضمون ''ادبِ جدید'' بطور ''پیش لفظ'' شامل ہے۔ یہ سب نسخے اصلاً مکتبہ اردو، لاہور کے شائع کردہ ہیں۔ ان پر ناشر نے باضابطہ سنہ اشاعت درج نہیں کیا ہے۔

سنہ ۲۰۰۱ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور سے مطبوعہ منٹو راما میں کتاب منٹو کے افسانے (صص:۶۹۹ تا ۹۵۴) شامل ہے۔ اس کی فہرست (صص:۷ تا ۸) میں بھی وہی ۲۱/افسانے ہیں جو بانجھ میں شائع ہوئے، ڈاکٹر بخاری نے شمار کرائے اور ڈاکٹر برج پریمی نے درج کیے ہیں۔

مذکورۂ بالا نسخے، معمولی طور پر، ایک دوسرے سے مختلف ہیں: ڈاکٹر بخاری نے منٹو کے مضمون کو (بجا طور پر) ''پیش لفظ'' کہا ہے (ص:۱۴۶) بانجھ میں بھی مضمون کی ابتدا پر ''پیش لفظ'' کا عنوان ثبت ہے (ص:۷) لیکن ''مندرجات'' میں اسے ''دیباچہ'' لکھا گیا ہے۔ طبعِ اوّل میں صفحہ ۷ و ۸ پر، منٹو کی تحریر کا عنوان ''دیباچہ'' ہے۔ جب (بلراج مین را کے بقول. دوسری اور ڈاکٹر بخاری کے بقول: تیسری اشاعت

میں) منٹو نے ''ادبِ جدید'' کو اس مجموعے کا ''پیش لفظ'' بنایا تو کاتب نے ''مندرجات'' میں لفظ ''دیباچہ'' جوں کا توں کتابت کیا، پروف خواں کاتب کا ہم نظر تھا، یہ اتحادِ نظر کتاب کے ''چوتھی بار'' طبع ہونے تک جاری رہا حالانکہ چوتھی اشاعت (جس کا تعارف آئندہ سطور میں پیش ہوگا) بہ لحاظ کتابت بھی مذکورۂ بالا طباعتوں سے مختلف ہے۔ منتو راما میں اسے ہر دو جگہ ''پیش لفظ'' لکھا گیا ہے، لیکن مجموعے کا انتساب کہیں شامل نہیں۔ بانجھ کے ''مندرجات'' میں شمار ۹ پر افسانہ ''شہ نشین پر'' اور شمار ۱۰ پر ''بلاؤز'' درج ہے جب کہ ڈاکٹر برج پریمی کی درج کردہ فہرست میں یہ ترتیب برعکس ہے۔

ناگری رسمِ خط میں مطبوعہ دستاویز (مرتبین: بلراج مین را، شرددت) کی ''ببلیوگرافی (پہلا بھاگ)'' صص: ۴۷۴ تا ۴۷۵، میں منٹو کے اُن ۶۹/افسانوں کے عنوان درج ہیں جو منٹو کی ابتدائی پانچ کتابوں میں شامل ہیں۔ اُن میں نمبر ۸ سے ۲۹ تک بائیس عنوان تو ہر لحاظ سے وہی ہیں جو منٹو کے افسانے طبع چہارم میں شامل ہیں مگر عنوان نمبر ۳۰ ''اسٹوڈنٹ یونین کیمپ'' اور عنوان نمبر ۳۱ ''شرابی'' نہ تو منٹو کے افسانے طبع چہارم کی فہرست میں ہیں، نہ ہی کسی اور کتاب میں۔ ان افسانوں سے متعلق استفسار کے جواب میں کئی برس پہلے بلراج مین را نے بتایا تھا کہ یہ منٹو کے افسانے کے پہلے ایڈیشن میں شامل تھے جو رسالہ سائز پر مکتبہ اردو، لاہور سے شائع ہوا تھا، دوسرے ایڈیشن سے یہ افسانے منٹو نے حذف کر دیے تھے۔

منٹو کے افسانے طبع اوّل (مملوکہ: ہردیال لائبریری) کے ''مندرجات'' سے معلوم ہوا کہ بلراج مین را سے دو سہو ہوئے ہیں: اوّل یہ کہ منٹو نے دو نہیں تین افسانے حذف کیے تھے، تیسرے افسانے کا عنوان ''خودکشی کا اقدام'' ہے۔ دوسرا سہو یہ کہ انہوں نے مذکورۂ بالا ببلیوگرافی میں نمبر ۸ سے ۲۹ تک بائیس افسانوں کے عنوان، پہلے ایڈیشن کی بجائے، چوتھے ایڈیشن کے پیشِ نظر لکھے ہیں اور دو مذکورہ محذوف افسانوں کو اس طور شمار نمبر ۳۰/اور ۳۱ پر درج کیا ہے گویا طبع اول کی فہرست میں یہ آخری دو افسانے ہیں جبکہ مندرجاتِ طبع اوّل سے ظاہر ہے کہ کتاب میں، مذکورۂ بالا افسانوں کی ترتیب حسبِ ذیل ہے:

پانچواں افسانہ :	شرابی	ص:۴۵
پندرھواں افسانہ :	خودکشی کا اقدام	ص:۱۵۱
بیسواں افسانہ :	اسٹوڈنٹ یونین کیمپ	ص:۲۰۹

طبع اوّل کی نایابی کے باعث ہی نوادرات منٹو، مرتبہ محمد سعید (ادارہ فروغِ مطالعہ، لاہور، مئی ۲۰۰۹ء) میں ''خودکشی کا اقدام'' (صص: ۵۷ تا ۶۲) ایسے افسانوں، مضامین اور ترجموں کے ساتھ شائع ہوا

ہے جو سعادت حسن منٹو کی کسی کتاب میں شامل نہیں ہیں۔ یہ افسانہ: ہمایوں، لاہور، جلد: ۳۴، نمبر ا، جولائی ۱۹۳۸ء، صص: ۵۴۸ تا ۵۵۲، سے منقول ہے (ص:۱۹)

منٹو کے افسانے (طبع چہارم):

راقم الحروف کو منٹو کے افسانے طبع چہارم کا نادر نسخہ پروفیسر شمیم حنفی سے دستیاب ہوا جو قبل ازیں بلراج مین را کی ملکیت تھا۔ اس کے صفحہ ۲ پر یہ تفصیل شائع ہوئی ہے:

جملہ حقوق بحق پبلشرز محفوظ

چوتھی بار قیمت چار روپے

ناشر:- افتخار علی چوہدری

مقامِ اشاعت:- مکتبہ اردو۔ لاہور

مطبع:- دارالاشاعت پنجاب آرٹ پریس، لاہور

''جملہ حقوق...'' اور ''چوتھی بار'' سے تصدیق ہوتی ہے کہ کتاب کے تمام (باضابطہ) سابق ایڈیشن، مذکورۂ بالا ادارے سے شائع ہوئے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، اشاعتِ اول کے مقابلے میں اشاعت دوم وسوم کا سائز مختلف ہے۔ دوم وسوم اشاعتیں، سائز وغیرہ کے لحاظ سے مساوی ہیں...... ''چوتھی بار'' مطبوعہ کتاب کا سائز جداگانہ ہے: صفحے کا طول وعرض (ذرا دبتا ہوا) ساڑھے سترہ اور ساڑھے نو سینٹی میٹر ہے۔ خطِ لاہوری میں کتابت شدہ۔ کل صفحات: ۳۵۲، آخری صفحہ سادہ ہے۔

صفحہ ۳/اور ۴ پر: ''مندرجات'' کے زیرِ عنوان دو کالمہ فہرست ہے جس میں ''انتساب'' اور ''دیباچہ'' کے مقابل صفحہ نمبر درج نہیں۔ بعدہٗ افسانوں کے عنوان اور صفحہ نمبر لکھے گئے ہیں۔ ''مندرجات'' (ص:۴) میں دسویں افسانے ''شہ نشین پر'' کا عنوان اور صفحہ نمبر کتابت میں ترک ہو گئے ہیں۔ یہ ترک بلراج مین را نے سرخ روشنائی کے قلم سے پُر کیا ہے۔ صفحہ ۵ کی تیسری اور چوتھی سطر، اس انتساب پر مشتمل ہے:

ایک بار پھر
اخبار ''دین دنیا—دہلی'' کے نام جسمیں میرے خلاف سب سے زیادہ گالیاں چھپیں!

صفحہ ۶ سادہ ہے۔ دستیاب نسخے میں صفحات ۷ تا ۱۶/اور ۲۷۷ تا ۳۰۶ موجود نہیں۔ راقم الحروف کے علم و یقین کے مطابق، صفحات ۷ تا ۱۶/ای ''پیش لفظ'' پر مشتمل تھے جو کتاب کی طبع دوم سوم میں بھی شامل ہے

(اور جسے اِس طباعت کے کاتب نے بھی ''مندرجات'' میں ''دیباچہ'' تحریر کیا ہے)۔ ''مندرجات'' میں لکھے عنوان اور صفحہ نمبر سے ظاہر ہے کہ صفحات ۲۷۷ تا ۳۰۶، افسانہ ''ہتک'' پر مشتمل تھے۔

بنیادی نسخہ:

پورا منٹو کے لیے پیشِ نظر طبع چہارم کو بنیادی نسخہ بنایا گیا ہے کیونکہ مدوّن کے علم و یقین کے مطابق کوئی اور نسخہ ایسا نہیں جو منٹو کی نظرِ ثانی کے بعد اُن کے حینِ حیات میں شائع ہوا ہو۔ طبعِ اوّل کے بعد سب سے زیادہ (۲۲) افسانے اِسی اِشاعت میں ہیں۔ طبع دوم/سوم کے بعد اِس میں افسانہ ''پھاہا'' کا اضافہ کیا گیا جو طبعِ اوّل سے ماخوذ ہے، اِس میں شمولیت کے لیے منٹو نے افسانے کی لفظیات میں متعدد تبدیلیاں کی تھیں۔

طبع چہارم کے لیے ''پھاہا'' پر نظرِ ثانی کے ساتھ ہی (یکسر نظر انداز کردہ: شرابی، خودکشی کا اقدام اور اسٹوڈنٹ یونین کیمپ کے علاوہ) طبع اوّل کے تمام افسانوں پر نظرِ ثانی کا عمل پورا ہو گیا۔ کچھ ویسے ہی جیسے اوّلین مجموعے آتش پارے (۱۹۳۶ء) کے آٹھ میں سے سات افسانے، منٹو نے بھرپور نظرِ ثانی کے بعد نئے مجموعوں میں شامل کیے۔ فرق یہ رہا کہ آتش پارے کے سات افسانے تو بعد کے تین مجموعوں میں شمولیت کے لیے نظرِ ثانی کے عمل سے گزرے لیکن منٹو کے افسانے کے متون پر نظرِ ثانی کا عمل اِسی مجموعے کی آخری تین اشاعتوں میں مکمل ہوا۔

پورا منٹو کے لیے افسانہ ''ہتک'' کا حتمی متن متعین کرتے ہوئے رسالہ شعور شمارہ چار (ص: ۱۵ تا ۲۹) بالخصوص پیشِ نظر رہا ہے کیونکہ مدوّن کے علم و یقین کے مطابق، دستیاب نسخے سے نکالے گئے صفحات: ۲۷۷ تا ۳۰۶ کی بنا پر ہی یہ افسانہ، رسالے کے لیے کتابت کرایا گیا تھا۔

مندرجات

---

*۱۔ کتاب لذّت سنگ (طبع دوم، غالباً بعد از اگست ۱۹۵۰ء) کے مقدمہ میں شامل کیا گیا نظرثانی شدہ متن، ص ص: ۱۳ تا ۲۳۔

*۲۔ کتاب افسانے اور ڈرامے (۱۹۴۳ء/ ۱۹۴۴ء) میں شامل کیا گیا نظرثانی شدہ متن۔

ایک بار پھر
اخبار ''دین دنیا— دہلی'' کے نام
جس میں میرے خلاف سب سے زیادہ گالیاں چھپیں!

پیش لفظ

(وہ پرچہ جو میں نے جوگیشوری کالج بمبے میں پڑھا)

میرے مضمون کا عنوان ادب جدید ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ میں اس کا مطلب ہی نہیں سمجھتا لیکن یہ زمانہ ہی کچھ ایسا ہے کہ لوگ اُسی چیز کے متعلق باتیں کرتے ہیں جن کا [؟جس کا] مطلب ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ پچھلے دنوں گاندھی جی نے آغا خاں کے محل میں مرن برت رکھا۔ جب لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا وہ کس طرح زندہ رہ سکے ہیں تو ایک نارنگی پیدا کردی گئی۔ یہ نارنگی بھی کچھ دنوں کے بعد ناقابلِ فہم ہوگئی۔ بعض آدمیوں نے کہا کہ نارنگی نہیں تھی، موسمی تھی۔ بعض نے کہا: نہیں، موسمی نارنگی ہرگز نہیں تھی، مالٹا تھا...... بات بڑھتی گئی۔ چنانچہ اس پھل کی ساری ذاتیں گنوادی گئیں ... نارنگی، سنگترہ، موسمی، مالٹا، چکوترہ، سویٹ لائم، کھٹا لیموں، میٹھا لیموں وغیرہ وغیرہ — پھر ڈاکٹروں نے ان میں سے ہر ایک کی وٹامنز گنوائیں [کذا]۔ غذائیت کو کیلوریز میں تقسیم کیا گیا...... ایک برس میں چہتر برس کے بڈھے کو کتنی کیلوریز کی ضررت ہوتی ہے؟ اس پر بحث کی گئی اور صاحب، گاندھی جی کی یہ نارنگی یا موسمی، جو کچھ بھی تھی، سعادت [1] حسن منٹو بن گئی...... یہ میرا نام ہے لیکن بعض لوگ ادبِ جدید، المعروف نئے ادب، یعنی ترقی پسند ادب کو، سعادت حسن منٹو بھی کہتے ہیں اور جنہیں صنفِ کرخت پسند نہیں وہ اسے عصمت چغتائی بھی کہہ لیتے ہیں۔

جس طرح میں یعنی سعادت حسن منٹو اپنے آپ کو نہیں سمجھتا، اسی طرح ادبِ جدید، المعروف نیا ادب یعنی ترقی پسند لٹریچر بھی، میری فہم سے بالاتر ہے اور جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں، اُن لوگوں کی سمجھ سے بھی اونچا ہے جو اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند مضمونوں میں اس ادب کو جس کے کئی نام ہیں، اور زیادہ نام دینے کے لیے فحش نگاری اور مزدور پرستی سے منسوب کیا گیا ہے۔[2]

میں چیزوں کے نام رکھنے کو بُرا نہیں سمجھتا۔ میرا اپنا نام اگر نہ ہوتا تو وہ گالیاں کسے دی جاتیں جو اَب تک میں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں اپنے نقادوں سے وصول کرچکا ہوں...... نام ہو تو گالیاں اور شاباشیاں دینے اور لینے میں بہت سہولت پیدا ہوجاتی ہے لیکن اگر ایک ہی چیز کے بہت سے نام ہوں تو الجھاؤ پیدا ہونا ضروری ہے۔

سب سے بڑا الجھاؤ اس ترقی پسند ادب کے بارے میں پیدا ہوا ہے حالانکہ پیدا نہیں ہونا چاہیے تھا ...... ادب یا تو ادب ہے، ورنہ ادب نہیں ہے۔ آدمی یا تو آدمی ہے ورنہ آدمی نہیں ہے، گدھا ہے، مکان ہے، میز ہے یا اور کوئی چیز ہے ...... کہا جاتا ہے کہ سعادت حسن منٹو ترقی پسند انسان ہے ...... یہ کیا بے ہودگی ہے! سعادت حسن منٹو انسان ہے اور ہر انسان کو ترقی پسند ہونا چاہیے۔ ترقی پسند کہہ کر لوگ میری صفت بیان نہیں کرتے بلکہ اپنی بُرائی کا ثبوت دیتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود ترقی پسند نہیں ہیں یعنی وہ ترقی نہیں[۳] چاہتے ...... میں زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کا خواہش مند رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سب ترقی کریں. ... آج آپ طالب علم ہیں، ترقی کرتے کرتے آپ بھی اپنے آئیڈیل تک پہنچ جائیں۔

ہر آدمی ترقی پسند ہے۔ وہ لوگ جنہیں تخریبی یا رجعت پسند کہا جاتا ہے، خود کو ترقی پسند ہی سمجھتے ہیں .... اور پھر ہر زمانے میں قریب قریب ہر آدمی، گزری ہوئی نسل کے مقابلے میں، اپنے کو زیادہ ذہین، طباع اور ترقی یافتہ انسان ہی سمجھتا ہے۔ یہی حال ادب کا ہے۔ شرر کے ناول اور راشد الخیری کے قصے آج کل کے اکثر مصنفین کو بالکل بے جان معلوم ہوتے ہیں، پڑھنے والوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ مارکیٹ میں چلے جائیے .. ... آج سے دس بیس برس پہلے کے لکھنے والوں کی کتابیں اسٹالوں پر بہت کم دکھائی دیتی ہیں۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو کی کتابیں: ایم اسلم، تیرتھ رام فیروز پوری، سید امتیاز علی تاج اور عابد علی عابد کے مقابلے میں زیادہ پڑھی جاتی ہیں اس لیے کہ کرشن چندر اور اس کے ہم عصر نوجوانوں نے زندگی کے نئے تجربے بیان کیے ہیں[۴]۔

آج سے بیس پچیس برس پہلے ملک کی سیاسی اور مجلسی حالت بالکل مختلف تھی ...... اسی طرح آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پچاس ساٹھ برس اور پہلے، کیسی ہوگی۔ اگر مغلیہ حکومت کا دور دورہ ہوتا تو بہت ممکن ہے میرے گھر میں ایک حرم سرائے ہوتی۔ حرم سرائے نہ ہوتی تو کم از کم ایک بیوی گھر میں ہوتی اور دو تین طوائفیں میری ملازمت میں ہوتیں۔ مجھے بٹیریں لڑانے کا شوق ہوتا۔ یہ مضمون پڑھنے کے بجائے میں پرنسپل صاحب بالقابہ کی شان میں ایک قصیدہ سناتا جو خوش ہو کر یا تو میرا منہ موتیوں سے بھر دیتے یا جوگیشوری کالج مجھے بخش دیتے تاکہ میں اسے اپنا طویلہ بنا سکوں۔ مگر جیسا کہ آپ جانتے ہیں، حالت بہت مختلف ہے۔ مجھے یہاں سے پیدل اسٹیشن جانا پڑے گا اور ''فلمستان'' میں اپنے آقاؤں کو جواب دینا پڑے گا کہ میں اتنی دیر ڈاکٹر کے پاس کیا کرتا رہا... . میں اُن سے جھوٹ بول کے آیا ہوں کہ ڈاکٹر سے ٹیکا لگوانے جا رہا ہوں[۵]۔

ہاں، تو میں عرض کر رہا تھا کہ حالات بہت مختلف ہیں اور یہ اختلاف ہی ادب میں مختلف رنگ پیدا

کرتا ہے۔ پہلے فارغ البالی تھی۔ لوگ آرام پسند اور عیش پرست تھے۔ اُس زمانے کے ادب میں آپ کو بہت سی دماغی عیاشیاں نظر آسکتی ہیں۔ وہ غنودگی بھی آپ محسوس کرسکتے ہیں جو اُس زمانے کے ادیبوں پر طاری تھی۔ اس زمانے میں شاعر اپنے اصیل مرغ کی جوانامرگی پر زوردار نوحہ لکھتا تھا اور بہت بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا تھا۔ آج کا شاعر اپنی جوانامرگی کے نوحے لکھتا ہے۔ اُس عہد کا قصہ نویس جنوں اور پریوں کی داستانیں لکھ کر نام پیدا کرتا تھا۔ آج کا افسانہ نویس ان مردوں اور عورتوں کی کہانیاں لکھتا ہے جو جنوں اور پریوں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیں۔ اُس دور کا ادیب مطمئن انسان تھا۔ آج کا ادیب ایک غیر مطمئن انسان ہے۔ اپنے ماحول، اپنے نظام، اپنی معاشرت، اپنے ادب، حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی[۶] اُس کی اس بے اطمینانی کو لوگوں نے غلط نام دے رکھے ہیں۔ کوئی اسے ترقی پسندی کہتا ہے، کوئی فحش نگاری اور کوئی مزدور پرستی! یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان ادیبوں کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہبوطِ آدم سے لے کر اب تک ہر مرد کے اعصاب پر عورت سوار رہی ہے، اور کیوں نہ رہے؟ مرد کے اعصاب پر کیا ہاتھی گھوڑوں کو سوار ہونا چاہیے۔ جب کبوتر، کبوتریوں کو دیکھ کر گنگتے ہیں تو مرد، عورتوں کو دیکھ کر ایک غزل یا افسانہ کیوں نہ لکھیں؟ عورتیں کبوتریوں سے کہیں زیادہ دلچسپ، خوب صورت اور فکر خیز ہیں .کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟

آج سے کچھ عرصہ پہلے شاعری میں عورت کو ایک خوب صورت لڑکا بنادیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اُس زمانے کے شاعروں نے اِس میں کوئی مصلحت دیکھی ہوگی۔ مگر آج کے شاعر اس مصلحت کے خلاف ہیں۔ وہ عورت کے چہرے پر سبزے یا خط کے آغاز کو بہت ہی مکروہ اور خلافِ فطرت سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی اس کو اس کی اصلی شکل ہی میں[۷] دیکھیں. خدا لگتی کہیے، کیا آپ اپنی محبوبہ کے گالوں پر داڑھی پسند کریں گے؟

میں عرض کر رہا تھا کہ زمانے کی کروٹوں کے ساتھ ادب بھی کروٹیں بدلتا رہتا ہے...... آج اس نے جو کروٹ بدلی ہے، اس کے خلاف اخباروں میں مضمون لکھنا یا جلسوں میں زہر اگلنا بالکل بے کار ہے۔ وہ لوگ جو ادبِ جدید کا، ترقی پسند ادب کا، فحش ادب کا، یا جو کچھ بھی یہ ہے، خاتمہ کردینا چاہتے ہیں تو صحیح راستہ یہ ہے کہ اُن حالات کا خاتمہ کردیا جائے[۸] جو اس ادب کے محرک ہیں۔

محمود آباد کے راجا صاحب کا، حیدرآباد کے شاعر ماہر القادری صاحب کا، یا بمبئی کے دوا فروش حکیم مرزا حیدر بیگ صاحب کا، اِس لٹریچر کے خلاف ریزولیوشن پاس کرنا بالکل بے کار ہے۔ جب تک عورتوں اور مردوں کے جذبات کے درمیان ایک موٹی دیوار حائل رہے گی، عصمت چغتائی اُس کے چونے کو اپنے تیز ناخنوں سے کریدتی رہے گی۔ جب تک کشمیر کے حسین دیہاتوں میں شہروں کی گندگی پھیلی رہے گی، غریب

کرشن چندر ہولے ہولے روتا رہے گا...... جب تک انسانوں میں اور خاص طور پر سعادت حسن منٹو میں کمزوریاں موجود ہیں، وہ خُردبین سے دیکھ دیکھ کر باہر نکالتا اور دوسروں کو دکھاتا رہے گا...... راجا صاحب محمود آباد اور ان کے ہم خیال کہتے ہیں: یہ سراسر بیہودگی ہے...... تم جو کچھ لکھتے ہو، خرافات ہے...... میں کہتا ہوں: بالکل درست ہے، اس لیے کہ میں بیہودگیوں اور خرافات ہی کے متعلق لکھتا ہوں۔ راجا صاحب محمود آباد ایک کانفرنس کے صدر بن جائیں یا حکیم حیدر بیگ صاحب کھانسی دور کرنے کا مجرب شربت ایجاد کر دیں...... مجھے ان کی صدارت اور ان کے شربت سے کوئی دلچسپی نہیں...... البتہ جب میں ٹرین میں بیٹھا بیٹھا اپنا نیا خریدا ہوا قیمتی پین نکالتا ہوں، صرف اس غرض سے کہ لوگ دیکھیں اور مرعوب ہوں تو مجھے اپنا سفلہ پن بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے...... میرے پڑوس میں اگر کوئی عورت ہر روز خاوند سے مار کھاتی ہے اور پھر اُس کے جوتے صاف کرتی ہے تو میرے دل میں اُس کے لیے ذرہ برابر ہمدردی پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن جب میرے پڑوس میں کوئی عورت اپنے خاوند سے لڑ کر اور خودکشی کی دھمکی دے کر سینما دیکھنے چلی جاتی ہے اور میں خاوند کو دو گھنٹے سخت پریشانی کی حالت میں دیکھتا ہوں تو مجھے دونوں سے ایک عجیب و غریب قسم کی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے..... کسی لڑکے کو لڑکی سے عشق ہو جائے تو میں اسے زکام کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتا مگر وہ لڑکا میری توجہ کو اپنی طرف ضرور[9] کھینچے گا جو ظاہر کرے کہ اُس پر سیکڑوں لڑکیاں جان دیتی ہیں لیکن درحقیقت وہ محبت کا اتنا ہی بھوکا ہے جتنا بنگال کا فاقہ زدہ باشندہ...... اُس بظاہر کامیاب عاشق کی رنگین باتوں میں جو ٹریجڈی سسکیاں بھرتی ہوگی، اُس کو میں اپنے دل کے کانوں سے سنوں گا اور دوسروں کو سناؤں گا چکی پیسنے والی عورت جو دن بھر کام کرتی ہے اور رات کو اطمینان سے سو جاتی ہے، میرے افسانوں کی ہیروئن نہیں ہو سکتی۔ میری ہیروئن چکلے کی ایک ٹکھیائی رنڈی ہو سکتی ہے جو رات کو جاگتی ہے اور دن کو سوتے میں کبھی کبھی یہ ڈراؤنا خواب دیکھ کر اٹھ بیٹھتی ہے کہ بڑھاپا اُس کے دروازے پر دستک دینے آرہا ہے.... اُس کے بھاری بھاری پپوٹے جن پر برسوں کی اُچٹی ہوئی نیندیں منجمد ہو گئی ہیں، میرے افسانوں کا موضوع بن سکتے ہیں۔ اُس کی غلاظت، اُس کی بیماریاں، اُس کا چڑچڑا پن، اُس کی گالیاں، یہ سب مجھے بھاتی ہیں.. میں اُن کے متعلق لکھتا ہوں اور گھریلو عورتوں کی شُستہ کلامیوں، اُن کی صحت اور ان کی نفاست پسندی کو نظر انداز کر جاتا ہوں۔

اعتراض کیا جاتا ہے کہ نئے لکھنے والوں نے عورت اور مرد کے جنسی تعلقات ہی کو اپنا موضوع بنا لیا ہے۔ میں سب کی طرف سے جواب نہیں دوں گا۔ ... اپنے متعلق اتنا کہوں گا کہ یہ موضوع مجھے پسند ہے

... کیوں ہے؟ ...... بس ہے ...... سمجھ لیجیے کہ مجھ میں Perversion ہے اور اگر آپ عقل مند ہیں، چیزوں کے عواقب و عواطف اچھی طرح جانچ سکتے ہیں تو سمجھ لیں گے کہ یہ بیماری مجھے کیوں لگی ہے ۔ ..... زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں، اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ زمانہ ناقابل برداشت ہے ...... مجھ میں جو برائیاں ہیں، وہ اس عہد کی برائیاں ہیں ...... میری تحریر میں کوئی نقص نہیں، جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے .... میں ہنگامہ پسند نہیں۔ میں لوگوں کے خیالات و جذبات میں ہیجان پیدا کرنا نہیں چاہتا ۔ میں تہذیب و تمدن اور سوسائٹی کی چولی کیا اتاروں گا جو ہے ہی ننگی ...... میں اسے کپڑے پہنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا، اس لیے کہ یہ میرا کام نہیں، درزیوں کا ہے ...... لوگ مجھے 'سیاہ قلم' کہتے ہیں لیکن میں تختۂ سیاہ پر کالی چاک سے نہیں لکھتا، سفید چاک استعمال کرتا ہوں کہ تختۂ سیاہ کی سیاہی اور بھی زیادہ نمایاں ہو جائے ..... یہ میرا خاص انداز، میرا خاص طرز ہے جسے فحش نگاری، ترقی پسندی اور خدا معلوم کیا کچھ" کہا جاتا ہے ...... لعنت ہو سعادت حسن منٹو پر، کم بخت کو گالی بھی سلیقے سے نہیں دی جاتی۔

جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا تو گھر والے سب بے زار تھے۔ باہر کے لوگوں کو بھی میرے ساتھ" دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے ''بھئی کوئی نوکری تلاش کرو، کب تک بے کار پڑے افسانے لکھتے رہو گے'' ...... آٹھ دس برس پہلے افسانہ نگاری، بے کاری کا دوسرا نام تھا۔ آج اسے ادب جدید کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے ذہن نے کافی ترقی کر لی ہے .. وہ وقت بھی آ جائے گا جب اِس جدید ادب کا صحیح مطلب واضح ہو جائے گا اور حکیم حیدر بیگ صاحب دہلوی کو اپنے شفا خانے سے اٹھ کر نئے لکھنے والوں کے روگ کی تشخیص نہیں کرنا پڑے گی۔

جب سے جنگ شروع ہوئی ہے، ادب جدید پر ایک نئے زوایے سے حملہ کیا جا رہا ہے ...... کہا جاتا ہے کہ جب ساری دنیا جنگ کے شعلوں میں لپٹی ہے، ہر روز ہزاروں انسانوں کا خون مٹی میں مل رہا ہے، فنا، بادۂ ہر جام بنی ہے، دوسری اجناس کی طرح انسانوں کے گوشت پوست کی دکانیں بھی کھلی ہیں، [تو؟] یہ نئے لکھنے والے کیوں خاموش ہیں ......؟ . .... کیا اِن کے قلم صرف جنسیات کی روشنائی ہی میں ڈوبتے ہیں؟ ...... دنیا کا نقشہ بدل رہا ہے، ہر لحظہ، ہر گھڑی ایک نئے طوفان کا پیغام لا رہی ہے مگر اِن کے دل و دماغ پر ایسا جمود طاری ہے کہ دور ہی نہیں ہوتا!

میں پھر دوسروں کی طرف سے جواب نہیں دوں گا...... اپنے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا کا نقشہ واقعی بدل رہا ہے لیکن اگر میں نے اُس کے متعلق کچھ لکھ دیا...... تو میرا حلیہ بھی بدل جائے گا...... ڈرپوک آدمی ہوں، جیل سے بہت ڈر لگتا ہے۔ یہ زندگی جو بسر کررہا ہوں، جیل سے کم تکلیف دہ نہیں۔ اگر اِس جیل کے اندر ایک اور جیل پیدا ہوجائے اور مجھے اُس میں ٹھونس دیا جائے تو چٹکیوں میں میرا دم گھٹ جائے...... زندگی سے مجھے پیار ہے۔ حرکت کا دل دادہ ہوں۔ چلتے پھرتے سینے میں [سینے پر؟] گولی کھا سکتا ہوں لیکن جیل میں کھٹل کی موت نہیں مرنا چاہتا...... یہاں اس پلیٹ فارم پر یہ مضمون سناتے سناتے آپ سب سے مار کھالوں گا اور اُف تک نہیں کروں گا لیکن ہندو مسلم فساد میں اگر کوئی میرا سر پھوڑ دے تو میرے خون کی ہر بوند روتی رہے گی۔ میں آرٹسٹ ہوں، اوچھے زخم اور بھدّے گھاؤ مجھے پسند نہیں...... جنگ کے بارے میں کچھ لکھوں اور دل میں پستول دیکھنے اور اُس کو چھونے کی حسرت دبائے کسی تنگ و تاریک کوٹھری میں مرجاؤں...... ایسی موت سے تو یہی بہتر ہے کہ لکھنا وکھنا چھوڑ کر ڈیری فارم کھول لوں اور پانی ملا دودھ بیچنا شروع کردوں۔ میں اس جنگ کے بارے میں کچھ نہیں لکھوں گا...... گولے اور تار پیڈو ایک طرف رہے، میں نے تو آج تک ہوائی بندوق بھی نہیں چلائی...... بچپن کی بات ہے: ہمارے پڑوس میں ایک تھانے دار رہتے تھے۔ ان کے پاس ایک پستول تھا۔ پیٹی اتار کر جب وہ پلنگ پر رکھتے تو سب بچوں سے کہہ دیا جاتا۔ "دیکھو اُس کمرے میں مت جانا...... وہاں پستول پڑا ہے"... کبھی کبھی ہم ڈرتے ڈرتے اُس کمرے میں چلے جاتے، دور کھڑے رہ کر اُس خطرناک آلے کی طرف دیکھتے تو دل دھک دھک کرنے لگتا، ایسا محسوس ہوتا کہ پڑے پڑے وہ پستول دغ جائے گا..... اب بتایئے میں اور میرے دوست، ٹینکوں کے بارے میں کیا لکھیں گے......"[۱۲]

میں اس جنگ کے بارے میں کچھ نہیں لکھوں گا لیکن جب میرے ہاتھ میں پستول ہوگا اور دل میں یہ دھڑکا نہیں رہے گا کہ یہ خود بخود چل پڑے گا تو میں اُسے لہراتا ہوا باہر نکل جاؤں گا اور اپنے اصلی دشمن کو پہچان کر، یا تو ساری گولیاں اُس کے سینے میں خالی کردوں گا...... یا خود چھلنی ہوجاؤں گا...... اُس موت پر جب میرا کوئی نقاد یہ کہے گا کہ پاگل تھا، تو میری روح اُن لفظوں ہی کو سب سے بڑا تمغہ سمجھ کر اٹھالے گی اور اپنے سینے پر آویزاں کرلے گی۔

بمبئی

یکم جنوری ۱۹۴۴ء

سعادت حسن منٹو

حواشی

(ان حواشی میں ص سے مراد: بانجھ کا صفحہ ہے۔ دیگر
کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ نہ آیا کہ وہ کس طرح زندہ رہ سکتے ہیں... کچھ دنوں بعد... جو کچھ بھی تھی۔ وہ سعادت — صص ۷ تا ۸

۲۔ منسوب کیا ہے — ص ۸

۳۔ کہا جاتا ہے۔ سعادت... وہ خود ترقی نہیں — صص ۸ تا ۹

۴۔ ترقی پسند سمجھتے... تجربے بیان کیے — ص ۹

۵۔ حرم سرائے ہوتی، نہ ہوتی تو... اوّلین متن میں "جا رہا ہوں۔" کے بعد نیا پارا
جو مدوّن کے نزدیک راجح ہے۔ — صص ۹ تا ۱۰

۶۔ اور حالات کا یہ اختلاف ہی... اپنے آپ سے غیر مطمئن ہے — ص ۱۰

۷۔ اصلی شکل میں ہی — ص ۱۱

۸۔ میں عرض کر رہا ہوں... خاتمہ کیا جائے — ایضاً

۹۔ ہی کے متعلق تو... شربت ایجاد کریں... دو گھنٹے تک سخت... برابر بھی اہمیت۔
مدوّن کے نزدیک اوّلین متن کا فقرہ "زکام کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتا"
راجح ہے... توجہ کو ضرور — ص ۱۲

۱۰۔ مطلب یہ ہے کہ زمانہ... تمدن کی اور... کیا کیا کچھ — صص ۱۳ تا ۱۴

۱۱۔ بھی حسبِ معمول میرے ساتھ — ص ۱۴

۱۲۔ میرا بھی حلیہ... دم گھٹ جائے گا... اوّلین متن میں: "شروع کر دوں۔" اور
"گولے..." کے درمیان کا جملہ شامل نہیں تھا۔
... اب بتائیے میں توپوں اور ٹینکوں کے بارے میں کیا لکھوں گا۔ — صص ۱۵ تا ۱۶

مضمون ادب جدید (مشمولہ: مقدمہ لذتِ سنگ) میں درج ذیل عبارت بھی شامل ہے جو منٹو نے "پیش لفظ" میں شامل نہیں کی تھی:

... مجھے چست وردی پہننے کا شوق نہیں ہے۔ پیتل اور تانبے کے تمغوں اور کپڑے کے رنگین بلّوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہوٹلوں میں ڈانس کر کے، کلبوں میں شراب پی کر اور ٹیکسیوں میں چونا کھاتی لڑکیوں کے ساتھ گھوم کر، میں وار ایفرٹ کی مدد کرنا نہیں چاہتا...... اس سے کہیں زیادہ دلچسپ مشاغل مجھے میسر ہیں...... مثال کے طور پر یہ مشغلہ کیا بُرا ہے کہ میں ہر روز بمبئی سینٹرل سے گورے گاؤں اور گورے گاؤں سے بمبئی سینٹرل تک، برقی ٹرین میں، سیکڑوں وردی پوش فوجیوں کو دیکھتا ہوں جو فتح و نصرت کو اور

زیادہ قریب لانے کے لیے، شراب کے نشے میں مدہوش یا تو ٹانگیں پسارے سو رہے ہوتے ہیں، یا نہایت ہی بدنما عورتوں سے، میری موجودگی سے غافل، نہایت ہی واہیات قسم کا رومانس لڑانے میں مصروف ہوتے ہیں۔ لذتِ سنگ، طبع دوم: صص: ۲۲ تا ۲۳

نیا قانون

منگو کوچوان اپنے اڈّے میں بہت عقل مند[1] آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہورہا ہے، استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب استاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی تو اس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبرانہ انداز میں پیش گوئی کی تھی: ''دیکھ لینا گاما چودھری![2] تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔''

اور جب گاما چودھری نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو استاد منگو نے بڑی متانت سے جواب[3] دیا تھا: ''ولایت میں اور کہاں؟''

اسپین کی جنگ[4] چھڑی۔ اور جب ہر شخص کو پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈے میں جتنے کوچوان حلقہ بنائے حقہ پی رہے تھے، دل ہی دل میں استاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کررہے تھے۔ اور استاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگا چلاتے ہوئے، اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلۂ خیال کررہا تھا۔

اس روز شام کے قریب جب وہ اڈے میں آیا تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتمایا ہوا تھا۔ حقے کا دور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو استاد منگو نے سر پر سے خاکی پگڑی اتاری اور بغل میں داب کر بڑے مفکرانہ لہجے میں کہا:

''یہ کسی پیر کی بددعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو چھریاں چلتی رہتی ہیں اور میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دکھایا تھا اور اس درویش نے جل کر یہ بددعا دی تھی: ''جا، تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے ... اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حقے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی: ''یہ کانگریسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں،

اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں تو کچھ نہ ہوگا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہوگی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آجائے گا، یا وہ روس والا جس کی بابت میں نے سنا ہے کہ بہت تگڑا آدمی ہے۔ لیکن ہندوستان سدا غلام رہے گا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے یہ بد دعا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج[۵] کرتے رہیں گے۔"

استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں مگر اس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے کے سرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اسے متلی آجاتی[۶] نہ معلوم کیوں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو!

جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدر رہتی[۷] اور وہ شام کو اڈے میں آکر ہل مارکہ سگریٹ پیتے یا حقے کے کش لگاتے ہوئے اس "گورے" کو جی بھر کر سنایا کرتا۔

"......" یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا: "آگ لینے آئے تھے۔ اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے،[۸] یوں رعب گانٹھتے ہیں گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں......"

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا۔ جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا، وہ اپنے سینے کی آگ اگلتا رہتا:

"شکل دیکھتے ہو نا تم اس کی..... جیسے کوڑھ ہو رہا ہے..... بالکل مردار...... ایک دھپے کی مار، اور گٹ پٹ گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم، پہلے پہل جی میں آئی کہ ملاعون کی کھوپری کے[۹] پرزے اڑا دوں لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے..... "یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیص کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا:

"قسم ہے بھگوان کی، ان لاٹ صاحبوں کے ناز اٹھاتے اٹھاتے تنگ[۱۰] آگیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں، رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون وانون بنے تو ان لوگوں سے

نجات ملے۔ تیری قسم، جان میں جان آجائے۔"

اور جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور ان کی گفتگو سے اسے پتہ چلا کہ ہندستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے، گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے:

"سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندستان میں نیا قانون چلے گا...... کیا ہر چیز بدل جائے گی؟"

"ہر چیز تو نہیں بدلے گی۔ مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی۔"

"کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟"

"یہ پوچھنے کی بات ہے۔ کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے۔"

ان مارواڑیوں کی بات چیت استاد منگو کے دل میں ناقابل بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بہت بُری طرح پیٹا کرتا تھا مگر اس روز وہ بار بار پیچھے مڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کے بال، ایک انگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اونچے کر کے، گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا: "چل بیٹا .. " ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھا دے۔"

مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے" پہنچا کر اس نے انار کلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی۔ اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے، ایسے ہی بلند آواز میں کہا: "ہت تیری ایسی تیسی۔"

شام کو جب وہ اڈے کو لوٹا تو خلاف معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہوگیا۔ آج وہ ایک بڑی" خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا...... بہت بڑی خبر، اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لیے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا۔ لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے، اسٹیشن کے اڈے کی آہنی چھت کے نیچے بے قراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آ رہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ

ہونے والا تھا، اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے غور وفکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ ''کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟'' بار بار گونج رہا تھا اور اس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اس نے ان مارواڑیوں کو گالی دی...... ''غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل...... نیا قانون ان کے لیے کھولتا ہوا پانی ہوگا۔''

وہ بے حد مسرور تھا۔ خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں...... سفید چوہوں (وہ ان کو اسی نام سے یاد کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائیں گی۔

جب نتھو گنجا، پگڑی بغل میں دبائے، اڈے میں داخل ہوا تو استاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا: ''لا ہاتھ ادھر...... ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے...... تیری اس گنجی کھوپری پر بال اُگ آئیں۔''

اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے مزے لے لے کر نئے قانون کے متعلق[۱۴] اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دوران گفتگو میں اس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا: ''تو دیکھتا رہ، کیا بنتا ہے، یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا۔''

استاد منگو موجودہ سوویٹ نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا اور اسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں۔ اسی لیے اس نے ''روس والے بادشاہ'' کو ''انڈیا ایکٹ'' یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں، وہ انہیں ''روس والے بادشاہ'' کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ استاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں ''روس والے بادشاہ'' اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں، یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے، تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا۔[۱۵]

ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان میں سے ایک، دوسرے سے کہہ رہا تھا:

''جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ ایسی فیڈریشن دنیا کی

تاریخ میں آج تک نہ سنی نہ دیکھی گئی ہے۔[۱] سیاسی نظریے کے اعتبار سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں!''

ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی چونکہ اس میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے، اس لیے استاد منگو صرف اوپر کے جملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اس نے خیال کیا: یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو بُرا سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو۔ چنانچہ اس خیال کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا: ''ٹوڈی بچے!''

جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں ''ٹوڈی بچہ'' کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور ''ٹوڈی بچے'' میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلبہ کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں یہ باتیں کرتے سنا:

''نئے آئین نے میری امیدیں بڑھا دی ہیں اگر...... صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔''

''ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آ جائے۔''

''ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔''

''وہ بے کار گریجویٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ان میں کچھ تو کمی ہوگی۔''

اس گفتگو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی اور وہ اس کو ایسی ''چیز'' سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ ''نیا قانون...!'' وہ دن میں کئی بار سوچتا: ''یعنی کوئی نئی چیز!'' اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آ جاتا جو اس نے دو برس ہوئے چودھری خدا بخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا، جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا، وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی ''نئے قانون'' کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سنا۔ مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا، بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی ان سے اس کی

آنکھوں کو ضرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلاف معمول سرد تھا اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اٹھا اور اصطبل میں جا کر تانگے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی...... وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اس نے صبح کے سرد دھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا مگر اسے ہر چیز پرانی نظر آئی۔ آسمان کی طرح 'پرانی۔ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی'، اور اس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی، اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱ر مارچ کو چودھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنے میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز، کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے، دکانوں کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھرو [گھنگھروؤں؟] کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی...... ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں۔ لیکن استاد منگو مایوس نہیں تھا۔

''ابھی بہت سویرا ہے، دکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں۔'' اس خیال سے اسے تسکین تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا'' ہائی کورٹ میں نو بجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟''

جب اس کا تانگا گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔ جو طلبہ کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے، خوش پوش تھے۔ مگر استاد منگو کو نہ جانے ان کے کپڑے میلے میلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انارکلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کھل چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ منہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں۔ اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ مگر استاد منگو کے لیے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی...... وہ نئے

قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب استاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا تو اس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری میں گزارے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہوگا۔ مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اسی غیر مغلوب خواہش کے زیر اثر اُس نے کئی بار اپنی بیمار بیوی کے پیٹ کو دبا دبا کر اور اس کے اوپر کان رکھ رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آگیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس بھی[18] پڑا تھا:

''تو ہر وقت مُردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اٹھ ذرا چل پھر، تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے۔ یوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ تو سمجھتی ہے[19] کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچہ جن دے گی؟''

استاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔ وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا نہ صرف خواہش مند تھا بلکہ متجسس تھا۔ اس کی بیوی گنگادئی اس کی اس قسم کی بے قراریوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی تھی: ''ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور تم پیاس سے بے حال ہو رہے ہو۔''

کچھ بھی ہو مگر استاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہیے تھا۔ وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وہ گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لیے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو استاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کے اسی[20] ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔

انارکلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں خیال[21] کیا:

چلو یہ بھی اچھا ہوا...... شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتا چل جائے۔

چھاؤنی پہنچ کر استاد منگو نے سواری کو اس کی منزل مقصود پر اتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر،

بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا اور پچھلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا...... جب استاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اسے کسی بیتے ہوئے واقعے پر غور کرنا ہوتا تھا تو وہ، عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر، پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر، اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد، بڑی دھیمی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے کچھ دیر کے لیے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا اسی طرح استاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا اور اس قابلِ غور بات کو آئینِ جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اسے بلایا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اسے، سڑک کے اس طرف، دور بجلی کے کھمبے کے پاس، ایک ''گورا'' کھڑا نظر آیا جو اسے ہاتھ سے بلا رہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اس کو خیال آیا: ان کے پیسے چھوڑنا بھی بے وقوفی ہے۔ کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیے ہیں، ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہییں، چلو چلتے ہیں۔

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگا موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور آنکھ جھپکنے میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگا ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا:

''صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟''

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ 'صاحب بہادر' کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ، نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی، گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر، ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی، ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی۔ گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا۔ اور اپنے اندر اس نے اس ''گورے'' کو سینے کی آگ

میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

جب ''گورے'' نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رخ بچا کر سگریٹ سلگا رہا تھا، مڑ کر تانگے کے پائدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو کی اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔

استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اترنے والا تھا، اپنے سامنے کھڑے ''گورے'' کو یوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کے وجود کے ذرے ذرے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے...... اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا ہے [تھا؟] گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگریٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا: ''جانا مانگتا[۲۵] یا پھر گڑبڑ کرے گا؟''

''وہی ہے۔'' یہ لفظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے۔ اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔

''وہی ہے۔'' اس نے یہ لفظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دہرائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا، وہی ہے جس سے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہوئی تھی اور اس خوامخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی شراب تھی، اسے طوعاً و کرہاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اس کے پرزے اڑا دیے ہوتے، مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوانوں ہی پر گرتا[۲۶] ہے۔

استاد منگو نے، پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے، گورے سے کہا: ''کہاں جانا مانگتا ہے؟''

استاد منگو کے لہجے میں چابک[۲۷] ایسی تیزی تھی۔

گورے نے جواب دیا ''ہیرا منڈی۔''

''کرایہ پانچ روپے ہو گا۔'' استاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔

یہ سن کر گورا حیران ہو گیا۔ وہ چلّایا: ''پانچ روپے۔ کیا تم......؟''

''ہاں، ہاں، پانچ روپے۔'' یہ کہتے ہوئے استاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھینچ کر ایک وزنی گھونسے کی

شکل اختیار کر گیا۔ ”کیوں جاتے ہو یا بے کار باتیں بناؤ گے؟“

استاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہو گیا۔

گورا، پچھلے برس کے واقعے کو پیش نظر رکھ کر، استاد منگو کے سینے کی چوڑائی نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔ اس حوصلہ افزا خیال کے زیر اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے استاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی استاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے اوپر سے پست قد گورے کو دیکھا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اس کا گھونسا کمان میں سے تیر کی طرح سے اوپر[۲۸] کو اٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھڈی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اتر کر اسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیر گورے نے ادھر اُدھر سمٹ کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں سے شرارے برس رہے ہیں تو اس نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ اس چیخ پکار نے استاد منگو کی باہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا:

”پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں ...... پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں ...... اب ہمارا راج ہے بچہ!“

لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے، گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو ان دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی، منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے، حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر، وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا:

”وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے ...... اب نیا قانون ہے میاں ...... نیا قانون!“

اور بے چارہ گورا، اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ، بے وقوفوں کے مانند، کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ ”نیا قانون، نیا قانون“ چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

’’نیا قانون، نیا قانون، کیا بک رہے ہو...... قانون وہی ہے، پرانا!‘‘
اور اس کو حوالات میں بند کردیا گیا۔

حواشی

(ان حواشی میں ص سے مراد: منٹو کے افسانے طبع اوّل (۱۹۴۰ء)
کا صفحہ ہے۔ دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ اڈے میں عقل مند — ص ۹
۲۔ پیشین گوئی ... دیکھ لینا چودھری — ایضاً
۳۔ متانت سے یہ جواب — ایضاً
۴۔ اسپین میں — ایضاً
۵۔ چاقو چھریاں چلتے رہتے ہیں ... میں نے اپنے بڑوں ... تو کچھ نہ ہو سکے گا ... ہندوستان غلام ... آدمی ہی راج — ص ۱۰
۶۔ کرتے تھے اور اس کے ... جب کبھی وہ کسی گورے ... حتیٰ کہ — ایضاً
۷۔ مکدر رہتی تھی — ایضاً
۸۔ ان بندروں نے — ایضاً
۹۔ شکل دیکھتے ناتم ... ہو رہا ہو ... کہ اس کی کھوپڑی کے — ص ۱۱
۱۰۔ میں تنگ — ایضاً
۱۱۔ اُسے چابک سے ... چل بیٹا، چل بیٹا— — ایضاً
۱۲۔ ٹھکانے پر — ص: ۱۲
۱۳۔ بہت بڑی — ایضاً
۱۴۔ قانون کی بابت — ایضاً
۱۵۔ خوش ہوتا تھا — ص ۱۳
۱۶۔ ایسا فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سنا نہ دیکھا گیا ہے۔ — ایضاً
۱۷۔ بنی ہوئی تھی — ص ۱۴
۱۸۔ کئی مرتبہ اپنی بیمار ... برس پڑا تھا — ص ۱۵
۱۹۔ کیا تو سمجھتی ہے — ایضاً
۲۰۔ ذہن کی اسی — ص ۱۶
۲۱۔ دل میں یہ خیال — ایضاً

۲۲۔ منسوخ فقرہ: بلکہ یوں کہیے کہ اِس — ص:۱۷

۲۳۔ جی میں آئی کہ اس کی طرف کوئی توجہ... اس کو یہ خیال... وہ ان کی — ایضاً

۲۴۔ تانگے کو موڑ کر... آنکھ جھپکنے کی دیر میں — ایضاً

۲۵۔ مانگتا ہے — ص:۱۸

۲۶۔ مرکب: طوعاً و کرہاً، کا واوِ عطف، طبع اوّل میں درست لکھا گیا ہے
لہٰذا وہی راجح ہے... پر گرا کرتا ہے — ایضاً

۲۷۔ اس کے چابک — ایضاً

۲۸۔ خیال کر رہا تھا، اس کی...۔ اور اس حوصلہ افزا... تیر کی طرح اُوپر — ایضاً

شغل

(میکسم گورکی کی یاد میں)

یہ پچھلے دنوں کی بات ہے۔ جب ہم برسات میں سڑکیں صاف کر کے اپنا پیٹ پال رہے تھے۔

ہم میں سے کچھ کسان تھے اور کچھ مزدوری پیشہ، چونکہ پہاڑی دیہاتوں میں روپے کا منہ دیکھنا بہت کم نصیب ہوتا ہے اس لیے ہم سب خوشی خوشی چھ آنے روزانہ پر سارا دن پتھر ہٹاتے رہتے تھے جو بارشوں کے زور سے ساتھ والی پہاڑیوں سے لڑھک کر سڑک پر آ گرتے تھے۔ پتھروں کو سڑک پر سے ہٹانا تو خیر ایک معمولی بات تھی، ہم تو اس اجرت پر ان پہاڑیوں کو ڈھانے پر بھی تیار تھے جو ہمارے گرد و پیش، سیاہ اور ڈراونے دیووں کی طرح اکڑی کھڑی تھیں۔ دراصل ہمارے بازو سخت سے سخت مشقت کے عادی تھے۔ اس لیے یہ کام ہمارے لیے بالکل معمولی تھا۔ البتہ جب کبھی ہمیں سڑک کو چوڑا کرنے کے لیے پتھر کاٹنا ہوتے تو رات کو ہمیں بہت تکان محسوس ہوتی تھی، پٹھے اکڑ جاتے اور صبح کو بیدار ہوتے وقت ایسا محسوس ہوتا کہ وہ تمام پتھر جنہیں ہم گذشتہ روز کاٹتے اور پھوڑتے رہے ہیں [رہے تھے؟] ہمارے جسموں پر بوجھ ڈالے ہوئے ہیں۔ مگر ایسا کبھی کبھی ہوتا تھا۔

ہمارا کام ہر روز صبح سات بجے شروع ہوتا تھا۔ جب طلوع ہوتے ہوئے سورج کی طلائی کرنیں، چیڑ کے دراز قد درختوں سے چھن چھن کر، ہمارے پاس والے نالے کے خشم آلود پانی سے اٹکھیلیاں کر رہی ہوتیں اور آس پاس کی جھاڑیوں میں ننھے ننھے پرندے اپنے گلے پھُلا پھُلا کر چیخ رہے ہوتے۔ یوں کہیے کہ ہم قدرت کو اپنے خواب سے بیدار ہوتا دیکھتے تھے۔ صبح کی ہلکی پھلکی ہوا میں شبنم آلود سبز جھاڑیوں کی دل نواز سرسراہٹ، نالے میں سنگ ریزوں سے کھیلتے ہوئے کف آلود پانی کا شور اور برسات کے پانی میں بھیگی ہوئی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو، چند ایسی چیزیں تھی جو ہمارے سنگین سینوں میں ایک ایسی لطافت پیدا کر دیتی تھیں جو زندگی کے اس دوزخ میں ہمیں بہشت کے خواب دکھانے لگتی۔

ہمیں ہر روز بارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ یعنی سارا دن ہم سڑک کی موریوں اور پتھروں کو صاف کرتے

رہتے تھے۔ یہ کام دلچسپ نہ تھا مگر ہم نے اس کی ناخوش گوار یک آہنگی دور کرنے کے لیے ایک طریقہ ایجاد کرلیا تھا: جب ہم سب اس پہاڑی کے نیچے جمع شدہ ملبے کو اپنے بیلچوں سے ہٹا رہے ہوتے جس کے سنگ ریزے ہر وقت سڑک پر گرتے رہتے تھے، تو ہم ایک سُر میں کوئی پہاڑی گیت شروع کردیتے۔ ملبے کے پتھروں سے ٹکرا کر ہمارے بیلچوں کی جھنکار اس گیت کی تال کا کام دیتی تھی۔ یہ گیت اس افسردگی کو دور کردیتا جو یہ غیر دلچسپ کام کرنے سے ہمارے دلوں میں پیدا ہوجاتی ہے۔[1] جب تک اس کے سُر ہماری چوڑی چھاتیوں میں سے نکلتے رہتے ہم محسوس تک نہ کرتے کہ اس دوران میں ہم نے ملبے کے ایک بہت بڑے ڈھیر کو صاف کرلیا ہے۔

موٹر لاریوں کی آمدورفت سے بھی ہمارا دل بہلا رہتا تھا جو رنگ برنگ مسافروں کو کشمیر سے واپس یا کشمیر کی طرف لے جاتی رہتی تھیں۔ جب کبھی کوئی لاری ہمارے پاس سے گزرتی تو ہم کچھ عرصے کے لیے، اپنی جھکی ہوئی کمریں سیدھی کرکے، سڑک کے ایک طرف کھڑے ہوجاتے اور زمین پر اپنے بیلچے ٹیک کر اس کو سامنے والے موڑ کے عقب میں گم ہوتے دیکھتے رہتے۔ ان لاریوں کو اتنی دور تک دیکھتے رہنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم تھوڑا سستا لیں۔ مگر بعض اوقات ان لاریوں کی شاندار اسباب سے لدی ہوئی چھتیں اور ان کی کھڑکیوں سے مسافروں کے لہراتے ہوئے ریشمی کپڑوں کی جھلک، ہمارے دلوں میں ایک ناقابل بیان تلخی پیدا کردیتی تھی اور ہم اپنے آپ کو ان پتھروں کی طرح فضول اور ناکارہ تصور کرنے لگتے تھے جن کو ہمارے بیلچوں کے دھکے ادھر اُدھر پھینکتے رہتے تھے۔ ان مسافروں کے طرح طرح کے لباس دیکھ کر جن پر یقیناً بہت سے روپے صرف ہوئے ہوں گے، ہم غیر ارادی طور پر اپنے کپڑوں کی طرف دیکھنا شروع کردیتے تھے۔

ہم میں سے اکثر کا لباس: پٹو کے تنگ پائجامے، گاڑھے کی قمیص اور لدھیانے کی صدری پر مشتمل تھا۔ سب کے پائجامے یا تو گھٹنوں پر سے گھس گھس کر اتنے باریک ہوگئے تھے کہ ان میں سے جسم کے بالوں کی پوری نمائش ہوتی تھی یا بالکل پھٹے[2] ہوئے تھے۔ قمیصوں اور صدریوں کی بھی یہی حالت تھی۔ ان پر جگہ جگہ مختلف رنگ کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ قریب قریب ہم سب کی قمیصوں کے بٹن غائب تھے۔ اس لیے سینے عام طور پر کھلے رہتے تھے اور کام کرتے وقت ان پر پسینے کی بوندیں صاف نظر آسکتی تھیں۔

بارہ بجے کے قریب ہم کام چھوڑ کر، کھانا کھانے کے لیے، سڑک کے نیچے اتر کر پیڑ [پیڑوں؟] کے سائے تلے بیٹھ جاتے تھے۔ یہ کھانا ہم صبح کپڑے میں باندھ کر اپنے ساتھ لاتے تھے۔ تین ''ڈھوڈے'' (مکئی کی موٹی روٹیاں) اور عام طور پر سرسوں کا ساگ ہوتا تھا جس کو ہم اپنے بھوکے پیٹ میں ڈالتے تھے۔ کھانے

کے بعد ہم پانی عموماً نالے سے پیا کرتے تھے اور جس روز بارش کی زیادتی کے باعث اس کا پانی زیادہ گدلا ہوجائے [؟گدلا ہوجاتا] تو ہم دور سڑک کے اُس پار چلے جایا کرتے تھے جہاں صاف پانی کا ایک چشمہ پھوٹتا ہے۔

کھانے سے فارغ ہوکر ہم فوراً کام شروع کردیا کرتے تھے۔ گو ہمارا جی چاہتا تھا کہ نرم نرم گھاس پر لیٹ کر تھوڑی دیر ستالیں اور پھر کام شروع کریں مگر یہ کیونکر ہوسکتا تھا، جبکہ ہمیں ہر وقت اس بات کا خیال رہتا تھا کہ پورا کام کیے بغیر اجرت نہ ملے گی۔

ہمارا مطمحِ نظر کام کرنا اور اس حیلے سے اپنا پیٹ پالنا تھا، اور چونکہ ہمیں معلوم تھا کہ ہم میں سے کسی نے اگر اپنے کام میں ذرا سی سست رفتاری یا بے دلی کا اظہار کیا تو، تاش کی گڈی سے ناکارہ جوکر کی طرح، باہر نکال کر پھینک دیا جائے گا۔ اس لیے ہم دل لگا کر کام کیا کرتے تھے تاکہ ہمارے افسروں کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہمارے افسر ہم پر [؟ہم سے] بہت خوش تھے۔ یہ کیونکر ہوسکتا ہے، وہ بڑے آدمی ٹھہرے، اس لیے ان کا جائز و ناجائز طور پر خفا ہونا بھی درست ہوتا ہے۔ کبھی یہ لوگ ایسے ہی ہمارے کام کا معائنہ کرتے وقت اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے ہم پر برس پڑتے تھے لیکن ہم جو ان کی بڑائی کو بخوبی سمجھتے تھے "مہاراج، مہاراج" کہہ کر ان کا غصہ سرد کردیا کرتے۔ ہم جانتے تھے کہ ان کا غصہ بالکل بے جا ہے لیکن یہ احساس ہمارے دلوں میں نفرت کے جذبات پیدا نہیں کرتا تھا۔ شاید اس لیے کہ کورنشوں نے ہم کو بالکل مردہ بنا رکھا ہے۔ یا پھر اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ہم کو یہ خوف دامن گیر رہتا تھا کہ اگر ہم اپنے موجودہ کام سے ہٹادیے گئے تو ہماری روزی بند ہوجائے گی۔

ہم اپنے کام سے مطمئن تھے اور یہی وجہ ہے کہ ہم تھوڑی مزدوری اور زیادہ کام کے مسئلے پر بہت کم غور کیا کرتے تھے۔ اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟ اس لیے کہ یہ کام پڑھے لکھے آدمیوں کا ہے۔ اور ہم بالکل اَن پڑھ اور جاہل تھے۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہماری دنیا بالکل الگ تھلگ تھی جس کی سرحدیں پتھر توڑنے یا ان کو ہٹانے، بارہ بجے روٹی کھانے اور پھر کام کرنے اور اس کے بعد اپنے اپنے ڈیروں میں سوجانے تک ختم ہوجاتی تھیں۔ ہمیں ان حدود کے باہر کسی شے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ دوسرے الفاظ میں اپنا اور اپنے متعلقین کا [اپنے اور اپنے متعلقین کے؟] پیٹ پالنے کے دھندے میں ہم کچھ ایسی بری طرح پھنس کر رہ گئے تھے کہ اس کے [سے؟] باہر نکل کر ہم کسی اور شے کی خواہش کرنا ہی بھول گئے تھے۔

ہمارے کام پر، سڑکوں کے محکمے کی طرف سے ایک نگراں مقرر تھا جو دن کا بیشتر حصہ سڑک کے ایک

طرف چار پائی بچھا کر بیٹھے رہنے میں گزار دیتا۔ یہ ذات کا پنڈت تھا۔ اونچے طبقے کا امتیازی نشان، سیندور کے تلک کی صورت میں، ہر وقت اس کی سفید پیشانی پر چمکتا رہتا تھا۔ ہم اپنے نگراں کو احترام اور عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اول اس لیے کہ وہ برہمن تھا اور دوسرے اس لیے کہ ہم اس کے ماتحت تھے۔ چنانچہ اِدھر اُدھر کے دوسرے کاموں کے علاوہ ہم باری باری دن میں کئی بار اس کے پینے کے لیے حقہ تازہ کیا کرتے تھے اور آگ بنا کر اس کی چلمیں بھرا کرتے تھے۔

پنڈت کا کام صرف یہ تھا کہ صبح، چار پائی پر اپنے گیروے رنگ کی کلف لگی پگڑی اور ریشمی کوٹ اتار کر، اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے، ہماری حاضری لگائے اور پھر ایک بڑے رجسٹر میں کچھ درج کرنے کے بعد ادھر اُدھر ٹہلتا رہے یا حقہ پیتا رہے۔ وہ اپنے کام میں بہت کم دلچسپی لیتا تھا۔ البتہ جب کبھی معائنے کے لیے کسی افسر کی موٹر ادھر سے گزرنا ہوتی تھی تو وہ اپنی چار پائی اٹھوا، ہمارے پاس کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔ اس کی اس چالاکی پر ہم دل ہی دل میں بہت ہنسا کرتے تھے۔

ایک روز جبکہ صبح سے ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور ہم بارہ بجے کھانا کھانے سے فارغ ہو کر حسب معمول اپنے کام میں مشغول تھے، موٹر کے ہارن نے ہمیں چونکا دیا۔ لاریوں کی نسبت ہم موٹروں کے دیکھنے کے بہت شائق تھے۔ اس لیے کہ ان میں ہماری بھوکی نظروں کے دیکھنے کے لیے عجیب و غریب چیزیں نظر آتی تھیں۔ ہم کمریں سیدھی کر کے کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں موڑ کے عقب سے سبز رنگ کی ایک چھوٹی موٹر نمودار ہوئی۔ جب یہ ہمارے قریب پہنچی تو ہم نے دیکھا کہ اس کی باڈی، بارش کے ننھے ننھے قطروں کے نیچے چمک رہی ہے۔ [وہ] بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی، شاید اس لیے کہ پچھلی سیٹ پر جو دو صاحب بیٹھے ہوئے تھے ان میں ایک، اپنی رانوں پر گراموفون رکھے بجا رہے تھے۔ جب یہ موٹر ہمارے مقابل آئی تو ریکارڈ کی آواز، سڑک کی ساتھ [کے ساتھ؟] والی پہاڑی کے پتھروں سے ٹکرا کر، فضا میں گونجی۔ کوئی گا رہا تھا:

نہ میں کسی کا نہ کوئی میرا چھایا چاروں اور اندھیرا
اب کچھ سوجھت ناہیں موہے، اب کچھ ......

آواز[؟] میں بے حد درد تھا۔ ایک لمحے کے لیے ایسا معلوم ہوا کہ ہم شاید بحرِ ظلمات میں ڈوب گئے ہیں۔ جب موٹر، اپنی نیم وا کھڑکیوں سے اس گیت کے دردناک سُر بکھیرتی ہوئی، ہماری نظروں سے اُوجھل ہو گئی تو ہم سب نے ایک آہ بھر کر اپنا کام شروع کر دیا۔

شام کے قریب جب سورج کی سُرخ اور گرم ٹکیا، پگھلے ہوئے تانبے کا رنگ اختیار کر کے ایک سیاہ پہاڑی کے پیچھے چھپ رہی تھی اور اس کی عنابی کرنیں، دراز قد درختوں کی چوٹیوں سے کھیل رہی تھیں: سبز رنگ کی وہی موٹر اُس طرف سے واپس آتی دکھائی دی جدھر وہ دوپہر کو گئی تھی۔ جب ہم نے اُس کے ہارن کی آواز سُنی تو کام چھوڑ کر اس کو دیکھنے لگے۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہ ہمارے آگے سے گزر گئی۔ اور پھر دفعتاً ہم سے آدھی جریب کے فاصلے پر کھڑی ہوگئی۔ وہ باجا جو اُس میں بج رہا تھا، خاموش ہوگیا۔

تھوڑی دیر کے بعد، پچھلی سیٹ سے ایک نوجوان دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ وہ اپنی پتلون کو کمر پر سے درست کرتا ہوا ہمارے پاس سے گزرا اور آہستہ آہستہ اس پُل کی طرف روانہ ہوگیا جو سامنے نالے پر بندھا ہوا تھا۔ یہ خیال کر کے کہ وہ نالے کے پانی کا نظارہ کرنے کے لیے گیا ہے، جیسا کہ عام طور پر ادھر سے گزرنے والے مسافر کیا کرتے تھے، ہم اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔

ابھی ہمیں اپنا کام شروع کیے پانچ منٹ سے زیادہ عرصہ نہ گزرا ہوگا کہ پُل کی طرف سے تالی کی آواز بلند ہوئی۔ ہم نے مڑ کر دیکھا: پتلون پوش نوجوان، سڑک کے ساتھ پتھروں سے چُنی ہوئی دیوار کے پاس کھڑا، غالباً موٹر میں [بیٹھے؟] اپنے ساتھیوں کو متوجہ کر رہا تھا۔ سنگین منڈیر پر، اُس نوجوان سے کچھ دُور، ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔

ہم میں سے ایک نے اپنے بیلچے کو بڑے زور سے موری کی گیلی مٹی میں گاڑتے ہوئے کہا:

''یہ رام دئی ہے۔''

کالو نے جو اُس کے پاس کھڑا تھا، دریافت کیا: ''رام دئی؟''

''سنتو چمار کی لڑکی اور کون؟'' . . اس کے لہجے میں بیلچے کے لوہے ایسی سختی تھی۔

ہم باقی چار حیران تھے کہ اس گفتگو کا مطلب کیا ہے؟ اگر وہ لڑکی جو منڈیر پر بیٹھی ہے، سنتو چمار کی لڑکی ہے تو کون سی اہم بات ہے کہ ہمارا ساتھی اس قدر تیز بول رہا ہے۔ ہم غور کر رہے تھے کہ فضل نے جو ہم سب سے عمر میں بڑا تھا اور نماز روزے کا بہت پابند تھا، اپنی داڑھی کو کھجلاتے ہوئے نہایت ہی متفکرانہ لہجے میں کہا:

''دنیا میں ایک اندھیر مچا ہے . . . خدا معلوم لوگوں کو کیا ہوگیا ہے؟''

یہ سُن کر ہم باقی تین، اصل معاملے سے آگاہ ہو کر سب کچھ سمجھ گئے اور اس احساس نے ہمارے دلوں پر غم اور غصے کی ایک عجیب و غریب کیفیت طاری کر دی۔

تالی کی آواز سُن کر موٹر کی پچھلی نشست سے، پتلون پوش کے ساتھی نے اپنا سر باہر نکالا اور یہ دیکھ کر کہ اس کا دوست اسے بلا رہا ہے، دروازہ کھول کر باہر نکلا اور ہمارے قریب سے گزرتا ہوا پُل کی جانب روانہ ہوگیا ہم، بیوقوف بکریوں کی طرح، اُسے اپنے دوست کے پاس جاتا دیکھتے رہے۔

جب پتلون پوش نوجوان کا دوست اُس کے پاس پہنچ گیا تو وہ دونوں لڑکی کی طرف بڑھے اور اس سے باتیں کرنا شروع کردیں۔ یہ دیکھ کر کالُو پیچ و تاب کھا کر رہ گیا اور خشم آلود لہجے میں بولا:

''بدمعاش......!''

فضل نے سرد آہ بھری اور مغموم لہجے میں کہنے لگا: ''جب سے یہ سڑک بنی ہے اور ایسے بابوؤں کی آمد و رفت زیادہ ہوگئی ہے، یہاں کے تمام علاقوں میں گندگی پھیل گئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ سڑک بننے سے بہت آرام ہوگیا ہے۔ ہوگا، مگر اس قسم کے بے شرمی کے نظارے پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آتے تھے. خدا بچائے!''

اس دوران میں پتلون پوش کے ساتھی نے لڑکی کو بازو سے پکڑ لیا اور غالباً اس کو اُٹھ کر چلنے کے لیے کہا مگر وہ اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔ یہ دیکھ کر کالُو سے نہ رہا گیا اور اس نے رام پرشاد سے کہا: ''آؤ، یہ لوگ تو اب دست درازی کررہے ہیں!''

کالُو یہ کہہ کر اکیلا ہی اُس جانب بڑھنے کو تھا کہ ہم نے اسے روک دیا۔ اور یہ مشورہ دیا کہ تمام معاملہ پنڈت کے گوش گزار کردیا جائے جو چار پائی پر سو رہا ہے۔ اور پھر جو وہ کہے اُس پر عمل کیا جائے۔ اس تجویز کو معقول خیال کرکے، ہم سب پنڈت کے پاس گئے اور اُسے جگا کر سارا قصہ سنا دیا۔ اس نے ہمارے گفتگو کو بڑی بے پروائی سے سُنا، جیسے کوئی بات ہی نہیں اور اُن دونو جوانوں کی طرف دیکھ کر جو اَب رام دئی کو خدا معلوم کس طریقے سے منا کر اپنے ساتھ لا رہے تھے، کہا:

''جاؤ تم اپنا کام کرو۔ میں ان سے خود دریافت کرلوں گا۔''

یہ جواب سن کر، ہم بے چارگی کی حالت میں اپنے کام پر آگئے لیکن ہم سب کی نگاہیں رام دئی اور اُن دونو جوانوں پر جمی ہوئی تھیں جو اَب پُل طے کرکے پنڈت کی چار پائی کے قریب پہنچ رہے تھے۔ لڑکے آگے تھے اور رام دئی تھکی ہوئی گھوڑی کی طرح اُن کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ جب وہ سب پنڈت کے آگے سے گزرنے لگے تو وہ چار پائی پر سے اٹھا دو تین منٹ تک اُن سے کچھ باتیں کرنے کے بعد، وہ بھی اُن کے ساتھ ہولیا۔

جب پنڈت، رام دئی اور وہ نوجوان ہمارے پاس سے گزرے تو ہم نے دیکھا کہ نوجوانوں کے چہروں پر ایک حیوانی جھلک ناچ رہی ہے اور پنڈت بڑے ادب سے ان کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔[۶] رام دئی کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں......

موٹر کے پاس پہنچ کر پنڈت نے آگے بڑھ کر[۷] اُس کا دروازہ کھولا۔ پہلے پتلون پوش، پھر رام دئی اور اس کے بعد دوسرا نوجوان موٹر میں داخل ہوگئے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے موٹر چلی اور نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اور ہم آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔

''شیطان، مردُود!!'' کالُو نے بڑے اضطراب سے یہ دو لفظ ادا کیے۔[۸]

اتنے میں پنڈت آ گیا اور ہم کو مضطرب دیکھ کر ایک مصنوعی آواز میں کہنے لگا: ''میں نے اُن سے دریافت کیا ہے۔ کوئی بات نہیں، وہ لڑکی کو ذرا موٹر کی سیر کرانا چاہتے تھے۔ انسپکٹر صاحب کے مہمان ہیں اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دُور لے جا کر اُسے چھوڑ دیں گے۔ امیر آدمی ہیں، ان کے شغل اسی قسم کے ہوتے ہیں''۔[۹]

یہ کہہ کر پنڈت چلا گیا۔

ہم دیر تک خُدا معلوم کن گہرائیوں میں غرق رہے کہ دفعتاً فضل کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ دو مرتبہ زور سے تھوک کر اُس نے اپنے ہاتھوں کو گیلا کیا اور بیلچے کو سنگ ریزوں کے ڈھیر میں گاڑتے ہوئے کہا:

''اگر امیر آدمیوں کے یہی شغل ہیں تو ہم غریبوں کی بہو بیٹیوں کا اللہ بیلی ہے!''

حواشی

(ان حواشی میں ص سے مراد: منٹو کے افسانے طبع اوّل (۱۹۴۰ء) کا صفحہ ہے۔ دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ یہ گیت وہ افسردگی دور کر دیتا جو یہ غیر دلچسپ کام ہمارے دلوں میں پیدا کر دیتا تھا۔ ص:۲۲

۲۔ ان لفظوں پر طبع اوّل کا صفحہ ۲۲ مکمل ہوا۔ کتاب میں صفحات: ۲۳ تا ۲۹ غیر موجود ہونے کے باعث، اُن سے بنیادی نسخے کے متن کا موازنہ اور متنی تبدیلیوں کی نشان دہی ممکن نہیں۔ آگے کا متن بنیادی نسخے (بالکل پیچھے... ص ۳۵ تا... اور رام دئی تھی، ص: ۴۲) کے مطابق ہے۔ موازنے کا عمل،

طبع اوّل کے ص: ۲۷ سے پھر شروع ہوگا۔ — ص: ۲۲

۳۔ طبع اوّل میں نئے پارے کا آغاز لیکن مدوّن کے نزدیک نئی سطر مناسب ہے۔ — طبع چہارم، ص: ۳۹

۴۔ طبع اوّل کے ص: ۲۷ کا آغاز: ہوئی گھوڑی کی طرح۔ — ایضاً

۵۔ یہ پارا منثور اما (ص: ۲۷۷) میں شامل نہیں۔ — ایضاً

۶۔ وہ دو نوجوان... ناچ رہی تھی... چل رہا تھا — ص: ۲۷

۷۔ پنڈت نے بڑھ کر — ایضاً

۸۔ آہ، شیطان، مردود!... تین لفظ ادا کیے۔ — ایضاً

۹۔ دریافت کیا... بنگلے میں ٹھیرے ہیں... لے جا کر وہ... امیر آدمیوں کے
شغل اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ — ایضاً

پھاہا

گوپال کی ران پر جب یہ بڑا پھوڑا نکلا تو[1] اُس کے اوسان خطا ہوگئے۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ آم خوب ہوئے تھے۔ بازاروں میں، گلیوں میں، دُکان داروں کے پاس، پھیری والوں کے پاس، جدھر دیکھو، آم ہی آم نظر آتے: لال، پیلے، سبز، رنگا رنگ کے ...... سبزی منڈی میں لاکھوں کے حساب سے ہر قسم کے آم آتے تھے اور نہایت سستے داموں[2] فروخت ہو رہے تھے۔ یوں سمجھیے کہ پچھلے برس کی کسر پوری ہو رہی تھی۔

اسکول کے باہر چھوٹو رام پھل فروش سے گوپال نے ایک روز خوب جی بھر کے آم کھائے اور جیب میں سے [؟جیب خرچ میں سے] ایک مہینے کے بچائے ہوئے جتنے پیسے جمع تھے سب کے سب اُن آموں پر خرچ کردیے جن کے گودے اور رس میں شہد گھلا ہوا تھا[3]۔

اُس روز چھٹی کے وقت آم کھانے کے بعد، انگلیاں چاٹتے ہوئے، گوپال کو اسکول کے حلوائی سے دودھ کی لسّی پینے کا خیال آیا تھا۔ اور اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر اُس نے گنڈا رام حلوائی سے پاؤ بھر دودھ کی لسّی بنانے کو کہا بھی تھا مگر حلوائی نے یہ کہہ کر انکار کردیا تھا: ''بابو گوپال! پہلا حساب چُکا دو[4] تو اور ادھار دوں گا، ورنہ نہیں۔''

گوپال نے اگر آم نہ کھائے ہوتے یا اگر اُس کی جیب میں تھوڑے بہت پیسے ہوتے تو وہ وہیں کھڑے کھڑے گنڈا رام کا حساب چکا دیتا۔ اور کچھ نہیں تو نقد دام دے کر لسّی کا وہ گلاس لے لیتا جس میں برف کا ٹکڑا ڈبکیاں لگا رہا تھا اور جسے حلوائی نے برا سا منہ بنا کر اپنے پیچھے لوہے کے تھال پر رکھ دیا تھا مگر گوپال کچھ بھی نہ کرسکا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چوتھے روز اس کی ران پر یہ بڑا پھوڑا نکل آیا۔ اور تین چار روز تک ابھرتا رہا۔

گوپال کے اوسان خطا ہوگئے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے؟ وہ پھوڑے سے اتنا پریشان نہیں تھا جتنا اُس کے درد سے[5] ...... اور سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ پھوڑا دن بدن لال ہوتا چلا جارہا تھا۔ اور اس کے منہ پر بدن کی جھلی پھٹنا شروع ہوگئی تھی۔ بعض اوقات گوپال کو یہ معلوم ہوتا کہ پھوڑے کے

اندر کوئی ہنڈیا اُبل رہی ہے اور اس کے اندر سب کچھ [اندر کا سب کچھ؟] ایک ہی اُبال میں نکلنا چاہتا ہے۔ یہ چیز اُسے بہت پریشان کر رہی تھی اور پھوڑے کی جسامت دیکھ کر ایک مرتبہ تو اُسے ایسا معلوم ہوا تھا کہ اُس کی جیب میں سے کانچ کی گولی نکل کر اس کی ران میں گھس گئی ہے۔

گوپال نے گھر میں پھوڑے کی بابت کسی سے ذکر نہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر پتا جی کو اس کا پتہ چل گیا تو وہ اپنے تھانے کی مکھیوں کا سارا غصہ اسی پر نکالیں گے۔ اور بہت ممکن ہے کہ وہ اُسے اس چھڑی سے پیٹنا شروع کر دیں جو تھوڑے روز ہوئے گردھاری وکیل کے منشی نے وزیر آباد سے انہیں تحفے کے طور پر لا کر دی تھی۔ ماں کا مزاج بھی کم گرم نہ تھا۔ وہ اگر اُسے آم کھانے کے جرم کی سزا نہ دیتی تو اس غلطی پر اس کے کان کھینچ کھینچ کر ضرور لال کر دیتی کہ اُس نے گھر کے باہر اکیلے اکیلے آم کیوں اُڑائے۔ اُس کی ماں کا اصول تھا کہ ''گوپال اگر تجھے زہر بھی کھانا ہو تو گھر میں کھانا!''[۷] گوپال اچھی طرح جانتا تھا کہ اس اصول کے پیچھے اس کی ماں کی صرف یہ خواہش تھی کہ گوپال کے منہ کے ساتھ اس کا منہ بھی چلتا رہے۔

کچھ بھی ہو، گوپال کی ران پر پھوڑا نکلنا تھا، نکل آیا۔ اُس کا باعث، جہاں تک گوپال سمجھ سکا تھا، وہی آم تھے۔ اس نے پھوڑے کی بابت گھر میں کسی سے ذکر نہ کیا تھا۔ اس کو اپنے پتا جی کی وہ ڈانٹ اچھی طرح یاد تھی جو غسل خانے کے اندر بتائی گئی تھی۔ اس کے پتا جی، لالہ پرشوتم داس تھانے دار، لنگوٹ باندھے، نل کی دھار کے نیچے اپنی گنجی چندیا رکھے اور بڑی توند بڑھائے، مونچھوں میں سے آم کا رس چوس رہے تھے۔ سامنے بالٹی میں ایک درجن کے قریب آم پڑے تھے جو انہوں نے صبح سویرے ایک ٹھیلے والے سے اس کا چالان کاٹ کر حاصل کیے تھے۔ گوپال، باپ کی پیٹھ مل رہا تھا اور میل کی مروڑیاں بنا رہا تھا۔ جب اس نے ہاتھ صاف کرنے کے لیے بالٹی میں ڈالے تھے اور چپکے سے ایک آم اڑانا چاہا تھا تو لالہ جی نے بڑے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک کر، [ایک؟] چھوٹے سے آم کو مونچھوں سمیت منہ میں ڈالتے ہوئے کہا تھا: ''بے شرم ...... تجھے بڑوں کا لحاظ کرنا، جانے کب[۷] آئے گا؟''

اور جب گوپال نے رونی صورت بنا کر کہا تھا: ''پتا جی ...... آم کھانے کو میرا بھی تو جی چاہتا ہے!'' تو تھانے دار صاحب نے آم کی گٹھلی چوس کر موری میں پھینکتے ہوئے کہا تھا: ''گوپو! تیرے لیے یہ آم بہت گرم تھا۔ پھوڑے پھنسیاں چاہتا ہے تو بے شک کھا لے ..... دو تین بارشیں اور ہو لینے دے، پھر خوب ٹھاٹ سے کھائیو، تیری ماں سے کہوں گا وہ لسّی[۸] بنا دے گی ...... چل اب پیٹھ مل۔'' اور گوپال نے یہ رکاوٹ کی بات سن کر خاموشی سے اپنے پتا کی پیٹھ ملنا شروع کر دی تھی اور آم کی مٹھاس نے جو پانی اس کے منہ میں

بھر دیا تھا اُسے دیر تک نکلتا رہا تھا۔

اس کے دوسرے روز اس نے آم کھائے اور چوتھے روز اس کی ران پر پھوڑا نکل آیا۔ اس کے پتا کی بات سچی ثابت ہوئی۔

اب اگر گوپال گھر میں کسی سے اس پھوڑے کی بات کرتا[9] تو ظاہر ہے کہ خوب پٹتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خاموش رہا اور پھوڑے کا بڑھاو بند کرنے کی تدبیریں سوچتا رہا۔

ایک روز اس کے پتا جی تھانے سے واپسی پر جب گھر آئے تو اُن کے ہاتھ میں ایک لمبی سی بتی تھی۔ گوپال کی ماں کو آواز دے کر انہوں نے یہ بتی اس کے ہاتھ میں دے کر کہا: ''لے، آج بڑے کام کی چیز لایا ہوں، بمبئی کا مرہم ہے، سو دواؤں کی ایک دوا ہے۔ پھوڑے پھنسی کی بہار ہے، ذرا سا پھاہا پھوڑے پر لگا دو گی، یوں آرام آجائے گا۔ یوں بمبئی کا ''نخالص'' مرہم ہے۔ سنبھال کے رکھ!''

گوپال اپنی بہن نرملا کے ساتھ صحن میں گیند بلا کھیل رہا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ جب تھانے دار جی، مرہم دے کر اپنی پتنی کو کچھ سمجھا رہے تھے تو نرملا نے زور سے گیند پھینکی۔ گوپال کا دھیان باپ کی طرف تھا۔ گیند زور سے پھوڑے پر لگی۔ گوپال بلبلا اٹھا۔ لیکن درد کو اندر ہی اندر پی گیا۔ وہ اسکول میں ماسٹر ہری رام کے مشہور بید کی مار کھا کر درد سہنے کا عادی ہو چکا تھا۔

ادھر گوپال کے پھوڑے پر گیند لگی اُدھر اس کے باپ کی آواز بلند ہوئی: ''ذرا سا پھاہے پر لیپ کر کے لگا دو گی ..... یوں آرام آجائے گا ...... یوں۔'' اور یوں کے ساتھ اس کے باپ کی چٹکی نے گویا گوپال کے سوئے ہوئے دماغ کی چٹکی بھر لی۔ اس کو اپنے درد کا علاج معلوم ہو گیا۔

اُس کی ماں نے مرہم کی بتی سامنے والان میں سلائی کی پٹاری میں رکھ دی۔ گوپال کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی ماں عام طور پر سلائی کی پٹاری ہی میں سب سنبھالنے والی چیزیں رکھا کرتی ہے۔ سب سے زیادہ سنبھالنے والی چیز وہ سوچتا تھا جس سے اُس کی ماں ہر دسویں پندرہویں روز اپنے تنگ ماتھے کے بال صاف کیا کرتی تھی۔ یہ بلاشک و شبہ سلائی کی پٹاری میں اُس پڑیا سمیت موجود تھا جس میں کوئلوں کی سفید راکھ جمع رہتی تھی جو[10] اُس کی ماں بال نوچ کر ماتھے پر لگایا کرتی تھی۔

تاہم گوپال نے اپنا اطمینان کرنے کے لیے گیند والان میں پھینک دی۔ اور اُس کو پلنگ کے نیچے سے نکالتے ہوئے، اپنی ماں کو سلائی کی پٹاری میں مرہم رکھتے دیکھ لیا۔

دوپہر کو اُس نے، اپنی بہن نرملا کو ساتھ ملا کر، چھوٹی قینچی جس سے اُس کا باپ انگلیوں کے ناخن کاٹتا

تھا، مرہم کی بتی اور اپنے باپ کے پائجامے سے بچا ہوا لٹھے کا وہ ٹکڑا حاصل کر لیا جس سے اُس کی ماں، ایک اور ٹکڑے کو ساتھ ملا کر، شلوار کی میانی بنانا چاہتی تھی۔

دونوں، یہ چیزیں لے کر اوپر کوٹھے پر چلے گئے۔ اور برساتی کے نیچے کوئلوں کی بوریوں کے پاس بیٹھ گئے۔

نرملا نے، اپنی جیب سے لٹھے کا ٹکڑا نکال کر، اپنی ران پر شلوار کے پھسلتے ہوئے ریشمی کپڑے پر پھیلا کر، جب گوپال کی طرف اپنی ناچتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا تو اُس وقت ایسا معلوم ہوا کہ گیارہ برس کی یہ کم سن لڑکی جو دریائی سرکنڈے کی طرح نازک اور لچکیلی تھی، ایک بہت بڑے کام کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہی ہے۔

اُس کا ننھا سا دل جو اس وقت تک صرف ماں باپ کی جھڑکیوں اور اپنی گڑیوں کے میلے ہوتے ہوئے چہروں کی فکر سے دھڑکا کرتا تھا، اب اپنے بھائی کی ران پر پھوڑا دیکھنے کے خیال سے دھڑک رہا تھا۔ اُس کے کان کی لویں لال اور گرم ہو گئی تھیں۔

گوپال نے گھر میں اپنے پھوڑے کی بابت کسی سے ذکر نہ کیا تھا لیکن اب اُسے نرملا کو ساری بات سنانا پڑی[۱۳] کہ کس طرح اُس نے چوری چوری آم کھائے اور لسّی پینا بھول گیا اور اس کی ران پر پیسے کے برابر پھوڑا نکل آیا۔ جب اس نے اپنی رام کہانی سنا کر نرملا سے رازدارانہ لہجے میں کہا تھا: ''دیکھ، نرملا! گھر میں یہ بات کسی سے نہ کہیو۔'' تو نرملا نے بڑی متین صورت بنا کر جواب دیا تھا: ''میں پاگل تھوڑی ہوں۔''

گوپال کو یقین تھا کہ نرملا یہ بات اپنے تک ہی رکھے گی۔ چنانچہ اُس نے پاجامے کو اوپر اڑس لیا۔ نرملا کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ جب گوپال نے بیٹھ کر اپنا پھوڑا دکھایا اور نرملا نے دور ہی سے اپنی اُنگلی سے اسے چھوا تو اُس کے بدن پر ایک جھرجھری سی طاری ہو گئی۔ سی سی کرتے ہوئے اُس نے اُبھرے ہوئے لال پھوڑے کی طرف دیکھا اور کہا: ''کتنا لال ہے۔''

''ابھی تو اور ہو گا۔'' گوپال نے اپنے مردانہ حوصلے کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔ نرملا نے حیرت سے کہا: ''سچ؟''[۱۳]

''ابھی تو کچھ [کچھ بھی؟][۱۴] لال نہیں ہے، جو پھوڑا میں نے چرنجی کے منہ پر دیکھا ہے وہ اِس سے کہیں زیادہ بڑا اور لال تھا۔'' گوپال نے پھوڑے پر دو انگلیاں پھیریں۔

''تو ابھی اور[۱۵] بڑھے گا؟'' نرملا آگے سرک آئی۔

''کیا پتا ہے...... ابھی تو بڑھتا چلا جا رہا ہے۔'' گوپال نے جیب میں سے مرہم کی بتی نکال کر کہا۔

نرملا سہم سی گئی۔ ''اس مرہم سے تو آرام آجائے گا نا؟''

گوپال نے بتی کے ایک سرے پر سے کاغذ کی تہہ جدا کی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''اس کا ایک پھاہا لگانے ہی سے پھٹ[۱۶] جائے گا۔''

''پھٹ جائے گا۔'' نرملا کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے کان کے پاس ربڑ کا غبارہ پھٹ گیا ہے۔ اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔

''اور اِس کے اندر جو کچھ ہے پھوٹ بہے گا!'' گوپال نے مرہم کو اُنگلی پر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

نرملا کا گلابی رنگ اب بمبئی کے مرہم کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ اُس نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا: ''مگر یہ پھوڑے کیوں نکلتے ہیں بھیا؟''

''گرم چیزیں کھانے سے!'' گوپال نے ایک ماہر طبیب کے سے انداز میں جواب دیا۔

نرملا کو وہ دو انڈے یاد آگئے جو اُس نے دو ماہ پہلے کھائے تھے۔ وہ کچھ سوچنے لگی۔

گوپال اور نرملا کے درمیان چند باتیں اور ہوئیں۔ اس کے بعد وہ اصلی کام کی طرف متوجہ ہوئے۔ نرملا نے لٹھے کا ایک گول پھاہا کاٹا، بڑی نفاست سے۔ یہ روپے کے برابر تھ اور اس کی گولائی میں مجال ہے جو ذرا سا نقص بھی [؟ذرا سا بھی نقص] ہو۔ اُسی طرح گول تھا جس طرح نرملا کی ماں کے ہاتھ کی بنی ہوئی روٹی گول ہوتی تھی۔

گوپال نے اُس پھاہے پر تھوڑا سا مرہم لگا دیا۔ اور اُسے اچھی طرح پھیلانے کے بعد پھوڑے کی طرف غور سے دیکھا۔ نرملا، گوپال کے اوپر جھکی ہوئی تھی اور گوپال کی ہر حرکت کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ گوپال نے جب پھاہا اپنے پھوڑے کے اوپر جما دیا [جمایا؟] تو وہ[۱۷] کانپ گئی جیسے اُس کے بدن پر کسی نے برف کا ٹکڑا رکھ دیا ہے۔

''اب آرام آجائے گا نا؟'' نرملا نے نیم سوالیہ انداز میں کہا۔

گوپال جواب دینے بھی نہ پایا تھا کہ برساتی کے برابر والی سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ یہ اُن کی ماں تھی جو غالباً کوئلے لینے کے لیے آرہی تھی۔

گوپال اور نرملا نے بیک وقت ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اور کچھ کہے سنے بغیر سب چیزیں اکٹھی کر کے اُس پرانے صندوق کے پیچھے چھپا دیں جہاں ان کی بہی سندری بچے دیا کرتی تھی اور چپکے سے بھاگ گئے۔

یہاں سے بھاگ کر گوپال جب نیچے گیا تو اُس کے باپ نے اُسے باہر فالودہ لانے کے لیے بھیج دیا۔ جب واپس آیا تو اسے گلی میں نرملا ملی۔ فالودے کا گلاس اُس کے حوالے کر کے وہ چرنجی کے گھر چلا گیا۔ اور اس طرح اُن چیزوں کو اپنی اپنی جگہ[۱۸] پر رکھنا بھول گیا جو ماں کے اچانک آ جانے سے اس نے اور نرملا نے صندوق کے پیچھے چھپا دی تھیں۔

چرنجی کے یہاں وہ دیر تک تاش کھیلتا رہا۔ کھیل سے فارغ ہو کر جب وہ چرنجی کی بغل میں ہاتھ ڈالے، کمرے سے باہر نکل رہا تھا تو کسی بات پر اُس کا دوست ہنسا اور اس کے داہنے گال پر پھوڑے کا نشان لمبی سی لکیر بن گیا۔ اُس کو دیکھ کر فوراً ہی اپنے پھوڑے کا گوپال کو خیال آیا اور اس خیال کے ساتھ ہی اُسے وہ چیزیں یاد آ گئیں جو صندوق کے پیچھے پڑی تھیں۔ چرنجی کی بغل سے ہاتھ نکال کر وہ بھاگا۔[۱۹]

گھر پہنچ کر اُس نے وہاں کی فضا دیکھی: اس کی ماں صحن میں بیٹھی اُس کے باپ سے ''ملاپ'' اخبار کی خبریں سن رہی تھی، دونوں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ گوپال اُن کے پاس سے گزرا۔ دونوں نے اس کی طرف دیکھا مگر اس سے کوئی بات نہ کی۔ گوپال کو اطمینان ہو گیا کہ ابھی تک اُس کی ماں نے اپنی سلائی کی پٹاری نہیں دیکھی۔ چنانچہ وہ چپکے سے کوٹھے پر چلا گیا۔

بڑے[۲۰] کوٹھے کو طے کر کے دروازے کے اندر داخل ہونے والا ہی تھا کہ اس کے قدم رُک گئے۔

صندوق کے پاس بیٹھی نرملا کچھ کر رہی تھی۔ گوپال پیچھے ہٹ گیا اور چھپ کر دیکھنے لگا:

نرملا بڑے انہماک سے پھاہا تراش رہی تھی۔ اُس کی پتلی پتلی انگلیاں قینچی سے بڑا نفیس کام لے رہی تھیں۔ پھاہا کاٹنے کے بعد اُس نے تھوڑا سا مرہم نکال کر اُس پر پھیلایا اور گردن جھکا کر اپنے کرتے کے بٹن کھولے۔ سینے کے داہنی طرف چھوٹا سا اُبھار تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تکلی پر صابن کا چھوٹا سا نامکمل بلبلہ اٹکا ہوا ہے۔

نرملا نے پھاہے پر پھونک ماری اور اُسے اُس ننھے سے ابھار پر جما دیا۔

حواشی

(ان حواشی میں ص سے مراد: منٹو کے افسانے طبع اوّل (۱۹۴۰ء) کا صفحہ ہے۔ دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ یہ بڑا پھوڑا نکل آیا اور ص:۲۹

۲۔ بنیادی نسخے میں فقرہ. لکھوں کے حساب سے، کا پہلا لفظ بیک نظر 'کھول' پڑھا جا رہا ہے۔ لفظ ماقبل 'میں' اور اس کے درمیان کچھ فصل ہے؛ فصل میں چند غیر واضح نشان ہیں جو کبھی ادھورا کو ما محسوس ہوتے ہیں تو کبھی کتابت کے کاغذ یا پلیٹ سے کھرچے ہوئے لام الف کا چھوٹا سا نچلا حصہ۔ اشاعتِ اوّل میں مطبوعہ لفظ 'لاکھوں' کو نگاہ میں رکھتے ہوئے بنیادی نسخے پر نظر ڈالی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ پروف خواں کی غلط نشان دہی یا اپنی نگاہ کی چوک کے باعث کاتب نے نون غنہ کا طویل آغاز گھٹانے کے بجائے لام الف کو کھرچ دیا ہے لہٰذا مدوّن نے بنیادی نسخے کے بجائے طبع اوّل کی لفظیات کو ترجیح دی ہے... داموں پر — ص ۲۹

۳۔ کھلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ — ایضاً

۴۔ چکادے — ایضاً

۵۔ سمجھ میں نہیں آتا... جتنا درد [ق] سے تھ — ص ۳۰

۶۔ گھر میں کہا۔ — ایضاً

۷۔ نکلتا تھا اور نکل آیا... کرنا نہ جانے کب — ص ۳۱

۸۔ بہت گرم ہیں... وہ لسّی بھی — ایضاً

۹۔ کی بابت ذکر کرتا — ایضاً

۱۰۔ پھاہے پر لیپ کر کے — ایضاً

۱۱۔ یہ اس کی ماں — ص ۳۲

۱۲۔ اب نرملا کو ساری بات کہہ سنائی تھی — ایضاً

۱۳۔ ''ابھی یہ اور ہوگا''... حیرت سے پوچھا: ''کیا؟'' — ص ۳۳

۱۴۔ یہ تو ابھی کچھ لال — ایضاً

۱۵۔ تو ابھی یہ اور — ایضاً

۱۶۔ لگانے ہی سے یہ پھٹ — ایضاً

۱۷۔ مرہم لگایا... تو نرملا کانپ گئی — ص ۳۴

۱۸۔ اور جب وہ واپس... ان کی جگہ — ایضاً

۱۹۔ گوپال کو فوراً ہی اپنے پھوڑے کا خیال... وہ جرجی کی بغل سے — ایضاً

۲۰۔ وہ بڑے — ص ۳۵

ٹیڑھی لکیر[1]

اگر سڑک سیدھی ہو...... بالکل سیدھی، تو اُس پر اُس کے قدم منوں بھاری ہو جاتے تھے۔ وہ کہا کرتا تھا۔ ''یہ زندگی کے خلاف ہے جو پیچ در پیچ راستوں سے بھری[2] ہے۔'' جب ہم دونوں باہر سیر کو نکلتے تو اُس دوران میں وہ کبھی سیدھے راستے پر نہ چلتا۔ اُسے باغ کا وہ کونا بہت پسند تھا جہاں لہراتی ہوئی روشیں بنی ہوئی تھیں۔

ایک بار اس نے اپنی ٹانگوں کو سینے کے ساتھ جوڑ کر، بڑے دل کش انداز میں، مجھ سے کہا تھا: ''عباس! اگر مجھے اور کوئی کام نہ ہو تو بخدا میں اپنی ساری زندگی کشمیر کی پہاڑی سڑکوں پر چڑھنے اُترنے میں گزار دوں ...... کیا پیچ ہیں!..... ابھی تم مجھے نظر آرہے ہو اور ایک موڑ مڑنے کے بعد میری نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہو...... کتنی پُراسرار چیز ہے!. ... سیدھے راستے پر تم ہر آنے والی چیز دیکھ سکتے ہو مگر یہاں آنے والی چیزیں تمہاری آنکھوں کے سامنے بالکل اچانک آجائیں گی[3] ...... موت کی طرح اچانک ... .اس میں کتنا مزہ ہے!''

وہ ایک دُبلا پتلا نوجوان تھا، بے حد دُبلا۔ اس کو ایک نظر دیکھنے سے اکثر اوقات معلوم ہوتا کہ ہسپتال کے کسی بستر سے کوئی زرد رُو بیمار اُٹھ کر چلا آیا ہے۔ اس کی عمر بمشکل بائیس برس کے قریب ہوگی مگر بعض اوقات وہ اس سے بہت زیادہ عمر کا معلوم ہوتا تھا۔ اور عجیب بات ہے کہ کبھی کبھی اس کو دیکھ کر میں یہ خیال کرنے لگتا[4] کہ وہ بچہ بن گیا ہے۔ اس میں ایکا ایکی اس قدر تبدیلی ہو جایا کرتی تھی کہ مجھے اپنی نگاہوں کی صحت پر شبہ ہونے لگ جاتا تھا۔

آخری ملاقات سے دس روز پہلے، جب وہ مجھے بازار میں ملا تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ ہاتھ میں[5] ایک بڑا سیب لیے اُسے دانتوں سے کاٹ کر کھا رہا تھا۔ اس کا چہرہ بچوں کے مانند ایک ناقابلِ بیان خوشی کے باعث تمتمایا ہوا تھا۔ اس کا سارا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ سیب بہت لذیذ ہے۔

سیب کے رس سے بھرے ہوئے ہاتھوں کو، بچوں کے مانند، اپنی پتلون سے صاف کر کے اس نے میرا ہاتھ بڑے جوش سے دبایا اور کہا: ''عباس! وہ دو آنے مانگتا تھا مگر میں نے بھی[6] ایک ہی آنے میں خریدا۔''

اس کے ہونٹ ظفر مندانہ ہنسی کے باعث تھرتھرانے لگے۔ پھر اس نے جیب سے ایک چیز نکالی اور

میرے ہاتھ میں دے کر کہا: ''تم نے لٹو تو بہت ۷ دیکھے ہوں گے، پر ایسا لٹو کبھی دیکھنے میں نہ آیا ہوگا ... .. اوپر کا بٹن دباؤ...... دباؤ...... ارے دباؤ!''

میں سخت متحیر ہو رہا تھا لیکن اس نے میری طرف دیکھے بغیر لٹو کا بٹن دبا دیا جو میری ہتھیلی پر سے اُچھل کر سڑک پر لنگڑانے لگا...... اس پر خوشی کے مارے میرے دوست نے اُچھلنا شروع کر دیا۔

''دیکھو، عباس، دیکھو، اس کا ناچ۔'' میں نے لٹو کی طرف دیکھا جو میرے سر کی مانند گھوم رہا تھا۔ ہمارے اردگرد بہت سے آدمی جمع ہو گئے تھے۔ شاید وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ میرا دوست دوائیں بیچے گا۔

''لٹو اٹھاؤ اور چلیں...... [؟اور چلو] لوگ ہمارا تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو رہے ہیں!''

میرے لہجے میں شاید تھوڑی سی تیزی تھی کیونکہ اس کی ساری خوشی ماند پڑ گئی اور اس کے چہرے کی تمتماہٹ غائب ہو گئی۔ وہ اُٹھا اور اس نے میری طرف کچھ اس انداز سے دیکھا کہ مجھے ایسا معوم ہوا جیسے ۸ ایک ننھا سا بچہ رونی صورت بنا کر کہہ رہا ہے: میں نے تو کوئی بُری بات نہیں کی، پھر مجھے کیوں جھڑکا گیا ہے؟

اس نے لٹو وہیں سڑک پر چھوڑ دیا اور میرے ساتھ چل پڑا۔ گھر تک میں نے اور اس نے کوئی بات نہ کی۔ گلی کے نکڑ پر پہنچ کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس قلیل عرصے میں اس کے چہرے پر انقلاب ۹ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ مجھے ایک تفکر زدہ بوڑھا نظر آیا۔

میں نے پوچھا: ''کیا سوچ رہے ہو؟''

اس نے جواب دیا ''میں یہ سوچ رہا ہوں، اگر خدا کو انسان کی زندگی بسر کرنی پڑ جائے تو کیا ہو؟''

وہ اسی قسم کی بے ڈھنگی باتیں سوچا کرتا تھا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو نرالا ظاہر کرنے کے لیے ایسے خیالات کا اظہار کرتا ہے مگر یہ بات غلط تھی۔ دراصل اس کی طبیعت کا رجحان ہی ایسی چیزوں کی طرف رہتا تھا جو کسی اور دماغ میں نہیں آتی تھیں۔

آپ یقین نہیں کریں گے مگر اس کو اپنے جسم پر رِستا ہوا زخم بہت پسند تھا۔ وہ کہا کرتا تھا: اگر میرے جسم پر ہمیشہ کے لیے کوئی زخم بن جائے تو کتنا اچھا ہو ..... مجھے درد میں بڑا مزہ آتا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اسکول میں ایک روز اس نے میرے سامنے اپنے بازو کو استرے کے تیز بلیڈ سے زخمی کیا، صرف اس لیے کہ کچھ روز اس میں درد ہوتا رہے۔ ٹیکا اس نے کبھی اس خیال سے نہیں لگوایا تھا کہ اس سے ہیضے، پلیگ یا ملیریا کا خوف نہیں رہتا۔ اس کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی تھی کہ دو تین روز اس کا بدن بخار کے باعث تپتا رہے۔ چنانچہ جب کبھی وہ بخار کو دعوت دیا کرتا تھا تو مجھ سے'' کہا کرتا تھا:

''عباس! میرے گھر ایک مہمان آنے والا ہے۔ اس لیے تین روز تک مجھے فرصت نہیں ملے گی۔''

ایک روز میں نے اس سے پوچھا کہ تم آئے دن ٹیکا کیوں لگواتے ہو، اس" نے جواب دیا: ''عباس ، میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ ٹیکا لگوانے سے جو بخار چڑھتا ہے اُس میں کتنی شاعری ہوتی ہے..... جب جوڑ جوڑ میں درد ہوتا ہے اور اعضا شکنی ہوتی ہے تو بخدا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم کسی نہایت ہی ضدی آدمی کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہو...... اور پھر بخار بڑھ جانے سے جو خواب آتے ہیں۔ واللہ، کس قدر بے ربط ہوتے ہیں...... بالکل ہماری زندگی کے مانند! ابھی تم یہ دیکھتے ہو کہ تمہاری شادی کسی نہایت ہی حسین عورت سے ہو رہی ہے، دوسرے لمحے یہی [وہی؟] عورت تمہاری آغوش میں ایک قوی ہیکل پہلوان بن جاتی ہے۔''

میں اس کی ان عجیب وغریب باتوں کا عادی ہوگیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ایک روز مجھے اس کے دماغی توازن پر شبہ ہونے لگا۔ گذشتہ مئی میں مَیں نے اُس سے اپنے [ایک ایسے؟] استاد کا تعارف کرایا، جس کی میں بے حد عزّت کرتا تھا...... ڈاکٹر شاکر نے اُس کا ہاتھ بڑی گرم جوشی سے دبایا اور کہا: ''میں آپ سے مل کر بہت خوش ہُوا ہوں۔''

''اس کے برعکس، مجھے آپ سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔'' یہ میرے دوست کا جواب تھا جس نے مجھے بے حد شرمندہ کیا۔ آپ قیاس فرمایئے کہ اُس وقت میری کیا حالت ہوئی ہوگی۔ شرم کے مارے میں اپنے اُستاد کے سامنے گڑا جا رہا تھا اور وہ بڑے اطمینان سے سگریٹ کے کش لگا کر، ہال میں ایک تصویر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ڈاکٹر شاکر نے میرے دوست کی اس حرکت کو بُرا سمجھا [کا بُرا مانا؟] اور تخلیے میں مجھ سے، بڑے تیز لہجے میں، کہا: ''معلوم ہوتا ہے تمہارے دوست کا دماغ ٹھکانے نہیں۔''

میں نے اُس کی طرف سے خود معذرت طلب کی اور معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ میں واقعی بے حد شرمندہ تھا کہ ڈاکٹر شاکر کو میری وجہ سے ایسا سخت فقرہ سننا پڑا۔

شام کو میں اپنے دوست کے پاس گیا، اس ارادے کے ساتھ کہ اس سے اچھی طرح باز پُرس کروں گا اور اپنے دل کی بھڑاس نکالوں گا۔ وہ مجھے لائبریری کے باہر ملا۔ میں نے چھوٹتے ہی اس سے کہا: ''تم نے آج ڈاکٹر شاکر کی بہت بے عزتی کی...... معلوم ہوتا ہے تم نے مجلسی آداب کو خیر باد کہہ دیا ہے۔''

وہ مسکرایا[۱۲] ''ارے چھوڑو اس قصے کو۔ آؤ کوئی اور کام کی بات کریں۔''

یہ سُن کر میں اُس پر برس پڑا۔ خاموشی سے میری تمام باتیں سُن کر اُس نے صاف صاف کہہ دیا:

''اگر مجھ سے مل کر کسی شخص کو خوشی حاصل ہوتی ہے تو ضروری نہیں کہ اُس سے مل کر مجھے بھی خوشی حاصل ہو ..... اور پھر پہلی ملاقات پر صرف ہاتھ ملانے سے میں نے اُس کے دل میں خوشی پیدا کر دی!...... میری سمجھ[۱۳] میں نہیں آتا...... تمہارے ڈاکٹر صاحب نے اس روز پچیس آدمیوں سے تعارف کیا اور ہر شخص سے انہوں نے یہی کہا کہ آپ سے مل کر مجھے بڑی مسرت حاصل ہوئی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہر شخص ایک ہی قسم کے تاثرات پیدا کرے؟ ..... تم مجھ سے ایسی فضول باتیں نہ کرو...... آؤ اندر چلیں!''

میں ایک سحر زدہ آدمی کی طرح اس کے ساتھ ہولیا اور لائبریری کے اندر جا کر اپنا سب غصّہ بھول گیا۔ بلکہ یہ سوچنے لگا کہ میرے دوست نے جو کچھ کہا تھا، صحیح ہے۔ لیکن فوراً ہی میرے دل میں ایک حسد سا پیدا ہوا۔ کہ اس شخص میں اتنی قوت کیوں ہے کہ وہ [یہ؟] اپنے خیالات کا اظہار بے دھڑک کر دیتا ہے۔ پچھلے دنوں میرے ایک افسر کی دادی مرگئی تھی اور مجھے اس کے سامنے مجبوراً اپنے اوپر غم کی کیفیت طاری کرنی پڑی تھی اور اُس سے، اپنی مرضی کے خلاف، دس پندرہ منٹ تک افسوس ظاہر کرنا پڑا تھا۔ اس کی دادی سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کی موت کی خبر نے میرے دل پر کوئی اثر نہ کیا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے نقلی جذبات تیار کرنے پڑے تھے۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ میرا کیریکٹر اپنے دوست کے مقابلے میں بہت کمزور ہے۔ اس خیال ہی نے میرے دل میں حسد کی چنگاری پیدا کی تھی اور میں اپنے حلق میں ایک ناقابل برداشت[۱۴] تلخی محسوس کرنے لگا تھا لیکن یہ ایک وقتی اور ہنگامی جذبہ تھا جو ہوا کے ایک تیز جھونکے کے مانند آیا اور گزر گیا۔ میں بعد میں اس پر بھی نادم ہوا۔

مجھے اُس سے بے حد محبت تھی لیکن اس محبت میں غیر ارادی طور پر کبھی کبھی نفرت کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔ ایک روز میں نے اس کی صاف گوئی سے متاثر ہو کر[۱۵] کہا تھا: ''یہ کیا بات ہے کہ بعض اوقات میں تم سے نفرت کرنے لگتا ہوں۔'' اور اس نے مجھے یہ جواب دے کر مطمئن کر دیا تھا ''تمہارا دل جو میری محبت سے بھرا ہوا ہے، ایک ہی چیز کو بار بار دیکھ کر کبھی کبھی تنگ آجاتا ہے اور کسی دوسری شے کی خواہش کرنے لگ جاتا ہے...... اور پھر اگر تم مجھ سے کبھی کبھی نفرت نہ کرو تو مجھ سے ہمیشہ محبت بھی نہیں کر سکتے ..... انسان اسی قسم کی الجھنوں کا مجموعہ ہے۔''

میں اور وہ اپنے وطن سے بہت دُور تھے، ایک ایسے بڑے شہر میں جہاں زندگی تاریک قبر سی معلوم ہوتی ہے مگر اُسے کبھی اُن گلیوں کی یاد نہ ستاتی تھی جہاں اس نے اپنا بچپن اور اپنے شباب کا زمانۂ آغاز گزارا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسی شہر میں پیدا ہوا ہے۔ میرے چہرے سے ہر شخص یہ معلوم کر سکتا ہے کہ میں

غریب الوطن ہوں مگر میرا دوست ان جذبات سے یکسر عاری ہے۔ وہ کہا کرتا ہے: وطن کی یاد بہت بڑی کمزوری ہے۔ ایک جگہ سے خود کو چیپک دینا[16] ایسا ہی ہے جیسے ایک آزادی پسند سانڈ کو کھونٹے سے باندھ دیا جائے۔

اس قسم کے خیالات کے مالک کی جو ہر شے کو ٹیڑھی عینک سے دیکھتا ہو اور مُروجہ رسوم کے خلاف چلتا ہو، باقاعدہ نکاح خوانی ہو، یعنی پرانی رُسوم کے مطابق اُس کا عقد عمل میں آئے تو کیا آپ کو تعجب نہ ہوگا؟...... مجھے یقین ہے کہ ضرور ہوگا۔

ایک روز شام کو جب وہ میرے پاس آیا اور بڑے سنجیدہ انداز میں، اس نے مجھے اپنے نکاح کی خبر سنائی تو آپ یقین کریں، میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس حیرت کا باعث یہ چیز نہ تھی کہ وہ شادی کر رہا ہے۔نہیں، مجھے تعجب اس بات پر تھا کہ اس نے لڑکی بغیر دیکھے، پُرانے خطوط کے مطابق، نکاح کی رسم میں شامل ہونا قبول کیسے کرلیا؟ جبکہ وہ ہمیشہ اُن مولویوں کا مضحکہ اڑایا کرتا تھا جو لڑکی اور لڑکے کو رشتۂ ازدواج میں باندھتے ہیں۔ وہ کہا کرتا تھا: یہ مولوی مجھے بڈھے[17] اور گٹھیا کے مارے پہلوان معلوم ہوتے ہیں جو اپنے اکھاڑے میں چھوٹے چھوٹے لڑکوں کی کشتیاں دیکھ کر اپنی حرص پوری کرتے ہیں۔

اور پھر وہ شادی یا نکاح پر لوگوں کے جھگڑے کا بھی تو قائل نہ تھا مگر..... اس کا نکاح پڑھا گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے مولوی نے ...... اُس مولوی نے جس سے اس کو سخت چڑ تھی اور جس کو وہ بوڑھا طوطا کہا کرتا تھا، اُس کا نکاح پڑھا۔ چھوہارے بانٹے گئے اور میں ساری کارروائی یوں دیکھ رہا تھا گویا سوتے میں کوئی سپنا دیکھ رہا ہوں۔

نکاح ہوگیا۔ دوسرے لفظوں میں انہونی بات ہوگئی۔ اور جو تعجب مجھے پہلے پیدا ہوا تھا، بعد میں بھی برقرار رہا۔ مگر میں نے اس کے متعلق اپنے دوست سے ذکر نہ کیا۔ اس خیال سے کہ شاید اسے ناگوار گزرے۔ لیکن دل ہی دل میں مَیں اس بات پر خوش[18] تھا کہ آخر کار اُسے اُس دائرے میں لوٹنا پڑا [آنا پڑا؟] جس میں دوسرے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

نکاح کر کے میرا دوست اپنے اصولوں کے ٹیڑھے مینار سے بہت بُری طرح پھسلا تھا اور اُس گڑھے میں سر کے بل آ گرا تھا جس کو وہ بے حد غلیظ کہا کرتا تھا۔ جب میں نے یہ سوچا تو میرے جی میں آئی کہ اپنے کج رفتار دوست کے پاس جاؤں اور اتنا ہنسوں، اتنا ہنسوں کہ پیٹ میں بل پڑ جائیں۔ مگر جس روز میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی اسی روز وہ دوپہر کو میرے گھر آیا۔

نکاح کو تین مہینے گزر گئے تھے اور اس دوران میں وہ ہمیشہ اُداس اُداس رہتا تھا۔ اس کا چہرہ چمک [؟دمک] رہا تھا اور ناک جو چند روز پہلے، بھدی نیام کے اندر چھپی ہوئی تلوار کا نقشہ پیش کرتی تھی، اس پر سب سے نمایاں[۱۹] نظر آ رہی تھی۔

وہ میرے کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اور سگریٹ سلگا کر میرے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے ہونٹوں کے اختتامی کونے کپکپا رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ مجھے کوئی بڑی اہم بات سنانے والا ہے۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

اس نے سگریٹ کے دھوئیں سے چھلا بنایا اور اس میں اپنی انگلی گاڑتے ہوئے مجھ سے کہا: ''عباس !میں کل یہاں سے جا رہا ہوں۔''

''جا رہے ہو؟'' میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

''میں کل یہاں سے جا رہا ہوں، شاید ہمیشہ کے لیے۔ میں اس خبر سے تمہیں مطلع کرنے کے لیے نہ آتا۔ مگر مجھے تم سے کچھ روپے لینا ہیں جو تم نے مجھ سے قرض لے رکھے ہیں... کیا تمہیں یاد ہے؟''

میں نے جواب دیا: ''یاد ہے، پر تم جا کہاں رہے ہو؟ ..... اور پھر ہمیشہ کے لیے ؟''

''بات یہ ہے کہ مجھے اپنی بیوی سے عشق ہو گیا ہے۔ اور کل رات میں اُسے بھگا کر اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں...... وہ تیار ہو گئی ہے!''

یہ سن کر مجھے اس قدر حیرت ہوئی کہ میں بے وقوفوں کی مانند ہنسنے لگا اور دیر تک ہنستا رہا۔ وہ اپنی منکوحہ بیوی کو جسے وہ جب چاہتا انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ لا سکتا تھا، اغوا کر کے لے جا رہا تھا..... بھگا کر لے جا رہا تھا۔ جیسے، جیسے۔ .... میں کیا کہوں کہ اُس وقت میں نے کیا سوچا .... دراصل میں کچھ سوچنے کے قابل ہی نہ رہا تھا۔

مجھے ہنستا دیکھ کر اس نے ملامت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا: ''عباس! یہ ہنسنے کا موقع نہیں۔ کل رات وہ اپنے مکان کے ساتھ والے باغ میں میرا انتظار کرے گی اور مجھے سفر کے لیے کچھ روپیہ فراہم کر کے، اُس کے پاس ضرور پہنچنا چاہیے، وہ کیا کہے گی، اگر میں اپنے وعدے پر قائم نہ رہا تمہیں کیا معلوم، میں نے کن کن مشکلوں کے بعد رسائی حاصل کر کے، اُس کو اس بات پر آمادہ کیا ہے!''

میں نے پھر ہنسنا چاہا مگر اس کو غایت درجہ سنجیدہ و متین دیکھ کر میری ہنسی دب گئی اور مجھے قطعی طور پر معلوم ہو گیا کہ وہ واقعی اپنی منکوحہ بیوی کو بھگا کر لے جا رہا ہے۔ کہاں؟ .. ... یہ مجھے معلوم نہ تھا۔

میں زیادہ تفصیل میں نہ گیا اور اسے وہ روپے ادا کر دیے جو میں نے عرصہ ہوا اس سے قرض لیے تھے

اور یہ سمجھ کر ابھی تک نہ دیے تھے کہ وہ نہ لے گا۔ مگر اس نے خاموشی سے نوٹ گن کر اپنی جیب میں ڈالے اور بغیر ہاتھ ملائے رخصت ہونے ہی والا تھا کہ میں نے آگے بڑھ کر اس سے کہا: ''تم جا رہے ہو[۲۰] ...... لیکن مجھے بھلا نہ دینا!''

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مگر اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔

''میں کوشش کروں گا۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں[۲۱] بہت دیر تک جہاں کھڑا تھا بُت بنا رہا۔

جب اُدھر اس کے سسرال[۲۲] والوں کو پتہ چلا کہ اُن کی لڑکی رات رات میں کہیں غائب ہوگئی ہے تو ایک ہیجان برپا ہوگیا۔ ایک ہفتے تک انہوں نے اُسے ادھر اُدھر تلاش کیا اور کسی کو اس واقعے کی خبر تک نہ ہونے دی۔ مگر بعد میں لڑکی کے بھائی کو میرے پاس آنا پڑا اور مجھے اپنا ہم راز بنا کر، اسے ساری رام کہانی سنانی پڑی۔

وہ بے چارے یہ خیال کر رہے تھے کہ لڑکی کسی اور آدمی کے ساتھ بھاگ گئی ہے اور لڑکی کا بھائی میرے پاس اس غرض سے آیا تھا کہ ان کی طرف سے میں اپنے دوست کو اس تلخ واقعے سے آگاہ کروں۔ وہ بے چارہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔

جب میں نے اُس کو اصل واقعے سے آگاہ کیا تو حیرت کے باعث اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی [پھٹی کی پھٹی؟] رہ گئیں۔ اِس بات سے تو اُسے بہت ڈھارس ہوئی کہ اُس کی بہن کسی غیر مرد کے ساتھ نہیں[۲۳] گئی بلکہ اپنے شوہر کے پاس ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میرے دوست نے یہ فضول اور نازیبا حرکت کیوں کی؟

''بیوی اُسی کی تھی۔ جب چاہتا لے جاتا۔ مگر اس حرکت سے تو یہ معلوم[۲۴] ہوتا ہے ...... جیسے ...... جیسے ......''

وہ کوئی مثال پیش نہ کر سکا۔ اور میں بھی اُسے[۲۵] کوئی اطمینان دہ جواب نہ دے سکا۔

کل صبح کی ڈاک سے مجھے اُس کا خط ملا جس کو میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھولا۔ لفافے میں ایک کاغذ تھا جس پر ایک ٹیڑھی لکیر کھینچی ہوئی تھی ...... خالی لفافہ ایک طرف رکھ کر میں اُس عمود کی طرف دیکھنے لگا ...... جو میں نے بورڈ پر چپکے ہوئے کاغذ پر گرایا تھا۔

حواشی

(ان حواشی میں ص سے مراد: منٹو کے افسانے طبع اوّل (۱۹۴۰ء) کا صفحہ ہے۔ دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ طبع اوّل میں افسانے کے عنوان کے نیچے، قوسین میں، خفی قلم سے یہ ضمنی عنوان بھی شائع ہوا تھا: (ایک سٹڈی) — ص: ۳۶
۲۔ بھری ہوئی — ایضاً
۳۔ آئیں گی — ایضاً
۴۔ اوقات یہ معلوم تھا کہ ... خیال کرنے لگتا تھا — صص: ۳۶ و ۳۷
۵۔ یہ بڑا عیب — ص: ۳۷
۶۔ آنے مانگ رہا تھا مگر میں نے اسے — ایضاً
۷۔ لٹو بہت — ایضاً
۸۔ معلوم ہوا کہ ایک — ایضاً
۹۔ نکڑ کے پاس پہنچ کر ... ایک انقلاب — ایضاً
۱۰۔ یہ کہا کرتا — ص: ۳۸
۱۱۔ لگواتے ہو، تو اُس — ایضاً
۱۲۔ وہ مسکرا دیا — ص: ۳۹
۱۳۔ باتیں سن کر اس نے کہا: ”لیکن کیا میں جھوٹ بولتا — اس سے مل کر مجھے قطعاً خوشی نہ ہوئی۔ اس لیے میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا — اگر مجھ سے ... یہ ضروری ... یہ میری سمجھ — ایضاً
۱۴۔ ناقابلِ بیان — ص: ۴۰
۱۵۔ اس سے کہا — ایضاً
۱۶۔ کہا کرتا تھا ... طبعِ اوّل میں ”چپک دینا“ شائع ہوا ہے بنیادی نسخے (ص: ۶۱) میں ”چپک“ غالباً کتابت کا سہو ہے لٰہذا مدوّن کے نزدیک ”چپک دینا“ راجح ہے۔ — ایضاً
۱۷۔ جب ایک روز شام کو وہ ... اس نے بڑے سنجیدہ انداز میں مجھے ... لڑکی کو بغیر ... کیسے قبول ... ایسے بڈھے — صص: ۴۰ تا ۴۱
۱۸۔ میں نے اس کی بابت ... بہت خوش — ص: ۴۱
۱۹۔ چہرہ پگھلے ہوئے تانبے کے مانند چمک ... اس کی ناک ... اس کے

چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں — ص ۴۱۰

۲۰۔ تم کہاں جا رہے ہو — ص ۴۲

۲۱۔ وہ چلا گیا اور میں — ایضاً

۲۲۔ اس کی سسرال — ص ۴۳

۲۳۔ مرد کے پاس نہیں — ایضاً

۲۴۔ وہ جب چاہتا اُسے لے جاتا۔ مگر اس کی اس حرکت سے یہ معلوم — ایضاً

۲۵۔ میں بھی اُس کو کوئی — ایضاً

پہچان

ایک نہایت ہی تھرڈ کلاس ہوٹل میں دیسی وِھسکی کی بوتل ختم کرنے کے بعد طے ہوا کہ باہر گھوما جائے اور ایک ایسی عورت تلاش کی جائے جو ہوٹل اور وِھسکی کے پیدا کردہ تکدّر کو دور کر سکے۔ کوئی ایسی عورت ڈھونڈی جائے جو ہوٹل کی کثافت کے مقابلے میں نفاست پسند اور بدذائقہ وِھسکی کے مقابلے میں لذیذ ہو۔

فخر نے ہوٹل کی غلیظ فضا سے باہر نکلتے ہی، مجھ سے اور مسعود سے کہا: ''کوئی دانے دار عورت ہو..... اچھے گویّے کے گلے کی طرح اُس میں بڑے بڑے دانے ہوں..... خدا کی قسم طبیعت صاف ہو جائے۔''

وِھسکی، دانوں سے بالکل خالی تھی۔ سوڈا بھی بالکل بے جان تھا۔ غالباً اسی وجہ سے فخر، دانے دار عورت کا قائل ہو رہا تھا۔ ہم تینوں عورت چاہتے تھے۔ فخر، دانے دار عورت چاہتا تھا، مجھے ایسی عورت مطلوب تھی جو بڑے سلیقے سے واہیات باتیں کرے..... اور مسعود کو ایسی عورت کی ضرورت تھی جس میں بنیا پن نہ ہو، اپنی فیس کے روپے لے کر ٹرنک میں یا جہاں اُس کا جی چاہے رکھے اور کچھ عرصے کے لیے بھول جائے کہ سودا کر رہی ہے۔

اس بازار کا راستہ ہم جانتے تھے جہاں عورتیں مل سکتی ہیں۔ کالی، نیلی، پیلی، لال اور جامنی رنگ کی عورتیں۔ پیڑوں کی طرح اُن کے مکان ایک قطار میں دُور تک دوڑتے چلے گئے ہیں، یہ رنگ برنگی عورتیں اُن [میں] پکے ہوئے پھلوں کے مانند لٹکی رہتی ہیں، آپ نیچے سے ڈھیلے مار کر' انہیں گرا سکتے ہیں۔

ہمیں یہ عورتیں مطلوب نہیں تھیں۔ دراصل ہم اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتے تھے۔ ہم ایسی عورت یا عورتیں چاہتے تھے جو عُرفِ عام میں ''پرائیویٹ'' ہوں یعنی جو منڈی کے ہجوم میں سے نکل کر علاحدہ شریف محلوں میں اپنا کاروبار چلا رہی ہوں۔

ہم تینوں میں، فخر سب سے زیادہ تجربے کار تھا۔ قوتِ ارادی بھی اُس میں ہم سب سے زیادہ تھی۔ ایک تانگے والا جب ہمارے پاس سے گزرا تو اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روکا۔ اور بغیر کسی جھجک کے معنی خیز لہجے میں اُس سے کہا: ''ہم سیر کرنا چاہتے ہیں..... چلو گے؟''

تانگے والے نے جو سنجیدہ اور متین آدمی معلوم ہوتا تھا، ہم تینوں کی طرف باری باری دیکھا۔ میں

جھینپ سا گیا۔ خاموشی ہی خاموشی میں وہ ہم سے کہہ گیا تھا: تم نوجوانوں کو شراب پی کر یہ کیا ہو جاتا ہے؟

فخر نے دوبارہ اُس سے کہا: ''ہم سیر کرنا چاہتے ہیں..... چلو گے؟'' پھر فوراً ہی اُسے کچھ خیال آیا اور اپنا مطلب اور زیادہ واضح کر دیا: ''کوئی مال وال ہے تمہاری نگاہ میں؟''

مسعود اور میں دونوں ایک طرف کھسک گئے۔ مسعود نے گھبرا کر مجھ سے کہا: ''یہ فخر کیسا آدمی ہے، اسے کچھ سمجھاؤ''۔[۲]

مسعود سے میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ فخر نے آواز دی: ''آؤ بھئی آؤ!...... بیٹھو تانگے میں۔'' ہم تینوں تانگے میں بیٹھ گئے۔ مجھے اگلی نشست پر جگہ ملی۔

دسمبر کے آخری دن تھے۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ وِسکی پینے کے باوجود ہمیں سردی محسوس ہو رہی تھی۔ [میں] چونکہ اگلی نشست پر تھا اور تینوں میں سے، سب سے کمزور[۳] تھا اس لیے میرے کان سُن ہو رہے تھے۔ جب تانگا ڈفرن برج کے نیچے اُترا تو میں نے مفلر نکال کر کانوں اور سر پر لپیٹ لیا اور اوورکوٹ کا کالر بھی اونچا کر لیا۔

سانس گھوڑے کے نتھنوں سے بھاپ بن کر باہر نکل رہا تھا۔ ہم تینوں خاموش تھے۔ تانگے والا موٹے اور کھردرے کمبل میں لپٹا خاموشی سے اپنا تانگا چلا رہا تھا۔ میں نے اُس کی طرف غور سے دیکھا۔ سنجیدگی اس کے چہرے پر ٹھٹھری رہی تھی جو مجھے بہت بُری معلوم ہوئی۔ چنانچہ میں نے فخر سے کہا: ''فخر، یہ آدمی کیسا ہے..... کوئی بات ہی نہیں کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاسٹر آئل پی کر بیٹھا ہے۔''

تانگے والا میرے اس ریمارک پر بھی خاموش رہا۔ فخر نے کہا: ''زیادہ باتیں کرنے والے آدمی ٹھیک نہیں ہوتے۔ ہمارا مطلب سمجھ گیا ہے۔ لے چلے گا۔ جہاں اچھی چیز[۴] ہوئی۔''

مسعود جو سگریٹ سلگا رہا تھا، ایک دم بولا: ''واللہ عورت کتنی اچھی چیز ہے...... عورت، عورت کم ہے، چیز زیادہ ہے۔'' میں نے اس کو ذرا اور خوب صورت بنا کر کہا: ''مسعود، چیز نہیں ..... چیزی!''

شاعر آدمی تھا، پھڑک اٹھا: ''واللہ کیا بات پیدا کی ہے، چیز نہیں، چیزی!...... سو میاں تانگے والے! چیز اور چیزی میں جو فرق[۵] ہے، اس کا دھیان رکھنا'' تانگے والا خاموش رہا۔

اب میں نے اُس کی طرف اور زیادہ غور سے دیکھا: مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ عمر پینتیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ پتلی پتلی مونچھیں تھیں جن کے بال نیچے کو جھکے ہوئے تھے۔ سردی کی باعث چونکہ اُس نے کمبل کا ڈھاٹا سا بنا رکھا تھا اس لیے اس کا پورا چہرہ نظر نہ آتا تھا۔

میں نے اُس کی طرف دیکھ کر، فخر سے پوچھا: ''کہاں لے جارہا ہے[۷] ہمیں؟''

فخر نے جو زیادہ سوچ بچار کا عادی نہیں تھا، جواب دیا: ''اتنے بے تاب کیوں ہوتے ہو؟...... ابھی تھوڑی دیر کے بعد چیز تمہارے سامنے آجائے گی۔''

مسعود نے اس پر فخر سے کہا: ''تم سے کیا بات ہوئی ہے اِس کی؟''

فخر نے جواب دیا: ''روشن آرا روڈ پر...... کچھ میمیں رہتی ہیں۔ کہتا ہے ہمارے کام کی ہیں۔''

میموں کا نام سن کر مسعود کو اپنے ایک دوست کی نظم[۸] یاد آگئی۔ اُس کا حوالہ دے کر اُس نے کہا: ''تو چلو آج لگے ہاتھوں اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام بھی لے لیا جائے گا۔[۹] واللہ! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تانگے والا صاحبِ ذوق ہے، وہ نظم ضرور پڑھی ہوگی اس نے۔''

اس کے بعد دیر تک میموں کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ میں اور مسعود میموں کے بالکل قائل نہیں تھے لیکن فخر کو عورتوں کی یہ قسم پسند تھی [اُس نے کہا؟]: ''ان کا علم سائنٹیفک ہوتا ہے یعنی یہ عورتیں بڑے سائنٹیفک طریقے سے اپنا کاروبار چلاتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں مشرقی عورتوں کو رکھیے[۹] تو وہی [فرق] نظر آئے گا جو ہمارے یہاں کی ریوڑی اور وہاں کی ٹافی میں ہے۔ بھئی دراصل بات یہ ہے کہ ان میموں کا پیکنگ بڑا اچھا ہوتا ہے۔''

میں نے کہا: ''فخر! ممکن ہے تمہارا نظریہ درست ہو۔ مگر بھائی، میں ایسے موقعوں پر زبان کی مشکلات برداشت نہیں کرسکتا۔ میں اپنے دفتر میں بڑے صاحب کے ساتھ انگریزی بول سکتا ہوں۔ میں یہاں دہلی میں رہ کر اِس تانگے والے سے اردو میں بات چیت کرنا گوارا کرسکتا ہوں مگر اُس موقع پر، انگریزی میں گفتگو نہیں کرسکتا۔ میری پتلون انگریزی، میری ٹائی انگریزی، میرا شو انگریزی...... یہ سب چیزیں انگریزی ہوسکتی ہیں مگر خدا کے لیے، وہ چیز، مجھ سے انگریزی میں کیسے ہوسکتی ہے۔''

فخر اپنا نظریہ بھول کر ہنسنے لگا۔ مسعود شاید ابھی تک اپنے دوست کی لکھی ہوئی نظم پر غور کررہا تھا جس میں شاعر نے ایک فرنگی عورت کے ہونٹ چوس کر اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام لیا تھا...... دفعتاً چونک کر اُس نے کہا: ''کیوں بھئی! یہ تانگا کب تک چلتا رہے گا؟''

تانگے والے نے ایک دم باگیں کھینچ کر تانگا ٹھہرادیا اور فخر سے کہا: ''وہ جگہ آگئی صاحب! آپ اکیلے چلیے گا، یا......''

ہم تینوں تانگے والے کے پیچھے پیچھے چل دیے۔

ایک نیم روشن گلی میں وہ ہمیں لے گیا۔ دلّی کی دوسری گلیوں سے یہ گلی کچھ مختلف تھی، اس لیے کہ بہت[1] چوڑی تھی۔ دائیں ہاتھ کو ایک منزلہ مکان تھا جس کی کھڑکیوں اور دروازوں پر چقیں لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک دروازے کی چق اٹھ کر تانگے والا اندر داخل ہوگیا۔ چند لمحات کے بعد باہر آیا اور ہمیں اندر لے گیا۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے جب کہا: ''بھائی ہم کہیں اوندھے منہ نہ گر پڑیں'' تو دوسرے کمرے سے کسی عورت کی بھدی آواز سنائی دی: ''لالٹین تو لے گیا ہوتا تو'' اور تھوڑی ہی دیر کے بعد تانگے والا ایک اندھی سی لالٹین لے کر نمودار ہوا۔

''چلیے اندر تشریف لے چلیے۔'' ہم تینوں اندر تشریف لے گئے۔ دو کالی بھجنگی، انتہائی بدصورت عورتیں نظر آئیں جنہوں نے ڈھیلے ڈھیلے فراک پہن رکھے تھے ... یہ میمیں تھیں۔ میں نے اپنی ہنسی روک کر، فخر سے کہا: ''کیا لذیذ ٹافیاں'' ہیں!''

میری یہ بات سن کر اُن میموں میں سے ایک، جس کا سیاہ چہرہ[2] سرخی لگانے کے باعث زیادہ پکی ہوئی اینٹ کی سی رنگت اختیار کر گیا تھا، ہنسی...... میں بھی ہنس دیا اور بڑے پیار سے پوچھا: ''کیا نام ہے آپ کا؟''

بولی: ''لوسی۔''

شاعر مسعود نے آگے بڑھ کر دوسری سے پوچھا: ''آپ کا؟''

اس نے جواب دیا: ''میری۔''

فخر بھی آگے بڑھ آیا: ''کیوں صاحب، آپ کام کیا کرتی ہیں؟''

دونوں لجا گئیں، ایک نے ادا سے کہا: ''کیسا بات کرتا ہے تم؟''

دوسری نے کہا: ''چلو جلدی کرو، رہنا مانگتا ہے یا نہیں، ہمیں روٹی پکانا ہے۔''

میں نے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو گیلے آٹے سے بھرے ہوئے تھے۔ اور وہ[3] اس کی مروڑیاں بنا رہی تھی۔ تانگے والا قطعی طور پر ہمیں غلط جگہ لے آیا تھا۔ مروڑیاں اس کے ہاتھوں سے کچے فرش پر گر رہی تھیں اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اناج رو رہا ہے اور یہ مروڑیاں اس کے آنسو ہیں۔

ہم تینوں کے تینوں اس مکان میں آکر سخت پریشان ہوگئے مگر ہم اپنی پریشانی اُن دو عورتوں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہمیں سخت ناامیدی ہوئی تھی۔ اگر ہم ان سے صاف لفظوں میں کہہ دیتے کہ تم ہمارے مطلب کی نہیں ہو، تو ضرور ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی؛ عورت جس کے ہاتھ آٹے میں لتھڑے ہوں، ایسے جذبات سے عاری نہیں ہوسکتی۔

میں نے ان دونوں کی تعریف کی۔ فخر نے بھی میرا ساتھ دیا۔ پھر ہم تینوں جلد واپس آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے نکل گئے۔" تانگے والا ہمارا مطلب سمجھ گیا تھا چنانچہ اسے چند لمحات کے لیے وہاں ٹھہرنا پڑا۔ جب وہ باہر نکلا تو فخر نے اس سے کہا: "تم انہیں میمیں کہتے ہو؟"

تانگے والے نے بڑی متانت کے ساتھ جواب دیا: "لوگ یہی کہتے ہیں صاحب۔"

"لوگ جھک مارتے ہیں ..... میں نے خیال کیا تھا کہ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے ..... اب خدا کے لیے کسی ایسی جگہ لے چلو جہاں ہم چند گھڑیاں [گھڑی؟] اپنا دل بہلا سکیں۔"

مسعود نے تینوں کا اجتماعی مقصد اور زیادہ واضح کرنے کی کوشش کی۔ "دیکھو ہم ایسی جگہ جانا چاہتے ہیں جہاں کچھ عرصے کے لیے بیٹھ سکیں ...... ہمیں ایسی عورت کے پاس لے چلو جو باتیں کرنے کا سلیقہ رکھتی ہو ...... بھائی، ہم گورے نہیں ہیں، کسی فوج کے سپاہی نہیں ہیں، تین شریف آدمی ہیں، جنہیں عورت سے بات چیت کیے برسوں گزر چکے ہیں ...... سمجھے؟"

تانگے والے نے اثبات میں سر ہلا دیا "تو چلیے، بیٹھیے، آپ کو صدر بازار لے چلتا ہوں "

فخر نے پوچھا: "کون ہے وہاں؟"

تانگے والے نے گھوڑے کی باگیں تھام کر جواب دیا "ایک پنجابن ہے۔ بہت لوگ آتے ہیں اُس کے پاس۔"

تانگے والے نے پنجابن کے گھر کا رُخ کیا۔

راستے میں اُن دو میموں کا ذکر چھڑ گیا۔ ہم میں سے ہر ایک کو وہاں جانے کا افسوس تھا۔ اس لیے کہ ہم سب سے زیادہ، وہ ناامید ہوئی تھیں۔ میں نے اُن کو کچھ روپے دے دیے ہوتے مگر یہ بھیک ہو جاتی...... فخر نے ہماری اس گفتگو میں زیادہ حصہ نہ لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُن کا ذکر نہ کیا جائے لیکن جب تک تانگا پنجابن کے گھر تک نہ پہنچا، اُن کا ذکر ہوتا رہا۔

تانگا ایک فراخ بازار میں فٹ پاتھ کے پاس رُکا۔ طویلے کے ساتھ والا مکان تھا، جدھر کا ہم چاروں نے رخ کیا۔ زینہ طے کر کے ہم اوپر پہنچے۔ سامنے پیخانہ تھا، دروازے سے بے نیاز ...... اُس کے ساتھ ہی پرانی وضع کا مطلئ کمرہ تھا جس میں ہم چاروں داخل ہوئے۔ اُس کمرے کے آخری سرے پر، چار آدمی بیٹھے فلاش کھیلنے میں مصروف تھے جو ہماری آمد سے غافل رہے۔ البتہ وہ عورت جوان کے پاس کھڑی تھی، اور ایک آدمی کے پتوں میں دلچسپی لے رہی تھی، آہٹ پا کر ہماری طرف آئی۔

یہاں بھی لالٹین کی مدھم روشنی تھی جس کو فلاش کھیلنے والے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔
جب وہ فخر کے پاس آئی اور کولھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوگئی تو میں نے غور سے اُسے دیکھا: اس کی عمر کم از کم پینتیس برس کے قریب تھی، چھاتیاں بڑی بڑی تھیں جو اس نے بڑے ہی بیہودہ اور فحش انداز سے اوپر کو اٹھا رکھی تھیں۔ تنگ ماتھے پر نیلے رنگ کا چاند کُھدا ہوا تھا۔ جب وہ مسعود کی طرف دیکھ کر مسکرائی تو مجھے اس کے سامنے کے دو دانتوں میں سونے کی کیلیں نظر آئیں...... بڑی خوف ناک عورت تھی۔ اس کا منہ کچھ اس انداز سے کُھلتا تھا جیسے لیموں نچوڑنے والی مشین کا کھلتا ہے۔

اس نے فخر کو آنکھ ماری اور پوچھا: ”کہو کیا بات ہے؟“

فخر نے بچے کی طرح کہا: ”آپ کا نام؟“

اس نے کولھے پر ہاتھ رکھے، [ہاتھ رکھے رکھے؟] ہم تینوں کو باری باری دیکھ [اور کہا؟]: ”گلزار۔“

فخر نے فوراً ہی معذرت کی: ”ہم گلاب کے یہاں آئے تھے، غلطی سے ادھر چلے آئے، معاف کر دیجیے گا۔“

یہ سُن کر وہ فخر کے ہاتھ سے سگریٹ چھین کر، کش لگاتی، فلاش کھیلنے والوں کے پاس چلی گئی، جو ابھی تک ہماری آمد سے غافل تھے۔ نیچے اُتر کر ہم تینوں نے تانگے والے کو پھر اپنا مطلب سمجھایا اور اس کو بتایا کہ ہم کس قسم کی عورت چاہتے ہیں۔ اُس نے ہم تینوں کا لیکچر سنا اور کہا: ”آپ تھوڑے لفظوں میں مجھے بتایئے کہ آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟“

میں نے تنگ آ کر فخر سے کہا: ”بھئی تم ہی اسے اُن تھوڑے لفظوں میں سمجھاؤ جو تمہارے پاس باقی رہ گئے ہیں۔“

فخر نے اُسے سمجھایا: ”دیکھو ہمیں کسی لڑکی کے پاس لے چلو...... ایسی عورت کے پاس جو سولہ سترہ برس کی ہو، اِس سے زیادہ کی ہرگز نہ ہو۔ سمجھے؟“

تانگے والے نے کمبل کی بُکّل مار کے باگیں تھامیں اور کہا: ”آپ نے پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔ چلیے ...... اب آپ کو ٹھیک جگہ پر لے چلوں گا۔“

آدھے گھنٹے کے بعد وہ ٹھیک جگہ بھی[۱۵] آ گئی...... خدا معلوم کون سا بازار تھا۔ دوسری منزل پر ایک بیٹھک سی تھی جس کے دروازے پر موٹا اور میلا ٹاٹ لٹک رہا تھا۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو سامنے آنگن میں ایک دیہاتی 'بڑھیا' چولھا جھونک رہی تھی...... مٹی کے کونڈے میں گُندھا ہوا آٹا، پاس ہی پڑا تھا۔

دھواں اس قدر تھا کہ اندر داخل ہوتے ہی ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

بڑھیا نے چولھے میں لکڑیاں جھاڑ کر ہماری طرف دیکھا اور تانگے والے سے دیہاتی لہجے میں کہا: ''انہیں اندر لے جاؤ۔''

تانگے والے نے اندھیرے کمرے میں دیا سلائی جلا کر ہمیں داخل کیا اور کیل سے لٹکی ہوئی لالٹین کو روشن کر کے باہر چلا گیا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا: کونے میں ایک بہت بڑا پلنگ تھا جس کے پائے رنگین تھے، اس پر میلی سی چادر بچھی ہوئی تھی، تکیہ بھی پڑا تھا جس پر سُرخ رنگ کے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ پلنگ کے ساتھ والی دیوار کی کانس پر تیل کی ایک میلی بوتل اور لکڑی کی کنگھی پڑی تھی اُس کے دانتوں میں سر کا میل اور کئی بال پھنسے ہوئے تھے۔ پلنگ کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا ٹرنک تھا جس پر ایک کالی گرگابی رکھی تھی۔

مسعود اور فخر دونوں پلنگ پر بیٹھ گئے۔ میں کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک پست قد لڑکی، اپنے سے دوگنا دوپٹا اوڑھنے کی کوشش کرتی، اندر داخل ہوئی۔ فخر اور مسعود دونوں اٹھ کھڑے ہوئے، جب وہ لالٹین کی روشنی میں آئی تو میں نے اسے دیکھا۔ اس کی عمر بمشکل چودہ برس کے قریب ہوگی، چھاتیاں آڑو کے برابر تھیں مگر اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے جسم کو پیچھے چھوڑ کر بہت آگے نکل چکی ہے، بہت آگے، جہاں شاید اُس کی ماں بھی نہیں پہنچ سکی جو باہر آنگن میں چولھا جھونک رہی تھی۔ اُس کے نتھنے پھڑک رہے تھے اور اس انداز سے اپنا ایک ہاتھ ہلا رہی تھی جیسے مکار دُکان دار کی طرح، ڈنڈی مارے گی اور کبھی پورا تول نہیں تولے گی۔

ہم تینوں اُس کو حیرت بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔ فخر شرم بھی محسوس کر رہا تھا۔ مسعود کی ساری شاعری سمٹ کر شاید اُس کے ناخنوں میں چلی آئی[۱۶] کیونکہ وہ بُری طرح انہیں دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔

میں نے ایک بار پھر اُس کی طرف دیکھا، جیسے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا: ٹھنگنی سی لڑکی تھی جو ایک بہت بڑا میلا دوپٹا اوڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ رنگ گہرا سانولا، بدن کی ساخت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑی تیزی سے چلی ہوئی گاڑی ہے جو اَب ایک دم[۱۷] رک گئی ہے، اس کے پہیّوں میں بریک لگ گئے ہیں اور وہیں کھڑے کھڑے اُس کا رنگ روغن، دھوپ اور بارش میں اُڑ گیا ہے۔ اس عمر میں، بھدی سے بھدی لڑکی کے جسم میں جو ایک قسم[۱۸] کی شوخ جاذبیت ہوتی ہے، اُس میں بالکل نہیں تھی۔ کپڑوں کے باوجود وہ ننگی دکھائی دیتی تھی، بہت ہی بیہودہ اور ناواجب طریقے پر ننگی...... اُس کے جسم کا نچلا حصہ قطعی طور پر غیر نسوانی تھا۔

میں اُس سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کے عقب سے ایک بڈھا نمودار ہوا۔ بالکل سفید داڑھی،

سرضعف کے باعث ہل رہا تھا۔لڑکی نے دیہاتی زبان میں اُس سے[19] کچھ کہا۔جس کا مطلب میں صرف اس قدر سمجھا کہ وہ بڈھا اس کا نانا ہے۔

ہم تینوں صحیح معنوں میں اٹھ بھاگے۔ نیچے بازار میں پہنچے تو ہمارا تکدر کچھ دور ہُوا۔ بڈھے اور لڑکی کو دیکھ کر ہمارے جمالیاتی ذوق کو بہت ہی شدید صدمہ پہنچا تھا۔دیر تک ہم چپ چاپ رہے۔

فخر ٹہلتا رہا۔مسعود ایک کونے میں پیشاب کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔ میں، اوور کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، اوپر آسمان کی طرف دیکھتا رہا، جہاں نامکمل چاند بالکل اُس زرد بیسوا لونڈیا کی طرح، جس کے جسم کا نچلا حصہ قطعی طور پر غیرنسوانی تھ، بادل کے ایک بہت بڑے ٹکڑے[20] کا دوپٹا اوڑھنے کی کوشش کر رہا تھا...... اُس سے کچھ دور ایک چھوٹا سفید ٹکڑا، اُس کے نانا کے ضعیف سر کی طرح لرز رہا تھا. ...!

میرے بدن پر جُھرجُھری طاری ہوگئی۔

ہم غالباً دس بارہ منٹ تک بازار میں کھڑے رہے۔اُس کے بعد تانگے والا نیچے اترا۔فخر کے پاس جا کر اُس نے کہا: ”آپ نے آٹھ بجے تانگا لیا تھا... . اب گیارہ بج چکے ہیں، تین گھنٹوں کے پیسے دے دیجیے۔“

فخر نے کچھ کہے بغیر، دو روپے اُس کو دے دیے۔ روپے لے کر وہ مسکرایا: ”بابو جی آپ کو کچھ پہچان نہیں ...... ایسی کراری لونڈیا تو شہر بھر میں نہیں ملے گی آپ کو..... خیر آپ کو اختیار. .. تانگے میں بیٹھیے، میں ابھی آیا۔“

اُس کو اوپر جانے کی زحمت نہ اٹھانا پڑی کیونکہ سفید ریش بڈھا اُس کے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا اور موری کے پاس کھڑا اپنا ضعیف سر ہلا رہا تھا۔اُس کو دو روپے دے کر جب تانگے والے نے باگیں تھامیں تو اُس کی سنجیدگی غائب تھی۔”چل بیٹا“ کہہ کر اُس نے اپنی بھدی مگر مسرت بھری آواز میں گانا شروع کر دیا:

”ساون کے نظارے ہیں...... لالا.....“

حواشی

(ان حواشی میں ص سے مراد: بانجھ کا صفحہ نمبر ہے۔
دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ ڈھیلے اور پتھر مار کر ص:۵۶

۲۔ منثورا ما (ص:۷۳۸) میں یہ پارا شامل نہیں۔

۳۔ سب سے زیادہ کمزور ص ۵۷

۴۔ جہاں بھی چیز اچھی ایضاً

۵۔ چیزی میں فرق ص ۵۸

۶۔ لے جا رہے ہو ایضاً

۷۔ دوست کی ایک نظم ایضاً

۸۔ بنیادی نسخے میں نئے پارے کا آغاز (ص:۷۱) لیکن مدوّن کے نزدیک بانجھ میں درج مسلسل مکالمہ راجح ہے۔ ایضاً

۹۔ عورتوں کو دیکھیے ص ۵۹

۱۰۔ اس لیے بہت ایضاً

۱۱۔ ٹافیاں اور بسکٹ ("کمرے میں گھپ اندھیرا..." سے اس مکالمے تک، عبارت کی ترتیب مدوّن کی قائم کردہ ہے) ص ۶۰

۱۲۔ جس کا چہرہ ایضاً

۱۳۔ ہوئے تھے۔ وہ ایضاً

۱۴۔ بنیادی نسخے میں "نکل آگئے" (ص:۷۳) جبکہ بانجھ میں "نکل گئے" شائع ہوا ہے جو مدوّن کے نزدیک راجح ہے۔ ص ۶۱

۱۵۔ آدھ گھنٹے کے بعد ٹھیک جگہ بھی ص ۶۳

۱۶۔ چلی گئی ص ۶۵

۱۷۔ جو ایک دم ایضاً

۱۸۔ جسم میں ایک قسم ایضاً

۱۹۔ اُن سے ایضاً

۲۰۔ ایک بڑے ٹکڑے ص ۶۶

شوشو

گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ تمام کمرے لڑکے لڑکیوں، بچے بچیوں اور عورتوں سے بھرے تھے۔ اور وہ شور برپا ہو رہا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اگر اس کمرے میں دو تین بچے اپنی ماؤں سے لپٹے دودھ پینے کے لیے بلبلا رہے ہیں تو دوسرے کمرے میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ڈھولکی لیے بےسُری تانیں اُڑا رہی ہیں۔ نہ تال کی خبر ہے نہ لے کی، بس گائے جا رہی ہیں۔ نیچے ڈیوڑھی سے لے کر بالائی منزل کے [؟ کی] شہ نشینوں تک مکان مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ کیوں نہ ہو۔ ایک مکان میں دو بیاہ رچے تھے۔ میرے دونوں بھائی اپنی چاند سی دُلہنیں بیاہ کر لائے تھے!

رات کے گیارہ بجے کے لگ بھگ دونوں ڈولیاں آئیں اور گلی میں اس قدر شور برپا ہوا کہ الامان۔ مگر وہ نظارہ بڑا روح افزا تھا جب گلی کی سب شوخ و شنگ لڑکیاں باہر نکل آئیں اور تیتریوں کی طرح ادھر اُدھر پھڑ پھڑانے لگیں!

ساڑیوں کی ریشمی سرسراہٹ، کلف لگی شلواروں کی کھڑکھڑاہٹ اور چوڑیوں کی کھنکھناہٹ ہوا میں تیرنے لگی۔ تمتماتے ہوئے مکھڑوں پر بار بار گرتی ہوئی لٹیں، ننھے ننھے سینوں پر زور دے کر نکالی ہوئی بلند آوازیں، اونچی ایڑی کے بوٹوں پر تھرکتی ہوئی ٹانگیں، لچکتی ہوئی انگلیاں، دھڑکتے ہوئے لہجے، پھڑکتی ہوئی رگیں اور پھر اُن الھڑ لڑکیوں کی آپس میں سرگوشیاں! ..... یہ سب کچھ دیکھ کر ایسا لگتا ہے [؟ لگتا تھا][3] کہ گلی کے پتھریلے فرش پر حسن و شباب اپنے قلم سے اپنے معانی لکھ رہا ہے![؟ لکھ رہے ہیں!]

عباس میرے پاس کھڑا تھا۔ ہم دونوں، عورتوں کے ہجوم میں گھرے[2] تھے۔ دفعتاً عباس نے گلی کے نکڑ پر نظریں گاڑ کر کہا: ''شوشو کہاں ہے؟''

میں نے جواب دیا: ''مجھے اس وقت تمہارے سوال کا جواب دینے کی فرصت نہیں ہے۔''

میں اُس ہجوم میں اُس بھونرے کی مانند کھڑا تھا جو پھولوں بھری کیاری دیکھ کر یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کس پھول پر بیٹھے۔

عباس نے روتی آواز میں کہا: ''وہ نہیں آئی!''

''تو کیا ہوا...... باقی تو سب موجود ہیں...... ارے!...... دیکھو تو وہ نیلی ساڑی میں کون ہے؟ ...... شوشو۔'' میں نے عباس کا ہاتھ دبایا۔

عباس نے غور سے دیکھا: ''نیلی ساڑی میں......'' یہ کہہ کر اس نے اپنے مخصوص انداز میں میری طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر کہا: ''علاج کراؤ اپنی آنکھوں کا...... چغد کہیں کے، یہ شوشو ہے؟''

''کیوں، وہ نہیں ہے کیا؟'' میں نے پھر نیلی ساڑی کی طرف غور سے دیکھا اور ایسا کرتے ہوئے میری نگاہیں ایکا ایکی اُس لڑکی کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔ کچھ اس طور پر کہ اس کو ایک دھکا سا لگا۔ وہ سنبھلی اور فوراً منہ سے لال جیب نکال کر میرا منہ چڑایا۔ اپنی سہیلی کے کان میں کچھ کہا۔ اُس سہیلی نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا...... میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔

عباس نے جو اپنا اطمینان کرنے کے لیے ایک بار پھر اُس کی طرف دیکھ رہا تھا، بلند آواز میں کہا: ''بخدا تم اُس کی توہین کر رہے ہو...... گدھے کہیں کے...... عورت کے معاملے میں نرے احمق ہو...... کاٹھ کی کوئی پتلی نیلے رنگ میں لپیٹ لپاٹ کر تمہارے سامنے رکھ دی جائے، تم اسی کی بلائیں لینا شروع کر دو گے۔''

یہ الفاظ اتنی اونچی آواز میں ادا کیے گئے تھے کہ اس نیلی ساڑی والی نے سُن لیے۔ جب وہ ہمارے پاس سے گزرنے لگی تو خود بخود ٹھٹھک گئی۔ ایک لحظے کے لیے اُس کے قدم رکے، گویا ہم میں سے کسی نے اُس کو مخاطب کیا ہے، پھر فوراً اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس احساس کی پیدا کی ہوئی خفت دُور کرنے کے لیے اُس نے یوں ہی پیچھے مڑ کر دیکھا اور کہا: ''ارے...... امینہ تو کہاں اُڑ گئی؟!''

مجھے موقع ملا۔ میں نے جھٹ سے عباس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے اچھی طرح دبا کر اُس سے کہا: ''آپ سے مل کر مجھے بہت خوشی حاصل ہوئی مگر میرا نام محمد امین ہے...... مجھے نیل کنٹھ بھی کہتے ہیں۔

جل ہی تو گئی۔ مگر ہم، زیرِ لب مسکراتے، آگے بڑھ گئے۔ چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ عباس نے اضطراب بھرے لہجے میں کہا: ''شوشو ابھی تک نہیں آئی۔''

''تو میں کیا کروں...... میرے سر پر نمدہ باندھ دیجیے تو میں ابھی سرکار کے لیے اُسے تلاش کر کے لے آتا ہوں...... آخر یہ کیا حماقت ہے۔ بھئی تم تماشا بھی دیکھنے دو گے یا کہ نہیں؟...... اور پھر جناب یہ تو بتایئے، اگر وہ یہاں موجود بھی ہو تو آپ اُس سے ملاقات کیونکر کر سکتے ہیں۔ آپ کوئی امریکی ناول نہیں پڑھ رہے، کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہے!''

عباس میری بات فوراً سمجھ گیا۔ وہ اتنا بیوقوف نہیں تھا۔ چنانچہ ہم دنوں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے، گلی

سے نکل کر بازار میں چلے گئے۔ موڑ پر رام بھروسے پنواڑی کی دکان کھلی تھی جو بجلی[۱۰] کے قمقمے کے نیچے سر جھکائے اونگھ رہا تھا۔ ہم نے اس سے دو پان بنوائے اور وہیں بازار میں کرسیوں پر بیٹھ کر باتیں کرنے میں مشغول ہو گئے۔ دیر تک ہم، ہندوستان میں مرد عورت کے درمیان جو اجنبیت چلی آ رہی ہے اس کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ جب ایک بج گیا تو عباس جمائی لے کر اٹھا اور کہنے لگا: "بھئی اب نیند آ رہی ہے ..... اس حسرت کو ساتھ لیے جا رہا ہوں کہ شوشو کو نہ دیکھ سکا۔ سچ کہتا ہوں امین، وہ لڑکی ...... میں اب تمھیں کیا بتاؤں کہ وہ کیا ہے؟"

عباس نے اپنے گھر کا رُخ کیا اور میں نے اپنے گھر کا۔ راستے میں سوچتا رہا کہ عباس نے شوشو جیسی معمولی لڑکی میں ایسی کون سی غیر معمولی چیز دیکھی ہے جو ہر وقت اسی کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ عباس کے مذاق کے متعلق میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بڑا اونچا ہے۔ مگر یہاں اسے کیا ہو گیا تھا؟ ...... شوشو ...... شوشو ..... ارے یہ کیا؟ ...... دو تین بار اس کا نام میری زبان پر آیا تو میں نے یوں محسوس کیا کہ پیپر منٹ کی گولیاں چوس رہا ہوں ...... شوشو ...... ایک دو مرتبہ آپ بھی اسے دہرائیے، ذرا جلدی جلدی ...... کیا آپ کو لذت محسوس ہوئی؟ ...... ضرور ہوئی ہوگی۔ مگر کیوں؟ ... .. سمجھ میں[۱۱] نہیں آتا تھا کہ میں عباس کی محبوبہ شوشو کے بارے میں خواہ مخواہ کیوں غور کرنے لگا ہوں؟ اس میں کوئی ایسی چیز ہے ہی نہیں جو غور افروز ہو مگر ...... مگر ...... یہ شوشو نام میں دلچسپی ضرور تھی۔ اور کیا کہا تھا میں نے، لذت بھی!

شوشو میں بانجو [کے؟] تھرکتے ہوئے تاروں کی جھنکار سی پائی جاتی ہے۔ آپ یہ نام پکاریے تو ایسا معلوم ہوگا کہ آپ نے کسی ساز کے تنے ہوئے تاروں پر زور سے گز پھیر دیا ہے۔

شوشو ...... سوشیلا کا دوسرا نام ہے۔ یعنی اُس کی بگڑی ہوئی شکل، مگر اس کے باوجود اس میں کتنی موسیقی ہے ...... سوشیلا ... شوشو ...... شوشو ...... سوشیلا ...... غلط ...... سوشیلا میں شوشو کی سی موسیقیت ہرگز نہیں ہو سکتی!

فرنگی شاعر بائرن، شکیل تھا مگر اُس میں وہ کون سی شے تھی جو عورتوں کے سینے میں ہیجان برپا کر دیتی تھی؟ ..... اُس کا لنگڑا کر چلنا۔ گریٹا گاربو، قطعاً خوش شکل نہیں ہے مگر اُس میں کون سی چیز ہے جو فلمی تماشائیوں پر جادو کا کام کرتی ہے؟ ..... اُس کا ذرا بگڑے ہوئے انگریزی لہجے میں باتیں کرنا ...... یہ کیا بات ہے کہ بعض اوقات اچھی بھلی شے کو بگاڑنے سے اُس میں حسن پیدا ہو جاتا ہے؟ ......[۱۲]

سوشیلا پندرہ سولہ برس کی ایک معمولی لڑکی ہے جو ہمارے پڑوس میں رہتی ہے۔ اس عمر میں وہ ان تمام چیزوں کی مالک ہے[۱۳] جو عام نوجوانوں کے سینے میں ہلچل پیدا کرنے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ مگر عباس کی نظروں میں یہ کوئی خوبی نہ تھی۔ عام نوجوانوں کی طرح عباس کا دل، گھاس کی پتی کی مانند نہیں تھا جو ہوا

کے ہلکے سے جھونکے کے ساتھ ہی کانپنا شروع کر دیتی ہے ..... خدا جانے وہ اُس کی کس ادا پر مرتا تھا جو میرے ذہن سے بالاتر تھی۔

میں نے سوشیلا کی شکل وصورت اور اس کی صناعانہ قدر وقیمت کے متعلق کبھی غور نہیں کیا تھا۔ مگر نہ جانے میں اس روز اس کے متعلق کیوں سوچتا رہا۔ بار بار وہ میرے ذہن میں آ رہی تھی اور ہر بار، میں سوشیلا کو چھوڑ کر اس کے مختصر نام شوشو کی موسیقی میں گُم ہو جاتا تھا۔ ان ہی خیالات میں غرق،[۴] گلی کے موڑ پر پہنچ گیا اور مجھے اس چیز کا احساس اُس وقت ہوا جب میں نے دفعتاً وہاں کی فضا کو غیر معمولی طور پر خاموش پایا۔ مکان میری نظروں کے سامنے تھا۔ اُس کے باہر گلی کی دیوار کے ساتھ ایک برقی قمقمہ لٹک رہا تھا جس کی چوندھیا دینے والی روشنی ساری گلی میں بکھری ہوئی تھی ...... مجھے اُس قمقمے کے ''تجرّد'' پر بڑا ترس آیا۔ گلی بالکل سنسان تھی اور وہ قمقمہ متحیر سا معلوم ہوتا تھا۔

گھر میں[۵] داخل ہوا تو وہاں بھی خاموشی تھی۔ البتہ کبھی کبھار کسی بچے کے رونے کی لرزاں صدا اور پھر ساتھ ہی اُس کی ماں کی خواب آلود آواز سنائی دیتی تھی۔ ڈیوڑھی کے ساتھ والا کمرہ کھول کر میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ پاس ہی تپائی پر ''رومان'' پڑا تھا۔ اس کو اُٹھا کر میں نے ورق گردانی شروع کی۔ ورق الٹتے الٹتے اخترؔ کی غزل پر نظریں جم گئیں۔ مطلع کس قدر حسین تھا۔

نہ بھولے گا ترا راتوں کو شرماتے ہوئے آنا
رسیلی انکھڑیوں سے نیند برساتے ہوئے آنا

مجھے نیند آ گئی۔ کلاک کی طرف دیکھا تو چھوٹی سوئی دو کے ہندسے کے پاس پہنچ چکی تھی اور اس کا اعلان کرنے کے لیے الارم میں ارتعاش پیدا ہو رہا تھا ... ٹن ٹن ٹن ...... ٹن ٹن ٹن ... ن!

دو بج گئے ...... میں اُٹھا اور سونے کے ارادے سے، سیڑھیاں طے کر کے، اپنی خواب گاہ میں پہنچا۔ بہار کے دن تھے اور موسم خنک۔ میری خواب گاہ کی ایک کھڑکی باہر کی گلی میں[۶] کھلتی ہے جس کے پیازی رنگ کے ریشمی پردے میں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے بڑی پیاری لہریں پیدا کر رہے تھے۔

میں نے شب خوابی کا لباس پہنا اور سبز رنگ کا قمقمہ روشن کر کے بستر پر لیٹ گیا۔

میری پلکیں آپس میں ملنے لگیں۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں دُھنکی ہوئی روئی کے بہت بڑے انبار میں دھنسا جا رہا ہوں۔ نیند اور بیداری کے درمیان ایک لحظہ باقی رہ گیا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں کسی کے بولنے کی گنگناہٹ[۷] آئی۔ اس پر ملتی ہوئی پلکیں کھل گئیں۔ اور میں نے غنودگی دور کرتے ہوئے غور

سے سننا شروع کیا۔ ساتھ والے کمرے میں کوئی بول رہا تھا۔ یکا یک کسی کی دل کش ہنسی کی مُترنم آواز بلند ہوئی اور پھلجھڑی کے نورانی تاروں کے مانند پُرسکوت فضا میں بکھر گئی۔

میں بستر پر سے اٹھا اور دروازے کے ساتھ کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔

''دونوں دلہنیں ماشاء اللہ بڑی خوب صورت ہیں۔''

''چندے آفتاب چندے ماہتاب۔''

غالباً دو لڑکیاں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ اُن کے موضوع نے میری دلچسپی کو بڑھا دیا۔ اور میں نے زیادہ غور[18] سے سننا شروع کیا:

''تلے والی سرخ ساڑھی میں نرگس کتنی بھلی معلوم ہوتی تھی ..... گورے گورے گالوں پر بکھری ہوئی مقیش...... جی چاہتا تھا، بڑھ کر بلائیں لے لوں۔''

''بچاری سمٹی جا رہی تھی۔''

''سر تو اُٹھایا ہی نہیں اُس نے...... پر ...''

''پر، یہ شرم و حیا کب تک رہے گی ..... آج رات......''

''آج رات......!''

''اوئی اللہ ...... تو کیسی باتیں کر رہی ہے شوشو!'' اس کے ساتھ ہی کپڑے [کپڑوں؟] کی سرسراہٹ سنائی دی۔ میرے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی ... .. شوشو...... تو ان میں سے ایک سوشیلا بھی تھی۔ میری دلچسپی اور بھی بڑھ گئی اور میں نے دروازے میں کوئی دراڑ تلاش کرنا شروع کی کہ ان کی گفتگو کے ساتھ ساتھ اُن کو دیکھ بھی[19] سکوں۔

ایک کواڑ کے نچلے تختے سے چھوٹی سی گانٹھ نکل گئی تھی اور اس طرح چونّی کے برابر سوراخ پیدا ہو گیا تھا۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر میں نے اُس پر آنکھ جما دی:

شوشو قالین پر بیٹھی بسنتی رنگ کی ساڑی سے اپنی ننگی پنڈلی کو ڈھانک رہی تھی۔ اُس کے پاس ''عفت شرمائی ہوئی سی، گاؤ تکیے پر دونوں کہنیاں ٹیکے لیٹی تھی۔

''اس وقت اُن گوری چٹی دلہنوں پر کیا بیت رہی ہوگی؟'' شوشو یہ کہہ کر رُک گئی اور اپنی آواز دبا کر اس نے عفت کی چوڑیوں کو چھیڑ کر اُن میں کھنکھناہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا: ''ذرا سوچو تو؟''

عفت کے گال ایک لمحے کے لیے تھرتھرائے: ''کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو شوشو۔''

جی ہاں...... گویا ان باتوں سے دلچسپی نہیں[۲۱] میری بنو کو۔ بس میں ہو تو ابھی سے اپنی شادی رچالو۔''
عقت نے سوشیلا کی بات کاٹ دی: ''پر، یہ دُلہنوں کو کہاں لے گئے ہیں شوشو؟''
''کہاں لے گئے ہیں؟'' شوشو مسکرائی۔ ''سمندر کی تہ میں جہاں جل پریوں کا راج ہے...... کوہِ قاف کے غاروں میں جہاں سینگوں والے جن رہتے ہیں......!''
چند لمحات کے لیے ایک پُراسرار سکوت طاری رہا۔ اُس کے بعد شوشو پھر بولی: ''کہاں لے گئے ہیں؟...... لے گئے ہوں گے اپنے اپنے کمروں میں!''
''بے چاریوں کو نیند کیسے آئے گی؟'' ایک لڑکی نے جو ابھی تک خاموش بیٹھی تھی اور جس کا نام میں نہیں جانتا تھا، اپنا اندیشہ بیان کیا۔
شوشو کہنے لگی: ''بے چاریاں!...... کوئی ذرا اُن کے دل سے[۲۲] جا کر پوچھے کہ اُن کی آنکھیں اس رت جگے کے لیے کتنی بے قرار تھیں!''
''تو بہت خوش ہوں گی؟''[۲۳]
''اور کیا؟''
''پر میں نے سُنا ہے کہ یہ لوگ بہت ستایا کرتے ہیں؟'' عقت، سوشیلا کے پاس سرک آئی۔
''میں پوچھتی ہوں، تمھیں اندیشہ کس بات کا ہو رہا ہے؟...... جب تمہارے وہ ستانے لگیں گے تو نہ ستانے دینا اُنہیں...... ہاتھ پیر باندھ دینا اُن کے...... ابھی سے فکر میں کیوں گھلی جا رہی[۲۴] ہو۔''
''ہائیں ہائیں۔'' عقت نے تیزی سے کہا: ''تم کیسی باتیں کر رہی ہو شوشو۔ دیکھو تو میرا دل کتنے زور سے دھڑکنے لگا ہے!'' عقت نے سوشیلا کا ہاتھ اٹھا کر دل کے[۲۵] مقام پر رکھ دیا۔ ''کیوں؟''
شوشو نے عقت کے دل کی دھڑکنیں غور سے سُنیں اور بڑے پُراسرار لہجے میں کہا: ''جانتی ہو کیا[۲۶] کہہ رہا ہے؟''
عقت نے جواب دیا: ''نہیں تو؟''
''یہ کہتا ہے: عقت بانو غزنوی دلہن بننا چاہتی ہے!......''
''ہٹاؤ جی، لاج تو نہیں آتی تمہیں۔'' عقت نے مسکرا کر کروٹ بدلی۔ ''دل اپنا چاہتا ہے تمہارا، اور خواہ مخواہ یہ سب کچھ میرے سر منڈھ رہی ہو۔'' پھر یکا یک اُٹھ[۲۷] کھڑی ہوئی اور سوشیلا سے پوچھنے لگی: ''ہاں، یہ تو بتاؤ شوشو، تم بھلا کیسے آدمی سے شادی کرنا پسند کرو گی؟...... میرے سر کی قسم، سچ سچ بتاؤ، مجھی کو

ہائے ہائے کرو۔ اگر جھوٹ بولو!''

''میں کیوں بتاؤں۔'' یہ کہہ کر سوشیلا نے تیزی سے اپنے سر کو حرکت دی۔ اور اُس کا چہرہ جو ابھی تک میری[۲۸] نگاہوں سے پوشیدہ تھا، سامنے آ گیا۔ میں نے غور سے دیکھا: وہ مجھے بے حد حسین معلوم ہوئی۔ آنکھیں مست تھیں اور ہونٹ تلوار کے تازہ زخم کے مانند کھلے ہوئے تھے، سر کے چند پریشان بال برقی روشنی سے منور فضا میں ناچ رہے تھے، چہرے کا گندمی رنگ نکھرا ہوا تھا اور سینہ[۲۹] جس پر سے ساڑی کا پلو نیچے ڈھلک گیا تھا، ہولے ہولے دھڑک رہا تھا، چوڑے ماتھے پر سرخ بندیا بڑی پیاری معلوم ہوتی تھی۔

عفت نے اصرار کیا: ''تمہیں میرے سر کی قسم، بتاؤ!''

شوشو نے کہا: ''پہلے تم بتاؤ۔''

''تو سنو، مگر کسی سے کہو گی تو نہیں۔'' یہ کہہ کر عفت کچھ شرما سی گئی۔ ''میں چاہتی ہوں ...... میں چاہتی ہوں کہ میری شادی ایک ایسے نوجوان سے ہو...... ایسے ......''

شوشو بولی: ''توبہ، اب کہہ بھی دو۔''

عفت نے پیشانی پر سے بال ہٹائے اور کہا: ''ہاں، ایسے نوجوان سے ہو جس کا قد لمبا ہو۔ جسم بڑے بھائی[۳۰] کی طرح سڈول ہو۔ انگلینڈ ریٹرنڈ ہو۔ انگریزی فر فر بولتا ہو ...... رنگ گورا اور نقش تیکھے ہوں۔ موٹر چلانا جانتا ہو اور بیڈمنٹن بھی کھیلتا ہو۔''

شوشو نے پوچھا: ''بس کہہ چکیں؟''

''ہاں۔'' عفت نے، نیم وا لبوں سے، سوشیلا کی طرف غور سے دیکھنا شروع کیا۔[۳۱]

''میری دعا ہے کہ پر ماتما تمہیں ایسا ہی پتی عطا فرمائیں۔'' سوشیلا کا چہرہ بڑا سنجیدہ تھا اور لہجہ ایسا تھا جیسے مندر[۳۲] میں کوئی مقدس منتر پڑھ رہی ہے۔

وہ لڑکی جو گفتگو[۳۳] میں بہت کم حصہ لیتی [لے رہی؟] تھی، بولی ''عفت! اب شوشو کی باری ہے۔''

عفت جو شوشو کی ساڑی کا ایک کنارہ پکڑ کر اپنی انگلی کے گرد لپیٹ رہی تھی، کہنے لگی: ''بھئی اب تم بتاؤ۔ ہم نے تو اپنے دل کی بات تم سے کہہ دی''۔[۳۴]

شوشو نے جواب دیا: ''سن کے کیا کرو گی؟ ...... میرے خیالات تم سے بالکل مختلف ہیں۔''

''مختلف ہوں یا ملتے ہوں، پر ہم سنے بغیر تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔''

''میں ...... '' سوشیلا نے چھت کی طرف دیکھا۔ اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگی ''میں

...... پرتم مذاق[۳۵] اڑاؤ گی عفت!"

"ارے...... تم سناؤ تو!"

سوشیلا نے ایک آہ بھری: "میرے سپنے عجیب وغریب ہیں عفت ...... یہ میرے دماغ میں صابن کے رنگ برنگے بلبلوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور آنکھوں کے سامنے ناچ کر غائب ہو جاتے ہیں...... میں سوچتی ہوں ...... اور پھر سوچتی ہوں کہ میں کیوں سوچا کرتی ہوں۔ انسان جو کچھ چاہتا ہے، اگر ہو جایا کرے تو کتنی اچھی بات ہے ...... لیکن پھر زندگی میں کیا رہ جائے گا...... خواہشیں اور تمنائیں کہاں سے پیدا ہوں گی ...... ہم جس طرح جی رہے ہیں، ٹھیک ہے ...... جانتی ہوں کہ جو کچھ مانگ رہی ہوں، نہیں ملے گا۔ مگر دل میں مانگ تو رہے گی...... کیا زندہ[۳۶] رہنے کے لیے یہی کافی نہیں؟"

عفت اور دوسری لڑکی خاموش بیٹھی تھیں۔

شوشو نے پھر کہنا شروع کیا: "میں اپنا جیون ساتھی ایک ایسے نوجوان کو بنانا چاہتی ہوں جو صرف عمر کے لحاظ ہی سے جوان نہ ہو بلکہ اُس کا دل، اُس کا دماغ...... اُس کا رُواں رُواں جوان ہو...... وہ شاعر ہو ... میں شکل وصورت کی قائل نہیں ...... مجھے شاعر چاہیے جو میری محبت میں گرفتار ہو کر سراپا محبت بن جائے۔ جس کو میری ہر بات میں حُسن نظر آئے...... جس کے ہر شعر میں[۳۷] میری اور صرف میری تصویر ہو .... جو میری محبت کی گہرائیوں میں گم ہو جائے...... میں اُسے ان تمام چیزوں کے بدلے میں اپنی نسوانیت کا وہ تحفہ دوں گی جو آج تک کوئی عورت نہیں دے سکی۔"

وہ خاموش ہوگئی۔ عفت حیرت کے مارے اُس کا منہ تکنے لگی۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سوشیلا کی گفتگو کا کوئی مطلب نہیں سمجھ سکی۔ میں خود متحیر تھا کہ پندرہ سولہ برس کی اس دبلی پتلی لڑکی کے سینے میں کیسے کیسے خیالات کروٹیں لے رہے ہیں۔ اُس کا ایک ایک لفظ میرے دماغ میں گونج رہا تھا۔

"اگر وہ مجھے نظر آجائے۔" یہ کہہ کر سوشیلا آگے بڑھی اور عفت کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہنے لگی: "تو میں اُس کے استقبال کے لیے بڑھوں اور اُس کے ہونٹوں پر[۳۸] وہ بوسہ دوں جو ایک زمانے سے میرے ہونٹوں کے نیچے جل رہا ہے۔"

اور شوشو نے، عفت کے حیرت سے کھلے ہوئے ہونٹوں پر، اپنے ہونٹ جما دیے ...... اور دیر تک اُن کو جمائے رکھا۔ تعجب ہے کہ عفت بالکل ساکت بیٹھی رہی اور معترض نہ ہوئی۔

جب دونوں کے لب، ایک مدھم آواز کے ساتھ، جُدا ہوئے اور ان کے چہرے مجھے نظر آئے تو

ایک عجیب و غریب نظارہ دیکھنے میں آیا۔ جس کو الفاظ بیان ہی نہیں کر سکتے۔ عفت اُس شہد کی مکھی کی طرح مسرور و متعجب معلوم ہوتی تھی جس نے پہلی مرتبہ، پھول کی نازک پتیوں پر بیٹھ کر، اُس کا رس چُوسنے کی لذت محسوس کی ہو...... اور سوشیلا...... وہ اور زیادہ پُر اسرار ہوگئی تھی۔

"آؤ اب سوئیں۔"

یہ خواب آلود اور دھیمی آواز عفت کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کپڑوں کی سرسراہٹ بھی سنائی دی۔ اور میں خیالات کے گہرے سمندر میں غوطہ لگا گیا۔

گندمی رنگ کی ننھی سی گڑیا، اپنے چھوٹے سے دماغ میں کیسے کیسے انوکھے خیالات کی پرورش کر رہی تھی ...... اور وہ کون سا تحفہ اپنے دامنِ نسوانیت میں چھپائے بیٹھی تھی جو آج تک کوئی عورت، مرد کو پیش نہیں کر سکی؟......

میں نے سُوراخ میں سے دیکھا: شوشو اور عفت دونوں ایک دوسری کے گلے میں باہیں ڈالے سو رہی تھیں۔ شوشو کے چہرے پر بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کے سانس سے اُن میں خفیف سا ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔ وہ کس قدر تر و تازہ معلوم ہوتی تھی!...... واقعی وہ اس قابل تھی کہ اُس پر شعر کہے جائیں ...... لیکن عباس تو شاعر نہیں تھا؟...... پھر، پھر ......!

حواشی

(اِن حواشی میں ص سے مراد: منٹو کے افسانے طبع اول (۱۹۴۰ء) کا صفحہ ہے۔ دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ ایسا کیوں نہ ہوتا .. دُلہنوں کو بیاہ کر لا رہے تھے۔ — ص: ۶۳
۲۔ ادھر اُدھر پھڑ پھڑانا شروع کر دیا۔ — ایضاً
۳۔ مٹکتی ہوئی انگلیاں... دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا — ص: ۶۴
۴۔ گھرے ہوئے — ایضاً
۵۔ تمہیں اپنی آنکھوں کا ضرور علاج کرانا چاہیے — ایضاً
۶۔ فوراً ہی منہ میں سے لال جیب نکال کر اُس نے میرا منہ چڑایا اور — ایضاً
۷۔ قدم رک گئے... فوراً ہی اُس کو — ص: ۶۵
۸۔ وہ جل ہی تو — ایضاً
۹۔ یہ تو بتائیں کہ... پڑھ رہے، اور نہ آپ کوئی خواب دیکھ رہے ہیں، سمجھے آپ! — ایضاً
۱۰۔ کھلی تھی۔ وہ بجلی — ایضاً
۱۱۔ راستے میں یہ سوچتا... محسوس کیا کہ کسی نے پیپرمنٹ کی گولیاں رکھ دی ہیں — صص: ۶۵ تا ۶۶

۱۲۔ پارے کا آخری جملہ جو بنیادی نسخے (ص:۸۶) میں شامل نہیں: کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ نیچر خام ہے اور وہ ہمارے ردّ و بدل کی محتاج ہے؟ ص:۶۶
۱۳۔ لڑکی تھی... رہتی تھی... مالک تھی ایضاً
۱۴۔ خیالات میں غرق میں ایضاً
۱۵۔ جب میں گھر میں ص:۶۷
۱۶۔ باہر گلی کی طرف ایضاً
۱۷۔ مل رہی تھیں... محسوس ہوتا تھا... صرف ایک لحظہ... مدھم گنگناہٹ ایضاً
۱۸۔ اور زیادہ غور ص:۶۸
۱۹۔ ایک بجلی سی... ایک سوشیلا تھی... گفتگو سننے کے ساتھ ساتھ اُن کو بھی دیکھ ایضاً
۲۰۔ پاس ہی ایضاً
۲۱۔ دلچسپی ہی نہیں ص:۶۹
۲۲۔ ذرا اُن کے دل سے کوئی ایضاً
۲۳۔ خوش ہوں گی وہ ایضاً
۲۴۔ کھلی جاتی ایضاً
۲۵۔ اپنے دل کے ایضاً
۲۶۔ یہ کیا ایضاً
۲۷۔ یکایک وہ اٹھ ص:۷۰
۲۸۔ ''جو ابھی تک میری'' واوین میں درج یہ الفاظ، بنیادی نسخے (ص:۹۱) میں نہیں ہیں، طبع اوّل (ص:۷۰) سے شاملِ متن کیے گئے ہیں۔
۲۹۔ اور اُس کا سینہ ایضاً
۳۰۔ جسم عباس کے بڑے بھائی ایضاً
۳۱۔ شروع کر دیا ایضاً
۳۲۔ ایسا تھا کہ معلوم ہوتا تھا وہ مندر ایضاً
۳۳۔ اس گفتگو ایضاً
۳۴۔ بات تمہیں بتا دی ص:۷۱
۳۵۔ میرا مذاق ایضاً
۳۶۔ اور پھر یہ سوچتی ہوں... اگر انسان جو کچھ چاہتا ہے ہو جایا کرے... میں جانتی ہوں کہ جو کچھ میں مانگ رہی ہوں... مگر میرے دل میں مانگ... کیا میرے زندہ ایضاً
۳۷۔ مجھے اپنی تصویر نظر آئے ایضاً
۳۸۔ لبوں پر ص:۷۲

خوشیا

خوشیا سوچ رہا تھا۔

بنواری سے کالے تمباکو والا پان لے کر وہ اُس کی دُکان کے ساتھ اُس سنگین چبوترے پر بیٹھا تھا جو دن کے وقت ٹائروں اور موٹروں کے مختلف پُرزوں سے بھرا ہوتا ہے۔ رات کو ساڑھے آٹھ بجے کے قریب موٹر کے پُرزے اور ٹائر بیچنے والوں کی یہ دکان بند ہو جاتی ہے۔ اور[1] اِس کا سنگین چبوترہ خوشیا کے لیے خالی ہو جاتا ہے۔

وہ کالے تمباکو والا پان آہستہ آہستہ چبا رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ پان کی گاڑھی، تمباکو ملی پیک، اُس کے دانتوں کی ریخوں سے نکل کر اس کے منہ میں اِدھر اُدھر پھسل رہی تھی اور اُسے ایسا لگتا تھا کہ اُس کے خیال، دانتوں تلے پس کر اُس کی پیک میں گھل رہے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے [وجہ تھی؟] کہ وہ اسے پھینکنا [تھوکنا؟] نہیں چاہتا تھا۔

خوشیا پان کی پیک منہ میں پلپلا رہا تھا اور اُس واقعے پر غور کر رہا تھا جو اس کے ساتھ ابھی ابھی[3] پیش آیا تھا، یعنی آدھ گھنٹہ پہلے۔

وہ اِس سنگین چبوترے پر حسب معمول بیٹھنے سے پہلے، کھیت واڑی کی پانچویں گلی میں گیا تھا۔ منگلور سے جو نئی چھوکری کانتا آئی تھی، اُسی گلی کے نکڑ پر رہتی تھی۔ خوشیا سے کسی نے کہا تھا کہ وہ اپنا مکان تبدیل کر رہی ہے۔ چنانچہ وہ اِسی بات کا پتہ لگانے کے لیے وہاں گیا تھا۔

کانتا کی کھولی کا دروازہ اُس نے کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی: ''کون ہے؟'' اس پر خوشیا نے کہا: ''میں خوشیا!''

آواز دوسرے کمرے سے آئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا۔ خوشیا اندر داخل ہوا۔ جب کانتا نے دروازہ اندر سے بند کیا تو خوشیا نے مڑ کر دیکھا۔ اس کی حیرت کی کوئی انتہا[2] نہ رہی جب اس نے کانتا کو بالکل ننگا دیکھا۔ بالکل ننگا ہی سمجھو کیونکہ وہ اپنے انگ کو صرف ایک تولیے سے چھپائے ہوئے تھی۔ چھپائے ہوئے، بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ چھپانے کی جتنی چیزیں ہوتی ہیں وہ تو سب کی سب خوشیا کی حیرت زدہ

آنکھوں کے سامنے تھیں۔

''کہو خوشیا کیسے آئے؟...... میں بس اب نہانے والی ہی[5] تھی۔ بیٹھو بیٹھو..... باہر والے سے اپنے لیے چائے کے لیے تو کہہ آئے ہوتے..... جانتے تو ہو، وہ مُوا راما، یہاں سے بھاگ گیا ہے۔''

خوشیا جس کی آنکھوں نے کبھی عورت کو یوں اچانک ننگا نہیں دیکھا تھا، بہت گھبرا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے؟[6] اس کی نظریں جو ایک دم عریانی سے دوچار ہوگئی تھیں، اپنے آپ کو کہیں چھپانا چاہتی تھیں۔

اُس نے جلدی جلدی صرف اتنا کہا: ''جاؤ...... جاؤ تم نہالو'' پھر ایک دم اس کی زبان کھل گئی: ''پر جب تم ننگی تھیں تو دروازہ کھولنے کی کیا ضرورت تھی؟...... اندر سے کہہ دیا ہوتا، میں پھر آجاتا...... لیکن جاؤ ...... تم نہالو۔''

کانتا مسکرائی: ''جب تم نے کہا خوشیا ہے، تو میں نے سوچا کیا ہرج ہے، اپنا خوشیا ہی تو ہے، آنے دو......''

کانتا کی یہ مسکراہٹ ابھی تک خوشیا کے دل و دماغ میں تیر رہی تھی۔ اس وقت بھی کانتا کا ننگا جسم موم کے پتلے کی مانند اُس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا اور پگھل پگھل کر اُس کے اندر جا رہا تھا۔

اُس کا جسم خوب صورت تھا۔ پہلی مرتبہ خوشیا کو معلوم ہوا کہ جسم بیچنے والی عورتیں بھی ایسا سڈول بدن رکھتی ہیں۔ اُس کو اس بات پر حیرت ہوئی تھی۔ پر سب سے زیادہ تعجب اُسے اِس بات پر ہوا تھا کہ ننگ دھڑنگ وہ اس کے سامنے کھڑی ہوگئی اور اُس کو لاج تک نہ آئی۔ کیوں؟

اس کا جواب کانتا نے یہ دیا تھا: ''جب تم نے کہا خوشیا ہے، تو میں نے سوچا کیا ہرج ہے، اپنا خوشیا ہی تو ہے، آنے دو......''

کانتا اور خوشیا ایک ہی پیشے میں شریک تھے۔ وہ اُس کا دلّال تھا۔ اس لحاظ سے وہ اُسی کا تھا..... پر یہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ اس کے سامنے ننگی ہوجاتی [آجاتی؟][7] کوئی خاص بات تھی۔ کانتا کے الفاظ میں، خوشیا کوئی اور ہی مطلب کرید رہا تھا۔

یہ مطلب بیک وقت اس قدر صاف اور اس قدر مبہم تھا کہ خوشیا کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔

اِس وقت بھی وہ کانتا کے ننگے جسم کو دیکھ رہا تھا جو ڈھولکی پر منڈھے ہوئے چمڑے کی طرح تنا ہوا تھا۔ اُس کی لڑھکتی ہوئی نگاہوں سے بالکل بے پروا! کئی بار حیرت کے عالم میں بھی اُس نے اُس کے سانولے

سلونے بدن پر ٹوہ لینے والی نگاہیں گاڑی تھیں۔ مگر اُس کا ایک رواں تک بھی نہ کپکپایا تھا، بس سانولے پتھر کی مورتی کے مانند کھڑی رہی جو احساس سے عاری ہو۔

بھئی، ایک مرد اُس کے سامنے کھڑا تھا...... مرد، جس کی نگاہیں کپڑوں میں بھی عورت کے جسم تک پہنچ جاتی ہیں اور جو پر ماتما جانے، خیال ہی خیال میں کہاں کہاں پہنچ جاتا ہے۔ لیکن وہ ذرا بھی نہ گھبرائی اور ...... اور اس کی آنکھیں، ایسا سمجھ لو کہ ابھی لانڈری سے دُھل کر آئی ہیں ...... اس کو تھوڑی سی لاج تو آنی چاہیے تھی۔ ذرا سی سُرخی تو اُس کے دیدوں میں پیدا ہونی چاہیے۔ مان لیا، کسبی تھی؟ پر کسبیاں یوں ننگی تو نہیں کھڑی ہو جاتیں!

دس برس اُس کو دلالی کرتے ہو گئے تھے اور ان دس برسوں میں وہ پیشہ کرانے والی لڑکیوں کے تمام رازوں سے واقف ہو چکا تھا۔ مثال کے طور پر، اُسے یہ معلوم تھا کہ پائے دھونی کے آخری سرے پر جو چھوکری ایک نوجوان لڑکے کو بھائی بنا کر رہتی ہے؛ اس لیے ''اچھوت کنیا'' کا ریکارڈ'' کاہے کرتا مورکھ پیار، پیار، پیار'' اپنے ٹوٹے ہوئے باجے پر بجایا کرتی ہے کہ اُسے اشوک کمار سے بہت بُری طرح عشق ہے۔ کئی من چلے لونڈے، اشوک کمار سے اُس کی ملاقات کرانے کا جھانسا دے کر اپنا اُلو سیدھا کر چکے تھے۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ دادر میں جو پنجابن رہتی ہے، صرف اس لیے کوٹ پتلون پہنتی ہے کہ اُس کے ایک یار نے اُس سے کہا تھا کہ تیری ٹانگیں تو بالکل اُس انگریز ایکٹرس کی طرح ہیں جس نے ''مراکو عرف خونِ تمنا'' میں کام کیا تھا۔ یہ فلم اُس نے کئی بار دیکھا اور جب اُس کے یار نے کہا کہ مارلین ڈیٹرچ اس لیے پتلون پہنتی ہے کہ اُس کی ٹانگیں بہت خوبصورت ہیں اور اُن ٹانگوں کا اس نے دو لاکھ کا بیمہ کرا رکھا ہے تو اُس نے بھی پتلون پہننی شروع کر دی۔ جو اُس کے چوتڑوں میں بہت پھنس کر آتی تھی۔ اور اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ ''مز گاؤں'' والی دکھشنی چھوکری صرف اس لیے کالج کے خوب صورت لونڈوں کو پھانستی ہے کہ اُسے ایک خوب صورت بچے کی ماں بننے کا شوق ہے۔ اُس کو یہ بھی پتہ تھا کہ وہ کبھی اپنی خواہش پوری نہ کر سکے گی، اس لیے کہ بانجھ ہے۔ اور اُس کالی مدراسن کی بابت جو ہر وقت کانوں میں ہیرے کی ''بوٹیاں'' پہنے رہتی تھی، اُس کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ اُس کا رنگ کبھی سفید نہیں ہوگا اور وہ اُن دواؤں پر بے کار روپیہ برباد کر رہی ہے جو آئے دن خریدتی[۱۰] رہتی ہے۔

اُس کو اُن تمام چھوکریوں کا، اندر باہر کا، حال معلوم تھا جو اس کے حلقے میں شامل تھیں۔ مگر اُس کو یہ خبر نہ تھی کہ ایک روز کانتا کماری، جس کا اصلی نام اتنا مشکل تھا کہ وہ عمر بھر یاد نہیں کر سکتا تھا، اُس کے سامنے ننگی کھڑی

ہو جائے گی اور اُس کو زندگی کے سب سے بڑے" تعجب سے دوچار کرائے گی۔

سوچتے سوچتے اُس کے منہ میں پان کی پیک اس قدر جمع ہو گئی تھی کہ اب وہ مشکل سے چھالیا کے ان ننھے ننھے ریزوں کو چبا سکتا تھا جو اس کے دانتوں کی ریخوں میں سے ادھر اُدھر پھسل کر نکل جاتے تھے۔ اس کے تنگ ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو گئی تھیں جیسے ململ میں پنیر کو آہستہ سے دبا دیا گیا ہے [دبا دیا گیا ہو؟] ..... اُس کے مردانہ وقار کو دھکا سا پہنچتا تھا جب وہ کانتا کے ننگے جسم کو اپنے تصور میں لاتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا اپمان ہُوا ہے۔

ایک دم اُس نے اپنے دل میں کہا: بھئی یہ اپمان نہیں ہے تو کیا ہے ...... یعنی ایک چھوکری ننگ دھڑنگ تمہارے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور کہتی ہے اس میں" ہرج ہی کیا ہے؟ ... تم خوشیا ہی تو ہو ...... خوشیا نہ ہُوا، سالا وہ بلاّ ہو گیا جو اُس کے بستر پر ہر وقت اونگھتا رہتا ہے ...... اور کیا؟

اب اُسے یقین ہونے لگا کہ سچ مچ اس کی ہتک ہوئی ہے۔ وہ مرد تھا اور اُس کو اس بات کی غیر محسوس طریق پر توقع تھی کہ عورتیں خواہ شریف ہوں یا بازاری، اس کو مرد ہی سمجھیں گی۔ اور اس کے اور اپنے درمیان وہ پردہ قائم رکھیں گی جو ایک مدت سے چلا آرہا ہے۔ وہ تو صرف یہ پتہ لگانے کے لیے کانتا کے یہاں گیا تھا کہ وہ کب مکان تبدیل کر رہی ہے؟ اور کہاں جا رہی ہے؟ کانتا کے پاس اس کا جانا یکسر بزنس سے متعلق تھا۔ اگر خوشیا، کانتا کی بابت سوچتا" کہ جب وہ اُس کا دروازہ کھٹکھٹائے گا تو وہ اندر کیا کر رہی ہوگی؟ تو اُس کے تصور میں زیادہ سے زیادہ اتنی باتیں آسکتی تھیں:

سر پر پٹی باندھے لیٹ رہی ہوگی۔ [کذا]

بلّے کے بالوں میں سے پسّو نکال رہی ہوگی۔

اُس بال صفا پوڈر سے بغلوں کے بال اُڑا رہی ہوگی جو اتنی باس مارتا تھا کہ خوشیا کی ناک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

پلنگ پر اکیلی بیٹھی، تاش پھیلائے پیشنس کھیلنے میں مشغول ہوگی۔

بس اتنی چیزیں تھیں جو اُس کے ذہن میں آتیں۔ گھر میں وہ کسی کو رکھتی نہیں تھی اس لیے 'اُس بات' کا خیال ہی نہیں آسکتا تھا۔ پر خوشیا نے تو یہ سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ تو کام سے وہاں گیا تھا کہ اچانک کانتا ..... یعنی کپڑے پہننے والی کانتا...... مطلب یہ کہ وہ کانتا جس کو وہ ہمیشہ کپڑوں میں دیکھا کرتا تھا، اُس کے سامنے بالکل ننگی کھڑی ہوگئی ..... بالکل ننگی ہی سمجھو کیونکہ ایک چھوٹا سا تولیا سب کچھ تو چھپا نہیں سکتا۔ خوشیا کو یہ نظارہ

دیکھ کر ایسا محسوس ہوا تھا جیسے چھلکا اُس کے ہاتھ میں رہ گیا ہے اور کیلے کا گودا پُرچ کر کے اس کے سامنے آ گرا ہے۔ نہیں، اُسے کچھ اور ہی محسوس ہوا تھا۔ جیسے ...... جیسے وہ خود ننگا ہو گیا ہے۔ اگر بات یہاں تک ہی ختم ہو جاتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ خوشیا اپنی حیرت کو کسی نہ کسی حیلے سے دُور کر دیتا۔ مگر یہاں مصیبت یہ آن پڑی تھیں کہ اُس لونڈیا نے مسکرا کر کہا تھا: ''جب تم نے کہا خوشیا ہے، تو میں نے سوچا اپنا خوشیا ہی تو ہے، آنے دو'' ...... یہ بات اُسے کھائے جا رہی تھی۔

''سالی مسکرا رہی تھی'' ...... وہ بار بار بڑبڑاتا۔ جس طرح کانتا ننگی تھی، اُسی طرح اس کی مسکراہٹ، خوشیا کو ننگی نظر آئی تھی۔ مسکراہٹ ہی نہیں، اُسے کانتا کا جسم بھی اس حد تک نظر[۱۴] آیا تھا گویا اُس پر رندا پھرا ہوا ہے۔

اُسے بار بار بچپن کے وہ دن یاد آ رہے تھے جب پڑوس کی ایک عورت اس سے کہا کرتی تھی: ''خوشیا بیٹا، جا، دوڑ کے جا، یہ بالٹی پانی سے بھر لا۔'' جب وہ بالٹی بھر کے لایا کرتا تو وہ دھوتی سے بنائے ہوئے پردے کے پیچھے سے کہا کرتی تھی: ''اندر آ کے، یہاں میرے پاس رکھ دے۔ میں نے منہ پر صابن ملا ہوا ہے۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔'' وہ دھوتی کا پردہ ہٹا کر، بالٹی اُس کے پاس رکھ دیا کرتا تھا۔ اُس وقت صابن کے جھاگ میں لپٹی ہوئی ننگی عورت اسے نظر آیا کرتی تھی مگر اس کے دل میں کسی قسم کا ہیجان پیدا نہیں ہوتا تھا۔[۱۵]

بھئی میں اُس وقت بچہ تھا، بالکل بھولا بھالا۔ بچے اور مرد میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بچوں سے کون پردہ کرتا ہے مگر اب تو[۱۶] میں پورا مرد ہوں۔ میری عمر اس وقت اٹھائیس برس کے قریب ہے اور اٹھائیس برس کے جوان آدمی کے سامنے تو کوئی بوڑھی عورت بھی ننگی کھڑی نہیں ہوتی۔

کانتا نے اسے کیا سمجھا تھا؟ کیا اس میں وہ تمام باتیں نہیں تھیں جو ایک نوجوان مرد میں ہوتی ہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کانتا کو یک بیک ننگ دھڑنگ دیکھ کر بہت گھبرا گیا تھا لیکن چور نگاہوں سے کیا اس نے کانتا کی اُن چیزوں کا جائزہ نہیں لیا جو روزانہ استعمال کے باوجود اصلی حالت پر قائم تھیں اور کیا تعجب کے ہوتے ہوئے اس کے دماغ میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ دس روپے میں کانتا بالکل مہنگی نہیں۔ اور دسہرے کے روز بینک کا وہ منشی جو دو روپے کی رعایت نہ ملنے پر واپس چلا گیا تھا، بالکل گدھا تھا ...... اور ...... ان سب کے اوپر، کیا ایک لمحے کے لیے اُس کے تمام پٹھوں میں ایک عجیب قسم کا کھنچاؤ پیدا[۱۷] نہیں ہو گیا تھا۔ اور اُس نے ایک ایسی انگڑائی نہیں لینا چاہی تھی جس سے اُس کی ہڈیاں تک چٹخنے لگیں؟ ...... پھر کیا وجہ تھی کہ منگلور کی اُس سانولی چھوکری نے اس کو مرد نہ سمجھا اور صرف ...... صرف خوشیا سمجھ کر، اُس کو اپنا سب کچھ دیکھنے دیا؟

اس نے غصے میں آ کر پان کی گاڑھی پیک تھوک دی جس نے فٹ پاتھ پر کئی بیل بوٹے بنا دیے۔

پیک تھوک کر وہ اٹھا اور ٹرام میں بیٹھ کر اپنے گھر چلا گیا۔

گھر میں اُس نے نہا دھو کر، نئی دھوتی پہنی۔ جس بلڈنگ میں رہتا تھا[۱۸] اُس کی ایک دُکان میں سیلون تھا۔ اُس کے اندر جا کر اس نے آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھی کی۔ پھر فوراً ہی کچھ خیال آیا تو کرسی پر بیٹھ گیا اور بڑی سنجیدگی سے اس نے داڑھی مونڈنے کے لیے حجام سے کہا۔ آج چونکہ وہ دوسری مرتبہ داڑھی مُنڈوا رہا تھا، اس لیے حجام نے کہا: ''ارے بھئی خوشیا بھول گئے کیا؟ صبح میں نے ہی تو تمہاری داڑھی مونڈی تھی۔'' اس پر خوشیا نے، بڑی متانت سے، داڑھی پر اُلٹا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: ''کھونٹی اچھی طرح نہیں نکلی......''

اچھی طرح کھونٹی نکلوا کر اور چہرے پر پوڈر ملوا کر، وہ سیلون سے باہر نکلا۔ سامنے ٹیکسیوں کا اڈا تھا۔ بمبے کے مخصوص انداز میں اُس نے ''چھی چھی'' [؟شی شی] کر کے ایک ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی طرف متوجہ کیا اور انگلی کے اشارے سے اُسے ٹیکسی لانے کے لیے کہا۔

جب وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا تو ڈرائیور نے مڑ کر، اُس سے پوچھا: ''کہاں جانا ہے صاحب؟''

ان چار لفظوں نے اور خاص طور پر ''صاحب'' نے خوشیا کو بہت مسرور کیا۔ مسکرا کر، اُس نے بڑے دوستانہ لہجے میں جواب دیا: ''بتائیں گے، پہلے تم ''آپرا ہاؤس'' کی طرف چلو...... لیمنگٹن روڈ سے ہوتے ہوئے...... سمجھے!''

ڈرائیور نے میٹر کی لال جھنڈی کا سر نیچے دبا دیا۔ ٹن ٹن ہوئی اور ٹیکسی نے لیمنگٹن روڈ کا رخ کیا۔ لیمنگٹن روڈ کا جب آخری سرا آ گیا تو خوشیا نے ڈرائیور کو ہدایت دی: ''بائیں ہاتھ موڑ لو۔''

ٹیکسی بائیں ہاتھ مڑ گئی۔ ابھی ڈرائیور نے گیئر بھی نہ بدلا تھا کہ خوشیا نے کہا: ''یہ سامنے والے کھمبے کے پاس روک لینا ذرا۔'' ڈرائیور نے عین کھمبے کے پاس ٹیکسی کھڑی کر دی۔ خوشیا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور ایک پان والے کی دُکان کی طرف بڑھا۔ یہاں سے اس نے ایک پان لیا۔ اور اُس آدمی سے جو کہ دُکان کے پاس کھڑا تھا، چند باتیں کیں اور اُسے اپنے ساتھ ٹیکسی پر بٹھا کر ڈرائیور سے کہا: ''سیدھے لے چلو!''

دیر تک ٹیکسی چلتی رہی۔ خوشیا نے جدھر اشارہ کیا، ڈرائیور نے اُدھر ہینڈل پھرا دیا۔ مختلف پُر رونق بازاروں میں سے ہوتے ہوئے، ٹیکسی ایک نیم روشن گلی میں داخل ہوئی جس میں آمد و رفت بہت کم تھی۔ کچھ لوگ سڑک پر بستر جمائے لیٹے تھے۔ اُن میں سے کچھ بڑے اطمینان سے چمپی کرا رہے تھے۔ جب ٹیکسی اُن چمپی کرانے والوں کے آگے نکل گئی اور ایک کاٹھ کے بنگلہ نما مکان کے پاس پہنچی، تو خوشیا نے ڈرائیور کو ٹھہرنے کے لیے کہا: ''بس اب یہاں رُک جاؤ۔'' ٹیکسی ٹھہر گئی[۱۹] تو خوشیا نے، اُس آدمی سے جس کو وہ پان

والے کی دُکان سے اپنے ساتھ لایا تھا، آہستہ سے کہا: ''جاؤ...... میں یہاں انتظار کرتا ہوں۔''

وہ آدمی، بے وقوفوں کی طرح خوشیا کی طرف دیکھتا ہوا، ٹیکسی سے باہر نکلا اور سامنے والے چوبی مکان میں داخل ہوگیا۔

خوشیا جم کر ٹیکسی کے گدے پر بیٹھ گیا۔ ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھ کر، اُس نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی اور ایک دوکش لے کر باہر سڑک پر پھینک دی۔ وہ بہت مضطرب تھا۔ اس لیے اسے ایسا لگا کہ ٹیکسی'' کا انجن بند نہیں ہوا۔ اُس کے سینے میں چونکہ پھڑ پھڑاہٹ سی ہو رہی تھی اس لیے وہ سمجھا کہ ڈرائیور نے بل بڑھانے کی غرض سے پٹرول چھوڑ رکھا ہے۔ چنانچہ اُس نے تیزی سے کہا: ''یوں بے کار انجن چالو رکھ کر تم کتنے پیسے اور بڑھالو گے؟''

ڈرائیور نے مڑ کر خوشیا کی طرف دیکھا اور کہا: ''سیٹھ انجن تو بند ہے۔''

جب خوشیا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اُس کا اضطراب اور بھی بڑھ گیا۔ اور اس نے کچھ کہنے کے بجائے اپنے ہونٹ چبانے شروع کر دیے۔ پھر ایکا ایکی، سر پر وہ کشتی نما کالی ٹوپی پہن کر، [اوڑھ کر؟] جو اَب تک اُس کی بغل میں دبی ہوئی تھی، اس نے ڈرائیور کا شانہ ہلایا اور کہا ''دیکھو، ابھی ایک چھوکری آئے گی۔ جوں ہی اندر داخل ہو تم موٹر چلا دینا...... سمجھے...... گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے، معاملہ ایسا ویسا نہیں۔''

اتنے میں، سامنے چوبی مکان سے دو آدمی باہر نکلے۔ آگے آگے خوشیا کا دوست تھا۔ اور اُس کے پیچھے کانتا جس نے شوخ رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی!؟

خوشیا، جھٹ سے اُس طرف کو سرک گیا، جدھر اندھیرا تھا۔ خوشیا کے دوست نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور کانتا کو اندر داخل کر کے دروزاہ بند کر دیا۔ فوراً ہی، کانتا کی حیرت بھری آواز سنائی دی جو چیخ سے ملتی جلتی تھی: ''خوشیا تم!''

''ہاں میں...... لیکن تمھیں روپے مل گئے ہیں نا؟'' خوشیا کی موٹی آواز بلند ہوئی: ''دیکھو ڈرائیور! ...... جُوہُو لے چلو۔''

ڈرائیور نے سَیلف دبایا، انجن پھڑ پھڑانا شروع ہوا، وہ بات جو کانتا نے کہی، سنائی نہ دے سکی۔ ٹیکسی، ایک دھچکے کے ساتھ، آگے بڑھی اور خوشیا کے دوست کو سڑک کے بیچ حیرت زدہ چھوڑ کر، نیم روشن گلی میں غائب ہوگئی۔

اس کے بعد، کسی نے خوشیا کو، موٹروں [کے پرزوں؟] کی دُکان کے سنگین چبوترے پر، نہیں دیکھا۔

حواشی

(ان حواشی میں ص سے مراد: منٹو کے افسانے طبع اوّل (۱۹۴۰ء)
کا صفحہ ہے۔ دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ ایک کالے تمبا کو... جو کہ دن کے ... بھرا ہوتا تھا... بند ہو جاتی اور — ص:۷۳
۲۔ اُس کی دانتوں کی ... ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کے خیالات — ایضاً
۳۔ ''ابھی ابھی'' واوین میں درج یہ لفظ، بنیادی نسخے (ص:۹۸)
میں نہیں ہیں، طبع اوّل (ص:۷۳) سے شامل متن کیے گئے ہیں۔
۴۔ کوئی حد — ص:۷۴
۵۔ نہانے ہی والی — ایضاً
۶۔ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہے — ایضاً
۷۔ ننگی کھڑی ہو جاتی — ص:۷۵
۸۔ سے یہ بالکل بے پروا تھا... وہ سانولے پتھر... کھڑی رہی
جو کہ احساس سے عاری ہوتی ہے۔ — ایضاً
۹۔ آنکھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا... ہونی چاہیے تھی، مان لیا کہ وہ کسی تھی — ایضاً
۱۰۔ انگریزی ایکٹرس... پر بہت پھنس کر... آئے دن وہ خریدتی — صص:۷۵ تا ۷۶
۱۱۔ ''بڑے'' واوین میں درج یہ لفظ، بنیادی نسخے (ص:۱۰۲) میں نہیں ہے،
طبع اوّل (ص:۷۶) سے شامل متن کیا گیا ہے۔
۱۲۔ ہے کہ اِس میں — ص:۷۶
۱۳۔ عورتیں خواہ وہ شریف... بابت یہ سوچتا — ایضاً
۱۴۔ کانتا کا ننگا جسم بھی اس حد تک ننگا نظر — ص:۷۷
۱۵۔ کسی قسم کے خیالات پیدا نہیں ہوتے تھے۔ — ایضاً
۱۶۔ پر اب تو — ایضاً
۱۷۔ چلا گیا تھا، بدقسمت... کھنچاؤ سا پیدا — ص:۷۸
۱۸۔ وہ رہتا تھا — ایضاً
۱۹۔ بڑے مزے سے چپی... جب ٹیکسی ٹھہر گئی — ص:۷۹
۲۰۔ مضطرب تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ٹیکسی — ایضاً
۲۱۔ ''پہن رکھی تھی۔'' کے بعد کا منسوخ جملہ: یہ ساڑھی وہ خاص موقعوں پر
پہنا کرتی تھی — ص:۸۰

بانجھ

میری اور اُس کی ملاقات آج سے ٹھیک دو برس پہلے اپولو بندر پر ہوئی۔ شام کا وقت تھا، سورج کی آخری کرنیں سمندر کی اُن دور دراز لہروں کے پیچھے غائب ہو چکی تھیں جو ساحل کے بینچ پر بیٹھ کر دیکھنے سے، موٹے کپڑے کی تہیں معلوم ہوتی تھیں۔ میں گیٹ آف انڈیا کے اس طرف، پہلا بینچ چھوڑ کر جس پر ایک آدمی چمپی والے سے اپنے سر کی مالش کرا رہا تھا، دُوسرے بینچ پر بیٹھا تھا اور حدِ نظر تک پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھ رہا تھا۔ دور، بہت دور، جہاں سمندر اور آسمان گھل مل رہے تھے، بڑی بڑی لہریں آہستہ آہستہ اُٹھ رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بہت بڑا گدلے رنگ کا قالین ہے جسے اُدھر سے ادھر سمیٹا[1] جا رہا ہے۔

ساحل کے سب قمقمے روشن تھے جن کا عکس کنارے کے لرزاں پانی پر کپکپاتی ہوئی موٹی لکیروں کی صورت میں جگہ جگہ رینگ رہا تھا۔ میرے پاس پتھریلی دیوار کے نیچے، کئی کشتیوں کے لپٹے ہوئے بادبان اور بانس، ہولے ہولے حرکت کر رہے تھے۔ سمندر کی لہریں اور تماشائیوں کی آواز ایک گنگناہٹ بن کر فضا میں گھلی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی کسی آنے یا جانے والی موٹر کے ہارن کی آواز بلند ہوتی اور یوں معلوم[2] ہوتا کہ بڑی دلچسپ کہانی سننے کے دوران میں کسی نے زور سے ''ہوں'' کی ہے۔

ایسے ماحول میں سگریٹ پینے کا بہت مزہ آتا ہے۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ مگر ماچس نہ ملی۔ جانے کہاں بھول آیا تھا۔ سگریٹ کی ڈبیا واپس جیب میں رکھنے ہی والا تھا کہ پاس سے کسی نے کہا: ''ماچس لیجیے گا؟''

میں نے مڑ کر دیکھا، بینچ کے پیچھے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ یوں تو بمبئی کے عام باشندوں کا رنگ زرد ہوتا ہے لیکن اُس کا چہرہ خوفناک طور پر زرد تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا: ''آپ کی بڑی عنایت ہے۔''

یہ سن کر اُس نے ماچس کی ڈبیا جو اُس کے ہاتھ ہی میں تھی، میری طرف بڑھا دی۔ میں نے پھر شکریہ ادا کیا اور کہا: ''تشریف رکھیے۔''

اُس نے جواب دیا: ''آپ سگریٹ سلگا لیجیے، مجھے جانا ہے۔''

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے کیونکہ اس کے لہجے سے اس بات کا پتہ چلتا تھا کہ اسے

کوئی جلدی نہیں ہے اور نہ اسے کہیں جانا ہے۔ آپ کہیں گے کہ لہجے سے ایسی باتوں کا کس طرح پتہ[۴] چل سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے اُس وقت ایسا ہی محسوس ہوا۔ چنانچہ میں نے ایک بار پھر کہا: ''ایسی جلدی کیا ہے...... تشریف رکھیے۔'' اور یہ کہہ کر میں نے سگریٹ کی ڈبیا اس کی طرف بڑھادی: ''شوق فرمایئے۔''

اس نے سگریٹ کے چھاپ کی طرف دیکھا اور جواب دیا: ''شکریہ، میں صرف اپنا برانڈ پیا کرتا ہوں۔''

آپ مانیں نہ مانیں، مگر میں قسمیہ کہتا ہوں کہ اس بار اُس نے پھر جھوٹ بولا۔ اس مرتبہ پھر اس کے لہجے نے چغلی کھائی اور مجھے اُس سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اِس لیے کہ میں نے اپنے دل میں قصد کرلیا تھا کہ اسے ضرور اپنے پاس بٹھاؤں گا اور اپنا[۵] سگریٹ پلواؤں گا۔ [؟ اس لیے میں نے اپنے دل میں قصد کرلیا کہ اُسے ضرور اپنے پاس بٹھاؤں گا اور اپنا سگریٹ پلاؤں گا۔] میرے خیال کے مطابق اس میں مشکل کی کوئی بات ہی نہ تھی کیونکہ اس کے دو جملوں ہی نے مجھے بتادیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ میرے پاس بیٹھے اور سگریٹ پیے۔ لیکن بیک وقت اس کے دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے کہ میرے پاس نہ بیٹھے اور میرا سگریٹ نہ پیے۔ چنانچہ ہاں اور نہ کا یہ تصادم، اس کے لہجے میں صاف طور پر مجھے نظر آیا تھا۔ آپ یقین جانیے کہ اس کا وجود بھی ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں لٹکا ہوا تھا۔

اس کا چہرہ، جیسا کہ میں بیان کرچکا ہوں، بے حد پیلا تھا۔ اُس پر اس کی ناک، آنکھوں اور منہ کے خطوط، اس قدر مدھم تھے جیسے[۶] کسی نے تصویر بنائی ہے اور اُس کو پانی سے دھو ڈالا ہے۔ کبھی کبھی اس کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کے ہونٹ اُبھرسے آتے لیکن پھر راکھ میں لپٹی ہوئی چنگاری کی مانند سو جاتے۔ اس کے چہرے کے دوسرے خطوط کا بھی یہی حال تھا۔ آنکھیں گدلے پانی کی دو بڑی بڑی بوندیں تھیں جن پر اس کی چھدری پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ بال کالے تھے مگر ان[۷] کی سیاہی جلے ہوئے کاغذ کے مانند تھی جن میں [؟ جس میں] بھوسلاپن بھی ہوتا ہے۔ قریب سے دیکھنے پر اس کی ناک کا صحیح نقشہ معلوم ہوسکتا تھا مگر دُور سے دیکھنے پر وہ بالکل چپٹی معلوم ہوتی تھی کیونکہ، جیسا کہ میں اس سے پیشتر بیان کرچکا ہوں، اس کے چہرے کے خطوط بالکل ہی مدھم تھے۔

اس کا قد عام لوگوں جتنا تھا۔ یعنی نہ چھوٹا نہ بڑا۔ البتہ جب وہ ایک خاص انداز سے یعنی اپنی کمر کی ہڈی کو ڈھیلا چھوڑ کے، کھڑا ہوتا تو اس کے قد میں نمایاں فرق پیدا ہوجاتا۔ اس طرح جب کہ وہ [؟ اسی طرح جب وہ] ایک دم کھڑا ہوتا تو اس کا قد، جسم کے مقابلے میں بہت بڑا دکھائی دیتا۔

کپڑے اس کے خستہ حالت میں تھے لیکن میلے نہیں تھے۔ کوٹ کی آستینوں کے آخری حصے کثرتِ استعمال کے باعث گھس گئے تھے اور پھوسڑے نکل آئے تھے۔ کالر کھلا تھا اور قمیص بس ایک اور دھلائی کی مار تھی۔ مگر ان کپڑوں میں بھی وہ خود کو ایک باوقار انداز میں پیش کرنے کی سعی کر رہا تھا۔ میں نے 'سعی کر رہا تھا' اس لیے کہا کیونکہ جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے سارے وجود میں بے چینی کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے آپ کو میری نگاہوں سے اوجھل رکھنا چاہتا ہے۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا اور سگریٹ سُلگا کر اُس کی طرف پھر ڈبیا بڑھا دی: ''شوق فرمایئے۔''

یہ میں نے کچھ اس طریقے سے کہا اور فوراً ماچس سُلگا کر اِس انداز سے پیش کی کہ وہ سب کچھ بھول گیا۔ اس نے ڈبیا میں سے سگریٹ نکال کر منہ میں دبا لیا اور اسے سلگا کر پینا بھی شروع کر دیا۔ لیکن ایکا ایکی اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور منہ میں سے سگریٹ نکال کر، مصنوعی کھانسی کے آثار حلق میں پیدا کرتے ہوئے، اس نے کہا: '' کیونڈر مجھے راس نہیں آتے، ان کا تمباکو بہت تیز ہے، میرے گلے میں فوراً خراشیں پیدا ہو جاتی ہیں۔''

میں نے اس سے پوچھا: '' آپ کون سے سگریٹ پسند کرتے ہیں؟''

اس نے تُتلا کر [ہکلا کر؟] جواب دیا: ''میں ...... میں ...... دراصل سگریٹ بہت کم پیتا ہوں۔ کیونکہ ڈاکٹر ارولکر نے منع کر رکھا ہے۔ ویسے میں تھری فائیو پیتا ہوں جن کا تمباکو تیز نہیں ہوتا۔''

اس نے جس ڈاکٹر کا نام لیا، وہ بمبئی کا بہت بڑا ڈاکٹر ہے۔ اُس کی فیس دس روپے ہے اور جن سگریٹوں کا اس نے حوالہ دیا، اُن کے متعلق آپ کو بھی معلوم ہوگا کہ بہت مہنگے داموں پر ملتے ہیں۔ اس نے ایک ہی سانس میں دو جھوٹ بولے جو مجھے ہضم نہ ہوئے، مگر میں خاموش رہا۔ حالانکہ، سچ عرض کرتا ہوں، اس وقت میرے دل میں یہی خواہش چٹکیاں لے رہی تھی کہ اس کا غلاف اُتار دوں اور اس کی دروغ گوئی کو بے نقاب کر دوں۔ اور اسے کچھ اس طرح شرمندہ کروں کہ وہ مجھ سے معافی مانگے۔ مگر میں نے جب اس کی طرف دیکھا تو اس فیصلے پر پہنچا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے، اُس کا جز بن کر رہ گیا ہے۔ جھوٹ بول کر چہرے پر جو ایک سُرخی سی دوڑ جایا کرتی ہے، مجھے نظر نہ آئی۔ بلکہ میں نے یہ دیکھا کہ وہ جو کچھ کہہ چکا ہے اس کو حقیقت سمجھتا ہے۔ اس کے جھوٹ میں اس قدر اخلاص تھا یعنی اس نے اتنے پُر خلوص طریقے پر جھوٹ بولا تھا کہ اس کی میزانِ احساس میں ہلکی سی جنبش بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ خیر، اس قصّے کو چھوڑیے۔ ایسی باریکیاں میں آپ کو بتانے لگوں تو صفحوں کے صفحے کالے ہو جائیں گے اور افسانہ بہت خشک ہو جائے گا۔

تھوڑی سی رسمی گفتگو کے بعد میں نے اُس کو راہ پر لگالیا اور، ایک اور سگریٹ پیش کر کے، سمندر کے دل فریب منظر کی بات چھیڑ دی۔ چونکہ افسانہ نگار ہوں، اس لیے کچھ اس دلچسپ طریقے پر اُسے سمندر، اپولو بندر اور وہاں آنے جانے والے تماشائیوں کے بارے میں چند باتیں سنائیں کہ چھ سگریٹ پینے پر بھی اس کے حلق میں خرخراہٹ پیدا نہ ہوئی۔ اس نے میرا نام پوچھا۔ میں نے بتایا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا: ''آپ ...... آپ مسٹر ...... ہیں ...... میں آپ کے کئی افسانے پڑھ چکا ہوں۔ مجھے ...... مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ہی ...... ہیں۔ مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ واللہ! بہت خوشی ہوئی ہے۔''

میں نے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا مگر اس نے اپنی بات شروع کر دی ...... ''ہاں خوب یاد آیا۔ ابھی حال ہی میں آپ کا ایک افسانہ میں نے پڑھا ہے ...... عنوان بھول گیا ہوں ... ۔ اُس میں آپ نے ایک لڑکی پیش کی ہے جو کسی مرد سے محبت کرتی تھی۔ مگر وہ اُسے دھوکا دے گیا۔ اُسی لڑکی سے ایک اور مرد بھی محبت کرتا تھا۔ جو افسانہ سناتا ہے۔ جب اس کو لڑکی کی افتاد کا پتہ چلتا ہے تو وہ اُس سے ملتا ہے اور اس سے کہتا ہے''زندہ رہو ...... اُن چند گھڑیوں کی یاد میں [؟ یاد پر] اپنی زندگی کی بنیادیں کھڑی کرو جو تم نے اُس کی محبت میں گزاری ہیں، اُس مسرت کی یاد میں جو تم نے چند لمحات کے لیے حاصل کی تھی''۔ مجھے اصل عبارت یاد نہیں رہی لیکن مجھے بتائیے، کیا ایسا ممکن ہے ...... ممکن کو چھوڑیے، آپ یہ بتائیے کہ وہ آدمی آپ تو نہیں تھے؟ ...... معاف کیجیے گا، میں ایسے سوال کر رہا ہوں جو مجھے نہیں کرنے چاہییں۔ مگر کیا آپ ہی نے اُس سے کوٹھے پر ملاقات کی تھی اور اس کی تھکی ہوئی جوانی کو، اونگھتی ہوئی چاندنی میں چھوڑ کر، نیچے اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلے آئے تھے......'' یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم ٹھہر گیا۔''مگر مجھے ایسی باتیں نہیں پوچھنی چاہییں ...... اپنے دل کا حال کون بتاتا ہے۔''

اِس پر میں نے کہا:''میں آپ کو بتاؤں گا ...... لیکن پہلی ملاقات میں سب کچھ پوچھ لینا اور سب کچھ بتا دینا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ آپ کا کیا خیال ہے۔'' وہ جوش جو گفتگو کرتے وقت اُس کے اندر پیدا ہوگیا تھا، ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔ اُس نے دھیمے لہجے میں کہا:''آپ کا فرمانا بالکل درست ہے۔ مگر کیا پتہ ہے کہ آپ سے پھر کبھی ملاقات نہ ہو۔''

اس پر میں نے کہا:''اس میں شک نہیں، بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ لیکن ہماری ایک نہیں، بہت سی ملاقاتیں ہوسکتی ہیں۔ بے کار آدمی ہوں یعنی افسانہ نگار ... ۔ شام کو ہر روز اسی وقت، بشرطیکہ بیمار نہ ہوجاؤں، آپ مجھے ہمیشہ اسی جگہ پر پائیں گے ... یہاں بے شمار لڑکیاں سیر کو آتی ہیں۔ اور میں اس لیے

آتا ہوں کہ خود کو کسی کی محبت میں گرفتار کر سکوں...... محبت بڑی چیز نہیں ہے!''

''محبت ..... محبت......!'' اس نے اس سے آگے کچھ کہنا چاہا مگر نہ کہہ سکا اور جلتی ہوئی رسّی کی طرح، آخری بل کھا کر خاموش ہو گیا۔

میں نے ازراہِ مذاق اس سے محبت کا ذکر کیا تھا۔ دراصل اُس وقت فضا ایسی دل فریب تھی کہ اگر کسی عورت پر عاشق ہو جاتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا۔ جب دونوں وقت آپس میں مل رہے ہوں، نیم تاریکی میں بجلی کے قمقمے قطار اندر قطار آنکھیں جھپکنا شروع کر دیں، ہوا میں خنکی پیدا ہو جائے اور فضا پر ایک افسانوی کیفیت سی چھا جائے تو کسی اجنبی عورت کی قربت کی ضرورت محسوس ہوا کرتی ہے۔ ایک ایسی [ضرورت؟] جس کا احساس تحت الشعور ہی میں چھپا رہتا ہے۔

خدا معلوم اس نے کس افسانے کے متعلق مجھ سے پوچھا تھا؟ مجھے اپنے سب افسانے یاد نہیں اور خاص طور پر وہ تو بالکل یاد نہیں جو رومانی ہیں۔ میں اپنی زندگی میں بہت کم عورتوں سے ملا ہوں۔ وہ افسانے جو میں نے عورتوں کے متعلق لکھے ہیں یا تو کسی خاص ضرورت کے ماتحت لکھے ہیں، یا محض دماغی عیاشی کے لیے۔ میرے ایسے افسانوں میں چونکہ خلوص نہیں ہے اس لیے میں نے کبھی اُن کے متعلق غور نہیں کیا۔ ایک خاص طبقے کی عورتیں میری نظر سے گزری ہیں اور اُن کے متعلق ہی میں نے چند افسانے لکھے ہیں مگر وہ رومان نہیں ہیں۔ اُس نے جس افسانے کا ذکر کیا تھا وہ یقیناً کوئی ادنیٰ درجے کا رومان تھا جو میں نے اپنے چند جذبات کی پیاس بجھانے کے لیے لکھا ہوگا..... لیکن میں نے تو اپنا افسانہ بیان کرنا شروع کر دیا!

ہاں، تو جب وہ ''محبت'' کہہ کر خاموش ہو گیا تو میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ محبت کے بارے میں کچھ اور کہوں۔ چنانچہ میں نے کہنا شروع کیا: ''محبت کی یوں تو بہت سی قسمیں، ہمارے باپ دادا بیان کر گئے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ محبت خواہ ملتان میں ہو، یا سائبیریا کے یخ بستہ میدانوں میں، سردیوں میں پیدا ہو، یا گرمیوں میں، امیر کے دل میں پیدا ہو یا غریب کے دل میں ... محبت خوب صورت کریں یا بد صورت، بدکردار کرے یا نیکوکار...... محبت، محبت ہی رہتی ہے، اس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح بچّے پیدا ہونے کی صورت ہمیشہ [سے؟] ہی ایک سی چلی آرہی ہے، اسی طرح محبت کی پیدائش بھی ایک ہی طریقے پر ہوتی ہے۔ یہ جُدا بات ہے کہ سعیدہ بیگم ہسپتال میں بچّہ جنے اور راج کماری جنگل میں۔ غلام محمد کے دل میں بھنگن محبت پیدا کر دے اور نٹورلال کے دل میں کوئی رانی۔ جس طرح بعض بچّے وقت سے پہلے پیدا ہوتے ہیں اور کمزور رہتے ہیں، اسی طرح وہ محبت بھی کمزور رہتی ہے جو وقت سے پہلے جنم لے۔ بعض

دفعہ بچے بڑی تکلیف سے پیدا ہوتے ہیں، بعض دفعہ محبت بھی بڑی تکلیف دے کر پیدا ہوتی ہے۔ جس طرح عورتوں کا حمل گر جاتا ہے اسی طرح محبت بھی گر جاتی ہے۔ بعض دفعہ بانجھ پن پیدا ہو جاتا ہے، ادھر بھی آپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے جو محبت کرنے کے معاملے میں بانجھ ہیں..... اس کا یہ مطلب نہیں کہ محبت کرنے کی خواہش اُن کے دل سے ہمیشہ کے لیے مٹ جاتی ہے، یا اُن کے اندر وہ جذبہ ہی نہیں رہتا۔ نہیں، یہ خواہش اُن کے دل میں موجود ہوتی ہے مگر وہ اس قابل نہیں رہتے کہ محبت کر سکیں۔ جس طرح عورت اپنے جسمانی نقائص کے باعث بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتی، اسی طرح یہ لوگ چند روحانی نقائص کی وجہ سے کسی کے دل میں محبت پیدا کرنے کی قوت نہیں رکھتے...... محبت کا اسقاط بھی ہو سکتا ہے......''

مجھے اپنی گفتگو دلچسپ معلوم ہو رہی تھی۔ چنانچہ میں اُس کی طرف دیکھے بغیر لیکچر دیے چلا جا رہا تھا لیکن جب میں اُس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ سمندر کے اُس پار، خلا میں دیکھ رہا تھا اور اپنے خیالات میں گُم تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔

جب زور سے کسی موٹر کا ہارن بجا تو وہ چونکا اور خالی الذّہن ہو کر کہنے لگا: ''جی...... آپ نے بالکل درست فرمایا ہے!''

میرے جی میں آئی کہ اُس سے پوچھوں ..... ''درست فرمایا ہے؟ ...... اس کو چھوڑیے۔ آپ یہ بتائیے کہ میں نے کیا کہا ہے؟'' لیکن میں خاموش رہا اور اس کو موقع دیا کہ اپنے وزنی خیالات دماغ سے جھٹک دے۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس کے بعد اس نے پھر کہا: ''آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا ہے لیکن ...... خیر چھوڑیے اس قصّے کو۔''

مجھے اپنی گفتگو بہت اچھی معلوم ہوئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی میری باتیں سنتا چلا جائے۔ چنانچہ میں نے پھر سے کہنا شروع کیا: ''تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بعض آدمی بھی محبت کے معاملے میں بانجھ ہوتے ہیں۔ یعنی اُن کے دل میں محبت کرنے کی خواہش تو موجود ہوتی ہے لیکن ان کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس بانجھ پن کا باعث روحانی نقائص ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''

اُس کا رنگ اور بھی زرد پڑ گیا۔ جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ یہ تبدیلی اس کے اندر اتنی جلدی پیدا ہوئی کہ میں نے گھبرا کر اس سے پوچھا: ''خیریت تو ہے...... آپ بیمار ہیں؟''

''نہیں تو... نہیں تو......'' اُس کی پریشانی اور بھی زیادہ ہو گئی...... ''مجھے کوئی بیماری ویماری

نہیں ہے...... لیکن آپ نے کیسے[۱۳] سمجھ لیا کہ میں بیمار ہوں۔''

میں نے جواب دیا: ''اس وقت آپ کو جو کوئی بھی دیکھے گا، یہی کہے گا کہ آپ بہت بیمار ہیں۔ آپ کا رنگ خوف ناک طور پر زرد ہو رہا ہے...... میرا خیال ہے آپ کو گھر چلے جانا[۱۴] چاہیے۔ آیئے میں آپ کو چھوڑ آؤں۔''

''نہیں، میں خود چلا جاؤں گا۔ مگر میں بیمار نہیں ہوں...... کبھی کبھی میرے دل میں معمولی سا درد پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ شاید وہی ہو... میں ابھی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ آپ اپنی گفتگو جاری رکھیے۔''

میں تھوڑی دیر خاموش رہا کیونکہ وہ ایسی حالت میں نہیں تھا کہ میری بات غور سے سُن سکتا لیکن جب اس نے اصرار کیا تو میں نے کہنا شروع کیا: ''میں آپ سے یہ پوچھ رہا تھا کہ اُن لوگوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جو محبت کرنے کے معاملے میں بانجھ ہوتے ہیں..... میں ایسے آدمیوں کے جذبات اور ان کی اندرونی کیفیات کا اندازہ نہیں کر سکتا لیکن جب میں اُس بانجھ عورت کا تصور کرتا ہوں جو صرف ایک بیٹی یا بیٹا حاصل کرنے کے لیے دعائیں مانگتی ہے، خدا کے حضور میں گڑگڑاتی ہے۔ اور جب وہاں سے[۱۵] کچھ نہیں ملتا تو ٹونے ٹوٹکوں میں اپنا گوہرِ مقصود ڈھونڈتی ہے، شمشانوں سے راکھ لاتی ہے، کئی کئی راتیں جاگ کر سادھوؤں کے بتائے ہوئے منتر پڑھتی ہے، منتیں مانتی ہے، چڑھاوے چڑھاتی ہے۔ تو میں خیال کرتا ہوں کہ اُس آدمی کی بھی یہی حالت ہوتی ہوگی جو محبت کے معاملے میں بانجھ ہو...... ایسے لوگ واقعی ہمدردی کے قابل ہیں۔ مجھے اندھوں پر اتنا رحم نہیں آتا جتنا ان لوگوں پر آتا ہے۔''

اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور وہ تھوک نگل کر دفعتاً اٹھ کھڑا ہوا اور پرلی طرف منہ کر کے کہنے لگا: ''اوہ، بہت دیر ہوگئی۔ مجھے ضروری کام کے لیے جانا تھا۔ یہاں باتوں باتوں میں کتنا وقت گزر گیا۔''

میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ پلٹا اور جلدی سے میرا ہاتھ دبا کر، لیکن میری طرف دیکھے بغیر، اس نے ''اب رخصت چاہتا ہوں'' کہا اور چل دیا۔

دوسری مرتبہ اُس سے میری ملاقات پھر اپولو بندر ہی پر ہوئی۔ میں سیر کا عادی نہیں ہوں مگر اُس زمانے میں ہر شام اپولو بندر پر جانا، میرا دستور ہو گیا تھا۔ ایک مہینے کے بعد جب مجھے آگرے کے ایک شاعر نے ایک لمبا چوڑا خط لکھا جس میں اُس نے نہایت ہی حریصانہ طور پر اپولو بندر اور وہاں جمع ہونے والی پریوں کا ذکر کیا، اور مجھے اس لحاظ سے بہت خوش قسمت کہا کہ میں بمبئی میں ہوں، تو اپولو بندر سے میری دلچسپی ہمیشہ

کے لیے فنا ہوگئی۔ اب جب کبھی کوئی مجھے اپولو بندر جانے کو کہتا ہے تو مجھے آگرے کے شاعر کا خط یاد آجاتا ہے اور میری طبیعت متلا جاتی ہے۔ لیکن میں اُس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں جب خط[16] مجھے نہیں ملا تھا اور میں ہر روز جا کر شام کو [؟ ہر روز شام کو جا کر] اپولو بندر کے اس بینچ پر بیٹھا کرتا تھا جس کے اس طرف کئی آدمی، چمپی والوں سے اپنی کھوپڑیوں کی مرمت کراتے رہتے ہیں۔

دن پوری طرح ڈھل چکا تھا اور اُجالے کا کوئی نشان باقی نہیں رہا تھا۔ اکتوبر کی گرمی میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ہوا چل رہی تھی ...... تھکے ہوئے مسافر کی طرح۔ سیر کرنے والوں کا ہجوم زیادہ تھا۔ میرے پیچھے موٹریں ہی موٹریں کھڑی تھیں۔ بینچ بھی سب کے سب پُر تھے۔ جہاں بیٹھا تھا وہاں دو باتونی، ایک گجراتی اور ایک پارسی، نہ جانے کب کے جمے ہوئے تھے۔ دونوں[17] گجراتی بولتے تھے مگر مختلف لب و لہجے سے۔ پارسی کی آواز میں دو سُر تھے۔ وہ کبھی باریک سُر میں بات کرتا تھا، کبھی موٹے سُر میں۔ جب دونوں تیزی سے بولنا شروع کر دیتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے طوطے مینا کی لڑائی ہو رہی ہے۔

میں اُن کی لامتناہی گفتگو سے تنگ آ کر اُٹھا اور ٹہلنے کی خاطر تاج محل ہوٹل کا رُخ کرنے ہی والا تھا کہ سامنے سے مجھے وہ آتا دکھائی دیا۔ مجھے اس کا نام معلوم نہیں تھا۔ اس لیے میں اسے پکار نہ سکا لیکن جب اس نے مجھے دیکھا تو اس کی نگاہیں ساکن ہو گئیں جیسے اسے وہ چیز مل گئی ہو[18] جس کی اسے تلاش تھی۔

کوئی بینچ خالی نہیں تھا اس لیے میں نے اُس سے کہا: ''آپ سے بہت دیر کے بعد ملاقات ہوئی ... . چلیے سامنے ریستوراں میں بیٹھتے ہیں۔ یہاں کوئی بینچ خالی نہیں۔''

اُس نے رسمی طور پر چند باتیں کیں اور میرے ساتھ ہولیا۔ چند گزوں کا فاصلہ طے کرنے پر ہم دونوں ریستوراں میں بید کی بڑی بڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چائے کا آرڈر دے کر میں نے اُس کی طرف سگریٹوں کا ٹین بڑھا دیا۔ اتفاق کی بات ہے، میں نے[19] اُسی روز دس روپے دے کر ڈاکٹر ارولکر سے مشورہ لیا تھا۔ اور اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اول تو سگریٹ پینا ہی موقف کر دو اور اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو اچھے سگریٹ پیا کرو، مثال کے طور پر پانچ سو پچپن ...... چنانچہ میں نے ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق یہ ٹین اُسی شام خریدا تھا۔ اس نے ڈبے کی طرف غور سے دیکھا، پھر میری طرف نگاہیں اٹھائیں، کچھ کہنا چاہا مگر خاموش رہا۔

میں ہنس پڑا۔ ''آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ میں نے آپ کے کہنے پر یہ سگریٹ پینا شروع کیے ہیں. . . اتفاق کی بات ہے کہ آج مجھے بھی ڈاکٹر ارولکر کے پاس جانا پڑا کیونکہ کچھ دنوں سے میرے سینے میں درد ہو رہا ہے۔ چنانچہ اُس نے مجھ سے کہا یہ سگریٹ پیا کرو لیکن بہت کم......''

میں نے یہ کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کو میری یہ باتیں ناگوار معلوم ہوئی ہیں، چنانچہ میں نے فوراً اپنی جیب سے وہ نسخہ نکالا جو ڈاکٹر اروِلکر نے مجھے لکھ کر دیا تھا۔ یہ کاغذ میز پر میں نے اس کے سامنے رکھ دیا۔ ''یہ عبارت مجھ سے پڑھی تو نہیں جاتی مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے وٹامن کا سارا خاندان اس نسخے میں[۲۰] جمع کر دیا ہے۔''

اس کاغذ کو جس پر، اُبھرے ہوئے کالے حروف میں ڈاکٹر اروِلکر کا نام اور پتہ مندرج تھا اور تاریخ بھی لکھی ہوئی تھی، اس نے چور نگاہوں سے دیکھا اور وہ اضطراب جو اس کے چہرے پر پیدا ہو گیا تھا، فوراً دُور ہو گیا۔ چنانچہ اس نے مسکرا کر کہا: ''کیا وجہ ہے کہ اکثر لکھنے والوں کے اندر وٹامنز ختم ہو جاتی [ہو جاتے ؟] ہیں؟''

میں نے جواب دیا: ''اس لیے کہ اُنھیں کھانے کو کافی نہیں ملتا۔ کام زیادہ کرتے ہیں لیکن اُجرت بہت کم[۲۱] ملتی ہے۔''

اس کے بعد چائے آگئی اور دوسری باتیں شروع ہو گئیں۔

پہلی ملاقات اور اس ملاقات میں غالباً ڈھائی مہینے کا فاصلہ تھا۔ اُس کے چہرے کا رنگ پہلے سے زیادہ پیلا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پیدا ہو رہے تھے۔ اسے غالباً کوئی روحانی تکلیف تھی جس کا احساس اسے ہر وقت رہتا تھا کیونکہ باتیں کرتے کرتے بعض اوقات وہ ٹھہر جاتا اور اس کے ہونٹوں سے غیر ارادی طور پر آہ نکل جاتی۔ اگر[۲۲] ہنسنے کی کوشش بھی کرتا تو اس کے ہونٹوں میں زندگی پیدا نہیں ہوتی تھی۔

میں نے یہ کیفیت دیکھ کر اس سے اچانک طور پر پوچھا: ''آپ اُداس کیوں ہیں؟''

''اُداس۔ . . اُداس۔'' ایک پھیکی سی مسکراہٹ جو اُن مرنے والوں کے لبوں پر پیدا ہوا کرتی ہے جو ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ وہ موت سے خائف[۲۳] نہیں، اس کے ہونٹوں پر پھیلی۔ ''میں اُداس نہیں ہوں۔ آپ کی طبیعت اُداس ہو گی۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک ہی گھونٹ میں چائے کی پیالی خالی کر دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اچھا تو میں اجازت چاہتا ہوں...... ایک ضروری[۲۴] کام سے جانا ہے۔''

مجھے یقین تھا کہ اُسے کسی ضروری کام سے نہیں جانا ہے مگر میں نے اسے نہ روکا اور جانے دیا۔ اس دفعہ پھر اس کا نام دریافت نہ کر سکا۔ لیکن اتنا پتہ چل گیا کہ وہ ذہنی اور روحانی طور پر بے حد پریشان تھا۔ وہ اُداس تھا بلکہ یوں کہیے کہ اُداسی اس کے رگ و ریشے میں سرایت کر چکی تھی۔ مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی اداسی کا دوسروں کو علم ہو۔ وہ دو زندگیاں بسر کرنا چاہتا تھا: ایک وہ، جو حقیقت تھی[۲۵] اور ایک وہ، جس کی

تخلیق میں وہ ہر گھڑی، ہر لمحہ، مصروف رہتا تھا۔ لیکن اُس کی زندگی کے یہ دونوں پہلو ناکام تھے۔ کیوں؟...... یہ مجھے معلوم نہیں۔

اُس سے تیسری مرتبہ میری ملاقات پھر اپولو بندر پر ہوئی۔ اس دفعہ میں اسے اپنے گھر لے گیا۔ راستے میں ہماری کوئی بات چیت نہ ہوئی لیکن گھر پر اس کے ساتھ بہت سی باتیں ہوئیں۔ جب وہ میرے کمرے میں داخل ہُوا تو اس کے چہرے پر چند لمحات کے لیے اُداسی چھا گئی مگر وہ فوراً سنبھل گیا اور اس نے اپنی عادت کے خلاف اپنے آپ کو بہت تر و تازہ اور باتونی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ اس کو اس حالت میں دیکھ کر، مجھے اس پر اور بھی ترس آیا۔ وہ ایک موت جیسی حقیقت کو جھٹلا رہا تھا اور مزا یہ ہے کہ اس خود فریبی سے کبھی کبھی وہ مطمئن بھی نظر[۲۶] آتا تھا۔

باتوں کے دوران میں اس کی نظر میرے میز پر پڑی۔ شیشے کے فریم میں اس کو ایک لڑکی کی تصویر نظر آئی۔ اُٹھ کر[۲۷] اس نے تصویر کی طرف جاتے ہوئے کہا: "کیا میں آپ کی اجازت سے یہ تصویر دیکھ سکتا ہوں؟"

میں نے کہا: "بصد شوق۔"

اس نے تصویر کو ایک نظر دیکھا اور دیکھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ "اچھی خوب صورت لڑکی ہے...... میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی......؟"

"جی نہیں...... ایک زمانہ ہُوا۔ اِس سے محبت کرنے کا خیال میرے دل میں پیدا ہُوا تھا بلکہ یوں کہیے کہ تھوڑی سی محبت میرے دل میں پیدا بھی ہوگئی تھی مگر افسوس ہے کہ اس کو اُس کی خبر تک نہ ہوئی اور میں ...... میں ... . نہیں بلکہ وہ بیاہ دی گئی. .... یہ تصویر میری پہلی محبت کی یادگار ہے جو اچھی طرح پیدا ہونے سے پہلے ہی مرگئی۔"

"یہ آپ کی محبت [پہلی محبت؟] کی یادگار ہے ..... اس کے بعد تو آپ نے اور بھی بہت سے رومان لڑائے ہوں گے۔" اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ یعنی آپ کی زندگی میں تو کئی ایسی نامکمل اور مکمل محبتیں موجود ہوں گی؟"

میں کہنے ہی والا تھا کہ جی نہیں، خاکسار بھی محبت کے معاملے میں آپ جیسا ہی بنجر ہے۔ مگر جانے کیوں، یہ کہتا کہتا رک گیا اور خواہ مخواہ جھوٹ بول دیا: "جی ہاں...... ایسے سلسلے ہوتے ہی رہتے ہیں .....

آپ کی کتابِ زندگی بھی تو ایسے واقعات سے بھرپور ہوگی۔"

وہ کچھ نہ بولا اور بالکل خاموش ہوگیا جیسے کسی گہرے سمندر میں غوطہ لگا گیا ہے۔ [لگا گیا ہو؟] دیر تک جب وہ اپنے خیالات میں غرق رہا اور میں اس کی خاموشی سے اُداس ہونے لگا تو میں نے کہا: "اجی حضرت! آپ کن خیالات میں کھو گئے؟"

وہ چونک پڑا۔ "میں...... میں...... کچھ نہیں، میں ایسے ہی کچھ سوچ رہا تھا۔"

میں نے پوچھا: "کوئی بیتی ہوئی کہانی یاد آگئی...... کوئی بچھڑا ہوا سپنا مل گیا...... پرانے زخم ہرے ہوگئے؟"

"زخم...... پرانے...... زخم...... کئی زخم تو نہیں...... صرف ایک ہی ہے۔ بہت گہرا، بہت کاری...... اور زخم، میں چاہتا بھی نہیں۔ ایک ہی زخم کافی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میرے کمرے میں ٹہلنے کی کوشش کرنے لگا۔ کیونکہ اُس چھوٹی سی جگہ میں، جہاں کرسیاں، میز اور چارپائی سب کچھ پڑا تھا، ٹہلنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی، میز کے پاس اسے رکنا پڑا۔ تصویر کو اب کی دفعہ گہری نظروں سے دیکھا اور کہا: "اِس میں اور اُس میں کتنی مشابہت ہے...... مگر اُس کے چہرے پر ایسی شوخی نہیں تھی۔ اُس کی آنکھیں بڑی تھیں مگر ان آنکھوں کی طرح اُن میں شرارت نہیں تھی۔ وہ فکرمند آنکھیں تھیں۔ ایسی آنکھیں جو دیکھتی بھی ہیں اور سمجھتی بھی ہیں"...... یہ کہتے ہوئے اس نے ایک سرد آہ بھری اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ "موت بالکل ناقابلِ فہم چیز ہے، خاص طور پر اُس وقت جب کہ یہ جوانی میں آئے...... میں سمجھتا ہوں کہ خدا کے علاوہ ایک اور طاقت بھی ہے۔ جو بڑی حاسد ہے۔ جو کسی کو خوش دیکھنا نہیں چاہتی...... مگر چھوڑیے اس قصے کو۔"

میں نے اس سے کہا۔ "نہیں نہیں، آپ سناتے جائیے...... لیکن اگر آپ ایسا مناسب سمجھیں...... سچ پوچھیے تو میں یہ سمجھ رہا تھا کہ آپ نے کبھی محبت کی ہی نہ ہوگی۔"

"یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں نے کبھی محبت کی ہی نہیں اور ابھی ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ میری کتابِ زندگی ایسے کئی واقعات سے بھری پڑی ہوگی۔" یہ کہہ کر اس نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ "میں نے اگر محبت نہیں کی تو یہ دُکھ میرے دل میں کہاں سے پیدا ہوگیا ہے؟ میں نے اگر محبت نہیں کی تو میری زندگی کو یہ روگ کہاں سے چمٹ گیا ہے؟ ..... میں اُداس کیوں رہتا ہوں؟ مجھے اپنے آپ کا ہوش کیوں نہیں ہے؟...... میں روز بروز موم کی طرح کیوں پگھلا جا رہا ہوں؟"

بظاہر یہ تمام سوال وہ مجھ سے کر رہا تھا، مگر دراصل وہ، سب کچھ اپنے آپ ہی سے پوچھ رہا تھا۔

میں نے کہا: ''میں نے جھوٹ بولا تھا کہ آپ کی زندگی میں ایسے کئی واقعات ہوں گے مگر آپ نے بھی جھوٹ بولا تھا کہ میں اداس نہیں ہوں اور مجھے کوئی روگ نہیں ہے۔ ..... کسی کے دل کا حال جاننا آسان بات نہیں ہے۔ آپ کی اُداسی کی اور بہت سی وجہیں ہوسکتی ہیں، مگر جب تک مجھے آپ خود نہ بتائیں، میں کسی نتیجے پر کیسے پہنچ سکتا ہوں؟...... اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ واقعی روز بروز کمزور ہوتے جارہے ہیں۔ آپ کو یقیناً بہت بڑا صدمہ پہنچا ہے اور...... اور...... مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔''

''ہمدردی...... '' اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔'' مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ ہمدردی اُسے واپس نہیں لاسکتی ..... اُس عورت کو موت کی گہرائیوں سے نکال کر میرے حوالے نہیں کرسکتی جس سے مجھے پیار تھا... . آپ نے محبت نہیں کی ... مجھے یقین ہے، آپ نے محبت نہیں کی۔ اس لیے کہ اس کی ناکامی نے آپ پر کوئی داغ نہیں چھوڑا...... میری طرف دیکھیے۔'' یہ کہہ کر اس نے خود اپنے آپ کو دیکھا۔'' کوئی جگہ آپ کو ایسی نہیں ملے گی جہاں میری محبت کے نقش موجود نہ ہوں ...... میرا وجود خود اُس محبت کی ٹوٹی ہوئی عمارت کا ملبہ ہے ...... میں آپ کو یہ داستان کیسے سناؤں اور کیوں سناؤں جب کہ آپ اسے سمجھ ہی نہیں سکیں گے ..... کسی کا یہ کہہ دینا کہ میری ماں مرگئی ہے۔ آپ کے دل پر وہ اثر پیدا نہیں کرسکتا جو موت نے بیٹے پر کیا تھا...... میری داستانِ محبت آپ کو . ... کسی کو بھی، بالکل معمولی معلوم ہوگی مگر مجھ پر جو اثر ہوا ہے اُس سے کوئی بھی آگاہ نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ محبت میں نے کی ہے اور، سب کچھ، صرف مجھی پر گزرا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔ اس کے حلق میں تلخی پیدا ہوگئی تھی کیونکہ وہ بار بار تھوک نگلنے کی کوشش کررہا تھا۔

''کیا وہ آپ کو دھوکا دے گئی؟'' میں نے اس سے پوچھا۔'' یا کچھ اور حالات تھے؟''

''دھوکا ... .. وہ دھوکا دے ہی نہیں سکتی تھی۔ خدا کے لیے دھوکا نہ کہیے۔ وہ عورت نہیں فرشتہ تھی۔ مگر بُرا ہو اس موت کا جو ہمیں خوش نہ دیکھ سکی اور اسے ہمیشہ کے لیے اپنے پروں میں سمیٹ کر لے گئی۔ ..... آہ! . .. آپ نے میرے دل پر خراشیں پیدا کردی ہیں۔ سنیے ...... سنیے، میں آپ کو اس دردناک داستان کا کچھ حصہ سناتا ہوں ...... وہ ایک بڑے اور امیر گھرانے کی لڑکی تھی۔ جس زمانے میں اُس کی اور میری پہلی ملاقات ہوئی، میں اپنے باپ دادا کی ساری جائداد عیاشیوں میں برباد کرچکا تھا۔ میرے پاس ایک کوڑی بھی نہیں تھی۔ اپنا وطن چھوڑ کر میں لکھنؤ چلا آیا۔ اپنی موٹر چونکہ میرے پاس ہوا کرتی تھی اس لیے میں صرف موٹر

چلانے کا کام جانتا تھا۔ چنانچہ میں نے اُسی کو اپنا پیشہ قرار دینے کا فیصلہ کیا۔ پہلی ملازمت مجھے ڈپٹی صاحب کے یہاں ملی۔ جن کی وہ اکلوتی لڑکی تھی...... '' یہ کہتے کہتے وہ اپنے خیالات میں کھو گیا اور دفعتاً چپ ہو گیا۔ میں بھی خاموش رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ چونکا اور کہنے لگا: '' میں کیا کہہ رہا تھا؟ ''

'' آپ ڈپٹی صاحب کے یہاں ملازم ہو گئے۔ ''

ہاں، وہ اُن ہی ڈپٹی صاحب کی اکلوتی لڑکی تھی...... ہر روز صبح نو بجے میں زہرہ کو موٹر میں اسکول لے جایا کرتا تھا۔ وہ پردہ کرتی تھی۔ مگر موٹر ڈرائیور سے کوئی کب تک چھپ سکتا ہے۔ میں نے اسے دوسرے روز ہی دیکھ لیا..... وہ صرف خوب صورت ہی نہیں تھی۔ اس میں ایک خاص بات بھی تھی..... بڑی سنجیدہ اور متین لڑکی تھی۔ اس کی سیدھی مانگ نے اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کا وقار پیدا کر دیا تھا۔ وہ...... وہ...... میں کیا عرض کروں وہ کیا تھی۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں اس کی صورت اور سیرت بیان کر سکوں۔ ''

بہت دیر تک وہ اپنی زہرہ کی خوبیاں بیان کرتا رہا۔ اُس دوران میں اس نے کئی مرتبہ اس کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خیالات اس کے دماغ میں ضرورت سے زیادہ جمع ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھی بات کرتے کرتے اس کا چہرہ تمتما اٹھتا لیکن پھر اُداسی چھا جاتی اور وہ آہوں میں گفتگو کرنا شروع کر دیتا۔ وہ اپنی داستان بہت آہستہ آہستہ سنا رہا تھا، جیسے خود بھی مزہ لے رہا ہو۔ ایک ایک ٹکڑا جوڑ کر اس نے اپنی ساری کہانی پوری کی۔ جس کا ماحصل یہ تھا [یہ ہے؟]:

زہرہ سے اُسے بے پناہ محبت ہو گئی۔ کچھ دن تو، موقع پا کر اُس کا دیدار کرنے اور طرح طرح کے منصوبے باندھنے میں گزر گئے مگر جب اُس نے سنجیدگی سے اُس محبت پر غور کیا تو خود کو زہرہ سے بہت دور پایا۔ ایک موٹر ڈرائیور، اپنے آقا کی لڑکی سے محبت کیسے کر سکتا ہے؟ چنانچہ جب اس تلخ حقیقت کا احساس اس کے دل میں پیدا ہوا تو وہ مغموم رہنے لگا۔ لیکن ایک روز اس نے بڑی جرأت سے کام لیا۔ کاغذ کے ایک پُرزے پر اس نے زہرہ کو چند سطریں لکھیں۔ یہ سطریں [؟ وہ سطریں] مجھے یاد ہیں:

'' زہرہ! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمہارا نوکر ہوں۔ تمہارے والد صاحب مجھے تیس روپے ماہوار دیتے ہیں مگر میں تم سے محبت کرتا ہوں..... میں کیا کروں، کیا نہ کروں، میری سمجھ میں نہیں آتا..... ''

یہ سطریں کاغذ پر لکھ کر، اُس نے کاغذ، اُس کی ایک کتاب میں رکھ دیا۔ دوسرے روز جب وہ اسے موٹر میں اسکول لے گیا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ہینڈل کئی بار اس کی گرفت سے نکل نکل گیا۔ مگر خدا کا شکر

ہے کہ کوئی ایکسی ڈینٹ نہ ہوا۔ اُس روز اُس کی کیفیت عجیب رہی۔ شام کو جب وہ زہرہ کو اسکول سے واپس لارہا تھا تو راستے میں اس لڑکی نے موٹر روکنے کے لیے کہا۔ اس نے جب موٹر روک لی تو زہرہ نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہا: ''دیکھو نعیم! آئندہ تم ایسی حرکت کبھی نہ کرنا۔ میں نے ابھی تک ابا جی سے تمہارے اُس خط کا ذکر نہیں کیا جو تم نے میری کتاب میں رکھ دیا تھا۔ لیکن اگر پھر تم نے ایسی حرکت کی تو مجبوراً ان سے شکایت کرنا پڑے گی۔ سمجھے...... چلو اب موٹر چلاؤ۔''

اس گفتگو کے بعد اس نے بہت کوشش کی کہ ڈپٹی صاحب کی نوکری چھوڑ دے اور زہرہ کی محبت کو اپنے دل[۲۸] سے ہمیشہ کے لیے مٹا دے مگر وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ ایک مہینہ اسی کشمکش میں گزر گیا۔ ایک روز اس نے پھر جرأت سے کام لے کر خط لکھا اور زہرہ کی ایک کتاب میں رکھ کر اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کرنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ دوسرے روز صبح کو اسے نوکری سے برطرف کردیا جائے گا مگر ایسا نہ ہوا۔ شام کو اسکول سے واپس آتے ہوئے زہرہ اس سے ہم کلام ہوئی اور ایک بار پھر اس کو ایسی حرکتوں سے باز رہنے کے لیے کہا: ''اگر تمہیں اپنی عزت کا خیال نہیں تو کم از کم میری عزت کا تو کچھ خیال تمہیں ہونا چاہیے۔'' یہ اُس نے ایک بار پھر، اُسے کچھ اس سنجیدگی اور متانت سے کہا کہ نعیم کی ساری امیدیں فنا ہوگئیں۔ اور اس نے قصد کرلیا کہ وہ نوکری چھوڑ دے گا اور لکھنؤ سے ہمیشہ کے لیے چلا جائے گا۔ مہینے کے اخیر میں، نوکری چھوڑنے سے پہلے، اُس نے اپنی کوٹھڑی میں، لالٹین کی مدھم روشنی میں، زہرہ کو آخری خط لکھا۔ اُس میں اس نے نہایت درد بھرے لہجے میں اُس سے کہا: زہرہ! میں نے بہت کوشش کی کہ میں تمہارے کہے پر عمل کرسکوں مگر دل پر میرا اختیار نہیں ہے۔ یہ میرا آخری خط ہے، کل شام کو میں لکھنؤ چھوڑ دوں گا۔ اس لیے تمہیں اپنے والد صاحب سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری خاموشی میری قسمت کا فیصلہ کردے گی۔ مگر یہ خیال نہ کرنا کہ تم سے دُور رہ کر تم سے[۲۹] محبت نہیں کروں گا۔ میں جہاں کہیں بھی رہوں گا، میرا دل تمہارے قدموں میں ہوگا...... میں ہمیشہ اُن دنوں کو یاد کرتا رہوں گا جب میں موٹر اس لیے آہستہ آہستہ چلاتا تھا کہ تمہیں دھکا نہ لگے...... میں اِس کے سوا اور تمہارے لیے کر ہی کیا سکتا تھا......''

یہ خط بھی اس نے موقع پاکر اس کی کتاب میں رکھ دیا۔ صبح کو زہرہ نے اسکول جاتے ہوئے اس سے کوئی بات نہ کی اور شام کو بھی راستے میں اس نے کچھ نہ کہا۔ چنانچہ وہ بالکل ناامید ہوکر اپنی کوٹھڑی میں چلا آیا۔ جو تھوڑا بہت اسباب اس کے پاس تھا، باندھ کر اس نے ایک طرف رکھ دیا اور لالٹین کی اندھی روشنی میں چارپائی پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ زہرہ اور اس کے درمیان کتنا بڑا فاصلہ ہے۔

وہ بے حد مغموم تھا۔ اپنی پوزیشن سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ ایک ادنیٰ درجے کا ملازم ہے اور اپنے آقا کی لڑکی سے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ کبھی کبھی سوچتا تھا کہ اگر وہ اُس سے محبت کرتا ہے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ اور پھر اس کی محبت فریب تو نہیں۔ وہ اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ آدھی رات کے قریب اُس کی کوٹھڑی کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ لیکن پھر اُس نے خیال کیا کہ مالی ہوگا۔ ممکن ہے اُس کے گھر میں کوئی ایکا ایکی بیمار پڑ گیا ہو اور وہ اس سے مدد لینے کے لیے آیا ہو۔ لیکن جب اس نے دروازہ کھولا تو زہرہ سامنے کھڑی تھی۔ ...
جی ہاں زہرہ ..... دسمبر کی سردی میں شال کے بغیر، وہ اُس کے سامنے[۳۰] کھڑی تھی۔ اُس کی زبان گنگ ہوگئی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کہے۔ چند لحات قبر کی سی خاموشی میں گزر گئے۔ آخر زہرہ کے ہونٹ وا ہوئے اور تھرتھراتے ہوئے لہجے میں اس نے کہا: ''نعیم میں تمہارے پاس آگئی ہوں۔ بتاؤ اب تم کیا چاہتے ہو .... لیکن اس سے پہلے کہ تمہاری اس کوٹھڑی میں داخل ہوں، میں تم سے چند سوال کرنا چاہتی ہوں۔''

نعیم خاموش رہا۔ لیکن زہرہ اس سے پوچھنے[۳۱] لگی: ''کیا واقعی تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟''

نعیم کو جیسے ٹھیس سی لگی۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ ''زہرہ! تم نے ایسا سوال کیا ہے جس کا جواب اگر میں دوں تو میری محبت کی توہین ہوگی ...... میں تم سے پوچھتا ہوں، کیا میں محبت نہیں کرتا؟''

زہرہ نے اس سوال کا جواب نہ دیا اور تھوڑی دیر خاموش رہ کر اپنا دوسرا سوال [زبان پر لائی؟]:
''میرے باپ کے پاس کافی دولت ہے مگر میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ جو کچھ میرا کہا جاتا ہے میرا نہیں، اُن کا ہے۔ کیا تم مجھے دولت کے بغیر بھی ویسا ہی عزیز سمجھو گے؟''

نعیم بہت جذباتی آدمی تھا۔ چنانچہ اس سوال نے بھی اس کے وقار کو زخمی کیا۔ بڑے دُکھ بھرے لہجے میں اس نے زہرہ سے کہا: ''زہرہ! خدا کے لیے مجھ سے ایسی باتیں نہ پوچھو جن کا جواب اس قدر عام ہو چکا ہے کہ تمہیں تھرڈ کلاس عشقیہ ناولوں میں بھی مل سکتا ہے۔''

زہرہ اُس کی کوٹھڑی میں داخل ہوگئی اور اس کی چارپائی پر بیٹھ کر کہنے لگی: ''میں تمہاری ہوں اور ہمیشہ تمہاری رہوں گی۔''

زہرہ نے اپنا قول پورا کیا۔ جب دونوں لکھنؤ چھوڑ کر دہلی چلے آئے اور شادی کر کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگے تو ڈپٹی صاحب ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں پہنچ گئے۔ نعیم کو نوکری مل گئی تھی اس لیے وہ گھر میں نہیں تھا۔ ڈپٹی صاحب نے زہرہ کو بہت بُرا بھلا کہا۔ ان کی ساری عزت خاک میں مل گئی تھی۔ وہ

چاہتے تھے کہ زہرہ نعیم کو چھوڑ دے اور جو کچھ ہو چکا ہے اُسے بھول جائے۔ وہ نعیم کو دو تین ہزار روپے دینے کے لیے بھی تیار تھے۔ مگر انہیں ناکام لوٹنا پڑا۔ اس لیے کہ زہرہ، نعیم کو کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوئی۔ اُس نے اپنے باپ سے کہا: ''ابا جی! میں نعیم کے ساتھ بہت خوش ہوں۔ آپ اُس سے اچھا شوہر میرے لیے کبھی تلاش نہ کر سکتے۔ میں اور وہ آپ سے کچھ نہیں مانگتے۔ اگر آپ ہمیں دعائیں دے سکیں تو ہم آپ کے ممنون ہوں گے۔''

ڈپٹی صاحب نے جب یہ گفتگو سُنی تو بہت خشم آلود ہوئے۔ انہوں نے نعیم کو قید کرا دینے کی دھمکی بھی دی۔ مگر زہرہ نے صاف صاف کہہ دیا: ''ابا جی! اس میں نعیم کا کیا قصور ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں بے قصور ہیں۔ البتہ ہم ایک دوسرے سے محبت ضرور کرتے ہیں اور وہ میرا شوہر ہے ... یہ کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نابالغ نہیں ہوں۔''

ڈپٹی صاحب عقل مند تھے، فوراً سمجھ گئے کہ جب ان کی بیٹی ہی رضا مند ہے تو نعیم پر کیسے جرم عائد ہوسکتا ہے۔ چنانچہ وہ زہرہ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے گئے۔ کچھ عرصے[۳۲] کے بعد ڈپٹی صاحب نے مختلف لوگوں کے ذریعے سے نعیم پر دباؤ ڈالنے اور اُس کو روپے پیسے سے [کا؟] لالچ دینے کی کوشش کی، مگر ناکام رہے۔

دونوں کی زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی۔ گو نعیم کی آمدن بہت ہی کم تھی اور زہرہ کو جو ناز و نعم میں پلی تھی، بدن پر کھردرے کپڑے پہننے پڑتے تھے اور اپنے ہاتھ سے سب کام کرنے پڑتے تھے مگر وہ خوش تھی اور خود کو ایک نئی دنیا میں پاتی تھی، جہاں قدم قدم پر نعیم کی محبت کے نئے نئے پہلو اُس پر منکشف ہوتے تھے۔ وہ بہت سُکھی تھی ...... بہت سُکھی۔ نعیم بھی بہت خوش تھا۔ لیکن ایک روز خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ زہرہ کے سینے میں ایک موذی درد[۳۳] اٹھا اور پیشتر اس کے کہ نعیم اُس کے لیے کچھ کر سکے وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئی اور نعیم کی دنیا ہمیشہ کے لیے تاریک کر گئی۔

یہ داستان اُس نے رُک رُک کر اور خود مزہ لے لے کر قریباً چار گھنٹوں میں سنائی۔ جب وہ اپنا حالِ دل سنا چکا تو اس کا چہرہ، بجائے زرد ہونے کے، تمتما اٹھا جیسے[۳۴] اُس کے اندر آہستہ آہستہ کسی نے خون داخل کر دیا ہے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کا حلق سوکھ گیا تھا۔

داستان جب ختم ہوگئی تو وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا، جیسے اسے بہت جلدی ہے اور کہنے لگا: ''میں نے بہت غلطی کی ...... جو آپ کو اپنی داستانِ محبت سنا دی ..... میں نے بہت غلطی کی ... زہرہ کا ذکر صرف مجھ ہی

تک محدود رہنا چاہیے تھا...... لیکن ...... لیکن۔ ...''اُس کی آواز بھرآ گئی......''میں زندہ ہوں اور وہ......
وہ......''اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا اور جلدی سے میرا ہاتھ دبا کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

نعیم سے پھر میری ملاقات نہ ہوئی۔ اپولو بندر[۳۵] پر کئی مرتبہ اس کی تلاش میں گیا مگر وہ نہ ملا۔ چھ یا سات مہینے کے بعد اُس کا ایک خط مجھے ملا جو میں یہاں پر نقل کر رہا ہوں:

''......صاحب!

آپ کو یاد ہوگا۔ میں نے آپ کے مکان پر اپنی داستانِ محبت سنائی تھی...... وہ محض فسانہ تھا۔ ایک جھوٹا فسانہ۔ نہ کوئی زہرہ ہے نہ نعیم[۳۶]...... میں ویسے موجود تو ہوں مگر وہ نعیم نہیں ہوں جس نے زہرہ سے محبت کی تھی۔ آپ نے ایک بار کہا تھا کہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو محبت کے معاملے میں بانجھ ہوتے ہیں۔ میں بھی اُن بدقسمت آدمیوں میں سے ایک ہوں جس کی ساری جوانی اپنا دل پرچانے میں گزر گئی۔ زہرہ سے نعیم کی محبت، ایک دل بہلاوا تھا اور زہرہ کی موت...... میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ میں نے اُسے کیوں مار دیا؟ بہت ممکن ہے کہ اس میں بھی میری زندگی کی سیاہی کا دخل ہو۔

مجھے معلوم نہیں، آپ نے میرے افسانے کو جھوٹا سمجھا یا سچا۔ لیکن میں آپ کو ایک عجیب وغریب بات بتاتا ہوں کہ میں نے ..... یعنی اُس جھوٹے افسانے کے خالق نے، اس کو بالکل سچا سمجھا۔ سو فیصدی حقیقت پر مبنی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے واقعی زہرہ سے محبت کی ہے۔ اور وہ سچ مچ مرچکی ہے۔ آپ کو یہ سن کر اور بھی تعجب ہوگا کہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اُس فسانے کے اندر حقیقت کا عنصر زیادہ ہوتا گیا۔ اور زہرہ کی آواز، اُس کی ہنسی بھی، میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ میں اُس کے سانس کی گرمی تک[۳۷] محسوس کرنے لگا۔ افسانے کا ہر ذرہ جان دار ہوگیا اور میں نے ...... اور میں نے یوں اپنی قبر اپنے ہاتھوں سے کھودی .....

زہرہ، فسانہ نہ سہی مگر میں تو فسانہ ہوں۔ وہ مرچکی ہے۔ اس لیے مجھے بھی مرجانا چاہیے۔ یہ خط آپ کو میری موت کے[۳۸] بعد ملے گا...... الوداع ..... زہرہ مجھے ضرور ملے گی۔ . . کہاں؟...... یہ مجھے معلوم نہیں۔

میں نے یہ چند سطور صرف اس لیے آپ کو لکھ دی ہیں کہ آپ افسانہ نگار ہیں۔ اگر اس سے [ان سے؟] آپ افسانہ تیار کرلیں تو آپ کو سات آٹھ روپے مل جائیں گے۔ کیونکہ ایک مرتبہ آپ نے کہا تھا کہ

افسانے کا معاوضہ آپ کو سات سے دس روپے تک مل جایا کرتا ہے۔ یہ میرا تحفہ ہوگا۔ اچھا الوداع۔
آپ کا ملاقاتی ''نعیم''۳۹

نعیم نے اپنے لیے زہرہ بنائی اور مرگیا۔ میں نے اپنے لیے یہ افسانہ تخلیق کیا ہے اور زندہ ہوں۔ یہ میری زیادتی ہے۔

حواشی

(ان حواشی میں ص سے مراد: منٹو کے افسانے طبع اوّل (۱۹۴۰ء)
کا صفحہ ہے۔ دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ تمھیں معلوم ہوتی ہیں... ممبئی کے ساحل پر واقع معروف عمارت: گیٹ وے آف انڈیا کو منٹو نے اپنے اِس افسانے میں ہر جگہ ''گیٹ آف انڈیا'' لکھا ہے جس کو مدوّن نے اسی طرح شاملِ متن کیا ہے۔
... جیسے اُس طرف سے ادھر کو سمیٹا — ص:۸۱
۲۔ فضا میں سمندر کی لہروں اور تماشائیوں کی آواز ایک گنگناہٹ بن کر... اور ایسا معلوم — ایضاً
۳۔ ایسی باتوں کا پتہ کیسے — ص:۸۲
۴۔ شکریہ، لیکن میں اپنا برانڈ — ایضاً
۵۔ آپ مانیں یا نہ مانیں... اور اُسے اپنا — ایضاً
۶۔ تھے کہ معلوم ہوتا تھا — ایضاً
۷۔ اِن لفظوں پر طبع اوّل کا صفحہ ۸۲ مکمل ہوا۔ کتاب میں صفحات: ۸۳ تا ۸۶ غیر موجود ہونے کے باعث، اُن سے بنیادی نسخے کے متن کا موازنہ اور متنی تبدیلیوں کی نشان دہی ممکن نہیں۔ آگے کا متن بنیادی نسخے (کی سیاہی، جلے ہوئے ... ص:۱۱۲ تا... اس کو چھوڑیے، آپ یہ بتایئے، ص:۱۱۸) کے مطابق ہے۔ موازنے کا عمل، طبع اوّل کے ص:۸۷ سے پھر شروع ہوگا۔
۸۔ یہ افسانہ ''شہ نشین پر'' کا ذکر ہے جو منٹو کے اسی مجموعے میں شامل ہے۔
۹۔ طبع اوّل کے صفحہ ۸۷ کا آغاز: کہ میں نے کہا کیا ہے۔ طبع چہارم میں یہ فقرہ اس طور شائع ہوا ہے: میں نے کیا کہا ہے؟ (ص.۱۱۸)
۱۰۔ کہ وہ اپنے — ص:۸۷
۱۱۔ اور میں چاہتا تھا — ایضاً

۱۲۔ جیسے اس نے بھوت دیکھا ہے — ص:۸۷

۱۳۔ آپ نے یہ کیسے — ایضاً

۱۴۔ گھر چلا جاتا — ایضاً

۱۵۔ مگر جب میں... صرف ایک بیٹا یا بیٹی... گڑگڑاتی ہے۔ جب وہاں سے — ایضاً

۱۶۔ جب یہ خط — ص:۸۸

۱۷۔ نشان بھی باقی نہ رہا... واقع نہ... یہ دونوں گھراتی... کبھی وہ
باریک سُر... اور کبھی موٹے سُر — ایضاً

۱۸۔ رُخ کیا ہی تھا... چیز مل گئی ہے۔ — صص:۸۸ تا ۸۹

۱۹۔ ریستوراں کی بیدکی... بات ہے کہ میں نے — ص:۸۹

۲۰۔ دیکھا، اور خیال کیا... خاندان اِس کا تذ پر — ایضاً

۲۱۔ بہت ہی کم — ایضاً

۲۲۔ اردگرد سیاہ... وہ بعض اوقات... اُس کے سینے سے... وہ اگر — ص:۹۰

۲۳۔ جو یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ موت سے وہ بالکل خائف — ایضاً

۲۴۔ مجھے ایک ضروری — ایضاً

۲۵۔ پھر میں اُس کا نام... مجھے اتنا پتہ... پریشان ہے... حقیقت میں تھی — ایضاً

۲۶۔ اُس سے بہت ہی... فوراً ہی سنبھل... خلاف اپنے کو... موت جیسی تیخی... وہ مطمئن نظر — ایضاً

۲۷۔ ان لفظوں پر طبعِ اوّل کا صفحہ ۹۰ مکمل ہوا۔ کتاب میں صفحات ۹۱ تا ۹۴ غیر موجود ہونے کے باعث، اُن سے بنیادی نسخے کے متن کا موازنہ اور حتمی تبدیلیوں کی نشان دہی ممکن نہیں۔ آگے کا متن بنیادی نسخے (اُس نے تصویر کی طرف... ص ۱۲۴ تا... زہرہ کی محبت کو اپنے دل، صفحہ:۱۳۰) کے مطابق ہے۔ موازنے کا عمل، طبعِ اوّل کے ص:۹۵ سے پھر شروع ہوگا۔

۲۸۔ طبعِ اوّل کے صفحہ:۹۵ کا آغاز: سے ہمیشہ کے لیے مٹا دے۔

۲۹۔ اور اُس کی ایک کتاب.. اور اُس نے ایک بار پھر... عزت و آبرو... اُس کو
کچھ اس سنجیدگی... کوشش کی ہے کہ... رو کر میں تم سے — ص:۹۵

۳۰۔ پوزیشن سے وہ... بنیادی نسخے میں ''کوئی حق نہیں رکھتا۔'' کے بعد یہ جملہ شائع ہوا ہے: لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی بے اختیار اُس سے محبت کرتا ہے تو اس میں اُس کا کیا قصور ہے۔ (صص ۱۳۱ تا ۱۳۲) مدوّن کے نزدیک طبعِ اوّل کا جملہ راجح ہے لہٰذا وہی شاملِ متن کیا گیا ہے... دسمبر کی سردی میں وہ شال کے بغیر اُس کے سامنے — ص:۹۶

۳۱۔ اُس سے یہ پوچھنے — ایضاً

۳۲۔ لیکن کچھ عرصے — ص:۹۷

۳۳۔ ناز و نعمت... بنیادی نسخے میں ''موذی درد'' (ص ۱۳۴) اور طبعِ اوّل میں ''ایک موذی درد'' شائع

ہوا ہے۔ مدوّن کے نزدیک ''ایک موذی درد'' راجح ہے۔ ص ۹۷

۳۴۔ بنیادی نسخے میں ''جیسے'' شامل نہیں (ص ۱۳۴) جبکہ طبع اوّل میں ہے، مدوّن نے طبع اوّل کی پیروی کی ہے۔ ایضاً

۳۵۔ میں اپولو بندر ایضاً

۳۶۔ داستانِ عشق ... ہے اور نہ کوئی نعیم ص ۹۸

۳۷۔ نہیں کہ آپ نے میرا افسانہ ... ایک عجیب بات ... گرمی تک کو ایضاً

۳۸۔ موت واقع ہو جانے کے ایضاً

۳۹۔ طبع اوّل میں، اِس خط کے بعد ایک سطر سادی چھوڑ کر اختتامی جملے شائع ہوئے ہیں۔ ایضاً

نعرہ

اُسے یوں محسوس ہوا کہ اُس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔

وہ ساتویں منزل سے ایک ایک سیڑھی کر کے نیچے اُترا اور تمام منزلوں کا بوجھ اُس کے چوڑے مگر دُبلے کاندھے [؟ کاندھوں] پر سوار ہوتا گیا۔ جب وہ مکان کے مالک سے ملنے کے لیے اُوپر چڑھ رہا تھا تو اسے یوں محسوس ہوا تھا کہ اس کا کچھ بوجھ، ہلکا ہوگیا ہے اور کچھ، ہلکا ہوجائے گا۔ اس لیے کہ اُس نے اپنے دل میں سوچا تھا، مالک مکان جسے سب سیٹھ کے نام سے پکارتے ہیں، اس کی بپتا ضرور سُنے گا اور کرایہ چُکانے کے لیے اسے ایک مہینے کی اور مہلت بخش دے گا...... بخش دے گا!..... یہ سوچتے ہوئے اس کے غرور کو ٹھیس لگی تھی لیکن فوراً ہی اس کو اصلیت بھی معلوم ہوگئی تھی ...... وہ بھیک مانگنے ہی تو جارہا تھا۔ اور بھیک، ہاتھ پھیلا کر، آنکھوں میں آنسو بھر کر، اپنے دُکھ درد سُنا کر اور اپنے گھاؤ دکھا کر ہی مانگی جاتی ہے......!

اُس نے یہی کچھ کیا۔ جب وہ اُس سنگین عمارت کے بڑے دروازے میں داخل ہونے لگا تو اس نے اپنے غرور کو، اُس چیز کو جو بھیک مانگنے میں عام طور پر رکاوٹ پیدا کیا کرتی ہے، نکال کر فٹ پاتھ پر' ڈال دیا تھا۔

وہ اپنا دِیا بُجھا کر اور اپنے آپ کو اندھیرے میں لپیٹ کر، مالک مکان کے اُس روشن کمرے میں داخل ہُوا جہاں وہ اپنی دو بلڈنگوں کا کرایہ وصول کیا کرتا تھ، اور ہاتھ جوڑ کر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ سیٹھ کے تلک لگے ماتھے پر کئی سوٹیں پڑگئیں، اس کا بالوں بھرا ہاتھ ایک موٹی سی کاپی کی طرف بڑھا، دو بڑی بڑی آنکھوں نے اُس کاپی پر کچھ حروف پڑھے اور ایک بھدّی سی آواز گونجی.

''کیشو لال ..... کھولی پانچویں، دوسرا مالا...... دو مہینوں کا کرایہ ...... لے آئے ہو کیا؟''

یہ سُن کر اُس نے اپنا دل، جس کے سارے پُرانے اور نئے گھاؤ، وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کرید کرید کر گہرے' کرچکا تھا، سیٹھ کو دکھانا چاہا۔ اُسے پورا پورا یقین تھا کہ اسے دیکھ کر اس کے دل میں ضرور ہمدردی پیدا ہوجائے گی۔ پر...... سیٹھ جی نے کچھ سُننا نہ چاہا اور اُس کے سینے میں ایک بلّوہ سا مچ گیا۔

سیٹھ کے دل میں ہمدردی پیدا کرنے کے لیے اس نے اپنے وہ تمام دکھ جو بیت چکے تھے، گزرے

دُنوں کی گہری کھائی سے نکال کر اپنے دل میں بھر لیے تھے اور اُن تمام زخموں کی جلن جو مدت ہوئی مٹ چکے تھے، اس نے بڑی مشکل سے اکٹھی کر کے اپنی چھاتی میں جمع کی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنی چیزوں کو کیسے[3] سنبھالے؟

اُس کے گھر میں بن بلائے مہمان آگئے ہوتے تو وہ اُن سے بڑے روکھے پن سے کہہ سکتا تھا: ''جاؤ بھئی جاؤ، میرے پاس اتنی جگہ نہیں ہے کہ تمہیں بٹھا سکوں اور نہ میرے پاس روپیہ ہے کہ تم سب کی خاطر مدارات کرسکوں۔'' لیکن یہاں تو قصّہ ہی دوسرا[4] تھا۔ اس نے تو اپنے بھُولے بھٹکے دُکھوں کو اِدھر اُدھر سے پکڑ کر آپ اپنے سینے میں جمع کیا تھا۔ اب بھلا وہ باہر نکل سکتے تھے؟

افراتفری میں اُسے کچھ پتہ نہ چلا تھا کہ اس کے سینے میں کتنی چیزیں بھر گئی ہیں۔ پر جیسے جیسے اس نے[5] سوچنا شروع کیا، وہ پہچاننے لگا کہ فلاں دُکھ، فلاں وقت کا ہے اور فلاں درد، اسے فلاں وقت پر ہُوا تھا۔ اور جب یہ سوچ بچار شروع ہوئی تو حافظے نے بڑھ کر وہ دُھند ہٹادی جو اُن پر لپٹی ہوئی تھی۔ اور کل کے تمام دُکھ درد آج کی تکلیفیں بن گئے اور اس نے اپنی زندگی کی باسی روٹیاں پھر انگاروں پر سینکنا شروع کر دیں۔

اُس نے سوچا، تھوڑے سے وقت میں اس نے بہت کچھ سوچا۔ اس کے گھر کا اندھا لیمپ، کئی بار بجلی کے اُس بلب سے ٹکرایا جو مالک مکان کے گنجے سر کے اوپر مسکرا رہا تھا۔ کئی بار اس کے پیوند لگے کپڑے اُن کھونٹیوں پر لٹک کر پھر اس کے میلے بدن سے چمٹ گئے جو دیوار میں گڑی چمک رہی تھیں۔ کئی بار اسے اَن داتا بھگوان کا خیال آیا جو بہت دُور، نہ جانے کہاں بیٹھا، اپنے بندوں کا خیال رکھتا ہے۔ مگر اپنے سامنے سیٹھ کو کرسی پر بیٹھا دیکھ کر، جس کے قلم کی جنبش کچھ کا کچھ کرسکتی تھی، وہ اس بارے میں کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ کئی بار اُسے خیال آیا اور وہ سوچنے لگا کہ اسے کیا خیال آیا تھا؟ مگر وہ اس کے پیچھے بھاگ دوڑ نہ کرسکا۔ وہ سخت گھبرا گیا تھا۔ اس نے آج تک اپنے سینے میں اتنی کھلبلی نہیں دیکھی تھی۔

وہ اس کھلبلی پر ابھی تعجب ہی کر رہا تھا کہ مالک مکان نے غصے میں آکر اسے گالی دی...... گالی...... یوں سمجھیے کہ کانوں کے راستے پگھلا ہوا سیسہ شائیں شائیں کرتا اس کے دل میں اُتر گیا اور اس کے سینے کے اندر جو ہلڑ مچ گیا اس کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہ تھا۔ جس طرح کسی گرما گرم جلسے میں کسی [کی؟] شرارت سے بھگدڑ مچ جایا کرتی ہے، ٹھیک اُسی طرح اس کے دل میں ہلچل پیدا ہوگئی۔ اس نے بہت جتن کیے کہ اس کے وہ دُکھ درد جو اس نے سیٹھ کو دکھانے کے لیے اکٹھے کیے تھے، چُپ چاپ رہیں، پر کچھ نہ ہوسکا۔ گالی کا سیٹھ کے منہ نکلنا تھا کہ تمام بے چین ہوگئے اور اندھا دُھند ایک دوسرے سے[6] ٹکرانے لگے۔ اب تو وہ، یہ نئی

تکلیف بالکل نہ سہہ سکا اور اُس کی آنکھوں میں جو پہلے ہی تپ رہی تھیں، آنسو آ گئے جس سے ان کی گرمی اور بھی بڑھ گئی اور ان سے دھواں نکلنے لگا۔

اُس کے جی میں آئی کہ اُس گالی کو جسے وہ بڑی حد تک نگل چکا تھا، سیٹھ کے جھریوں پڑے چہرے پر قے کر دے مگر وہ اس خیال سے باز آ گیا کہ اس کا غرور تو بابر فٹ پاتھ پر پڑا ہے۔ اپولو بندر پر نمک لگی مونگ پھلی بیچنے والے کا غرور...... اس کی آنکھیں ہنس رہی تھیں اور اُن کے سامنے نمک لگی مونگ پھلی کے وہ تمام دانے جو اس کے گھر میں ایک تھیلے کے اندر، برکھا کے باعث، گیلے ہو رہے تھے، ناچنے لگے۔

اُس کی آنکھیں ہنسیں، اس کا دل بھی ہنسا۔ یہ سب کچھ ہوا، پر وہ کڑواہٹ دُور نہ ہوئی جو اس کے گلے میں سیٹھ کی گالی نے پیدا کر دی تھی۔ یہ کڑواہٹ اگر صرف زبان پر ہوتی تو وہ اسے تھوک دیتا مگر وہ تو بہت بُری طرح اس کے گلے میں اٹک گئی تھی اور نکالے نہ نکلتی تھی۔ اور پھر ایک عجیب قسم کا دکھ جو اُس گالی نے پیدا کر دیا تھا، اُس کی گھبراہٹ کو اور بھی بڑھا رہا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کی آنکھیں جو سیٹھ کے سامنے رونا فضول سمجھتی تھیں، اس کے سینے کے اندر اُتر کر آنسو بہا رہی ہیں، جہاں ہر چیز پہلے ہی سے سوگ میں تھی۔

سیٹھ نے اُسے پھر گالی دی۔ اُتنی ہی موٹی جتنی اس کی چربی بھری گردن تھی اور اسے یوں لگا کہ کسی نے اوپر سے اس پر کوڑا کرکٹ پھینک دیا ہے۔ چنانچہ اس کا ایک ہاتھ اپنے آپ، چہرے کی حفاظت[۸] کے لیے بڑھا، پر اس گالی کی ساری گرد اُس پر پھیل چکی تھی...... اب اُس نے وہاں ٹھہرنا اچھا نہ سمجھا۔ کیونکہ کیا خبر تھی...... کیا خبر تھی...... اسے کچھ خبر نہ تھی..... وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ ایسی حالتوں میں کسی بات کی سُدھ بُدھ نہیں رہا کرتی۔

وہ جب نیچے اُترا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اُس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔

ایک نہیں، دو گالیاں...... بار بار یہ دو گالیاں جو سیٹھ نے بالکل پان کی پیک کے مانند اپنے منہ سے اُگل دی تھیں، اُس کے کانوں کے پاس زہریلی بھِڑوں کی طرح بھنبھنانا شروع کر دیتی تھیں اور وہ سخت بے چین ہو جاتا تھا۔ وہ کیسے اُس...... اُس..... اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُس گڑبڑ کا نام کیا رکھے جو اس کے دل میں اور دماغ میں ان گالیوں نے مچا رکھی تھی۔ وہ کیسے اُس تپ کو دُور کر سکتا تھا جس میں وہ پھُنکا جا رہا تھا۔ کیسے؟...... پر وہ سوچ بچار کے قابل بھی تو نہیں رہا تھا۔ اس کا دماغ تو اس وقت ایک ایسا اکھاڑا

بنا ہوا تھا جس میں بہت سے پہلوان کشتی لڑ رہے ہوں۔ جو خیال بھی وہاں پیدا ہوتا، کسی دوسرے خیال سے جو پہلے ہی سے وہاں موجود ہوتا، بھڑ جاتا اور وہ کچھ سوچ نہ سکتا۹

چلتے چلتے جب ایکا ایکی اُس کے دکھ، قے کی صورت میں باہر نکلنے کو تھے، اس کے جی میں آئی، جی میں کیا آئی، مجبوری کی حالت میں، وہ اُس آدمی کو روک کر جو لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے پاس سے گزر رہا تھا، یہ کہنے ہی والا تھا ''بھیا میں روگی ہوں'' مگر جب اس نے اُس راہ چلتے آدمی کی شکل دیکھی تو بجلی کا وہ کھمبا جو اس کے پاس ہی زمین میں گڑا تھا، اسے اس آدمی سے کہیں زیادہ حساس دکھائی دیا اور جو کچھ وہ اپنے اندر سے باہر نکالنے والا تھا، ایک ایک گھونٹ کر کے پھر نگل گیا۔

فٹ پاتھ میں چوکور پتھر ایک ترتیب کے ساتھ جڑے ہوئے تھے، وہ اُن پتھروں پر چل رہا تھا۔ آج تک کبھی اس نے[۱۰] ان کی سختی محسوس نہ کی تھی مگر آج ان کی سختی اس کے دل تک پہنچ رہی تھی۔ فٹ پاتھ کا ہر ایک پتھر جس پر اس کے قدم پڑ رہے تھے، اس کے دل کے ساتھ ٹکرا رہا تھا ... سیٹھ کے پتھر کے مکان سے نکل کر ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا ہوگا [چلا ہوگا؟] کہ اس کا بند بند ڈھیلا ہوگیا۔

چلتے چلتے اُس کی ایک لڑکے سے ٹکر ہوئی اور [ہوئی تو؟] اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ ٹوٹ گیا ہے، چنانچہ اس نے جھٹ، اُس آدمی کی طرح جس کی جھولی سے بیر گر رہے ہوں، ادھر اُدھر اپنے ہاتھ پھیلائے اور اپنے آپ کو اکٹھا کر کے ہولے ہولے چلنا شروع کیا۔

اُس کا دماغ اس کی ٹانگوں کے مقابلے میں زیادہ تیزی کے ساتھ چل رہا تھا۔ چنانچہ کبھی کبھی چلتے چلتے اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس کا نچلا دھڑ، سارے کا سارا، بہت پیچھے رہ گیا ہے اور دماغ[۱۱] بہت آگے نکل گیا ہے۔ کئی بار اسے اس خیال سے ٹھہرنا پڑا کہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہو جائیں۔

وہ فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ جس کے اس طرف سڑک پر پوں پوں کرتی موٹروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ گھوڑے گاڑیاں، ٹرامیں، بھاری بھرکم ٹرک، لاریاں؛ یہ سب سڑک کی کالی چھاتی پر دندناتی ہوئی چل رہی تھیں۔ ایک شور مچا ہوا تھا، پر اُس کے کانوں کو کچھ سُنائی نہ دیتا تھا، وہ تو پہلے ہی سے شائیں شائیں کر رہے تھے جیسے ریل گاڑی کا انجن زائد بھاپ باہر نکال رہا ہے [رہا ہو؟]۔

چلتے چلتے ایک لنگڑے کُتے سے اُس کی ٹکر ہوئی۔ کتے نے اس خیال سے کہ شاید اُس کا پیر کچل دیا گیا ہے ''چاؤں'' کیا اور پرے ہٹ گیا۔ اور وہ سمجھا کہ سیٹھ نے اسے پھر گالی دی ہے... گالی.... گالی ٹھیک اُسی طرح اس سے اُلجھ کر رہ گئی تھی جیسے بیری[۱۲] کے کانٹوں میں کوئی کپڑا۔ وہ جتنی کوشش اپنے آپ کو

چھڑانے کی کرتا تھا، اُتنی ہی زیادہ اس کی روح زخمی ہوتی جارہی تھی۔

اُسے اُس نمک لگی مونگ پھلی کا خیال نہیں تھا جو اس کے گھر میں، برکھا کے باعث گیلی ہورہی تھی اور نہ اسے روٹی کپڑے کا خیال تھا۔ اس کی عمر تیس برس کے قریب تھی اور ان تیس برسوں میں، جن کے پرماتما جانے کتنے دن ہوتے ہیں، وہ کبھی بھوکا نہ سویا تھا اور نہ کبھی[۱۳] ننگا ہی پھرا تھا۔ اُسے صرف اس بات کا دُکھ تھا کہ اسے ہر مہینے کرایہ دینا پڑتا تھا۔ وہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرے، اُس بکرے جیسی داڑھی والے حکیم کی دوائیوں کے دام دے، شام کو تاڑی کی ایک بوتل کے لیے دُونّی پیدا کرے یا اُس گنجے سیٹھ کے مکان کے ایک کمرے کا کرایہ ادا کرے! مکانوں اور کرایوں کا فلسفہ اس کی سمجھ سے سدا اونچا رہا تھا۔ وہ جب بھی دس روپے گن کر سیٹھ یا اُس کے منیم کی ہتھیلی پر رکھتا تو سمجھتا تھا کہ زبردستی اس سے یہ رقم چھین لی گئی ہے۔ اور اب اگر وہ پانچ برس تک برابر کرایہ دیتے رہنے کے بعد، صرف دو مہینے کا حساب چکتا نہ کرسکا تو کیا سیٹھ کو اس بات کا اختیار ہوگیا کہ وہ اُسے گالی دے؟ سب سے بڑی بات تو یہی تھی جو اسے کھائے جارہی تھی۔ اسے ان بیس روپوں کی پروا نہ تھی جو اسے آج نہیں [تو؟] کل ادا کردینے تھے۔ وہ اُن دو گالیوں کی بابت سوچ رہا تھا جو اُن بیس روپوں کے بیچ میں سے نکلی تھیں۔ نہ وہ بیس روپے کا مقروض ہوتا اور نہ سیٹھ کے کٹھالی جیسے منہ سے یہ گندگی باہر نکلتی۔

"مان لیا، وہ دھنوان تھا۔ اُس کے پاس دو بلڈنگیں تھیں۔ جن کے ایک سو چوبیس کمروں کا کرایہ اُس کے پاس آتا تھا۔ پر اُن ایک سو چوبیس کمروں میں جتنے لوگ رہتے ہیں، اُس کے غلام تو نہیں! اور اگر غلام بھی ہیں تو وہ انہیں گالی کیسے دے سکتا ہے؟"[۱۴]

"ٹھیک ہے، اُسے کرایہ چاہیے، پر میں کہاں سے لاؤں؟ پانچ برس تک اس کو دیتا ہی رہا ہوں۔ جب ہوگا دے دوں گا۔ پچھلے برس برسات کا سارا پانی ہم پر ٹپکتا رہا، پر میں نے اسے کبھی گالی نہ دی، حالانکہ مجھے اُس سے کہیں زیادہ ہول ناک گالیاں یاد ہیں۔ میں نے سیٹھ سے بارہا[۱۵] کہا کہ سیڑھی کا ڈنڈا ٹوٹ گیا ہے، اسے بنوا دیجیے۔ پر میری ایک نہ سنی گئی۔ میری پھول سی بچی گری، اُس کا داہنا ہاتھ ہمیشہ کے لیے بے کار ہوگیا۔ میں گالیوں کے بجائے اُسے بد دُعائیں دے سکتا تھا، پر مجھے اس کا دھیان ہی نہیں آیا...... دو مہینے کا کرایہ نہ چکانے پر، میں گالیوں کے قابل ہوگیا! اُس کو یہ خیال تک نہ آیا کہ اُس کے بچے، اپولو بندر پر میرے تھیلے سے مٹھیاں بھر بھر کے مونگ پھلی کھاتے ہیں۔"

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اُس کے پاس اتنی دولت نہیں تھی جتنی کہ اس دو بلڈنگوں والے سیٹھ کے

پاس تھی، اور ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کے پاس اس سے بھی زیادہ دولت ہوگی، پر وہ غریب کیسے ہوگیا؟ ...... اسے غریب سمجھ کر ہی تو گالی دی گئی تھی، ورنہ اس گنجے سیٹھ کی کیا مجال تھی کہ کرسی پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اسے دو گالیاں سنا دیتا! گویا کسی کے پاس دھن دولت کا نہ ہونا، بہت بُری بات ہے۔ اب یہ اس کا قصور نہیں تھا کہ اس کے پاس دولت کی کمی تھی۔ سچ پوچھیے تو اس نے کبھی دھن دولت کے خواب دیکھے ہی نہ تھے۔ وہ اپنے حال میں مست تھا۔ اس کی زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی۔ پر پچھلے مہینے ایکا ایکی اس کی بیوی بیمار پڑ گئی اور اس کے [کی؟] دوا دارو پر وہ تمام روپے خرچ ہوگئے جو کرائے میں جانے والے تھے۔ اگر وہ خود بیمار ہوتا تو ممکن تھا کہ'' دواؤں پر روپیہ خرچ نہ کرتا لیکن یہاں تو اس کے ہونے والے بچے کی بات تھی جو ابھی اپنی ماں کے پیٹ ہی میں تھا۔ اُس کو اولاد بہت پیاری تھی، جو پیدا ہو چکی تھی اور جو پیدا ہونے والی تھی، سب کی سب اُسے عزیز تھی۔ وہ کیسے اپنی بیوی کا علاج نہ کراتا؟ ...... کیا وہ اُس بچے کا باپ نہ تھا؟ ...... باپ، پتا ...... وہ تو صرف دو مہینے کے کرائے کی بات تھی، اگر اسے اپنے بچے کے لیے چوری بھی کرنا پڑتی تو وہ کبھی نہ چوکتا۔

چوری، نہیں نہیں، وہ چوری کبھی نہ کرتا ...... یوں سمجھیے کہ وہ اپنے بچے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کے لیے تیار تھا مگر وہ چور کبھی نہ بنتا ...... وہ اپنی چھنی ہوئی چیز واپس لینے کے لیے لڑنے مرنے کو تیار تھا، پر وہ چوری نہیں کر سکتا تھا۔

اگر وہ چاہتا تو اُس وقت جب سیٹھ نے اسے گالی دی تھی، آگے بڑھ کر اس کا ٹینٹوا دبا دیتا اور اُس تجوری میں سے وہ تمام نیلے اور سبز نوٹ نکال کر بھاگ جاتا جن کو وہ آج تک لاجونتی کے پتے سمجھا کرتا تھا ...... نہیں نہیں، وہ ایسا کبھی نہ کرتا۔ لیکن پھر سیٹھ نے اسے گالی کیوں دی؟ ...... پچھلے برس چوپاٹی پر، ایک گاہک نے اسے گالی دی تھی، اسی لیے کہ دو پیسے کی مونگ پھلی میں چار دانے کڑوے چلے گئے تھے، اور اس کے جواب میں اس کی گردن پر ایسی دھول جمائی تھی کہ دُور بینچ پر بیٹھے آدمیوں نے بھی اس کی آواز سن لی تھی۔ مگر سیٹھ نے اُسے دو گالیاں دیں اور وہ چپ رہا ...... کیشو لال کھاری سینگ والا، جس کی بابت یہ مشہور تھا کہ وہ ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتا ...... سیٹھ نے ایک گالی دی اور وہ کچھ نہ بولا ...... دوسری گالی دی تو بھی خاموش'' رہا جیسے وہ مٹی کا پتلا ہے ...... پر مٹی کا پتلا کیسے ہوا؟ اس نے ان دو گالیوں کو سیٹھ کے تھوک بھرے منہ سے نکلتے دیکھا جیسے دو بڑے بڑے چوہے موریوں سے باہر نکلتے ہیں [نکلے ہوں؟]۔ وہ جان بوجھ کر خاموش رہا، اس لیے کہ وہ اپنا غرور نیچے چھوڑ آیا تھا ...... مگر اس نے اپنا غرور اپنے سے کیوں الگ کیا؟ سیٹھ سے گالیاں لینے کے لیے؟

یہ سوچتے ہوئے اسے ایکا ایکی خیال آیا کہ شاید سیٹھ نے اسے نہیں، کسی اور کو گالیاں دی تھیں ...... نہیں، نہیں، گالیاں اسے ہی دی گئی تھیں۔ اس لیے کہ دو مہینے کا کرایہ اُسی کی طرف نکلتا تھا۔ اگر اُسے گالیاں نہ دی گئی ہوتیں تو اس سوچ بچار کی ضرورت ہی کیا تھی اور یہ جو اس کے سینے میں بلڑ سا مچ رہا تھا، کیا بغیر کسی وجہ کے اسے دکھ دے رہا تھا؟ اسی کو دو گالیاں دی گئی تھیں۔

جب اس کے سامنے ایک موٹر نے اپنے ماتھے کی بتیاں روشن کیں تو اُسے ایسا معلوم ہُوا کہ وہ دو گالیاں پگھل کر اس کی آنکھوں میں دھنس گئی ہیں ... گالیاں ...... گالیاں ..... وہ جھنجلا گیا... وہ جتنی کوشش کرتا تھا کہ اُن گالیوں کی بابت نہ سوچے اتنی ہی شدت سے اسے ان کے متعلق سوچنا پڑتا تھا اور یہ مجبوری اسے بہت چڑچڑا بنا رہی تھی۔ چنانچہ اس چڑچڑے پن میں اس نے خواہ مخواہ دو تین آدمیوں کو جو اس کے پاس سے گزر رہے تھے، دل ہی دل میں گالیاں دیں: ''یوں اکڑ کے چل رہے ہیں جیسے ان کے باوا کا راج ہے!''

اگر اُس کا راج ہوتا تو وہ اس سیٹھ کو مزا چکھا دیتا جو اسے اوپر تلے دو گالیاں سُنا کر اپنے گھر میں یوں آرام سے بیٹھا تھا جیسے اس نے اپنی گدے دار کرسی میں سے دو کھٹمل نکال کر باہر پھینک دیے ہیں.. . ج ج اگر اس کا اپنا راج ہوتا تو وہ چوک میں بہت سے لوگوں کو اکٹھا کر کے سیٹھ کو بیچ میں کھڑا کر دیتا اور اس کی گنجی چندیا پر اس زور سے دھپا مارتا کہ [وہ؟] بلبلا اٹھتا، پھر وہ سب لوگوں سے کہتا کہ ہنسو، جی بھر کر[۱۸] ہنسو اور خود اتنا ہنستا کہ ہنستے ہنستے اس کا پیٹ دُکھنے لگتا.... پر اس وقت اُسے بالکل ہنسی نہیں آتی تھی [نہیں آرہی تھی؟] ...... کیوں؟...... وہ اپنے راج کے بغیر بھی تو سیٹھ کے گنجے سر پر دھپا مار سکتا تھا، اسے کس بات کی رکاوٹ تھی؟ .... رکاوٹ تھی... رکاوٹ تھی تو [تھی تب ہی تو؟] وہ گالیاں سُن کر خاموش ہو رہا۔

اُس کے قدم رُک گئے۔ اس کا دماغ بھی ایک دو پل کے لیے سستایا اور اس نے سوچا کہ چلو ابھی اس جھنجھٹ کا فیصلہ ہی کر دوں . ... بھاگا ہوا جاؤں اور ایک ہی جھٹکے میں سیٹھ کی گردن مروڑ کر اُس تجوری پر رکھ دوں جس کا ڈھکنا مگر مچھ کے منہ کی طرح کھلتا ہے...... لیکن وہ کھمبے کی طرح زمین میں کیوں گڑ گیا تھا؟ سیٹھ کے گھر کی طرف پلٹا کیوں نہیں تھا؟...... کیا اس میں جرأت[۱۹] نہ تھی؟

اُس میں جرأت نہ تھی... کتنے دُکھ کی بات ہے کہ[۲۰] اس کی ساری طاقت سرد پڑ گئی تھی ..... یہ گالیاں . . وہ ان گالیوں کو کیا کہتا...... ان گالیوں نے اس کی چوڑی چھاتی پر رولر سا پھیر دیا تھا...... صرف دو گالیوں نے .... حالانکہ پچھلے ہندو مسلم فساد میں ایک ہندو نے اُسے مسلمان سمجھ کر لاٹھیوں سے بہت پیٹا تھا اور ادھ مُوا کر دیا تھا اور اسے اتنی کمزوری محسوس نہ ہوئی تھی جتنی کہ اب ہو رہی تھی ...... کیشو لال

کھاری سینگ والا جو اپنے دوستوں سے بڑے فخر کے ساتھ کہا کرتا تھا کہ وہ کبھی بیمار نہیں پڑا، آج یوں چل رہا تھا جیسے برسوں کا روگی ہے...... اور یہ روگ کس نے پیدا کیا تھا؟...... دو گالیوں نے!

گالیاں ... گالیاں...... کہاں تھیں وہ دو گالیاں؟ اس کے جی میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ ان دو پتھروں کو جو کسی حیلے گلتے ہی نہ تھے، باہر نکال لے اور جو کوئی بھی اس کے سامنے آئے اس کے سر پر دے مارے، پر یہ کیسے ہو سکتا تھا..... اس کا سینہ مُربّے کا مرتبان تھوڑی تھا۔

ٹھیک ہے، لیکن پھر کوئی اور ترکیب بھی تو سمجھ میں آئے جس سے یہ گالیاں دُور دفان ہوں..... کیوں نہیں کوئی شخص بڑھ کر اُسے دُکھ سے نجات دلانے کی کوشش کرتا؟ کیا وہ ہمدردی کے قابل نہ تھا؟...... ہوگا، پر کسی کو اس کے دل کے حال کا کیا پتہ تھا۔ وہ کھلی کتاب تھوڑی تھا"۔ اور نہ اس نے اپنا دل باہر لٹکا رکھا تھا۔ اندر کی بات کسی کو کیا معلوم؟

نہ معلوم ہو!...... پرماتما کرے کسی کو معلوم نہ ہو...... اگر کسی کو اندر کی بات کا پتہ چل گیا تو کیشو لال کھاری سینگ والے کے لیے ڈوب مرنے کی" بات تھی...... گالیاں سُن کر خاموش رہنا معمولی بات تھی کیا؟

معمولی بات نہیں، بہت بڑی بات ہے...... ہمالہ پہاڑ جتنی بڑی بات ہے۔ اس سے بھی بڑی بات ہے۔ اس کا غرور مٹی میں مل گیا ہے۔ اس کی ذلت ہوئی ہے۔ اس کی ناک کٹ گئی ہے.. ... اس کا سب کچھ لُٹ گیا ہے"۔ چلو بھئی چُھٹی ہوئی۔ اب تو یہ گالیاں اس کا پیچھا چھوڑ دیں! وہ کمینہ تھا۔ رذیل تھا۔ نیچ تھا۔ گندگی صاف کرنے والا بھنگی تھا۔ کُتا تھا...... اس کو گالیاں ملنا ہی چاہیے تھیں۔ نہیں نہیں، کسی کی کیا مجال تھی کہ اسے گالیاں دے اور پھر بغیر کسی قصور کے۔ وہ اُسے کچّا نہ چبا جاتا.... اماں ہٹاؤ، یہ سب کہنے کی باتیں ہیں...... تم نے تو سیٹھ سے یوں گالیاں سنیں جیسے میٹھی میٹھی بولیاں تھیں۔

"میٹھی میٹھی بولیاں تھیں، بڑے مزے دار گھونٹ تھے، چلو یہی سہی..... اب تو میرا پیچھا چھوڑ دو، ورنہ سچ کہتا ہوں، دیوانہ ہو جاؤں گا...... یہ لوگ جو بڑے آرام سے ادھر اُدھر چل پھر رہے ہیں، میں ان میں سے ہر ایک کا سر پھوڑ دوں گا۔ بھگوان کی قسم! مجھے اب زیادہ تاب نہیں رہی۔ میں ضرور دیوانے کتے کی طرح سب کو کاٹنا شروع کر دوں گا۔ لوگ مجھے پاگل خانے میں بند کر دیں گے اور میں دیواروں کے ساتھ اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر مر جاؤں گا.. . مر جاؤں گا، سچ کہتا ہوں، مر جاؤں گا..... مر جاؤں گا، سچ کہتا ہوں، مر جاؤں گا اور میری رادھا ودھوا اور میرے بچے اناتھ ہو جائیں گے...... یہ سب کچھ اس لیے ہوگا کہ میں نے سیٹھ سے

دو گالیاں سُنیں اور خاموش رہا۔ جیسے میرے منہ پر[۲۴] تالا لگا ہوا تھا، میں لُولا، لنگڑا، اپاہج تھا ... پر ماتما کرے میری ٹانگیں، اس موٹر کے نیچے آکر ٹوٹ جائیں، میرے ہاتھ کٹ جائیں ...... میں مرجاؤں تا کہ یہ بک بک تو ختم ہو ...... تو یہ ...... کوئی ٹھکانہ ہے اس دُکھ کا .... کپڑے پھاڑ کر ننگا ناچنا شروع کردوں ...... اس ٹریم کے نیچے سر دے دوں، زور زور سے چلّانا شروع کردوں ...... کیا کروں، کیا نہ کروں؟''

یہ سوچتے ہوئے اُسے ایکا ایکی خیال آیا کہ بازار کے بیچ کھڑا ہوجائے اور سب ٹریفک کو روک کر جو اُس کی زبان پر آئے، بکتا چلا جائے۔ حتیٰ کہ اس کا سینہ سارے کا سارا خالی ہوجائے، یا پھر اس کے جی میں آئی کہ کھڑے کھڑے یہیں سے چلّانا شروع کردے: ''مجھے بچاؤ ...... مجھے بچاؤ!''

اتنے میں ایک آگ بجھانے والا انجن سڑک پر ٹن ٹن کرتا آیا اور اُدھر اُس موڑ میں گم ہوگیا۔ اس کو دیکھ کر وہ اونچی آواز میں کہنے[۲۵] ہی والا تھا: ''ٹھہرو .... میری آگ بجھاتے جاؤ۔'' مگر نہ جانے کیوں رُک گیا۔

ایکا ایکی اُس نے اپنے قدم تیز کردیے۔ اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اس کی سانس رُکنے لگی ہے اور اگر وہ تیز نہ چلے گا تو بہت ممکن ہے کہ وہ پھٹ جائے۔ لیکن جوں ہی اس کی رفتار بڑھی، اس کا دماغ آگ کا ایک چکّر سا بن گیا۔ اُس چکّر میں اس کے سارے پُرانے اور نئے خیال ایک ہار کی صورت میں گندھ گئے ...... دو مہینے کا کرایہ، اس کا پتھر کی بلڈنگ میں درخواست لے کر جانا ...... سات منزلوں کے ایک سو بارہ زینے، سیٹھ کی بھدّی آواز، اس کے گنجے سر پر مسکراتا ہوا بجلی کا لیمپ اور ...... یہ موٹی گالی ...... پھر دوسری ..... اور اس کی خاموشی ...... یہاں پہنچ کر آگ کے اس چکّر میں [؟ سے] تڑ تڑ گولیاں سی نکلنا شروع ہوجاتیں اور اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کا سینہ چھلنی ہوگیا ہے۔

اُس نے اپنے قدم اور تیز کیے اور آگ کا یہ چکر اتنی تیزی سے گھومنا شروع ہوا کہ شعلوں کی ایک بہت بڑی گیندی سی بن گئی جو اس کے آگے آگے زمین پر اُچھلنے کودنے لگی۔

وہ اب دوڑنے لگا۔ لیکن فوراً ہی خیالوں کی بھیڑ بھڑ میں ایک نیا خیال، بلند آواز میں چلّایا ''تم کیوں بھاگ رہے ہو؟ کس سے بھاگ رہے ہو؟ تم بزدل ہو!''

اُس کے قدم آہستہ آہستہ اُٹھنے لگے، بریک سی لگ گئی اور وہ ہولے ہولے چلنے لگا ...... وہ سچ مچ بزدل تھا ..... بھاگ کیوں رہا تھا؟ ...... اسے تو انتقام لینا تھا .... انتقام ...... یہ سوچتے ہوئے اسے اپنی زبان پر لہو کا نمکین ذائقہ محسوس ہوا اور اس کے بدن میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ لہو ......[۲۶] اسے آسان

زمین سب، لہو ہی میں رنگے ہوئے نظر آنے لگے ..... لہو...... اس وقت اس میں اتنی قوت تھی کہ پتھر کی رگوں میں سے بھی لہو نچوڑ سکتا تھا۔

اس کی آنکھوں میں لال ڈورے اُبھر آئے، مٹھیاں بھنچ گئیں اور قدموں[۲۷] میں مضبوطی پیدا ہوگئی ......اب وہ انتقام پر تُل گیا تھا۔

وہ بڑھا۔

آنے جانے والے لوگوں میں سے تیر کے مانند اپنا راستہ بناتا، آگے بڑھتا رہا۔ آگے ...... آگے!

جس طرح تیز چلنے والی ریل گاڑی چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کو چھوڑ جایا کرتی ہے، اُسی طرح وہ بجلی کے کھمبوں، دُکانوں اور لمبے لمبے بازاروں کو اپنے پیچھے چھوڑتا آگے بڑھ رہا تھا۔ آگے ...... آگے ...... بہت آگے!

راستے میں ایک سینما کی رنگین بلڈنگ آئی۔ اس نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور اس کے پاس سے بے پروا، ہوا کے مانند، بڑھ[۲۸] گیا۔

وہ بڑھتا گیا۔

اندر ہی اندر اس نے اپنے ہر ذرّے کو ایک بم بنالیا تھا تاکہ وقت پر کام آئے۔[۲۹] مختلف بازاروں سے زہریلے سانپ کی مانند پھنکارتا ہُوا، وہ اپولو بندر پہنچا..... اپولو بندر ..... گیٹ وے آف انڈیا کے سامنے بے شمار موٹریں قطار اندر قطار کھڑی تھیں۔ ان کو دیکھ کر اس نے یہ سمجھا کہ بہت سے گدھ، پَر جوڑے، کسی کی لاش کے اردگرد بیٹھے ہیں۔ جب اس نے خاموش سمندر کی طرف دیکھا تو اسے یہ ایک لمبی چوڑی لاش معلوم ہوئی ..... اس سمندر کے اس طرف ایک کونے میں لال لال روشنی کی لکیریں، ہولے ہولے بل کھا رہی تھیں۔ یہ ایک عالی شان ہوٹل کی پیشانی کا برقی نام تھا جس کی لال روشنی سمندر کے پانی میں گُدگُدی پیدا کر رہی تھی۔

کیشو لال کھاری سینگ والا اُس عالی شان ہوٹل کے نیچے کھڑا ہوگیا۔[۳۰]

اُس برقی بورڈ کے عین نیچے قدم گاڑ کر، اُس نے اُوپر دیکھا..... سنگین عمارت کی طرف جس کے روشن کمرے چمک رہے تھے اور ..... اُس کے حلق سے ایک نعرہ ..... کان کے پردے پھاڑ دینے والا نعرہ، پگھلے ہوئے گرم گرم لاوے کے مانند نکلا: ''ہت تیری......!''

جتنے کبوتر ہوٹل کی منڈیروں پر اُونگھ رہے تھے، ڈر گئے اور پھڑ پھڑانے لگے۔

نعرہ مار کر جب اُس نے اپنے قدم، زمین سے بڑی مشکل کے ساتھ، علاحدہ کیے اور واپس مڑا تو اُسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ ہوٹل کی سنگین عمارت اڑا اڑا دھم نیچے گر گئی ہے۔

اور یہ نعرہ سن کر ایک شخص نے اپنی بیوی سے، جو یہ شور سن کر ڈر گئی تھی، کہا: ''پگلا ہے!''

حواشی

(اِن حواشی میں ص سے مراد: منٹو کے افسانے طبع اوّل (۱۹۴۰ء)
کا صفحہ ہے۔ دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ گزرگاہ پر	ص: ۹۹
۲۔ کرید کرید کر ہرے	ص: ۱۰۰
۳۔ گئے گزرے دنوں... چیزوں کو وہ کیسے	ایضاً
۴۔ قصہ ہی اور	ایضاً
۵۔ جوں جوں اُس نے	ایضاً
۶۔ بلّو بچا اُس کا کچھ ٹھکانا... کہ وہ تمام بے چین... ایک دوسرے کے ساتھ	ص: ۱۰۱
۷۔ جھریاں پڑے... گزرگاہ پر	ایضاً
۸۔ یوں محسوس ہوا کہ... چہرے کی طرف حفاظت	ایضاً
۹۔ وہاں موجود تھا... سوچ نہ سکتا تھا	ص: ۱۰۲
۱۰۔ آج تک اُس نے کبھی	ایضاً
۱۱۔ اور اُس کا دماغ	ایضاً
۱۲۔ اُس کا زخمی پیر روند دیا گیا ہے... سیٹھ نے پھر اُسے... جیسے جھرجھری	ص: ۱۰۳
۱۳۔ نہ وہ کبھی	ایضاً
۱۴۔ لوگ رہتے تھے... غلام تو نہیں تھے... غلام بھی ہوتے تو بھی... دے سکتا تھا۔	ص: ۱۰۴
۱۵۔ سیٹھ سے ہزار بار	ایضاً
۱۶۔ کہ وہ کرسی پر... کہ وہ دواؤں پر	ایضاً
۱۷۔ اور اُس نے اس کے جواب... تو بھی وہ خاموش	ص: ۱۰۵
۱۸۔ جی بھر کے	ص: ۱۰۶
۱۹۔ کیا اُسے جرأت	ایضاً
۲۰۔ اُسے جرأت نہ تھی... دکھ کی بات تھی	ایضاً

۲۱۔ کتاب تھوڑی تھی — ص:۱۰۷
۲۲۔ یہ ڈوب مرنے کی — ایضاً
۲۳۔ بات تھی... بات تھی... بات تھی... مل گیا تھا... ہوئی تھی... کٹ گئی تھی... لٹ گیا تھا — ایضاً
۲۴۔ میرا پیچھا چھوڑو... میں دیوانہ... اضافہ: مرجاؤں گا،
سچ کہتا ہوں، مرجاؤں گا (ص ۱۳۹)... میرے منہ میں — ایضاً
۲۵۔ آواز میں یہ کہنے — ص ۱۰۸
۲۶۔ وہ بھاگ کیوں... لفظ "...... لہو" طبع اوّل میں دوبار لکھا ہوا ہے،
منٹو نے ایک کو منسوخ کر دیا۔ — ایضاً
۲۷۔ اُس کی مُٹھیاں... اُس کے قدموں — ایضاً
۲۸۔ ہوا کے مانند گزر — ایضاً
۲۹۔ طبع اوّل میں نئے پارے کا آغاز۔ — ص ۱۰۹
۳۰۔ طبع اوّل میں یہ جملہ اگلے پارے کا جزو ہے۔ — ایضاً

شہ نشین پر

وہ سفید سلمہ لگی ساڑی میں شہ نشین پر آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے نقرئی تاروں والا انار چھوڑ دیا ہے۔ ساڑی کے تھرکتے ہوئے ریشمی کپڑے پر جب جگہ جگہ سلمے کا کام ٹمٹمانے لگتا تو مجھے جسم پر وہ تمام ٹمٹماہٹیں گُدگُدی کرتی محسوس ہوتیں...... وہ خود ایک عرصے سے میرے لیے گُدگُدی بنی ہوئی تھی۔

میں اُس کو تقریباً دوسو مرتبہ دیکھ چکا ہوں اور ان تمام درشنوں کے نقوش علاحدہ علاحدہ میرے دل و دماغ پر مرتسم ہیں۔ ایک بار میں نے اسے صحن میں تیتری کے پیچھے دوڑتے دیکھا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ میری نگاہوں کے سامنے آئی اور گزر گئی۔ اب، جب کبھی میں اس واقعے کو یاد کرتا ہوں تو مجھے اپنے دل میں ایک ایسے پرندے کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے جو ڈر کر، ایکا ایکی اُڑ جائے۔ اسی طرح ایک روز میں نے اسے اسی شہ نشین پر، دھوپ میں اپنے گیلے بال جھٹکتے دیکھا تھا اور اب، میں جس وقت اُس تصویر کو اپنے ذہن کے پردے پر کھینچتا ہوں تو مجھے کبھی سیاہی نظر آتی ہے اور کبھی اجالا۔

میں اُس کو اتنا دیکھ چکا ہوں کہ اب میں اس کے سامنے آئے بغیر اسے جب چاہوں دیکھ سکتا ہوں۔ پہلے پہل مجھے اس کام میں دِقّت محسوس ہوئی تھی مگر اب کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ ابھی کل شام کو جب مجھے ایک دوست کے یہاں بیٹھے بیٹھے اُسے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی تو میں نے آنکھیں بند کیے بغیر، اسے اپنے سامنے لا کھڑا کیا۔ وہ ہو بہو ویسی تھی جیسی کہ وہ ہے اور اس بات کا نہ میرے دوست کو پتہ چلا اور نہ اُس کی بہن کو جو میرے سامنے کرسی پر بیٹھی تھی [بیٹھے تھے؟]۔ میں نے ایک لمحے کے لیے اُسے اپنے ذہن کی ڈبیا میں سے نکال کر دیکھا اور فوراً ہی وہیں بند کر دیا۔ کسی کو معلوم تک نہ ہوا کہ میں نے کیا کر دیا ہے۔ اس کو دیکھنے کے بعد میں نے یوں سلسلۂ کلام شروع کیا گویا میرا ذہن ایک لمحے کے لیے بھی غیر حاضر نہ ہُوا تھ...... ''جی ہاں سوکھی ہوئی مچھلیوں سے سخت بو آتی ہے۔ نہ جانے یہ لوگ اُنھیں کھاتے کس طرح ہیں۔ میری تو ناک..... ''اور اس کے بعد مختلف قسم کی ناکوں پر گفتگو شروع ہوگئی تھی۔

اُس کی ناک مجھے بہت پسند ہے۔ میرے پاس ہلکے گلابی رنگ کا ٹی سیٹ ہے جو مجھے صرف اس لیے عزیز ہے کہ اُس کی پیالیوں کی دستی اس کی ناک سے ملتی جلتی ہے۔ آپ ہنسیں گے۔ مگر... ایک روز صبح کو

جب میں نے اسے قریب سے دیکھا تو میرے دل میں عجیب وغریب خواہش پیدا ہوئی کہ اس کی ناک پکڑ کر اُس کے ہونٹوں کا رس پی لوں؟

اُس کے ہونٹ مجھے پیارے لگتے تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ ہر وقت نم آلود رہتے تھے۔ یہ نمی ان میں سنگترے کی لڑیوں کی مانند چمک پیدا کردیتی تھی۔ اُن کے چومنے کی خواہش اگر میرے دل میں پیدا ہوتی تھی تو اس کا باعث یہ نہ تھا کہ میں نے کتابوں میں پڑھا تھا اور لوگوں سے سُنا تھا کہ عورتوں کے ہونٹ چومے جاتے ہیں ...... اگر مجھے یہ علم نہ ہوتا تو بھی میرے دل میں اُن کو چومنے کی خواہش پیدا ہوتی۔ اُس کے ہونٹ ہی کچھ اس قسم کے تھے کہ وہ ایک نامکمل بوسہ معلوم ہوتے تھے۔

وہ میرے ہمسائے ڈاکٹر کی اکلوتی لڑکی تھی۔ سارا دن وہ نیچے اپنے باپ کی ڈسپنسری میں بیٹھی رہتی۔ کبھی کبھی جب میں اسے، بازار سے گزرتے ہوئے شیشوں میں سے، دوائیوں کی الماری کے پاس کھڑی، دیکھتا تو مجھے وہ ایک لمبی گردن والی بوتل دکھائی دیتی جس میں کوئی خوش رنگ سیال مادہ اُبل رہا ہو۔ ایک روز میں ڈسپنسری میں ڈاکٹر صاحب سے دوا لینے کے لیے گیا۔ مجھے زکام کی شکایت تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اُس سے کہا: ''بیٹا! ان کے رومال پر یوکلپٹس آئیل کے چند قطرے ٹپکا دو۔''

اس نے میرا رومال لیا اور الماری میں سے ایک چھوٹی سی بوتل نکال کر دوا کے قطرے ٹپکانے لگی۔ اُس وقت میرے جی میں آئی کہ اُٹھ کر اس کا ہاتھ تھام لوں اور کہوں: ''اس شیشی کو بند کردیجیے۔ اگر آپ اپنی آنکھوں کا ایک آنسو مجھے عنایت فرمادیں تو میری بہت سی بیماریاں دور ہو جائیں۔'' لیکن میں خاموش بیٹھا، دوا کے اُن سفید قطروں کی طرف دیکھتا رہا جو میرے رومال میں جذب ہو رہے تھے۔

جب سے میں نے اُسے دیکھنا شروع کیا ہے، میری دلی خواہش رہی ہے کہ وہ روئے اور میں اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے دیکھوں۔ میں نے تصور میں کئی مرتبہ اس کی آنکھوں کو نم ناک دیکھا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ میں اسے سچ مچ روتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کی گھنی پلکوں میں پھنسے ہوئے آنسو، بہت اچھے معلوم ہوں گے۔ چق پر سے جب بارش کے قطرے رک رک کر نیچے پھسل رہے ہوں تو کتنے دل فریب دکھائی دیا کرتے ہیں۔

ممکن ہے عورت کی آنکھوں میں آپ آنسو ضروری خیال نہ کریں۔ پر میں آنسوؤں کو ہٹا کر عورت کی آنکھوں کا تصور ہی نہیں کرسکتا۔ آنسو، آنکھوں کا پسینہ ہے۔ مزدور کی پیشانی صرف اُسی صورت میں مزدور کی پیشانی ہوسکتی ہے جب اُس پر پسینے کے قطرے چمک رہے ہوں۔ اور عورت کی آنکھیں صرف اُسی صورت

میں عورت کی آنکھیں ہوسکتی ہیں جب آنسوؤں سے ڈبڈبائی رہتی ہوں۔"

وہ سفید سلمہ لگی ساڑی میں شہ نشین پر آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے نقرئی تاروں والا انار چھوڑ دیا ہے۔ ساڑی کے تھرکتے ہوئے ریشمی کپڑے پر جگہ جگہ سلمے کا کام ٹمٹا رہا تھا۔ اور مجھے اپنے جسم پر گُدگُدی [محسوس؟] ہو رہی تھی۔ اس نے ایکا ایکی پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ گویا اس کو فوراً ہی اس بات کا احساس ہوا کہ اس کے علاوہ رات کی خاموشی میں کوٹھے پر کوئی اور متنفس بھی ہے...... اس کی آنکھیں...... اس کی آنکھیں دو موتی رول رہی تھیں...... وہ رو رہی تھی...... وہ...... وہ رو رہی تھی...... میرے دیکھتے دیکھتے اور قبل اس کے کہ میں کچھ کرسکوں، اس کی آنکھوں سے اس کے شباب کے پہلے پسینے کے قطرے چھلکے اور...... سنگین فرش پر پھسل گئے۔" وہ میری خلل انداز نگاہوں کی تاب نہ لاسکے۔ وہ دراصل چُپ چاپ، دوسروں کو خبر کیے بغیر، نوزائیدہ بچوں کے مانند، تھوڑی دیر اُن دو نرم و نازک پنگوڑوں میں لیٹے رہنا چاہتے تھے، مگر میری نگاہوں کے شور سے وہ مچل گئے۔ وہ رو رہی تھی۔ پر میں خوش تھا۔ اُس کی نم آلود آنکھیں کہرے میں لپٹی ہوئی جھیلیں معلوم ہوتی تھیں۔ بڑی پُر اسرار، بڑی فکر خیز، پانی کی پتلی سی تہ کے نیچے اس کی آنکھوں کی سفیدی اور سیاہی، اُن ننھی ننھی مچھلیوں کی مانند جھلملا رہی تھیں جو پانی کے اوپر آنے سے ڈرتی ہوں۔

میں نے اس کو دیکھنا چھوڑ کر اس کی آنکھوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ جس طرح دسمبر کی سرد اور گیلی رات میں کھلی فضا کے اندر دو دیے جل رہے ہوں۔ اس کی آنکھیں دور سے، بہت دور سے مجھے دیکھتی رہیں۔ میں نے اُن کی طرف بڑھنا شروع کیا...... دو آنسو بنے، گھنی پلکوں میں تھوڑی دیر پھنسے رہے، پھر آہستہ آہستہ اس کے زرد گالوں پر ڈھلک گئے۔ داہنی آنکھ میں ایک اور آنسو بنا، باہر نکلا...... گال کی ہڈی پر تھوڑی دیر کے لیے اُس مسافر کی طرح جس کی منزل قریب؟ ہو، ایک لحظے کے لیے ستایا اور پھسل کر، تیزی سے اس کے لبوں کے ایک گوشے کے قریب سے ہو کر، آگے دوڑنے والا ہی تھا کہ ہونٹوں کی نمی نے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ ایک پتلی سی دھار بن کر پھیل گیا۔

دُھلی ہوئی آنکھوں سے اُس نے میری طرف غور سے دیکھا اور پوچھا: "تم کون ہو؟"

وہ جانتی تھی کہ میں کون؟ ہوں، اور یہ پوچھتے ہوئے کہ میں کون ہوں، وہ میرے بارے میں کچھ دریافت نہ کر رہی تھی بلکہ وہ یہ پوچھ رہی تھی کہ وہ خود کون ہے۔ میں نے جواب دیا "تم شیلا ہو۔"

اس کے بھینچے ہوئے ہونٹ ایک خفیف ارتعاش کے ساتھ کھلے اور وہ سسکیوں میں کہنے لگی: "شیلا شیلا...... شی۔" وہ شہ نشین پر بیٹھ گئی۔ وہ تھکی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن ایکا ایکی اسے کچھ خیال آیا اور جو

خواب وہ دیکھ رہی تھی، اُسے اپنے دماغ سے جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں کہنے لگی:
''میں. ... میں ...... کیا کہہ رہی تھی؟ ..... مجھے کچھ نہیں ہوا...... میں اچھی ہوں..... اور میں یہاں کیسے چلی آئی؟''

میں نے اسے [اُس سے؟] بڑے تسلی آمیز لہجے میں کہا: ''گھبراؤ نہیں شیلا.... تم نے مجھ سے کچھ نہیں کہا...... ایسی باتیں نہ کہی جاتی ہیں اور نہ سُنی جاتی ہیں۔''

شیلا نے اس انداز سے میری جانب دیکھا گویا میں نے اس کی کوئی چوری پکڑ لی ہے: ''کیسی باتیں؟ ...... کیسی باتیں؟...... کوئی بات بھی تو ہو!''

میں نے اُس سے کہا: ''پرسوں جب تم نیچے ڈسپنسری میں لال لال جیب نکال کر طوطے سے کھیل رہی تھی اور تمہاری بلوریں انگلیاں بوتلوں سے ٹکرا کر ایک عجیب قسم کی جھنکار پیدا کر رہی تھیں، اُس وقت تم ایک نامکمل عورت تھیں، پر آج جب کہ تمہاری آنکھیں رو رہی ہیں، تم مکمل عورت بن گئی ہو۔ کیا تمہیں یہ فرق محسوس نہیں ہوتا؟ ہوتا ہے، ضرور ہوتا ہے، وہ چیز جو کل تھی آج تم میں نہیں ہے اور جو آج ہے کل نہ رہے گی، پر وہ داغ جو مسرّت کا گرم لوہا تمہارے دل پر لگایا گیا ہے، ہمیشہ ویسے کا ویسا رہے گا..... یہ کتنی اچھی بات ہے...... تمہاری زندگی میں ایک ایسی چیز تو ہوگی جو ساری کی ساری تمہاری ہوگی.... ایک ایسی چیز جس کی ملکیت پر کسی کو رشک نہیں ہوسکتا...... کاش میرا دل تمہارا دل ہوتا...... کسی عورت کا دل ہوتا .. جو ایک ہی داغ کو کافی سمجھتا ہے. .... عورت کے دل کی آبادی میں کئی ویرانے سما سکتے ہیں...... ویرانوں کا یہ ہجوم بجائے خود'' ایک آبادی ہے..... تم خوش قسمت ہو..... وہ دن جس کے لیے تمہیں انتظار کرنا پڑتا، تم نے بہت جلد دیکھ لیا...... تم خوش قسمت ہو۔''

وہ میری طرف اُس مرغی کی طرح حیرت سے دیکھنے لگی جس نے پہلی بار انڈا دیا ہو۔

وہ اپنے کو ٹٹولنے لگی: ''خوش قسمت! ..... میں خوش قسمت... وہ کیسے؟.. . آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

میں نے جواب دیا: ''جب پتنگ کٹ جائے اور کوٹھوں پر چڑھے ہوئے لونڈے ڈور لوٹنے کے لیے شور مچانا شروع کر دیں تو کسی کے بتانے کی حاجت نہیں رہتی کہ پتنگ کٹ گیا ہے...... جو پتنگ تم تے ہوا کی بلندیوں میں اُڑایا تھ، کہاں ہے؟...... کل تک اُس کی ڈور تمہارے ہاتھ میں تھی، پر آج نظر نہیں آتی!''

اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

''میں خوش قسمت ہوں .. .'' آنسوؤں میں بھیگے ہوئے لفظ اس کے منہ سے نکلے۔''میں خوش قسمت

ہوں ..... آپ اُن لونڈوں سے جو ڈور لوٹنے کے لیے کوٹھوں پر چڑھے رہتے ہیں، کم شور نہیں مچا رہے......"

آنسو زیادہ تیزی سے بہنے لگے۔ اس نے میری طرف اُس بارش میں سے دیکھا اور کہا: "میری آنکھوں سے آنسو نکال کر آپ کس کا حلق تر کرنا چاہتے ہیں ...... میں سب جانتی ہوں۔ یہ سوئیاں آپ مجھے کیوں چبھو رہے ہیں۔"

اُس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اس کی عقل اس وقت اس چاقو کے پھل کی مانند تھی جسے ضرورت سے زیادہ سان پر لگایا گیا ہو۔

میں نے اُس سے بڑے اطمینان سے کہا: "جو کچھ ہو چکا ہے اُس کا مجھے علم ہے اور اگر اُس وقت، میں تم سے یہ سب کچھ بھول جانے کے لیے کہتا، تم سے مصنوعی الفاظ میں ہمدردی کرتا، مداریوں کے مانند ایک ہاتھ میں تمہارا درد، تمہارا سارا غم لے کر، چھومنتر کے ذریعے سے غائب کر دیتا تو تم یقیناً مجھے اپنا دوست مانتیں، پر میں ایسا نہیں کر سکتا...... دل تمہارا ہے اور جو بھی اس پر[۱۱] گزرا ہے وہ بھی تمہارا ہے، میں کیوں تمہارے دل کو اس دولت سے محروم کروں، کیوں تمہیں اس درد کو بھول جانے کے لیے کہوں جو تمہارا سرمایۂ حیات ہے۔ اُسی درد پر، اُسی دکھ دینے والے واقعے پر جو بیت چکا ہے، تمہیں اپنی زندگی کے آنے والے دنوں کی بنیادیں استوار کرنا ہوں گی ... . میں جھوٹ نہیں بولنا چاہتا شیلا، پر اگر تم چاہتی ہو، تو تمہاری تسکین کے لیے میں یہ بھی کر سکتا ہوں، بولو میں کیا کہوں؟"

یہ سن کر اس نے تیزی سے کہا: "مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں!"

"میں جانتا ہوں...... ایسے حالات میں کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہوا کرتی...... آگ کے اندر کودنے والے کھیل میں، ہدایت دینے والے کی کیا ضرورت؟ ...... پریم کی ارتھی کو دوسرے کے کاندھوں سے کیا سروکار، یہ لاش تو زندگی بھر ہمیں اپنے ہی کاندھوں پر اٹھائے[۱۲] پھرنا ہوگی.. ..."

وہ بیچ میں بول اٹھی: "اٹھاؤں گی ...... آپ کو اس بات سے کیا...... ایسی ایسی بھیانک باتیں سنا کر آپ مجھے کس لیے ڈرانا چاہتے ہیں!..... میں نے اُس سے محبت کی ... اور کیا میں اب بھی اُس سے محبت نہیں کرتی!...... اس نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ میرے ساتھ فریب کیا ہے۔ پر یہ فریب، یہ دھوکا بھی تو اُسی نے دیا ہے جس سے میں محبت کرتی ہوں ..... میں جانتی ہوں کہ اس نے میری زندگی برباد کر دی ہے، مجھے کہیں کا نہیں رکھا، لیکن پھر کیا ہوا...... میں نے ایک بازی کھیلی اور ہار گئی ..... آپ مجھے ڈرانا چاہتے ہیں، مجھے طعنے دینا چاہتے ہیں ...... مجھے...... مجھے، جسے اب موت تک کی پروا[۱۳] نہیں رہی...... میں نے موت کا نام لیا

ہے۔ اور ... اور دیکھیے، آپ کے بدن پر کپکپی دوڑ گئی ہے، آپ موت سے ڈرتے ہیں مگر، میری طرف دیکھیے، میں موت سے نہیں ڈرتی!"

میں نے اُس کی طرف دیکھا، اس کے لبوں پر ایک زبردستی کی مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں، آنسوؤں کی پتلی تہ کے نیچے، ایک عجیب قسم کی روشنی جھلملا رہی تھی۔ اور وہ خود کانپ رہی تھی، ہولے ہولے۔

میں نے اُس کو دوبارہ غور سے دیکھا اور کہا: "میں موت سے ڈرتا ہوں، اس لیے کہ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ تم موت سے نہیں ڈرتیں، [14] اس لیے کہ تمہیں زندہ رہنا نہیں آتا۔ جو شخص [؟ لوگ] زندہ رہنے کا سلیقہ نہیں جانتے، اُن کے لیے زندہ رہنا بھی موت کے برابر ہے ..... اگر تم مرنا چاہتی ہو تو بڑے شوق سے مرجاؤ۔"

وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگی۔ میں نے کہنا شروع کیا: "تم مرنا چاہتی ہو۔ اس لیے کہ تم سمجھتی ہو کہ دُکھ کے اُس پہاڑ کا بوجھ جو ایکا ایکی تم پر ٹوٹ پڑا ہے تم سے نہ اُٹھایا جائے گا ..... یہ غلط ہے ... جب تم محبت کرنے کی طاقت رکھتی ہو تو اس کی شکست کے صدمے برداشت کرنے کی بھی قوت رکھتی ہو ... وہ لذت، وہ حظ، وہ مسرت جو تم نے اُس سے محبت کر کے حاصل کی، تمہاری زندگی کا عرق ہے، اسے سنبھال کر رکھو، اور باقی تمام عُمر ان چند گھونٹوں پر بسر کرو ...... وہ مرد جس سے تم نے محبت کی، اتنا ضروری، اتنا اہم نہیں ہے، جتنی کہ تمہاری محبت ہے جو اُس سے تم کو ہے ...... اُس مرد کو بھول جاؤ لیکن اپنی محبت کو یاد رکھو، اُس کی یاد پر جیو ...... اُن لمحات [15] کی یاد پر جن کو حاصل کرنے کے لیے، تم نے اپنی زندگی کی سب سے قیمتی شے توڑ ڈالی ...... کیا تم اُن لمحات کو بھول سکتی ہو جس کی [جن کی؟] قیمت میں تم نے ایک بیش بہا موتی دیا ہے؟ ...... ہرگز نہیں ...... مرد ایسے لمحات کو بھول سکتا ہے۔ بھول جاتا ہے۔ اس لیے کہ اُسے کوئی قیمت ادا نہیں کرنا پڑتی ...... پر، عورتیں نہیں بھول سکتیں جنھیں چند گھڑیوں کی فرصت [فرحت؟] کے لیے اپنی ساری زندگی چکنا چور کر دینا پڑتی ہے ...... تم مرنا چاہتی ہو! ... کیا تم اس سرائے میں اتنے مہنگے داموں پر کمرہ اُٹھا کر بھی اس کو چھوڑ دینا چاہتی ہو؟ ...... زندہ رہو ...... نہیں نہیں، اِس زندگی کو استعمال کرو۔ ہمیں مرنا ضرور ہے، اسی لیے تو زندہ رہنا بھی ضروری ہے۔"

میری باتوں نے اُس پر تھکان [16] سی طاری کر دی۔ وہ نڈھال ہو کر شہ نشین پر بیٹھ گئی اور کہنے لگی: "میں تھک گئی ہوں ......"

"جاؤ، سو جاؤ ... آرام کرو اور دوسری مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے خود میں ہمت پیدا کرو

... .'' یہ کہہ کر میں چلنے ہی کو تھا کہ مجھے دفعتاً ایک خیال آیا اور اُس خیال کے آتے ہی تھوڑی دیر کے لیے میرا دل بیٹھ سا گیا۔ میں نے سوچا: اگر اس نے اپنے آپ کو مار لیا تو......؟ اور یہ سوچتے ہوئے مجھے یہ خدشہ پیدا ہُوا کہ مجھ میں ایک چیز کی کمی ہو جائے گی۔ چنانچہ میں پلٹا اور اُس کے قریب جا کر اس سے التجائیہ لہجے میں کہا: ''شیلا! میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں......''

شیلا نے گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

''دیکھو شیلا، میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ خودکشی کے خیال سے باز آؤ[۱۷]...... تم زندہ رہو، ضرور زندہ رہو۔''

اس نے میری بات سُنی اور پوچھا: ''کیوں؟''

''کیوں؟...... یہ تم مجھ سے کیوں پوچھتی ہو شیلا؟ تمہارا دل اچھی طرح جانتا ہے کہ میں تم سے یہ التجا کیوں[۱۸] کر رہا ہوں ..... چھوڑو ان باتوں کو...... مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے اور نہ مجھے اپنے آپ سے کوئی شکایت ہے...... بات یہ ہے کہ میں نے جو چیز شروع کی تھی، اب اسے اختتام تک پہنچانا چاہتا ہوں...... میں خودغرض ہوں...... ہر انسان خودغرض ہے...... میں تم سے التجا کر رہا ہوں کہ تم نہ مرو، جیو...... یہ خودغرضی ہے...... تم زندہ رہو گی تو میری محبت جوان رہے گی..... تمہاری زندگی کے ہر دور کے ساتھ، میں اپنی محبت کو وابستہ دیکھنا چاہتا ہوں...... پر تمہاری اجازت سے......''

وہ دیر تک سوچتی رہی۔ وہ اب زیادہ سنجیدہ ہوگئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا: ''مجھے زندہ رہنا ہوگا!''

اُس کے اُس دھیمے لہجے میں عزم کے آثار تھے۔ اُس تھکی ہوئی جوانی کو، اونگھتی ہوئی چاندنی میں چھوڑ کر، میں نیچے اپنے فلیٹ پر چلا آیا اور سو گیا۔

حواشی

(ان حواشی میں ص سے مراد: منٹو کے افسانے طبع اوّل (۱۹۴۰ء)
کا صفحہ ہے۔ دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ اپنے جسم پر ص: ۱۱۱

۲۔ طبع اوّل میں "اب جب کبھی" (ص:۱۱۱) لیکن بنیادی نسخے میں "اور جب کبھی" (ص:۱۵۵) شائع ہوا ہے۔ مدوّن کے نزدیک طبع اوّل کا فقرہ راجح ہے۔ ص:۱۱۱
۳۔ ذکھڑا کیا تھا... بیٹھی ہوئی تھی... انہیں کس طرح کھاتے ہیں... ناکوں کے متعلق گفتگو ص:۱۱۲
۴۔ منسوخ فقرہ: یہ ناشتہ خوب رہتا! ایضاً
۵۔ بہت پیارے لگتے تھے... چومے جاتے ہیں، نہیں..... ایضاً
۶۔ اگر اُس پر پسینے... اگر آنسوؤں میں ڈبڈبائی... اس پارے کے بعد، صرف ایک سطر پر مشتمل پارہ جو بنیادی نسخے میں شامل نہیں: عورت کی آنکھوں اور مزدور کی پیشانی کا ایک ہی مقسوم ہے۔ ص:۱۱۳
۷۔ طبع اوّل میں جملوں کی ساخت یہ ہے: اُس نے ایکا ایکی پلٹ کر گویا اُس کو فوراً ہی، اس بات کا احساس ہوا ہے کہ اُس کے علاوہ، رات کی خاموشی میں، کوٹھے پر کوئی اور متنفس بھی ہے۔ میری طرف دیکھا...... سنگین فرش میں جذب ہو گئے ایضاً
۸۔ منزل بالکل قریب ص:۱۱۴
۹۔ وہ جانتی تھی۔ میں کون ایضاً
۱۰۔ اور تمہاری ہنسی، بلوریں بوتلوں سے... تمہاری زندگی میں ایک چیز تو ایسی ہوگی جو قبر تک تمہارے ساتھ جائے گی، تمہارے پاس ایک ایسی چیز تو ہوگی جو ساری کی... یہ ہجوم از خود صص:۱۱۴تا۱۱۵
۱۱۔ تمہارا سارا درد... دل تمہارا اور جو اس پر صص ۱۱۵تا۱۱۶
۱۲۔ اُٹھائیے اُٹھائیے ص:۱۱۶
۱۳۔ موت تک کی کوئی پروا ایضاً
۱۴۔ نہیں ڈرتی ہو ایضاً
۱۵۔ شکست کے صدمے کو... اُن چند لمحات ص ۱۱۷
۱۶۔ اُس پر تکان ایضاً
۱۷۔ باز آجاؤ ایضاً
۱۸۔ بنیادی نسخے (ص:۱۶۵) میں "کیوں" شامل نہیں، طبع اوّل کی بنا پر مدوّن نے درج کیا ہے۔ ص ۱۱۸

بلاؤز

کچھ دنوں سے مومن بہت بے قرار تھا۔ اُس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ[1] اس کا سارا وجود کچّا پھوڑا بن گیا ہے۔ کام کرتے وقت، باتیں کرتے ہوئے حتیٰ کہ سوچنے پر بھی، اُسے ایک عجیب قسم کا درد محسوس ہوتا تھا۔ ایسا درد جس کو وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔

بعض اوقات، بیٹھے بیٹھے وہ ایک دم چونک پڑتا۔ دُھندلے دُھندلے خیالات جو عام حالتوں میں بے آواز بُلبُلوں کی طرح پیدا ہو کر مٹ جایا کرتے ہیں، مومن کے دماغ میں بڑے شور کے ساتھ پیدا ہوتے تھے اور شور ہی کے ساتھ پھٹتے تھے۔ اس کے علاوہ اُس کے دل و دماغ کے نرم و نازک پردوں پر، ہر وقت جیسے خار دار پاؤں والی چیونٹیاں سی رینگتی تھیں۔ ایک عجیب قسم کا کھنچاؤ اس کے اعضا میں پیدا ہو گیا تھا جس کے باعث اسے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ اس تکلیف کی شدت جب بڑھ جاتی تو اُس کے جی میں آتا کہ اپنے آپ کو ایک بڑے سے ہاون[2] میں ڈال دے اور کسی سے کہے: ''مجھے کوٹنا شروع کر دو۔''

باورچی خانے میں گرم مسالا کوٹتے وقت جب لوہے سے لوہا ٹکراتا اور دھمکوں سے چھت میں ایک گونج سی دوڑ جاتی تو مومن کے ننگے پیروں کو یہ لرزش بہت بھلی معلوم ہوتی تھی[3]۔ پیروں کے ذریعے سے یہ لرزش اس کی تنی ہوئی پنڈلیوں اور رانوں میں دوڑتی ہوئی اس کے دل تک پہنچ جاتی جو تیز ہوا میں رکھے ہوئے دیے کی لَو کی طرح کانپنا شروع کر دیتا۔

مومن کی عمر پندرہ برس کی تھی۔ شاید سولھواں بھی لگا ہو۔ اسے اپنی عمر کے متعلق صحیح اندازہ نہیں تھا۔ وہ ایک صحت مند اور تن درست لڑکا تھا جس کا لڑکپن تیز قدمی سے جوانی کے میدان کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اسی دوڑ نے جس سے مومن بالکل غافل تھا، اس کے لہو کے ہر قطرے میں سنسنی پیدا کر دی تھی۔ وہ اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا مگر ناکام رہتا تھا۔

اس کے جسم میں کئی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں: گردن جو پہلے پتلی تھی، اب موٹی ہو گئی تھی۔ بانہوں کے پٹھوں میں اینٹھن سی پیدا ہو گئی تھی۔ کنٹھ نکل رہا تھا۔ سینے پر گوشت کی تہ موٹی ہو گئی تھی اور اب کچھ دنوں سے پستانوں میں گولیاں سی پڑ گئی تھیں، جگہ اُبھر آئی تھی جیسے کسی نے ایک ایک بنٹا اندر داخل کر دیا ہے،

اُن ابھاروں کو ہاتھ لگانے سے مومن کو بہت درد محسوس ہوتا تھا۔ کبھی کبھی کام کرنے کے دوران میں، غیر ارادی طور پر، جب اس کا ہاتھ ان گولیوں سے چھو جاتا تو وہ تڑپ اٹھتا۔ قمیص کے موٹے اور کھردرے کپڑے سے بھی اس کو تکلیف دہ سرسراہٹ محسوس ہوتی تھی۔

غسل خانے میں نہاتے وقت یا باورچی خانے میں جب کوئی اور موجود نہ ہو، [نہ ہوتا؟] مومن اپنے قمیص کے بٹن کھول کر اُن گولیوں کو غور سے دیکھتا تھا، ہاتھوں سے مسلتا تھا۔ درد ہوتا، ٹیسیں اٹھتیں، اُس کا سارا جسم پھلوں سے لدے ہوئے پیڑ کی طرح، جسے زور سے ہلایا گیا ہو، کانپ کانپ جاتا مگر اس کے باوجود وہ اس درد پیدا کرنے والے کھیل میں مشغول رہتا تھ۔ کبھی کبھی زیادہ دبانے پر یہ گولیاں پچک جاتیں اور ان کے منہ سے لیس دار[۴] لعاب نکل آتا، اُس کو دیکھ کر اس کا چہرہ کان کی لوؤں تک سُرخ ہو جاتا۔ وہ یہ سمجھتا کہ اُس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے۔

گناہ اور ثواب کے متعلق مومن کا علم بہت محدود تھا۔ ہر وہ فعل جو ایک انسان دوسرے انسانوں کے سامنے نہ کر سکتا ہو، اُس کے خیال کے مطابق گناہ تھا۔ چنانچہ جب شرم کے مارے اس کا چہرہ کان کی لوؤں تک سُرخ ہو جاتا تو وہ جھٹ سے اپنی قمیص کے بٹن بند کر لیتا اور دل میں عہد کرتا کہ آئندہ ایسی فضول حرکت کبھی نہیں کرے گا لیکن اس عہد کے باوجود، دوسرے تیسرے روز تخلیے میں، پھر اسی کھیل میں[۵] مشغول ہو جاتا۔

مومن سے گھر والے سب خوش تھے۔ وہ بڑا محنتی لڑکا تھ، سب کام وقت پر کر دیتا تھا اور کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتا تھا۔ ڈپٹی صاحب کے یہاں اُسے کام کرتے ہوئے صرف تین مہینے ہوئے تھے لیکن اس قلیل عرصے میں اس نے گھر کے ہر فرد کو اپنی محنت کش طبیعت سے متاثر کر لیا تھا۔ چھ روپے مہینے پر وہ نوکر ہوا تھ مگر دوسرے مہینے ہی اُس کی تنخواہ میں دو روپے بڑھا دیے گئے تھے۔ وہ اِس گھر میں بہت خوش تھا اس لیے کہ اس کی یہاں قدر کی جاتی تھی۔ مگر وہ اب کچھ دنوں سے بے قرار[۶] تھا۔ ایک عجیب قسم کی آوارگی اس کے دماغ میں پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھ کہ سارا دن، بے مطلب، بازاروں میں گھومتا پھرے یا کسی سنسان مقام پر جا کر لیٹا رہے۔

اب کام میں اُس کا جی نہیں لگتا تھا۔ لیکن اِس بے دلی کے ہوتے ہوئے بھی وہ کاہلی نہیں برتتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ گھر میں کوئی بھی اس کے اندرونی انتشار سے واقف نہیں تھا۔ رضیہ تھی سو وہ دن بھر باجا بجانے، نئی نئی فلمی طرزیں سیکھنے اور رسالے پڑھنے میں مصروف رہتی تھی۔ اُس نے کبھی مومن کی نگرانی ہی نہیں کی تھی۔ شکیلہ البتہ مومن سے ادھر اُدھر کے کام لیتی تھی اور کبھی کبھی اُسے ڈانٹتی بھی تھی مگر اب کچھ دنوں سے

وہ چند بلاؤزوں کے نمونے اُتارنے میں بے طرح مشغول تھی۔ یہ بلاؤز اُس کی ایک سہیلی کے تھے جسے نئی نئی تراشوں کے کپڑے پہننے کا بہت شوق تھا۔ شکیلہ اُس سے آٹھ بلاؤز مانگ کر لائی تھی اور کاغذوں پر ان کے نمونے اتار رہی تھی۔ چنانچہ اُس نے بھی کچھ دنوں سے[7] مومن کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

ڈپٹی صاحب کی بیوی سخت گیر عورت نہیں تھی۔ گھر میں دو نوکر تھے یعنی مومن کے علاوہ ایک بڑھیا بھی تھی، زیادہ تر باورچی خانے کا کام ہی کرتی تھی، مومن کبھی کبھی اُس کا ہاتھ بٹا دیا کرتا تھا۔ ڈپٹی صاحب کی بیوی نے، ممکن ہے مومن کی مستعدی میں کوئی کمی دیکھی ہو مگر اُس نے مومن سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اور وہ انقلاب جس میں سے مومن کا دل و دماغ اور جسم گزر رہا تھا، اُس سے تو ڈپٹی صاحب کی بیوی بالکل غافل تھی۔ چونکہ اس کا کوئی لڑکا نہیں تھا اس لیے وہ مومن کی ذہنی اور جسمانی تبدیلیوں کو نہیں سمجھ سکتی[8] تھی اور پھر مومن نوکر تھا...... نوکروں کے متعلق کون غور و فکر کرتا ہے، بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہ تمام منزلیں پیدل طے کر جاتے ہیں اور آس پاس کے آدمیوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔

مومن کا بھی بالکل یہی حال تھا۔ وہ کچھ دنوں سے موڑ مڑتا، زندگی کے ایک ایسے راستے پر آنکلا تھا جو زیادہ لمبا تو نہیں تھا مگر بے حد پُر خطر تھا۔ اس راستے پر اس کے قدم کبھی تیز تیز اُٹھتے تھے، کبھی ہولے ہولے۔ وہ دراصل جانتا نہیں تھا کہ ایسے راستوں پر کس طرح چلنا چاہیے؟ انہیں جلدی طے کرنا چاہیے یا کچھ وقت لے کر، آہستہ آہستہ ادھر اُدھر کی چیزوں کا سہارا لے کر، طے کرنا چاہیے۔ مومن کے ننگے پاؤں [پیروں؟] کے نیچے، آنے والے شباب کی گول گول چکنی بٹیاں پھسل رہی تھیں، وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ بے حد مضطرب تھا۔ اسی اِضطراب کے باعث، کئی بار کام کرتے کرتے چونک کر، وہ غیر ارادی طور پر کسی کھونٹی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیتا اور اس کے ساتھ لٹک جاتا۔ پھر اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ ٹانگوں سے پکڑ کر اُسے کوئی اتنا کھینچے[9] کہ وہ ایک مہین تار بن جائے۔ یہ سب باتیں اس کے دماغ کے کسی ایسے گوشے میں پیدا ہوتی تھیں کہ وہ ٹھیک طور پر ان کا مطلب نہیں سمجھ سکتا تھا۔[10]

غیر شعوری طور پر وہ چاہتا تھا کہ کچھ ہو...... کیا ہو؟...... بس کچھ ہو، میز پر قرینے سے چُنی ہوئی پلیٹیں ایک دم اُچھلنا شروع کر دیں۔ کیتلی پر رکھا ہوا ڈھکنا، پانی کے ایک ہی ابال سے اُوپر کو اُڑ جائے۔ نل کی جستی نالی پر دباؤ ڈالے تو وہ دُہری ہو جائے اور اس میں سے پانی کا ایک فوارہ سا پھوٹ نکلے۔ اُسے ایک ایسی زبردست انگڑائی آئے کہ اس کے سارے جوڑ علاحدہ علاحدہ ہو جائیں اور ایک[11] ڈھیلا پن پیدا ہو جائے...... کوئی ایسی بات وقوع پذیر ہو جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی ہو۔

مومن بہت بے قرار تھا۔

رضیہ نئی فلمی طرزیں سیکھنے میں مشغول تھی اور شکیلہ کاغذوں پر بلاؤزوں کے نمونے اتار رہی تھی۔ جب اُس نے یہ کام ختم کرلیا تو وہ نمونہ جو اُن میں سب سے اچھا[12] تھا، سامنے رکھ کر اپنے لیے اُودی ساٹن کا بلاؤز بنانا شروع کیا۔ اب رضیہ کو بھی اپنا باجا اور فلمی گانوں کی کاپی چھوڑ کر اُس طرف متوجہ ہونا پڑا۔

شکیلہ ہر کام بڑے اہتمام اور چاؤ سے کرتی تھی۔ جب سینے پرونے بیٹھتی تو اس کی نشست بڑی پُر اطمینان ہوتی تھی۔ اپنی چھوٹی بہن رضیہ کی طرح، وہ افراتفری پسند نہیں کرتی تھی۔ ایک ایک ٹانکا سوچ سمجھ کر بڑے اطمینان سے لگاتی تھی تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے۔ پیمائش بھی اُس کی بہت صحیح ہوتی تھی اس لیے کہ وہ پہلے کاغذ کاٹ کر، پھر کپڑا کاٹتی تھی، یوں وقت [تو؟] زیادہ صرف ہوتا مگر چیز بالکل فٹ تیار ہوتی ہے [؟تھی]۔[13]

شکیلہ بھرے بھرے جسم کی صحت مند لڑکی تھی۔ اُس کے ہاتھ بہت گدگدے تھے۔ گوشت بھری مخروطی انگلیوں کے آخر میں ہر جوڑ پر ایک ننھا گڑھا تھا۔ جب وہ مشین چلاتی تھی، یہ[14] ننھے ننھے گڑھے ہاتھ کی حرکت سے کبھی کبھی غائب بھی ہوجاتے تھے۔

شکیلہ مشین بھی بڑے اطمینان سے چلاتی تھی، آہستہ آہستہ، اُس کی دو یا تین اُنگلیاں بڑی رعنائی کے ساتھ مشین کی ہتھی کو گھماتی تھیں، اس کی کلائی میں ایک ہلکا سا خم پیدا ہوجاتا تھا، گردن ذرا اُس طرف کو جھک جاتی تھی اور بالوں کی ایک لٹ جسے شاید اپنے لیے کوئی مستقل جگہ نہیں ملتی تھی، نیچے پھسل آتی تھی، شکیلہ اپنے کام میں اس قدر منہمک ہوتی تھی کہ وہ اُسے ہٹانے یا جمانے کی کوشش نہیں[15] کرتی تھی۔

جب شکیلہ اُودی ساٹن سامنے پھیلا کر اپنے ناپ کا بلاؤز تراشنے لگی تو اُسے ٹیپ کی ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ اُن کا اپنا ٹیپ گھس گھسا کر اب بالکل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا تھا۔ لوہے کا گز موجود تھا مگر اُس سے کمر اور سینے کی پیمائش کیسے ہوسکتی ہے۔ اس کے اپنے کئی بلاؤز موجود تھے مگر اب چونکہ وہ پہلے سے کچھ موٹی ہوگئی تھی اس لیے وہ ساری[16] پیمائشیں دوبارہ کرنا چاہتی تھی۔

قمیص اُتار کر اس نے مومن کو آواز دی۔ جب وہ آیا تو اُس سے کہا: ''جاؤ مومن، دوڑ کر چھ نمبر سے کپڑے کا گز لے آؤ۔ کہنا شکیلہ بی بی مانگتی ہیں۔''

مومن کی نگاہیں شکیلہ کی سفید بنیان کے ساتھ ٹکرائیں۔ وہ کئی بار شکیلہ بی بی کو ایسی بنیانوں میں دیکھ چکا تھا مگر آج اسے ایک عجیب قسم کی[17] جھجک محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی نگاہوں کا رُخ دوسری طرف پھیر لیا

اور گھبراہٹ میں کہا: ''کیسا گز بی بی جی؟''

شکیلہ نے جواب دیا ''کپڑے کا گز ...... ایک گز تو یہ تمہارے سامنے پڑا ہے، لوہے کا ہے۔ ایک دوسرا گز بھی ہوتا ہے جو کپڑے کا[۱۸] بنا ہوتا ہے، جاؤ چھ نمبر میں جاؤ اور دوڑ کے ان سے یہ گز [وہ گز؟] لے آؤ، کہنا شکیلہ بی بی مانگتی ہیں۔''

چھ نمبر کا فلیٹ بالکل قریب تھا۔ مومن فوراً ہی کپڑے کا گز لے کر آ گیا۔ شکیلہ نے یہ گز اس کے ہاتھ سے لیا اور کہا: ''یہیں ٹھہر جاؤ، اسے ابھی واپس لے جانا۔'' پھر وہ اپنی بہن رضیہ سے مخاطب ہوئی: ''ان لوگوں کی کوئی چیز زیادہ دیر اپنے پاس[۱۹] رکھ لی جائے تو وہ بُڑھیا تقاضے کر کر کے پریشان کر دیتی ہے ...... ادھر آؤ، یہ گز لو اور یہاں سے میرا ناپ لو۔''

رضیہ نے شکیلہ کی کمر اور سینے کا ناپ لینا شروع کیا تو اُن کے درمیان کئی باتیں ہوئیں۔ مومن دروازے کی دہلیز میں کھڑا، تکلیف دہ خاموشی سے یہ باتیں سُنتا رہا:

''رضیہ! تم گز کھینچ کر[۲۰] ناپ کیوں نہیں لیتیں ..... پچھلی دفعہ بھی یہی ہُوا، تم نے ناپ لیا اور میرے بلاؤز کا ستیاناس ہو گیا۔ اُوپر کے حصے پر اگر کپڑا فٹ نہ آئے تو اِدھر اُدھر بغلوں میں جھول پڑ جاتے ہیں۔''

''کہاں کا لوں، کہاں کا نہ لوں، تم تو عجب مخمصے میں ڈال دیتی ہو۔ یہاں کا ناپ لینا شروع کیا تو تم نے کہا: ذرا نیچے[۲۱] کا لو ..... ذرا چھوٹا بڑا ہو گیا تو کون سی آفت آ جائے گی!''

''بھئی واہ ...... چیز کے فٹ ہونے ہی میں تو ساری خوب صورتی ہے۔ ثریا کو دیکھو کیسے فٹ کپڑے پہنتی ہے، مجال ہے جو کہیں شکن پڑے، کتنے خوب صورت معلوم ہوتے ہیں ایسے کپڑے ...... لو اب ناپ لو......''[۲۲]

یہ کہہ کر شکیلہ نے سانس کے ذریعے سے اپنا سینہ پھُلانا شروع کیا۔ جب اچھی طرح پھُول گیا تو سانس روک کر اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا: ''لو اب جلدی کرو۔''

جب شکیلہ نے سینے کی ہوا خارج کی تو مومن کو ایسا محسوس ہوا [کہ؟] اس کے اندر ربڑ کے کئی غبارے پھٹ گئے ہیں۔ اس نے گھبرا کر کہا: ''گز لائیے بی بی جی ...... میں دے آؤں''[۲۳]۔

شکیلہ نے اسے جھڑک دیا: ''ذرا ٹھہر جاؤ۔''

یہ کہتے ہوئے، کپڑے کا گز، اس کے ننگے بازو سے لپٹ گیا۔ جب شکیلہ نے اسے اتارنے کی کوشش کی تو مومن کو اس کی سفید بغل میں کالے کالے بالوں کا ایک گچھا نظر آیا۔ مومن کی اپنی بغلوں میں بھی

ایسے ہی بال اُگ رہے تھے مگر یہ گچھا اسے بہت بھلا معلوم ہوا۔ ایک سنسنی سی اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ ایک عجیب وغریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ یہ کالے کالے بال اس کی مونچھیں بن جائیں ..... بچپن میں وہ بھٹوں کے کالے اور سنہری بال نکال کر اپنی مونچھیں بنایا کرتا تھا۔ اُن کو اپنے بالائی ہونٹ پر جماتے وقت جو اُسے سرسراہٹ محسوس ہوا کرتی تھی اُسی قسم کی سرسراہٹ اس خواہش نے اس کے بالائی ہونٹ اور ناک میں پیدا کی۔[۲۴]

شکیلہ کا بازو اب نیچے جھک گیا تھا اور اس کی بغل چھپ گئی تھی مگر مومن اب بھی کالے کالے بالوں کا وہ گچھا دیکھ رہا تھا۔ اس کے تصور میں شکیلہ کا بازو دیر تک ویسے ہی اٹھا رہا اور بغل میں سے اُس کے[۲۵] سیاہ بال جھانکتے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد شکیلہ نے مومن کو گز دے دیا اور کہا: ''جاؤ، اسے واپس[۲۶] دے آؤ۔ کہنا: بہت بہت شکریہ ادا کیا ہے۔''

مومن گز واپس دے کر باہر صحن میں بیٹھ گیا۔ اس کے دل و دماغ میں دُھندلے دُھندلے سے خیال[۲۷] پیدا ہو رہے تھے۔ دیر تک وہ اُن کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے غیر ارادی طور پر اپنا چھوٹا سا ٹرنک کھولا جس میں اس نے عید کے لیے نئے کپڑے بنوا کر رکھے تھے۔

جب ٹرنک کا ڈھکنا کھلا اور نئے لٹھے کی بُو اس کی ناک تک پہنچی تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ نہا دھو کر اور یہ نئے کپڑے پہن کر وہ سیدھا شکیلہ بی بی کے پاس جائے اور اسے سلام کرے...... اس کی لٹھے کی شلوار کس طرح کھڑ کھڑ کرے گی اور اُس کی رومی ٹوپی......

رومی ٹوپی کا خیال آتے ہی مومن کی نگاہوں کے سامنے اُس کا پھُندنا آ گیا اور پھُندنا فوراً ہی اُن کالے کالے بالوں کے گچھے میں تبدیل ہوگیا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھا تھا۔ اس نے کپڑوں کے نیچے سے اپنی نئی رومی ٹوپی نکالی اور اس کے نرم اور لچکیلے پھُندنے پر ہاتھ پھیرنا شروع ہی کیا تھا[۲۸] کہ اندر سے شکیلہ بی بی کی آواز آئی: ''مومن!''

مومن نے ٹوپی ٹرنک میں رکھی، ڈھکنا بند کیا اور اندر چلا گیا جہاں شکیلہ نمونے کے مطابق اُودی ساٹن کے کئی ٹکڑے کاٹ چکی تھی۔ اُن چمکیلے اور پھسل پھسل جانے والے ٹکڑوں کو ایک جگہ رکھ کر مومن[۲۹] کی طرف متوجہ ہوئی: ''میں نے تمہیں اتنی آوازیں دیں، سو گئے تھے کیا؟''

مومن کی زبان میں لکنت پیدا ہوگئی: ''نہیں بی بی جی۔''

''تو کیا کر رہے تھے؟''

''کچھ...... کچھ بھی نہیں۔''

''کچھ تو ضرور کرتے ہو گے؟'' شکیلہ یہ سوال کیے جا رہی تھی مگر اُس کا اصل دھیان بلاؤز کی طرف[۳۰] تھا جسے اب اُسے کچا کرنا تھا۔

مومن نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ جواب دیا: ''ٹرنک کھول کر اپنے نئے کپڑے دیکھ رہا تھا۔''

شکیلہ کھِل کھِلا کر ہنسی۔ رضیہ نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔[۳۱]

شکیلہ کو ہنستے دیکھ کر مومن کو ایک عجیب سی تسکین محسوس ہوئی اور تسکین نے[۳۲] اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا کی کہ وہ کوئی ایسی، مضحکہ خیز طور پر احمقانہ، حرکت کرے جس سے شکیلہ کو اور زیادہ ہنسنے کا موقع ملے، چنانچہ لڑکیوں کی طرح جھینپ کر اور لہجے میں شرماہٹ پیدا کر کے اس نے کہا: ''بڑی بی بی جی سے پیسے لے کر میں ریشمی رومال بھی لاؤں گا۔''

شکیلہ نے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا: ''کیا کرو گے اُس رومال کو؟''

مومن نے جھینپ کر جواب دیا: ''گلے میں باندھ لوں گا بی بی جی..... بڑا اچھا معلوم ہوگا۔'' یہ سُن کر شکیلہ اور رضیہ دونوں دیر تک ہنستی رہیں۔

''گلے میں باندھو گے تو یاد رکھنا میں اُسی سے پھانسی دے دوں گی تمہیں۔''[۳۳] یہ کہہ کر شکیلہ نے اپنی ہنسی دبانے کی کوشش کی اور رضیہ سے کہا: ''کم بخت نے مجھے کام ہی بھلا دیا۔ رضیہ! میں نے اسے کیوں بلایا تھا؟''

رضیہ نے جواب نہ دیا اور نئی فلمی طرز گنگنانا شروع کر دی جو وہ دو روز سے سیکھ رہی تھی۔ اس دوران میں شکیلہ کو خود ہی یاد آ گیا کہ اس نے مومن کو کیوں بلایا تھا۔ ''دیکھو مومن میں تمہیں یہ بنیان اُتار کر دیتی ہوں، دوائیوں کی دکان کے پاس جو ایک دکان نئی کھلی ہے نا، وہی جس میں تم اُس دن میرے ساتھ گئے تھے، وہاں جاؤ اور پوچھ کر آؤ کہ ایسے چھ بنیانوں کا[۳۴] وہ کیا لے گا...... کہنا ہم پوری چھ لیں گے...... اس لیے کچھ رعایت ضرور کرے...... سمجھ لیا نا؟''

''مومن نے جواب دیا: ''جی ہاں۔''

''اب تم پرے ہٹ جاؤ۔''

مومن باہر نکل کر دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ چند لمحات کے بعد بنیان اس کے قدموں کے پاس

آگرا اور اندر سے شکیلہ کی آواز آئی: ''کہنا ہم اسی قسم کی، اسی ڈیزائن کی، بالکل یہی چیز لیں گے۔ فرق نہیں ہونا چاہیے!''

مومن نے ''بہت اچھا'' کہہ کر بنیان اُٹھا لیا جو پسینے کے باعث کچھ کچھ گیلا ہو رہا تھا جیسے کسی نے بھاپ پر رکھ کر فوراً ہی ہٹا لیا ہو، بدن کی بُو بھی اس میں بسی ہوئی تھی، میٹھی میٹھی گرمی بھی تھی۔ یہ تمام چیزیں اس کو بہت بھلی معلوم ہوئیں۔

وہ اُس بنیان کو جو بلّی کے بچّے کی طرح ملائم تھا، اپنے ہاتھوں میں مسلتا باہر چلا گیا۔ جب بھاؤ واؤ دریافت کر کے بازار سے واپس آیا تو شکیلہ بلاؤز کی سلائی شروع کر چکی تھی، اُس سیاہی مائل[۳۵] ساٹن کے بلاؤز کی جو مومن کی رومی ٹوپی کے پھُندنے سے کہیں زیادہ چمکیلی اور لچک دار تھی۔

یہ بلاؤز شاید عید کے لیے تیار کیا جا رہا تھا کیونکہ عید اب بالکل قریب آ گئی تھی۔ مومن کو ایک دن میں کئی بار بُلایا گیا: دھاگا لانے کے لیے، استری نکالنے کے لیے، سوئی ٹوٹی تو نئی سوئی لانے کے لیے۔ شام کے قریب جب شکیلہ نے دوسرے روز پر جب باقی کام اُٹھا دیا تو وہ دھاگے کے ٹکڑے [؟دوسرے روز پر باقی کام اٹھا دیا تو دھاگے کے ٹکڑے] اور اُودی ساٹن کی بے کار کترنیں اُٹھانے کے لیے بھی اُسے بلایا گیا۔

مومن نے اچھی طرح جگہ صاف کر دی۔ باقی سب چیزیں [تو؟] اٹھا کر باہر پھینک دیں مگر اُودی ساٹن کی چمک دار کترنیں[۳۶] اپنی جیب میں رکھ لیں...... بالکل بے مطلب کیونکہ اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ ان کو [اِن کا؟] کیا کرے گا۔

دوسرے روز اس نے جیب سے کترنیں نکالیں اور الگ بیٹھ کر ان کے دھاگے الگ کرنے شروع کر دیے۔ دیر تک وہ اس کھیل میں مشغول رہا۔ حتیٰ کہ دھاگے کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں[۳۷] کا ایک گچھا سا بن گیا، اُس کو ہاتھ میں لے کر وہ دباتا رہا، مسلتا رہا..... لیکن اس کے تصور میں شکیلہ کی وہی بغل تھی جس میں اس نے کالے کالے بالوں کا ایک چھوٹا سا گچھا دیکھا تھا۔

اُس دن بھی اُسے شکیلہ نے کئی بار بلایا...... کالی ساٹن کے بلاؤز کی ہر شکل اس کی نگاہوں کے سامنے آتی رہی۔ پہلے جب اُسے کچا کیا گیا تھا [تو؟] اُس پر سفید دھاگے کے بڑے بڑے ٹانکے جا بجا پھیلے ہوئے تھے، پھر اس پر استری کی گئی جس سے سب شکنیں دور ہو گئیں اور چمک بھی دوبالا ہو گئی۔ اس کے بعد کچی حالت ہی میں شکیلہ نے اسے پہنا، رضیہ کو دکھایا، دوسرے کمرے میں سنگھار میز کے پاس جا کر آئینے میں خود اُس کو ہر پہلو سے اچھی طرح دیکھا۔ جب پورا اطمینان ہو گیا تو اُسے اتارا، جہاں جہاں تنگ یا کھُلا تھا

وہاں نشان بنائے، اُس کی ساری خامیاں دور کیں، ایک بار [پھر؟] پہن کر دیکھا، جب بالکل فٹ ہو گیا تو پکی سلائی شروع کی۔

اِدھر ساٹن کا یہ بلاؤز سیا جا رہا تھا، اُدھر مومن کے دماغ میں عجیب و غریب خیالوں کے جیسے ٹانکے سے اُدھڑ رہے تھے...... جب اُسے کمرے میں بلایا جاتا اور اُس کی نگاہیں چمکیلی ساٹن کے بلاؤز پر پڑتیں تو اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ہاتھ سے چھو کر اسے دیکھے، صرف چھو کر ہی نہیں دیکھے بلکہ[۳۸] اس کی ملائم اور روئیں دار سطح پر دیر تک ہاتھ پھیرتا رہا...... اپنے کھردرے ہاتھ۔

اس نے اس [؟ ان] ساٹن کے ٹکڑوں سے اس کی ملائمی کا اندازہ[۳۹] کر لیا تھا۔ دھاگے جو اس نے اُن ٹکڑوں سے نکالے تھے اور بھی زیادہ ملائم ہو گئے تھے۔ جب اس نے ان کا گُچھا بنایا تھا تو دباتے وقت اسے معلوم ہوا کہ ان میں ربڑ کی سی لچک بھی ہے...... وہ جب بھی اندر آ کر بلاؤز کو دیکھتا، اس کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دوڑ جاتا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھے تھے۔ کالے کالے بال۔ مومن سوچتا تھا: کیا وہ بھی اس ساٹن ہی کی طرح ملائم ہیں؟

بلاؤز بالآخر تیار ہو گیا...... مومن کمرے کے فرش پر گیلا کپڑا پھیر رہا تھا کہ شکیلہ اندر آئی۔ قمیص اُتار کر اس نے پلنگ پر رکھی۔ اُس کے نیچے اُسی قسم کا سفید بنیان تھا جس کا نمونہ لے کر مومن بھاؤ دریافت کرنے گیا تھا...... اس کے اوپر شکیلہ نے اپنے ہاتھ کا سلا ہوا بلاؤز پہنا، سامنے کے ہک لگائے اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

مومن نے فرش صاف کرتے کرتے آئینے کی طرف دیکھا۔ بلاؤز میں اب جان سی پڑ گئی تھی۔ ایک دو جگہ پر وہ اس قدر چمکتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا ساٹن کا رنگ سفید ہو گیا ہے۔

شکیلہ کی پیٹھ مومن کی طرف تھی جس پر ریڑھ کی ہڈی کی لمبی جھری، بلاؤز فٹ ہونے کے باعث، اپنی پوری گہرائی کے ساتھ نمایاں تھی۔ مومن سے نہ رہا گیا چنانچہ اس نے کہا ''بی بی جی آپ نے تو درزیوں کو بھی مات کر دیا''۔[۴۰]

شکیلہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوئی مگر وہ رضیہ کی رائے طلب کرنے کے لیے بے قرار تھی اس لیے وہ صرف ''اچھا سلا ہے نا؟''[۴۱] کہہ کر باہر دوڑ گئی...... مومن آئینے کی طرف دیکھتا رہ گیا جس میں بلاؤز کا سیاہ اور چمکیلا عکس دیر تک موجود رہا۔

رات کو جب وہ پھر اُس کمرے میں صراحی رکھنے کے لیے آیا [گیا؟] تو اس نے کھونٹی پر لکڑی کے

ہینگر میں اُس بلاؤز کو دیکھا۔ کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ چنانچہ آگے بڑھ کر پہلے اس نے اُسے غور سے دیکھا پھر ڈرتے ڈرتے اُس پر ہاتھ پھیرا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے یہ محسوس ہوا[۲۲] کہ کوئی اس کے جسم کے ملائم روئیں پر ہولے ہولے، بالکل ہوائی لمس کی طرح، ہاتھ پھیر رہا ہے۔

رات کو جب وہ سویا تو اس نے کئی اوٹ پٹانگ خواب دیکھے...... ڈپٹی صاحب نے پتھر کے کوئلوں کا ایک بڑا ڈھیر اسے کوٹنے کو کہا۔ جب اس نے ایک کوئلہ اٹھایا اور اس پر ہتھوڑے کی ضرب لگائی تو وہ نرم نرم بالوں کا ایک گچھا بن گیا...... یہ کالی کھانڈ کے مہین مہین تار تھے جن کا گولا بنا ہوا تھا...... پھر یہ گولے کالے رنگ کے غبارے بن کر ہوا میں اُڑنا شروع ہوئے... .. بہت اُوپر جا کر یہ پھٹنے لگے...... پھر آندھی آگئی اور مومن کی رومی ٹوپی کا پھندنا کہیں غائب ہوگیا.... . پھندنے کی تلاش میں وہ نکلا .. .. دیکھی اَن دیکھی جگہوں میں گھومتا رہا..... نئے لٹھے کی بُو بھی کہیں سے آنا شروع ہوئی، پھر نہ جانے کیا ہوا...... ایک کالی ساٹن کے بلاؤز پر اس کا ہاتھ پڑا ..... کچھ دیر وہ کسی دھڑکتی ہوئی چیز پر اپنا ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر دفعتاً ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ کیا ہوگیا ہے۔ اس کے بعد اسے خوف، تعجب اور ایک انوکھی ٹیس کا احساس ہوا۔ اس کی حالات اس وقت عجیب وغریب تھی...... پہلے اُسے تکلیف دہ حرارت محسوس ہوتی[۲۳] تھی مگر چند لمحات کے بعد ایک ٹھنڈی سی لہر اس کے جسم پر رینگنے لگی۔

حواشی

(اِن حواشی میں ص سے مراد: منٹو کے افسانے طبع چہارم کا صفحہ ہے۔ دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ اضافہ شدہ فقرہ: اُس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ (افسانے اور ڈرامے۔ ص:۹)

۲۔ پیدا ہوتے... ساتھ پھٹتے...۔ اضافہ شدہ فقرہ: اِس کے علاوہ (افسانے اور ڈرامے۔ ص.۹)... ایک بڑے بادن — صص:۱۲۷ تا ۱۲۸

۳۔ معلوم ہوتی۔ — ص:۱۲۸

۴۔ اپنی قمیص... ہاتھوں سے مسلتا...... سارا جسم... مشغول رہتا... ایک لیس دار — ص:۱۶۹

۵۔ ''دل میں عہد کرتا'' واوین میں درج یہ الفاظ، مجموعہ افسانے اور ڈرامے (ص:۱۱) میں موجود نہیں۔ بنیادی نسخے (ص:۱۶۹) سے شامل کیے گئے ہیں ... دوسرے یا تیسرے روز تخلیے میں وہ پھر اِس کھیل — ایضاً

٦۔ مومن سے سب گھر والے خوش تھے بڑا محنتی لڑکا تھا۔ جب ہر کام وقت پر کر دیتا تھا تو کسی کو شکایت کا موقع کیسے ملتا... مگر اب کچھ دنوں سے وہ بے قرار	ص: ١٦٩تا١٧٠
٧۔ نگرانی ہی نہ کی... وہ بھی چند بلاؤزوں... بے حد شوق... اُس نے کچھ دنوں سے	ص: ١٧٠
٨۔ بھی تھی۔ جو زیادہ تر... کام کرتی تھی... جس میں مومن... نہیں سمجھ سکتی اور	ایضاً
٩۔ اسی لیے بے حد مضطرب... کوئی اتنا کھینچے، اتنا کھینچے	ص: ١٧١
١٠۔ افسانے کا یہ پارا مفقود لما (ص۔٨١٢) میں اُس پارے کے بعد شائع ہوا ہے جو اس فقرے پر مکمل ہوتا ہے:... پھر وہ اسی کھیل میں مشغول ہو جاتا۔	
١١۔ اُس میں ایک	ایضاً
١٢۔ جو اُن سب میں اچھا	ص: ١٧٢
١٣۔ بہت صحیح تھی... کہ پہلے کاغذ کاٹ کر... صرف ہوتا ہے... تیار ہوتی تھی	ایضاً
١٤۔ لڑکی تھی۔ بالکل بہت... جوڑ پر ایک ایک... جب مشین چلاتی تھی تو یہ	ایضاً
١٥۔ ہتھی گھماتی تھیں۔ کلائی میں... منہمک رہتی کہ اُسے... کوشش ہی نہیں	ایضاً
١٦۔ اس لیے ساری	
١٧۔ ایک قسم کی	ص ١٧٣
١٨۔ یہ وجہ کا ہے... دوسرا گز بھی ہوتا ہے، کپڑے کا،	ایضاً
١٩۔ کوئی چیز اپنے پاس	ایضاً
٢٠۔ گز کو کھینچ کر	ص ١٧٤
٢١۔ شروع کیا تھا... ذرا اور نیچے	ایضاً
٢٢۔ فٹ ہونے میں تو... لو اب تم ماپ لو... (اولین متن کی گزشتہ سطور میں بھی جہاں جہاں "ماپ" لکھا تھا اسے منٹو نے نظر ثانی شدہ متن میں "ناپ" کر دیا ہے۔)	ایضاً
٢٣۔ دبے پاؤں	ایضاً
٢٤۔ مومن کو سفید بغل میں... جو سرسراہٹ اُسے... پیدا کر دی	ص: ١٧٤تا١٧٥
٢٥۔ اور بغل چھپ... بغل میں اس کے	ص ١٧٥
٢٦۔ جاؤ، واپس	ایضاً
٢٧۔ دھندلے دھندلے خیال	ایضاً
٢٨۔ شروع کیا تھا	ص ١٧٦
٢٩۔ رکھ کر، مومن	ایضاً
٣٠۔ دھیان اصل میں بلاؤز کی طرف	ایضاً
٣١۔ یہ دو مختصر جملے، اولین متن (ص:١٧٦) میں جداگانہ پارے کے طور پر شائع ہوئے ہیں لیکن نظر ثانی شدہ متن (ص:١٨) میں ماقبل پارے کا جزو ہیں۔ مدوّن کے نزدیک	

اوّلین متن کا طریق راجح ہے۔

۳۲۔ اس تسکین نے — ص ۱۷۶

۳۳۔ یاد رکھنا اُسی سے پھانسی دے دوں گی۔ — ص ۱۷۷

۳۴۔ پارے کے اگلے جملے، اوّلین متن (ص:۱۷۷) کے مطابق ہیں کیونکہ نظرثانی شدہ متن (ص:۱۹) کے کاتب نے غالباً سطر کو گھٹانے کی غرض سے، نہ صرف اوقاف و رموز سے چشم پوشی کی بلکہ ایک بے محل لفظ بھی کتابت کر دیا ہے۔

۳۵۔ اُودی اُودی — ص ۱۷۸

۳۶۔ مگر سائن کی چمکیلی کترنیں — ایضاً

۳۷۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں — ایضاً

۳۸۔ خیالوں کے ٹانکے سے ... جی چاہتا کہ وہ ... چھو کر ہی نہیں بلکہ — ص:۱۷۹

۳۹۔ ملائمت کا اندازہ ... تیجما بنایا تو ... معلوم ہوا تھا کہ ... ملائم ہوں گے؟ — صص:۱۷۹تا۱۸۰

۴۰۔ اوّلین متن میں "سفید ہوگیا ہے" کے بعد نیا پارا نہیں تھا... آپ نے درزیوں کو بھی مات کر دیا ہے! — ص:۱۸۰

۴۱۔ "اچھا ہے نا؟" — ایضاً

۴۲۔ پہلے اس نے غور سے ... اُسے یوں لگا — ایضاً

۴۳۔ تلاش میں نکلا... دیکھی اور اُن دیکھی ... کچھ دیر تک وہ کسی دھڑکتی ... مدوّن کے نزدیک اوّلین متن کا لفظ "کسی" (ص:۱۸۱) نظرثانی شدہ متن کے "اُس" (ص:۲۴) کے مقابلے میں قابل ترجیح ہے۔

... حرارت محسوس ہوئی — ص:۱۸۱

اُس کا پتی

لوگ کہتے تھے کہ نتھو کا سر اس لیے گنجا ہُوا ہے کہ وہ ہر وقت سوچتا رہتا ہے۔ اس بیان میں کافی صداقت ہے کیونکہ سوچتے وقت نتھو ہمیشہ سر کھجلایا کرتا ہے۔ چونکہ اس کے بال بہت کھردرے اور خشک ہیں اور تیل نہ ملنے کے باعث بہت خستہ ہوگئے ہیں اس لیے بار بار کھجلانے سے اُس کے سر کا درمیانی حصہ بالوں سے بالکل بے نیاز ہوگیا ہے۔ اگر اُس کا سر ہر روز دھویا جاتا تو یہ حصہ ضرور چمکتا مگر میل کی زیادتی کے باعث اس کی حالت بالکل اُس توے کی سی ہوگئی ہے[1] جس پر ہر روز روٹیاں پکائی جائیں مگر اُسے صاف نہ کیا جائے۔

نتھو، بھٹے پر اینٹیں بنانے کا کام کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر اپنے خیالات کو کچی اینٹیں سمجھتا تھا اور کسی پر فوراً ہی ظاہر نہیں کیا کرتا تھا۔ اُس کا یہ اصول تھا کہ خیال کو اچھی طرح پکا کر باہر نکالنا چاہیے تاکہ جس عمارت میں بھی وہ استعمال ہو اُس کا ایک مضبوط حصہ بن جائے۔

گاؤں والے اُس کے خیالات کی قدر کرتے تھے اور مشکل بات میں اس سے مشورہ لیا کرتے تھے لیکن اس قدر افزائی سے نتھو اپنے آپ کو اہم نہیں سمجھنے لگا تھا۔ جس طرح گاؤں میں شمبھو کا کام ہر وقت لڑتے جھگڑتے رہنا تھا اسی طرح اُس کا کام ہر وقت دوسروں کو مشورہ دیتے رہنا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ہر شخص صرف ایک کام کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ شمبھو کے بارے میں چوپال پر جب کبھی ذکر چھڑتا تو وہ ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا۔ ''کھاد کتنی بدبودار چیزوں سے بنتی ہے، پر کھیتی باڑی اُس کی بنا ہو ہی نہیں سکتی۔ شمبھو کے ہر سانس میں گالیوں کی باس آتی ہے، ٹھیک ہے، پر گاؤں کی چہل پہل اور رونق بھی اُسی کے دم سے قائم ہے۔ ..... اگر وہ نہ ہو تو لوگوں کو کیسے معلوم ہو کہ گالیاں کیا ہوتی ہیں؟ اچھے بول جاننے کے ساتھ ساتھ بُرے بول بھی معلوم ہونے چاہییں۔''

نتھو بھٹے سے واپس آرہا تھا اور حسبِ معمول سر کھجلاتا، گاؤں کے کسی مسئلے پر غور و فکر کر رہا تھا۔ لالٹین کے کھمبے کے پاس پہنچ کر اس نے اپنا ہاتھ سر سے علاحدہ کیا جس کی انگلیوں سے وہ بالوں کا ایک میل بھرا گچھا مروڑ رہا تھا۔ وہ اپنے جھونپڑے[2] کے تازہ لپے ہوئے چبوترے کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ سامنے سے اسے کسی نے آواز دی۔

نتھو پلٹا اور اپنے سامنے والے جھونپڑے کی طرف بڑھا جہاں مادھو اُسے اب ہاتھ کے اشارے سے بلا رہا تھا۔

جھونپڑے کے چھجے کے نیچے چبوترے پر مادھو، اُس کا لنگڑا بھائی اور چودھری بیٹھے تھے۔ اُن کے اندازِ نشست سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی نہایت ہی اہم بات سوچ رہے ہیں۔ سب کے چہرے[۳] کچی اینٹوں کی مانند پیلے تھے۔ مادھو تو بہت دنوں کا بیمار دکھائی دیتا تھا۔ ایک کونے میں طاقچے کے نیچے روپا کی ماں بیٹھی ہوئی تھی۔ غلیظ کپڑوں میں وہ میلے کپڑوں کی ایک گٹھڑی دکھائی دے رہی تھی۔

نتھو نے دُور ہی سے معاملے کی نزاکت محسوس کی اور قدم تیز کر کے اُن کے پاس پہنچ گیا۔

مادھو نے اشارے سے اُسے پاس بیٹھنے کو کہا۔ نتھو بیٹھ گیا اور اس کا ایک ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے بالوں کے اس گُچھے کی طرف بڑھ گیا جس کی جڑیں کافی بل چکی تھیں۔ اب وہ اُن لوگوں کی باتیں سننے کے لیے بالکل تیار تھا۔

مادھو اُس کو اپنے پاس بٹھا کر خاموش ہو گیا۔ مگر اس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹ صاف ظاہر کر رہے تھے کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن فوراً نہیں[۴] کہہ سکتا۔ مادھو کا لنگڑا بھائی بھی خاموش تھا اور بار بار اپنی کٹی ہوئی ٹانگ کے آخری ٹنڈ منڈ حصے پر جو گوشت کا ایک بدشکل لوتھڑا سا بنا ہوا تھا، ہاتھ پھیر رہا تھا۔ روپا کی ماں طاقچے میں رکھی ہوئی مورتی کے مانند گونگی بنی ہوئی تھی اور چودھری اپنی مونچھوں کو تاؤ دینا بھول کر زمین پر لکیریں بنا رہا تھا۔

نتھو نے خود ہی بات شروع کی: ''تو......''

مادھو بولا: ''نتھو بات یہ ہے کہ ... بات یہ ہے کہ ... اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ بات کیا ہے...... میں کچھ کہنے کے قابل نہ رہا...... چودھری! تم ہی جی کڑا کر کے سارا قصہ سُنا دو۔''

نتھو نے گردن اٹھا کر چودھری کی طرف دیکھا مگر وہ کچھ نہ بولا۔ اور زمین پر لکیریں بناتا رہا[۵]۔

دوپہر کی اُداس فضا بالکل خاموش تھی البتہ کبھی کبھی چیلوں کی چیخیں سنائی دیتی تھیں اور جھونپڑے کے داہنے ہاتھ گھورے پر جو مرغ کُوڑے کو کرید رہا تھا، کبھی کبھی کسی مرغی[۶] کو دیکھ کر بول اٹھتا تھا۔

چند لمحات تک جھونپڑے کے چھجے کے نیچے سب خاموش رہے۔ اور نتھو معاملے کی نزاکت اچھی طرح سمجھ گیا۔

روپا کی ماں نے روتی آواز میں کہا: ''میرے پھوٹے بھاگ!...... اُس کو تو جو کچھ اُجڑنا تھا اُجڑی،

مجھ ابھاگن کی ساری دنیا برباد ہوگئی...... کیا اب کچھ نہیں ہوسکتا؟''

مادھو نے کندھے ہلا دیے اور نتھو سے مخاطب ہو کر کہا: ''کیا ہوسکتا ہے؟...... بھئی میں یہ کلنک کا ٹیکا اپنے ماتھے پر لگانا نہیں چاہتا...... میں نے جب اپنے لالو کی بات روپا سے ۷ پکی کی تھی تو مجھے یہ قصہ معلوم نہیں تھا... اب تم لوگ خود ہی وچار کرو کہ سب کچھ جانتے ہوئے، میں اپنے بیٹے کا بیاہ روپا سے کیسے کرسکتا ہوں؟''

یہ سُن کر نتھو کی گردن اٹھی، وہ شاید یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ لالو کا بیاہ روپا سے کیوں نہیں ہوسکتا۔ ابھی کل تک سب ٹھیک ٹھاک تھا۔ اب اتنی جلدی کیا ہوگیا کہ روپا، لالو کے قابل نہیں رہی۔ وہ روپا اور لالو دونوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اور سچ پوچھو تو گاؤں میں ہر شخص ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ کون سی بات تھی جو اُسے ان دونوں کے بارے میں معلوم نہ تھی۔ روپا اس کی آنکھوں کے سامنے پھولی پھلی، بڑھی اور جوان ہوئی۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ اُس نے اُس کے گال پر ایک زور کا دھپا بھی مارا تھا اور اس کو اتنی مجال نہ ہوئی تھی کہ چوں بھی کرے۔ حالانکہ گاؤں کی سب چھوکریاں چھوکرے گستاخ تھے اور بڑوں کا بالکل ادب نہ کرتے تھے۔ روپا تو بڑی بھولی بھالی لڑکی تھی، باتیں بھی بہت کم کرتی تھی اور اس کے چہرے پر بھی کوئی ایسی علامت نہ تھی جس سے یہ پتا چلتا کہ وہ کوئی شرارت بھی کرسکتی ۸ ہے، پھر آج اُس کی بابت یہ باتیں کیوں ہورہی تھیں۔

نتھو کو گاؤں کے ہر جھونپڑے اور اُس کے اندر رہنے والوں کا حال معلوم تھا۔ مثال کے طور پر: اُسے معلوم تھا کہ چودھری کی گائے نے صبح سویرے ایک بچھڑا دیا ہے اور مادھو کے لنگڑے بھائی کی بیساکھی ٹوٹ گئی ہے۔ گاما حلوائی اپنی مونچھوں کے بال چنوا رہا تھا کہ اس کے ہاتھ سے آئینہ گر کر ٹوٹ گیا اور ایک سیر دودھ کے پیسے نائی کو بطور قیمت دینا پڑے ...... اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ دو اُپلوں پر، پرس رام اور گنگو کی جج بچ ہوتے ہوتے رہ گئی تھی اور سالگ رام نے اپنے بچوں کو پاپڑ بھون کر کھلائے تھے حالانکہ وید جی نے منع کیا تھا کہ اُن کو مرچوں والی کوئی شے نہ دی جائے۔ نتھو حیران تھا کہ ایسی کون سی بات ہے جو اسے معلوم نہیں؟ یہ تمام خیالات اس کے دماغ میں ایک دم آئے اور وہ مادھو کا کاسے، اپنی حیرت دور کرنے کی خاطر، کوئی سوال کرنے ہی والا تھا کہ چودھری نے زمین پر طوطے کی شکل مکمل ۹ کرتے ہوئے کہا: ''کچھ سمجھ میں نہیں آتا...... تھوڑے ہی دنوں میں وہ بچے کی ماں بن جائے گی۔''

تو یہ بات تھی۔ نتھو کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ دوپہر کی دھوپ میں اُڑنے والی ساری چیلیں اس کے دماغ میں گھس کر چیخنے لگی ہیں۔ اس نے اپنے بال زیادہ تیزی سے مروڑنے

شروع کر دیے۔

مادھو کاکا، تتھو کی طرف جھکا اور بڑے دُکھ بھرے لہجے میں اُس سے کہنے لگا: ''بیٹا! تمہیں یہ تو معلوم ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کی بات روپا سے پکّی کی تھی۔ اب میں تم سے کیا کہوں...... ذرا کان ادھر لاؤ'' ...! اُس نے ہولے سے تتھو کے کان میں کچھ کہا اور پھر اسی لہجے میں کہنے لگا: ''کتنی شرم کی بات ہے۔ میں تو کہیں کا نہ رہا، یہ میرا بڑھاپا اور یہ جان لیوا دُکھ، اور تو اور لالو کو بتاؤ کیا دُکھ ہوا ہوگا تم ہی انصاف کرو، کیا لالو کی شادی اب اس سے ہو سکتی ہے...... لالو کی شادی تو ایک طرف رہی، کیا ایسی لڑکی ہمارے گاؤں میں رہ سکتی ہے...... کیا اس کے لیے ہمارے یہاں کوئی جگہ ہے؟''

تتھو نے سارے گاؤں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اور اُسے ایسی کوئی جگہ نظر نہ آئی جہاں روپا اپنے باپ [؟پاپ] سمیت رہ سکتی تھی۔ البتہ اُس کا ایک جھونپڑا تھا جس میں وہ چاہے کسی کو بھی رکھتا۔ پچھلے برس اُس نے [ایک؟] کوڑھی کو اُس میں پناہ دی تھی۔ حالانکہ سارا گاؤں اُسے روک رہا تھا اور اُسے ڈرا رہا تھا کہ دیکھو تتھو! یہ بیماری بڑی چھوت والی ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں چمٹ جائے۔ لیکن وہ اپنی مرضی کا مالک تھا، اس نے وہی کچھ کیا جو اس کے من نے اچھا سمجھا۔ کوڑھی اس کے گھر میں پورے چھ مہینے رہ کر مر گئی۔ لیکن اُسے بیماری ویماری بالکل نہ لگی۔ اگر گاؤں میں روپا کے لیے کوئی جگہ نہ رہے تو کیا اس کا یہ مطلب تھا کہ اسے ماری ماری پھرنے دیا جائے؟ ہرگز نہیں، تتھو اس بات کا قائل نہیں تھا کہ دُکھی پر اور دُکھ لاد دیے جائیں۔ اس کے جھونپڑے میں ہر وقت اُس کے لیے جگہ تھی۔

وہ چھ مہینے تک ایک کوڑھی کی تیمارداری کر سکتا تھا اور روپا کوڑھی تو نہیں تھی ..... کوڑھی تو نہیں تھی، یہ سوچتے ہوئے تتھو کا دماغ ایک گہری بات سوچنے لگا ..... روپا کوڑھی نہیں تھی، اس لیے وہ ہمدردی کی زیادہ مستحق بھی نہیں تھی، اسے کیا روگ تھا؟..... کچھ بھی نہیں، جیسا کہ یہ لوگ کہہ رہے تھے، وہ تھوڑے ہی دنوں میں بچے کی ماں بننے والی تھی۔ پر یہ بھی کوئی روگ ہے، اور کیا ماں بننا کوئی پاپ ہے؟ ہر لڑکی، عورت بننا چاہتی ہے اور عورت ماں، اُس کی اپنی استری ماں بننے کے لیے تڑپ رہی تھی اور وہ خود یہ چاہتا تھا کہ وہ جلدی ماں بن جائے۔ اس لحاظ سے بھی روپا کا ماں بننا کوئی ایسا جرم نہیں تھا جس پر اُسے کوئی سزا دی جائے یا پھر اُسے رحم کا مستحق قرار دیا جائے۔ وہ ایک کے بجائے دو بچے جنے، اس سے کسی کا کیا بگڑتا تھا۔ وہ عورت ہی تو تھی، مندر میں گڑی ہوئی دیوی تو تھی نہیں، اور پھر یہ لوگ خواہ مخواہ کیوں اپنی جان ہلکان کر رہے تھے۔ مادھو کاکا کے لڑکے سے اس کی شادی ہوتی تو بھی کبھی نہ کبھی بچہ ضرور پیدا ہوتا۔ اب کون سی آفت آ گئی تھی۔

یہ بچّہ جو اَب اس کے پیٹ میں تھا، کہیں سے اُڑ کر تو نہیں آ گیا۔ شادی بیاہ ضرور ہُوا ہوگا۔ یہ لوگ باہر بیٹھے آپ ہی فیصلہ کر رہے ہیں اور جس کی بابت فیصلہ ہو رہا ہے اُس سے کچھ پوچھتے ہی نہیں،" گویا بچّہ وہ نہیں بلکہ یہ خود جن رہے ہیں۔ عجیب بات تھی اور پھر ان کو بچّے کی کیا فکر پڑ گئی تھی۔ بچّے کی فکر یا تو ماں کرتی ہے یا اُس کا باپ ۔ باپ؟ اور مزہ دیکھیے کہ کوئی بچّے کے باپ کی بات ہی نہیں کرتا تھا۔

یہ سوچتے ہوئے نتھو کے دماغ میں ایک بات آئی اور اُس نے مادھو کاکا سے کہا: "کاکا، جو کچھ تم نے کہا، اُس سے مجھے بڑا دُکھ ہوا۔ پر تم نے یہ کیسے کہہ دیا کہ روپا کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں...... ہم سب اپنے اپنے جھونپڑوں کو تالے لگا دیں تو بھی اُس کے لیے ایک دروازہ کھلا رہتا ہے!"

چودھری نے زمین پر طوطے کی آنکھ بناتے ہوئے کہا: "توبہ کا!"

نتھو نے جواب دیا: "اُن کے لیے جو پاپی ہوں...... روپا نے کوئی پاپ نہیں کیا، وہ نردوش ہے!"

چودھری نے حیرت سے مادھو کاکا کی طرف دیکھا اور کہا: "اِس نے پوری بات نہیں سنی۔"

مادھو کا لنگڑا بھائی اپنی کٹی ہوئی ٹانگ پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

نتھو، روپا کی ماں سے مخاطب ہوا: "ابھی سُن لیتا ہوں...... روپا کہاں ہے؟"

روپا کی ماں نے اپنی کھردری انگلیوں سے آنسو پونچھے اور کہا: "اندر بیٹھی اپنے نصیبوں کو رو رہی ہے۔"

یہ سن کر نتھو نے اپنا سر ایک بار زور سے کھجلایا اور اٹھ کر جھونپڑے کے اندر چلا گیا۔

روپا اندھیری کوٹھری کے ایک کونے میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ میلے کچیلے کپڑوں میں اندھیرے کے اندر وہ گیلی مٹّی کا ایک ڈھیر سا دکھائی دے رہی تھی۔ جو باتیں باہر ہو رہی تھیں اُن کا ایک ایک لفظ اس نے سنا تھا۔ حالانکہ اُس کے کان اس کے اپنے دل کی باتیں سننے میں لگے ہوئے تھے جو کسی طرح ختم ہی نہ ہوتی تھیں۔ نتھو اندر آنے کے لیے اٹھا تو وہ دوڑ کر سامنے کھٹیا پر جا پڑی اور گدڑی میں اپنا سر منہ چھپا لیا۔

نتھو نے جب دیکھا کہ روپا چھپ گئی ہے تو اُسے بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے پوچھا: "ارے مجھ سے کیوں چھپتی ہو؟"

روپا رونے لگی اور اپنے آپ کو کپڑے میں اور لپیٹ لیا۔ وہ بغیر آواز کے رو رہی تھی مگر نتھو کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ روپا کے آنسو اس کے تپتے ہوئے دل پر گر رہے ہیں۔ اس نے گدڑی کے اُس حصّے پر ہاتھ پھیرا جس کے نیچے روپا کا سر تھا اور کہا: "تم مجھ سے کیوں چھپتی ہو؟"

روپا نے سسکیوں میں جواب دیا: ''روپا نہیں چھپتی ننھو! ...... وہ اپنے پاپ کو چھپا رہی ہے۔''

ننھو اس کے پاس بیٹھ گیا اور کہنے لگا: ''کیسا پاپ ...... تم نے کوئی پاپ نہیں کیا...... اور اگر کیا بھی ہوتو کیا اُسے چھپانا چاہیے، یہ تو خود ایک پاپ ہے...... میں تم سے صرف ایک بات پوچھنے آیا ہوں۔ مجھے یہ بتادو کہ کس نے تمہاری سدا ہنستی آنکھوں میں یہ آنسو بھر دیے ہیں، کس نے اس بالی عمر میں تمہیں پاپ اور پُن کے جھگڑے میں پھنسا دیا ہے؟''

''میں کیا کہوں؟'' روپا یہ کہہ کر گدڑی میں اور سمٹ گئی۔ ننھو بولتا تھا اور روپا کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی اسے اکٹھا کر رہا ہے، اُسے سکیڑ رہا ہے۔

ننھو نے بڑی مشکل سے روپا کے مُنہ سے کپڑا ہٹایا اور اس کو اُٹھا کر بٹھا دیا۔ روپا نے دونوں ہاتھوں میں اپنے مُنہ کو چھپا لیا اور زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ اس سے ننھو کو بہت دکھ ہوا۔ ایک تو پہلے اُسے یہ چیز ستا رہی تھی کہ ساری بات اُس کے ذہن میں مکمل طور پر نہیں آتی۔ اور دوسرے روپا اس کے سامنے رو رہی تھی۔ اگر اسے ساری بات معلوم ہوتی تو وہ اُس کے یہ آنسو روکنے کی کوشش کر سکتا تھا جو میلی گدڑی میں جذب ہو رہے تھے۔ مگر اس کو، سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہیں تھا کہ روپا تھوڑے ہی دنوں میں بچّے کی ماں بننے والی ہے۔

اُس نے پھر اس سے کہا: ''روپا تم مجھے بتاتی کیوں نہیں ہو ...... ننھو بھیا تم سے پوچھ رہا ہے اور وہ کوئی غیر تھوڑی ہے جو تم یوں اپنے من کو چھپا رہی ہو .... تم روتی کیوں ہو۔ غلطی ہو ہی جایا کرتی ہے .لالو کی کسی اور سے شادی ہو جائے گی اور تم اپنی جگہ خوش رہو گی ...... تمہیں دنیا کا ڈر ہے تو میں کہوں گا کہ تم بالکل بیوقوف ہو، لوگوں کے جو جی میں آئے کہیں، تمہیں اُس سے کیا... . غلطی کر کے اپنے آپ کو دوسروں کے حوالے کر دینا تو میری سمجھ میں سب سے بڑی غلطی ہے ...... جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ اب تو ہمیں یہ سوچنا ہے کہ اس کے آگے کیا ہوگا...... تم دوسروں کی بابت نہ سوچو، اپنی فکر کرو، سب سے زیادہ ضروری چیز اس وقت تم ہو۔ اور سچ پوچھو تو اپنی ذات ہی ہمیشہ سب سے ضروری ہوتی ہے ...... رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوگا روپا، آنسو بھری آنکھوں سے نہ تم مجھے ہی ٹھیک طور سے دیکھ سکتی ہو اور نہ اپنے آپ کو... ... رونا بند کرو، مجھے ساری بات بتاؤ۔''

روپا کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اُس سے کیا کہے۔ وہ دل میں سوچتی تھی کہ اب ایسی کون سی بات رہ گئی ہے جو دنیا کو معلوم نہیں۔ یہی سوچتے ہوئے اس نے ننھو سے کہا ''ننھو بھیا، مجھ سے زیادہ تو دوسروں کو معلوم ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ جو کچھ میں سوچتی تھی ایک سپنا تھا، یوں تو ہر چیز سپنا ہوتی ہے، پر

یہ سپنا بڑا ہی عجیب ہے۔ کیسے شروع ہوا، کیونکر ختم ہوا، اس کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام دن جو میں کبھی خوشی سے گزارتی تھی، آنکھوں میں آنسو بننا شروع ہو گئے ہیں ...... میں گھڑا لے کر اُچھلتی، کودتی، گاتی، کنویں پر پانی بھرنے گئی، پانی بھر کر جب واپس آنے لگی تو ٹھوکر لگی اور گھڑا چکنا چور ہو گیا۔ مجھے بڑا دُکھ ہوا، میں نے چاہا کہ اُس ٹوٹے ہوئے گھڑے کے ٹکڑے اٹھا کر جھولی میں بھرلوں، پر لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ نقصان میرا ہوا، چاہیے تو یہ تھا کہ وہ مجھ سے ہمدردی کرتے، پر انہوں نے الٹا مجھے ہی ڈانٹنا شروع کر دیا، گویا گھڑا اُن کا تھا اور توڑنے والی میں تھی اور اُس روڑے کا کوئی قصور ہی نہ تھا[۱۲] جو راستے میں پڑا تھا۔ اور جس سے دوسرے بھی ٹھوکر کھا سکتے تھے ..... تم مجھ سے کچھ نہ پوچھو، مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔‘‘

نتھو کی انگلیاں زیادہ تیزی سے بالوں کا گچھا مروڑنے لگیں۔ اُس نے بڑے اضطراب سے کہا:

’’میں صرف اتنا پوچھتا ہوں کہ وہ ہے کون؟‘‘

’’کون؟‘‘

’’وہی ...... وہی .....‘‘ نتھو اِس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

روپا کے سینے سے بے اختیار ایک آہ نکل گئی۔ ’’وہ پہلے جتنا نزدیک تھا، اب اُتنا ہی دور ہے!‘‘

’’میں اُس کا نام پوچھتا ہوں ...... اور جانتی ہو، میں تم سے اُس کا نام کیوں پوچھتا ہوں؟ ...... اس لیے کہ وہ تمہارا پتی ہے .. ... اور تم اُس کی پتنی ہو ...... تم اس کی ہو اور وہ تمہارا ...... یہ ... یہ ...‘‘

نتھو اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ روپا نے دیوانہ وار اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور پھٹے ہوئے لہجے میں کہا: ’’ہولے ہولے بولو نتھو۔ ہولے ہولے بولو، کہیں وہ ..... جو میرے ہردے میں نیا جیو ہے، نہ سُن لے کہ اُس کی ماں پاپن ہے ...... نتھو! اسی ڈر کے مارے تو میں زیادہ سوچتی نہیں، زیادہ غم نہیں کرتی کہ اُس کو کچھ معلوم نہ ہو ... .. پر بیٹھے بیٹھے کبھی میرے من میں آتا ہے کہ ڈوب مروں، اپنا گلا گھونٹ لوں یا پھر زہر کھا کے[۱۳] مر جاؤں......‘‘

نتھو نے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ایک دو سیکنڈ غور کرنے کے بعد اس نے کہا: ’’کبھی نہیں، کبھی نہیں، میں تمہیں کبھی مرنے نہ دوں گا، تم کیوں مرو، یوں تو موت سے چھٹکارا نہیں، سب کو ایک دن مرنا ہے، پر اسی لیے تو جینا بھی ضروری ہے ..... میں کچھ لکھا پڑھا نہیں، میں کوئی پنڈت نہیں، پر جو کچھ میں نے کہا ہے، ٹھیک ہے، تم مجھے اُس کا نام بتا دو۔ میں تمہیں اُس کے پاس لے چلوں گا۔ اور اُسے مجبور کروں گا

کہ وہ تمہارے ساتھ بیاہ کرلے اور تمہیں اپنے پاس رکھے... وہی تمہارا پتی ہے!''

نتھو پھر روپا کے پاس بیٹھ گیا اور کہنے لگا: ''لو میرے کان میں کہہ دو...... وہ کون ہے؟...... روپا کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں، کیا تمہیں یقین نہیں آتا کہ میں تمہارے لیے کچھ کر سکوں گا۔''

روپا نے جواب دیا: ''تم میرے لیے سب کچھ کر سکتے ہو نتھو، پر جس آدمی کے پاس تم مجھے لے جانا چاہتے ہو، کیا وہ بھی کچھ کرے گا؟ ..... وہ تو مجھے بھول بھی چکا ہوگا۔''

نتھو نے کہا۔ ''تمہیں دیکھتے ہی اُسے سب کچھ یاد آجائے گا...... باقی چیزوں کی یاد اُسے میں دلا دوں گا...... تم مجھے اُس کا نام تو بتاؤ...... یہ ٹھیک ہے کہ استری اپنے پتی کا نام نہیں لیتی، پر ایسے موقع پر تمہیں کوئی لاج نہ آنی چاہیے۔''

روپا خاموش رہی، اس پر نتھو اور زیادہ مضطرب ہوگیا۔'' میں تمہیں ایک سیدھی سادی بات سمجھاتا ہوں اور تم سمجھتی ہی نہیں ہو، پگلی، جو تمہارے بچّے کا باپ ہے وہی تمہارا پتی ہے...... اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ تم تو بس آنسو بہائے جاتی ہو، کچھ سنتی ہی نہیں ہو...... میں پوچھتا ہوں، اُس کا نام بتانے میں ہرج ہی کیا ہے.... لو، تم نے تو اور رونا شروع کردیا۔ اچھا بھئی، میں زیادہ باتیں نہیں کرتا، تم یہ بتادو کہ وہ ہے کون...... تم مان لو، میں اُس کا کان پکڑ کر سیدھے راستے پر لے آؤں گا۔''

روپا نے سسکیوں میں کہا: ''تم بار بار پتی نہ کہو نتھو...... میری جوانی، میری آشا، میری دنیا، کبھی کی ودھوا ہو چکی ہے...... تم میری مانگ میں سیندور بھرنا چاہتے ہو اور میں چاہتی ہوں کہ سارے بال ہی نوچ ڈالوں...... نتھو اب کچھ نہیں ہو سکے گا...... میری جھولی کے بیر زمین پر گر کر[۱۴]...... سب کے سب موری میں جا پڑے ہیں۔ اب انہیں باہر نکالنے سے کیا فائدہ...... اُس کا نام پوچھ کر تم کیا کروگے...... لوگ تو اب میرا نام بھول جانا چاہتے ہیں۔''

نتھو تنگ آگیا اور تیز لہجے میں کہنے لگا: ''تم... تم بیوقوف ہو...... میں اب تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔''

وہ اٹھ کر جانے لگا تو روپا نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روکا۔ ایسا کرتے ہوئے اُس کا رنگ زرد[۱۵] پڑ گیا۔

نتھو نے اُس کی گیلی آنکھوں کی طرف دیکھا: ''بولو؟''

روپا بولی: ''نتھو بھیا، مجھے مارو، مجھے خوب پیٹو، شاید اِس طرح میں اُس کا نام بتادوں...... تمہیں یاد ہوگا، ایک بار میں نے بچپن میں مندر کے ایک پیڑ سے کچے آم توڑے تھے اور تم نے ایک ہی چانٹا مار کر

مجھ سے سچی بات کہلوالی تھی ۔ آؤ مجھے مارو...... یہ چور جسے میں نے اپنے من میں پناہ دے رکھی ہے، بغیر مار کے باہر نہیں نکلے گا۔"

تھو خاموش رہا۔ ایک لحظے کے لیے اس نے کچھ سوچا۔ پھر ایکا ایکی اس نے روپا کے پیلے گال پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ چھت کے چند سوکھے اور گرد سے اٹے تنکے، دھمک کے مارے نیچے گر پڑے۔ تھو کی سخت انگلیوں نے روپا کے گال پر کئی تہریں کھود دیں۔

تھو نے گرج کر پوچھا: "بتاؤ وہ کون ہے؟"

جھونپڑے کے باہر مادھو کے لنگڑے بھائی کی آدھی ٹانگ کانپی۔ چودھری جس تنکے سے زمین پر ایک اور طوطے[۶] کی شکل بنا رہا تھا، ہاتھ کانپنے کے باعث دُہرا ہوگیا۔ مادھو کاکا نے، کُلنگ کی طرح اپنی گردن اونچی کر کے جھونپڑے کے اندر دیکھا۔

اندر سے تھو کی خشم آلود آواز آ رہی تھی مگر یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں مادھو کاکا، چودھری اور لنگڑے کیشو نے آپس میں کئی باتیں کیں۔ آخر میں مادھو کاکا، کا بھائی، بیساکھی ٹیک کر اٹھا۔ وہ جھونپڑے میں جانے ہی والا تھا کہ تھو باہر نکلا۔ کیشو ایک طرف ہٹ گیا، تھو نے پلٹ کر اپنے پیچھے دیکھا اور کہا "آؤ روپا۔" پھر اُس نے روپا کی ماں سے کہا: "ماں تم بالکل چنتا نہ کرو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ہم شام تک لوٹ آئیں گے۔"

کسی نے تھو سے یہ نہ پوچھا کہ وہ روپا کو لے کر کدھر جا رہا ہے۔ مادھو کاکا کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ تھو اور روپا دونوں چبوترے پر سے اتر کر موری کے اُس پار جا چکے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی مونچھ کے سفید بال نوچنے میں مصروف ہوگیا اور چودھری، کبڑے تنکے کو سیدھا کرنے لگا۔

بھٹے کے مالک لالہ گنیش داس کا لڑکا ستیش، جسے بھٹے کے مزدور چھوٹے لالہ جی کہا کرتے تھے، اپنے کمرے میں اکیلا چائے پی رہا تھا۔ پاس ہی تپائی پر ایک کھلی ہوئی کتاب رکھی تھی جسے غالباً وہ پڑھ رہا تھا۔ کتاب کی جلد کی طرح اُس کا چہرہ بھی جذبات سے خالی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنے چہرے پر غلاف چڑھا رکھا ہے۔ وہ ہر روز اپنے اندر ایک نیا ستیش پاتا تھا۔ وہ جاڑے اور گرمیوں کے درمیانی موسم کی طرح متغیر تھا۔ وہ گرم اور سرد لہروں کا ایک مجموعہ تھا۔ دوسرے دماغ سے سوچتے تھے لیکن وہ ہاتھوں اور پیروں سے سوچتا تھا۔ وہ اپنی عمر کی اُن منزلوں کو طے کر رہا تھا جہاں ہر شے کھیل نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی

زندگی کو گیند کی مانند اچھال رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اُچھل کود ہی زندگی کا اصل مقصد ہے۔ اُس کو مسلنے میں بہت زیادہ مزہ آتا تھا۔ ہر شے کو وہ مسل کر دیکھتا تھا۔

عورتوں کے متعلق اُس کا نظریہ یہ تھا کہ مرد خواہ کتنا ہی بوڑھا ہو جائے مگر اُس کو عورت جوان ملنی چاہیے۔ عورت میں جوانی کو وہ اتنا ہی ضروری خیال کرتا تھا جتنا اپنے ٹینس کھیلنے والے ریکٹ میں بُنے ہوئے جال کے اندر تناؤ کو۔ وہ اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا: ''زندگی کے ساز کا ہر تار، ہر وقت تنا ہونا چاہیے[۱۷] تاکہ ذرا سی جنبش پر بھی وہ لرزنا شروع کر دے۔''

یہ لرزش، یہ کپکپاہٹ، جس سے ستیش کو اس قدر پیار تھا دراصل اُس کے گندے خون کے کھولاؤ کا نتیجہ تھی۔ جنسی خواہشات اُس کے اندر اس قدر زیادہ ہوگئی تھیں کہ جوان حیوانوں کو دیکھ کر بھی اسے لذت محسوس ہوتی تھی۔ وہ جب اپنی گھوڑی کے جوان بچے کے کپکپاتے ہوئے بھورے بدن کو دیکھتا تھا تو اُسے ناقابلِ بیان مسرت حاصل ہوتی تھی۔ اس کو دیکھ کر کئی بار اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ اپنا بدن اُس کے تروتازہ بدن کے ساتھ گھسے۔

ستیش چائے پی رہا تھا اور دل ہی دل میں چائے دانی کی تعریف کر رہا تھا جو بے داغ سفید چینی کی بنی ہوئی تھی۔ ستیش کو داغ پسند نہیں تھے۔ وہ ہر شے میں ہمواری پسند کرتا تھا۔ صاف بدن عورتوں کو دیکھ کر وہ اکثر کہا کرتا تھا: ''میری نگاہیں اُس عورت پر کئی گھنٹے تیرتی رہیں...... وہ کس قدر ہموار تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شفاف پانی کی چھوٹی سی جھیل[۱۸] ہے۔''

یہ کمرہ جس میں اس وقت ستیش بیٹھا تھا، خاص طور پر اس کے لیے بنوایا گیا تھا۔ کمرے کے سامنے ٹینس کورٹ تھا۔ یہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہر روز شام کو ٹینس کھیلتا تھا۔ آج اُس نے اپنے دوستوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ ٹینس کھیلنے نہیں آئے گا کیونکہ اُسے آج ایک اور دلچسپ کھیل کھیلنا تھا۔ بھنگی کی نوجوان لڑکی[۱۹] جس کے متعلق اُس نے ایک روز اپنے دوست سے یہ کہا تھا: ''تم اُسے دیکھو...... سچ کہتا ہوں تمہاری نگاہیں اس کے چہرے پر سے پھسل پھسل جائیں گی۔ میری نگاہیں اس کو دیکھنے سے پہلے، اُس کے کھردرے بالوں کو تھام لیتی ہیں تاکہ پھسل نہ جائیں'' آج ایک مدت کے بعد ٹینس کورٹ میں اُس سے خفیہ ملاقات کرنے کے لیے آرہی تھی۔

وہ چائے پی رہا تھا اور اُس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چائے میں اُس جوان لڑکی کے سانولے رنگ کا عکس پڑ رہا ہے۔

اُس کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ باہر سوکھے پتے کھڑکے تو ستیش نے پیالی میں سے چائے کا آخری گھونٹ پیا اور اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا......

ایک لمبا سا، سایہ ٹینس کورٹ کے جھاڑو دیے ہوئے سینے پر متحرک ہوا اور لڑکی کی بجائے نتھو نمودار ہوا۔

ستیش نے غور سے اُس کی طرف دیکھا" کہ آنے والا بھٹے کا ایک مزدور ہے۔ نتھو اپنے بالوں کا ایک گچھا انگلیوں سے مروڑ رہا تھا اور ٹینس کورٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ستیش کی کرسی برآمدے میں بچھی تھی۔ پاس پہنچ کر نتھو کھڑا ہو گیا اور ستیش کی طرف یوں دیکھنے لگا گویا چھوٹے لالہ جی کو اُس کی آمد کی غرض و غایت اچھی طرح معلوم ہے۔

ستیش نے پوچھا: ''کیا ہے؟''

نتھو خاموشی سے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا: ''چھوٹے لالہ جی! میں اُسے لے کر آیا ہوں۔ اب آپ اُسے اپنے پاس رکھ لیجیے، گاؤں والے اُسے بہت تنگ کر رہے ہیں۔''

ستیش حیران ہو گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ نتھو کیا کہہ رہا ہے۔ اس نے پوچھا: ''کسے؟ . کیسے تنگ کر رہے ہیں۔''

نتھو نے جواب دیا: ''آپ... آپ... روپا کو... آپ کی پتنی کو۔''

''میری پتنی؟'' ستیش چکرا گیا: ''میری پتنی ...... تیرا دماغ تو نہیں بہک گیا ...... یہ کیا بک رہا ہے؟'' ...... یہ کہتے ہی اس کے اندر ...... بہت اندر، روپا کا خیال پیدا ہوا۔ اور اُسے یاد آیا کہ پچھلے ساون میں وہ ایک موٹی موٹی آنکھوں اور گدرائے ہوئے جسم والی ایک لڑکی سے کچھ دنوں کھیلا تھا۔ وہ دودھ لے کر شہر میں جایا کرتی تھی۔ ایک بار اس نے دودھ کی بوندیں اس کے اُبھرتے ہوئے سینے پر ٹپکتی دیکھی تھیں اور ...... ہاں ہاں، یہ روپا وہی لڑکی تھی۔ جس کے بارے میں اس نے ایک بار یہ خیال کیا تھا کہ وہ دودھ سے زیادہ ملائم ہے۔ اُس کو حیرت بھی ہوئی تھی کہ یہ اینٹیں بنانے والے ایسی نرم و نازک لڑکیاں کیسے پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ بھنگی کی لڑکی کو بھول سکتا تھا، سوشیلا کو فراموش کر سکتا تھا جو ہر روز اُس کے ساتھ ٹینس کھیلتی تھی، وہ ہسپتال کی نرس کو بھول سکتا تھا جس کے سفید کپڑوں کا وہ بہت معترف تھا، وہ اُس... لیکن وہ روپا کو نہیں بھول سکتا تھا...... اسے اچھی طرح یاد تھا کہ دوسری یا تیسری ملاقات پر جب کہ روپا نے اپنا آپ اس کے حوالے کر دیا تھا تو اس کی ایک بات پر اسے بہت ہنسی آئی تھی۔ روپا نے اُس سے کہا تھا: ''چھوٹے لالہ جی! کل سندری چمارن کہہ رہی تھی: جلدی جلدی بیاہ کر لے ری۔ بڑا مزا آتا ہے ...... اُسے کیا پتہ کہ میں بیاہ کر بھی

چکی ہوں ...... مگر روپا تھی کہاں؟ ستیش کی حیوانی حس اُس کا نام سنتے ہی بیدار ہو چکی تھی۔ گو ستیش کا دماغ معاملے کی نزاکت کو سمجھ گیا تھا مگر اُس کا جسم صرف اپنی دلچسپی کی طرف متوجہ تھا۔

ستیش نے پوچھا: ''کہاں ہے روپا؟''

نتھو اٹھ کھڑا ہوا۔ ''باہر کھڑی ہے...... میں ابھی اُسے لاتا ہوں۔''

ستیش نے فوراً رعب دار لہجے میں کہا: ''خبردار جو اُسے تو یہاں لایا...... جا بھاگ جا یہاں سے۔''

''پر... پر... چھوٹے لالہ جی وہ... وہ آپ کی پتنی ہو چکی ہے... وہ... بچّے کی ماں بننے والی ہے اور بچّہ آپ ہی کا تو ہوگا... آپ ہی کا تو ہوگا۔'' نتھو نے تتلاتے [؟ ہکلاتے] ہوئے کہا۔

تو روپا حاملہ ہو چکی تھی ...... ستیش کو قدرت کی یہ ستم کاری سخت ناپسند تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ عورت اور مرد کے تعلقات کے ساتھ ساتھ یہ [؟ کے ساتھ یہ] حمل کا سلسلہ کیوں جوڑ دیا ہے۔ مرد جب کسی عورت کی خاص خوبی کا معترف ہوتا ہے تو اس کی سزا بچّے کی شکل میں کیوں طرفین کو بھگتنا پڑتی ہے .. .. روپا، بچّے کے بغیر کتنی اچھی تھی۔ اور وہ خود اس بچّے کے بغیر کتنے اچھے طریقے پر، روپا کے ساتھ تعلقات قائم رکھ سکتا تھا۔ اس سلسلۂ تولید کی وجہ سے کئی بار اُس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ عورت ایک بے کار شے ہے۔ یعنی اس کو ہاتھ لگاؤ اور بچّہ پیدا ہو جاتا ہے، یہ بھی کوئی بات ہے۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا [؟ نہیں آ رہا تھا] کہ وہ اُس بچّے کا کیا کرے جو پیدا'' ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر غور کر کے اس نے نتھو کو اپنے پاس بٹھایا اور بڑے آرام سے کہا:

''تم روپا کے کیا لگتے'' ہو...... خیر چھوڑو اس قصّے کو...... دیکھو، یہ بچّے وچّے کی بات مجھے پسند نہیں۔ مفت میں ہم دونوں بدنام ہو جائیں گے۔ تم ایسا کرو، روپا کو یہاں چھوڑ جاؤ...... میں اسے آج ہی کسی ایسی جگہ بھجوا دوں گا جہاں یہ بچّہ ضائع کر دیا جائے. ... اور روپا کو میں کچھ روپے دے دوں گا۔ وہ خوش ہو جائے گی...... تمہارا انعام بھی تمہیں مل جائے گا...... ٹھہرو۔''

یہ کہہ کر ستیش نے اپنی جیب سے بٹوا نکالا اور دس روپے کا نوٹ نتھو کے ہاتھ میں دے کر کہا: ''یہ رہا تمہارا انعام...... جاؤ عیش کرو۔''

نتھو چپکے سے اٹھا۔ دس روپے کا نوٹ اُس نے اچھی طرح مٹھی میں دبا لیا اور وہاں سے چل دیا۔ ستیش نے اطمینان کا سانس لیا کہ چلو چھٹی ہوئی۔'' اب وہ بھنگی کی لڑکی کی بابت سوچنے لگا کہ اگر اُسے بھی ... مگر یہ کیا، نتھو روپا کے ساتھ واپس آ رہا تھا۔

روپا کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور وہ یوں چل رہی تھی جیسے اُسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ ستیش نے سوچا: یہ بچہ پیدا کرنا بھی ایک اچھی خاصی مصیبت معلوم ہوتی ہے۔

نتھو اور روپا دونوں برآمدے کی سیڑھیوں کے پاس کھڑے ہوگئے۔ ستیش نے روپا کی طرف دیکھے بغیر کہا: ''دیکھو روپا، میں نے... اس کو سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ تم فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا...... سمجھیں ...... کیوں بھئی تم نے سب کچھ بتا دیا[۲۴] نا؟''

نتھو نے دس روپے کا نوٹ خاموشی سے ستیش کی طرف بڑھایا اور کہا: ''چھوٹے لالہ جی! کاغذ کے اس ٹکڑے سے آپ مجھے خریدنا چاہتے ہیں۔ میں تو ایک بہت بڑا سودا کرنے آیا تھا۔''

ستیش نے سمجھا کہ نتھو شاید دس روپے سے زیادہ مانگتا ہے: ''کتنے چاہئیں[۲۵] تجھے...... میرے پاس اس وقت پچاس ہیں، لیتا ہوں تو لے جاؤ۔''

نتھو نے روپا کی طرف دیکھا۔ روپا کی آنکھوں سے آنسو نکل کر سیمنٹ سے لپی ہوئی سیڑھیوں پر ٹپک رہے تھے۔ اُس کے دل پر یہ قطرے پگھلے ہوئے سیسے کی طرح گر رہے تھے۔ ستیش کی طرف اس نے مڑ کر کہا: ''چھوٹے لالہ جی، یہ آپ کی پتنی ہے۔ آپ اس کے بچے کے باپ ہیں...... جیسے بڑے لالہ جی آپ کے پتا ہیں...... روپا کے لیے اور کوئی جگہ نہیں ہے، وہ [؟ یہ] آپ کے پاس رہے گی اور آپ اسے پتنی بنا کر رکھیں گے...... سب گاؤں والے اسے دھتکار رہے ہیں، کس لیے...... اس لیے کہ وہ [؟ یہ] آپ کا بچہ اپنے پیٹ میں لیے لیے پھرتی ہے...... آپ کو تھامنا پڑے گا اس لڑکی کا ہاتھ، جس نے آپ کو اپنا سب کچھ دے دیا..... آپ کا دل پتھر کا نہیں ہے چھوٹے لالہ جی! اور اس چھوکری کا دل بھی پتھر نہیں ہے...... آپ نے اس کو سہارا نہ دیا تو اور کون دے گا۔ یہ آتی نہیں تھی۔ رو رو کے اپنی جان ہلکان کر رہی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا اور کہا: پگلی تو کیوں روتی ہے تیرا پتی جیتا ہے۔ چل میں تجھے اُس کے پاس لے چلوں گا''[۲۶]

ستیش کو پتی پتنی کا مطلب ہی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ''دیکھو بھائی! زیادہ بکواس نہ کرو، تم یوں ڈرا دھمکا کر مجھ سے زیادہ روپے وصول نہیں کر سکتے۔ میں ایک سو روپے دینے پر راضی ہوں مگر شرط یہ ہے کہ بچہ ضائع کر دیا جائے اور تم جو[۲۷] مجھ سے یہ کہتے ہو کہ میں اسے اپنے گھر میں بسا لوں تو یہ ناممکن ہے...... میں اس کا پتی خواب میں بھی نہیں بنا اور نہ یہ میری کبھی پتنی بنی ہے...... سمجھے؟ سو روپیہ لینا ہو تو کل آ کے یہاں سے لے جانا، اب یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ۔''

نتھو بھنا گیا۔

''اور ۔ ۔ ۔ اور ...... یہ بچہ کیا آسمان سے آ گیا ہے؟ ۔ ۔ ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھوت پریتوں نے بھر دیے ہیں ۔ ۔ ۔ میرا دل ... میرا دل کون مسل رہا ہے .... یہ روپے ... یہ سو روپے کیا آپ خیرات کے طور پر دے رہے ہیں ...... کچھ ہوا ہے تو یہ سب کچھ ہو رہا ہے ...... کوئی بات ہے تو یہ ہلچل مچ رہی ہے ۔ ۔ ۔ آپ اس کے بچے کے باپ ہیں تو کیا اس کے پتی نہیں؟ ۔ ۔ میری عقل کو کچھ ہو گیا ہے یا آپ کی سمجھ کو ؟''

ستیش یہ تقریر برداشت نہ کر سکا: ''الو کے پٹھے! تو جاتا ہے کہ نہیں یہاں سے، کھڑا اپنی منطق چھانٹ رہا ہے، جا جو کچھ کرنا ہے کر لے دیکھوں تو میرا کیا بگاڑ لے گا۔''

نتھو نے ہولے سے کہا: ''میں تو سنوارنے آیا تھا چھوٹے لالہ جی ...... آپ ناحق کیوں بگڑ رہے ہیں۔ آپ کیوں نہیں اِس کا ہاتھ تھام لیتے۔ یہ آپ کی پتنی ہے۔''

''پتنی کے بچے، اب تو اپنی بکواس بند کرے گا یا نہیں ۔ ۔ ۔ بچہ بچہ، کیا بک رہا ہے ...... جا، لے جا، اپنی اِس کچھ لگتی کو،[۲۸] ورنہ یاد رکھ، کھال اُدھیڑ دوں گا۔''

نتھو کے سب پٹھے اکڑ گئے۔ ''بھگوان کی قسم! مجھ میں اتنی شکتی ہے کہ یوں ہاتھوں میں دبا کر تیرا سارا لہو نچوڑ دوں .... میری کھال تیرے ان نازک ہاتھوں سے نہیں اُدھڑے گی ...... میں تیری بوٹی بوٹی نوچ سکتا ہوں ...... پر میں کچھ نہیں کر سکتا ...... میں تجھے ہاتھ تک نہیں لگانا چاہتا ۔ ۔ تو روپا کے بچے کا باپ ہے، تو روپا کا پتی ہے، اگر میں نے تجھ پر ہاتھ اٹھایا تو مجھے ڈر ہے کہ روپا کے دل کو دھکا لگے گا ..... تو عورتوں سے ملتا جلتا ہے پر تو عورت کا دل نہیں رکھتا''۔[۲۹]

ستیش آپے سے باہر ہو گیا اور چیخنے لگا: ''تیری اور تیری روپا کی ایسی تیسی ۔ ... نکل یہاں سے باہر۔''

نتھو بڑھ کر روپا کے آگے کھڑا ہو گیا اور ستیش کے پاس .... بالکل پاس، جا کر کہنے لگا: ''چھوٹے لالہ جی مجھے معاف کر دیجیے،[۳۰] میں نے ایسی باتیں کہہ دی ہیں جو مجھے نہیں کہنا چاہیے تھیں ۔ ۔ مجھے معاف کر دیجیے مگر روپا کا ہاتھ تھام لیجیے ۔ ۔ آپ اس کے پتی ہیں، اس کے بھاگ میں آپ کے بنا اور کوئی مرد نہیں لکھا گیا۔ یہ آپ کی ہے ۔ ۔ ۔ اب آپ اسے اپنا بنا لیں ۔ .... یہ دیکھیے میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔''

''کیسے واہیات آدمی سے واسطہ پڑا ہے۔'' ستیش نے کمرے کے اندر جاتے ہوئے کہا: ''کہتا ہوں میں روپا ووپا کو نہیں جانتا مگر یہ خواہ مخواہ اِسے میرے پلے باندھ رہا ہے .... جاؤ جاؤ ہوش کی دوا کرو۔''

کمرے کا صرف ایک دروازہ کھلا تھا جس میں سے ستیش اندر داخل ہوا تھا۔ اندر داخل ہو کر اُس

نے یہ دروازہ بند کر دیا [وہ دروازہ بند کر لیا؟]۔ تھو نے دروازے کی لکڑی کی طرف دیکھا تو اُسے ستیش کے چہرے اور اُس میں کوئی فرق نظر نہ آیا۔

تھو نے اپنے سر کے بال مروڑنے شروع کیے اور جب پلٹ کر اس نے روپا سے کچھ کہنا چاہا تو وہ[31] جا چکی تھی۔۔۔ وہ اس کا پیچھا کرنے کے لیے بھاگا مگر وہ جا چکی تھی۔ باہر نکل کر اُس نے روپا کو بہت دُور درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے دیکھا۔ وہ اُس کے پیچھے یہ کہتا ہوا بھاگا: ''روپا...... روپا، ٹھہر جا...... میں ایک بار پھر اُسے سمجھاؤں گا ... وہی تیرا پتی ہے... .. اُس کا گھر ہی تیری اصل جگہ ہے۔''

وہ بہت دیر تک بھاگتا رہا مگر روپا بہت دُور نکل گئی تھی...... اُس روز سے آج تک[32] تھو، روپا کی تلاش میں سرگرداں ہے مگر وہ اسے نہیں ملتی۔ وہ لوگوں سے کہتا ہے: ''میں روپا کے پتی کو جانتا ہوں...... تم اُسے ڈھونڈ کر لاؤ۔ میں اُسے اُس کے پتی سے ملا دوں گا۔''

لوگ یہ سن کر ہنس دیتے ہیں .... بچے جب بھی تھو کو دیکھتے ہیں تو اُس سے پوچھتے ہیں: ''اُس کا پتی کون ہے تھو بھیا؟'' تو تھو اُن کو مارنے کے لیے دوڑتا ہے۔

حواشی

(اِن حواشی میں ص سے مراد: منٹو کے افسانے طبع اوّل (۱۹۴۰ء) کا صفحہ ہے۔ دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ حالت بالکل وہی ہے جو توے کی ہوتی ہے — ص:۱۲۷
۲۔ اور اپنے جھونپڑے — ص:۱۲۸
۳۔ اُن کی بیٹھک سے... اُن میں سے ہر ایک کے چہرے — ایضاً
۴۔ فوراً ہی نہیں — ایضاً
۵۔ مگر وہ زمین پر لکیریں بناتا رہا اور کچھ نہ بولا۔ — ص:۱۲۹
۶۔ وہ بھی کسی مرغی — ایضاً
۷۔ روپا کے بارے میں — ایضاً
۸۔ قابل نہ رہی... کون سی بات ہے... کل کی بات ہے... گاؤں کے سب چھوکرے چھوکریاں... کوئی شرارت کر سکتی — ایضاً
۹۔ پرس رام اور گنگو کی دو اُپلوں پر بیچ بیچ ہوتے ہوتے رہ گئی تھی... لفظ ''مکمل''

اولین متن (ص:۱۳۰) میں ہے، نظرثانی شدہ متن (ص:۱۸۷) میں موجود نہیں۔ ص ۱۳۰
۱۰۔ ذرا کان لاؤ اِدھر ایضاً
۱۱۔ تھوڑے ہی روز میں... ماں بنتا کیا کوئی باپ... اِس میں کسی کا کیا... اُڑ کر تو
آ نہیں گیا... آپ ہی آپ فیصلہ... فیصلہ ہو رہا تھا... پوچھتے ہی نہ تھے ص ۱۳۱
۱۲۔ ہر چیز سپنا ہوتی ہے۔ نظرثانی شدہ متن (ص ۱۹۳) میں ''ہوتی تھی'' شائع ہوا ہے۔
مدوّن کے نزدیک اولین متن میں اختیار کیا گیا صیغہ یعنی ''ہوتی ہے'' راجح ہے۔... اور
اُس کو توڑنے والی... قصور ہی نہیں تھا ص ۱۳۳
۱۳۔ یا زہر کھا کے ص:۱۳۴
۱۴۔ سیندور ڈالنا... پیر زمین پر نہیں گرے ص:۱۳۵
۱۵۔ رنگ بالکل زرد ایضاً
۱۶۔ زمین پر طوطے ایضاً
۱۷۔ تنا ہوا ہونا چاہیے ص ۱۳۶
۱۸۔ جو کہ بے داغ سفید... ہموارگی پسند کرتا... پانی کا چھوٹا سا تالاب ص ۱۳۷
۱۹۔ کیونکہ ایک اور دلچسپ کھیل اُسے آج کھیلنا تھا۔ بھنگی کی جوان لڑکی ایضاً
۲۰۔ لفظ ''دیکھا'' کے بعد کا حذف شدہ فقرہ: اور پہچان لیا ایضاً
۲۱۔ کیوں جوڑ دیا گیا... کسی عورت کی کسی خاص خوبی... تولید کی وجہ ہی
سے... وہ بچے کا کیا کرے جو کہ پیدا ص ۱۳۹
۲۲۔ کیا ہوتے ایضاً
۲۳۔ چلو یہ بھی کام ہو گیا ایضاً
۲۴۔ اِسے سب کچھ بتا دیا ایضاً
۲۵۔ کتنے روپے چاہییں ص ۱۴۰
۲۶۔ سیڑھیوں پر گر رہے تھے... جس طرح کہ بڑے لالہ جی... چھوکری دل بھی پتھر کا نہیں ہے...
پر میں نے اِسے سمجھایا بجھایا... اُس کے پاس لے چلوں ایضاً
۲۷۔ اور جو تم ایضاً
۲۸۔ اِس ماسی کو ص ۱۴۱
۲۹۔ دل کو دھکا پہنچے گا... دل نہیں جانتا ایضاً
۳۰۔ معاف کر دو ایضاً
۳۱۔ تو دیکھا کہ وہ ایضاً
۳۲۔ سے لے کر آج تک ص ۱۴۲

موسم کی شرارت

شام کو سیر کے لیے نکلا اور ٹہلتا ٹہلتا اُس سڑک پر ہولیا جو کشمیر کی طرف جاتی ہے۔

سڑک کے چاروں طرف چیڑ اور دیودار کے درخت، اونچی اونچی پہاڑیوں کے دامن پر کالے فیتے کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی ہوا کے جھونکے اُس فیتے میں ایک کپکپاہٹ سی پیدا کر دیتے۔ میرے دائیں ہاتھ کو ایک اُونچا ٹیلا تھا جس کے ڈھلوانوں میں گندم کے ہرے پودے، نہایت ہی مدھم سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے۔ یہ سرسراہٹ کانوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ آنکھیں بند کرلو تو یوں معلوم ہوتا کہ تصور کے گدگدے قالینوں پر کئی کنواریاں، ریشمی ساڑیاں[1] پہنے چل پھر رہی ہیں۔ اُن ڈھلوانوں کے بہت اوپر، چیڑ کے اونچے اونچے درختوں کا ایک ہجوم تھا۔ بائیں طرف سڑک کے بہت نیچے، ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کو جھاڑیوں نے گھیر رکھا تھا۔ اُس سے کچھ کچھ فاصلے پر پست قد جھونپڑے تھے، جیسے کسی حسین چہرے پر تل۔

ہوا گیلی اور پہاڑی گھاس کی بھینی بھینی باس سے لدی ہوئی تھی۔ مجھے اس سیر میں ایک ناقابلِ بیان لذت محسوس ہورہی تھی۔

سامنے ٹیلے پر دو بکریاں، بڑے پیار سے ایک دوسری کو اپنے ننھے ننھے سینگوں سے ریل رہی تھیں۔ اُن سے کچھ فاصلے پر کُتّے کا ایک پلّا جو کہ جسامت میں میرے بوٹ کے برابر تھا، ایک بھاری بھرکم بھینس کی ٹانگ سے لپٹ لپٹ کر اُسے ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ شاید بھونکتا بھی تھا کیونکہ اُس کا منہ بار بار کھلتا تھا۔ مگر اُس کی آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچتی تھی۔

میں یہ تماشہ دیکھنے کے لیے ٹھہر گیا۔ کتّے کا پلّا دیر تک بھینس کی ٹانگوں پر اپنے پنجے مارتا رہا مگر اُس کی ان دھمکیوں کا اثر نہ ہوا۔ جواب میں بھینس نے دو تین مرتبہ اپنی دم ہلا دی اور بس! ...... لیکن ایکا ایکی جب کہ پلّا[2] حملے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا، بھینس نے زور سے اپنی دم ہلائی۔ کسی سیاہ سی چیز کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ اس انداز سے اچھلا کہ مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔

میں ان کو چھوڑ کر آگے بڑھا۔

آسمان پر بادل کے سفید ٹکڑے، پھیلے ہوئے بادبان معلوم ہوتے تھے جن کو ہوا اِدھر سے اُدھر دھکیل

رہی تھی۔ سامنے پہاڑ کی چوٹی پر، ایک قدر آور درخت[۴] سنتری کی طرح اکڑا ہوا تھا۔ اُس کے پیچھے بادل کا ایک ٹکڑا جھوم رہا تھا۔ بادل، یہ دراز قد درخت اور پہاڑی ...... تینوں مل کر، بہت بڑے جہاز کا منظر پیش کر رہے تھے۔

میں نیچر کی اس تصویر کشی کو بے خود ہو کر دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً لاری کے ہارن نے مجھے چونکا دیا۔ خیالوں کی دنیا سے اُتر کر میں آوازوں کی دنیا میں آ گیا۔ من کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ مساموں کے سارے کان کھل گئے۔ میں فوراً سڑک کے ایک طرف ہٹ گیا۔

لاری، پر کار کی طرح، بڑی تیزی سے موڑ کے نصف دائرے پر گھومی اور ہانپتی ہوئی میرے پاس سے گزر گئی۔

ایک اور لاری گزرنے پر موڑ کے عقب میں[۴] پانچ چھ گائیں نمودار ہوئیں جو سر لٹکائے ہولے ہولے چل رہی تھیں۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ جب یہ میرے آگے سے گزر گئیں تو میں نے قدم اٹھایا اور موڑ کی جانب بڑھا۔

چند گزوں کا فاصلہ طے کرنے پر جب میں سڑک کے بائیں ہاتھ والے ٹیلے کے ایک بہت بڑے پتھر کے آگے نکل گیا جو موڑ پر سنگین پردے کا کام دے کر، سڑک کے دوسرے حصّے کو بالکل اُوجھل کیے ہوئے تھا تو دفعتاً میری نظریں ایک خود رو پودے سے دوچار ہوئیں۔

وہ جوان تھی، اُس گائے کی طرح جوان جس کے پٹھے جوانی کے جوش سے پھڑک رہے تھے، اور جو اُس کے پاس سے اپنے اندر ہزاروں کپکپاہٹیں لیے گزر رہی تھی ...... میں ٹھہر گیا۔

وہ ایک ننھے سے بچھڑے کو ہانک رہی تھی۔ دو تین قدم چل کر بچھڑا ٹھہر گیا اور اپنی جگہ پر ایسا جما کہ ہلنے کا نام نہ لیا۔ لڑکی نے بہتیرا زور لگایا، لاکھ جتن کیے، وہ ایک قدم آگے نہ بڑھا اور کان سمیٹ کر ایسا خاموش ہوا گویا وہ کسی کی آواز ہی نہیں سنتا۔ یہ تیور دیکھ کر لڑکی نے اپنی چھڑی سے کام لینا چاہا مگر چیڑ کی پتلی سی ٹہنی کارآمد ثابت نہ ہوئی۔ تھک ہار کر اُس نے بڑی مایوسی اور انتہائی غصے کی ملی جلی حالت میں اپنے دونوں پاؤں زمین پر زور سے مارے اور کاندھوں کو جنبش دے کر اس انداز سے کھڑی ہوگئی گویا اُس حیوان سے کہنا[۵] چاہتی ہے: لو اب ہم بھی یہاں سے ایک انچ نہ ہلیں گے۔

میں ابھی لڑکی کی اِس پیاری حرکت کو، مزا لینے کی خاطر اپنے ذہن میں دُہرانے ہی والا تھا کہ دفعتاً بچھڑا خود بخود اٹھ بھاگا۔ وہ اس تیزی کے ساتھ دوڑ رہا تھا کہ اُس کی کمزور ٹانگیں، میز کے ڈھیلے پایوں کی

طرح لڑکھڑا رہی تھیں۔

لڑکی، بچھڑے کی اس شرارت پر بہت متحیر اور خشم ناک ہوئی۔ نہ جانے میں کیوں خوش ہوا کہ اُسی اثنا میں اُس نے میری طرف دیکھا اور میں نے اُس کی طرف۔ ہم دونوں بیک وقت ہنس پڑے۔ فضا پر تاروں کا چھڑکاؤ سا ہو گیا۔

یہ سب کچھ، ایک لمحے کے اندر اندر ہوا۔ اس نے پھر میری طرف دیکھا مگر اِس دفعہ سوال کرنے والی[۶] لاج بھری آنکھوں سے ...... شاید اُس کو اب اس بات کا احساس ہوا تھا کہ اس کی مسکراہٹ کسی غیر مرد کے تبسم سے جا ٹکرائی ہے۔

وہ گہرے سبز رنگ کا دوپٹا اوڑھے ہوئے تھی[۷] معلوم ہوتا تھا کہ آس پاس کی ہریاول نے اپنی سبزی اُسی سے مستعار لی ہے۔ اُس کی شلوار بھی اُسی رنگ کی تھی۔ اگر وہ کُرتا بھی اُسی رنگ کا پہنے ہوتی تو دُور سے دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ سڑک کے درمیان ایک چھوٹا سا درخت اُگ رہا ہے۔

ہوا کے ملائم جھونکے اُس کے سبز دوپٹے میں بڑی پیاری لہریں پیدا کر رہے تھے۔ خود کو بے کار کھڑی دیکھ کر اور مجھ کو اپنی طرف گھورتے پا کر، وہ بے چین سی ہو گئی اور ادھر اُدھر یوں ہی دیکھا کی، جیسے کسی کا[۸] انتظار کر رہی ہے۔ پھر اپنے دوپٹے کو سنوار کر اُس نے اُس طرف کا رخ کیا جدھر گائیں آہستہ آہستہ جا رہی تھیں۔

میں اُس سے کچھ فاصلے پر بائیں ہاتھ [اُن؟] پتھروں کے پاس کھڑا تھا جو سڑک کے کنارے کنارے دیوار کی شکل میں چنے ہوئے تھے۔

جب وہ میرے قریب آئی تو غیر ارادی طور پر اُس نے میری طرف نگاہیں اٹھائیں لیکن فوراً سر کو جھٹک کر نیچے جھکا لیں۔ کولھے مٹکاتی اور چھڑی ہلاتی وہ میرے پاس سے یوں گزری جیسے کبھی کبھی، میرا اپنا خیال، میرے ذہن سے اپنا کاندھا رگڑ کر گزر جایا کرتا ہے۔

اُس کے سلیپر جو غالباً اس کے پاؤں میں کھُلے تھے، سڑک پر گھسٹنے سے شور پیدا کر رہے تھے۔ تھوڑی دُور جا کر اس نے اپنے قدم تیز کیے اور پھر دوڑنا شروع کر دیا۔ بیس پچیس گز کے فاصلے پر وہ پتھروں سے چُنی ہوئی دیوار پر پھرتی سے چڑھی اور مجھے ایک نظر دیکھ کر دوسری طرف کود گئی۔ پھر دوڑ کر ایک[۹] جھونپڑے کی چھت پر چڑھ کر، منڈیر پر بیٹھ گئی۔

اس کی یہ حرکات ...... یعنی ...... میری طرف اُس کا تین بار مڑ مڑ کر دیکھنا ..... کیا اس کی مسکراہٹ کے ساتھ میرے تبسم کے کچھ ذرّے تو چمٹ کر نہیں رہ گئے تھے؟......

اِس خیال نے میری نبض کی دھڑکن تیز کردی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے تھکاوٹ سی محسوس ہونے لگی۔ میرے پیچھے جھاڑیوں میں جنگل کے پنچھی گیت برسا رہے تھے ...... ہوا میں گھلی ہوئی موسیقی مجھے کس قدر پیاری معلوم ہوئی۔ نہ جانے میں کتنے گھونٹ اُس راگ ملی ہوئی ہوا کے، غٹاغٹ پی گیا۔[۱]

جھونپڑے سے کچھ دُور جھاڑیوں کے پاس لڑکی کی گائیں گھاس چر رہی تھیں۔ اُن سے پرے پتھریلی پگڈنڈی پر ایک کشمیری مزدور گھاس کا گٹھا کمر پر لادے اوپر چڑھ رہا تھا۔ دور...... بہت دُور، ایک ٹیلے سے دھواں بل کھاتا ہوا آسمان کی نیلاہٹ میں گھل مل رہا تھا۔ میرے گرد و پیش پہاڑیوں کی بلندیوں پر، ہرے ہرے چیڑوں اور سانولے پتھروں کے چوڑے چکلے سینوں پر: ڈوبتے سورج کی زرّیں کرنیں، سیاہ اور سنہرے رنگ کے مخلوط سائے بکھیر رہی تھیں۔ کتنا سُندر اور سُہانا سماں تھا۔

میں نے آپ کو عظیم الشان محبت میں گھرا ہُوا پایا۔

وہ جوان تھی۔ اُس کی ناک اس پنسل کی طرح سیدھی اور ستواں تھی جس سے میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، اُس کی آنکھیں ...... میں نے اُس جیسی آنکھیں بہت کم دیکھی ہیں، اس پہاڑی علاقے کی ساری گہرائیاں اُن میں سمٹ کر رہ گئی تھیں، پلکیں گھنی اور لمبی تھیں۔ جب وہ میرے پاس سے گزری تھی تو دھوپ کی ایک لرزاں شعاع اس کی پلکوں میں اُلجھ گئی تھی۔[۱]

اس کا سینہ مضبوط اور کشادہ تھا، اُس میں[۲] جوانی سانس لیتی تھی۔ کاندھے چوڑے، باہیں گول اور گدراہٹ سے بھرپور، کانوں میں چاندی کے لمبے لمبے بُندے تھے، بال دیہاتیوں کی طرح سیدھی مانگ نکال کر گُند ھے [گوندھے؟] ہوئے تھے جس سے اس کے چہرے پر وقار پیدا ہوگیا تھا۔

وہ جھونپڑے کی مٹیالی چھت پر بیٹھی اپنی چھڑی سے منڈیر کوٹ رہی تھی اور میں سڑک پر کھڑا تھا۔

''کس قدر بے وقوف ہوں۔'' دفعتاً میں نے ہوش سنبھالا اور اپنے دل سے کہا: اگر کوئی مجھے اس طرح اُس کو گھورتا ہوا دیکھ لے[۳] تو کیا کہے... اس کے علاوہ یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟

یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ جب میں نے ان الفاظ پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ میں کسی اور ہی خیال میں تھا۔ اس احساس پر مجھے ہنسی آگئی اور یوں ہی ایک بار اُس کو اور دیکھ کر، سیر کے قصد سے آگے بڑھا۔ دو ہی قدم چل کر مجھے خیال آیا کہ یہاں بٹوت میں صرف چند روز قیام کرنا ہے۔ کیوں نہ رخصت ہوتے وقت اس کو سلام کرلوں۔ اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ شاید میرے سلام کا ایک آدھ ذرّہ اُس کے حافظے پر ہمیشہ کے لیے جم جائے۔

میں ٹھہر گیا اور کچھ دیر منتظر رہنے کے بعد، میں نے سچ مچ اُس کو سلام کرنے کے لیے اپنا ہاتھ ماتھے کی طرف بڑھایا مگر فوراً اس احمقانہ حرکت سے باخبر ہو کر ہاتھ کو یوں ہی[۴] ہوا میں ہلا دیا اور سیٹی بجاتے ہوئے قدم تیز کر دیے۔

مئی کا گرم دن، شام کی خنکی میں آہستہ آہستہ گھل رہا تھا۔[۵]

سامنے پہاڑیوں پر ہلکا سا دھواں چھا گیا تھا، جیسے خوشی کے آنسو آنکھوں کے آگے ایک چادر سی تان دیتے ہیں، اُس دُھندلکے میں چیڑ کے درخت تحتِ شعور میں چھپے ہوئے خیالات معلوم ہوئے، یہ ایک ہی قطار میں پھیلتے چلے گئے تھے۔

میرے پاس ہی ایک جھاڑی پر موٹا سا کوّا اپنے سیاہ اور چمکیلے پر پھیلائے سستا رہا تھا...... ہوا کا ہر جھونکا، میرے جسم کے اُن حصوں کے ساتھ چھو کر جو کپڑوں سے آزاد تھے، ایک ایسی محبت کا پیغام دے رہا تھا جس سے میرا دل اِس سے قبل بالکل ناآشنا تھا۔

میں نے آسمان کی طرف نگاہیں اُٹھائیں، اور مجھے[۶] ایسا محسوس ہوا کہ وہ میری طرف حیرت سے دیکھ کر یہ کہنا چاہتا ہے: سوچتے کیا ہو...... جاؤ محبت کرو!

میں سڑک کے کنارے پتھروں کی دیوار پر بیٹھ گیا اور اُس...... اُس کی طرف ڈرتے ڈرتے دیکھا کہ مبادا کوئی رہ گذر سارا معاملہ تاڑ جائے۔ وہ اُسی طرح سر جھکائے اپنی جگہ پر بیٹھی تھی۔ اُسے کھیل میں کیا لُطف آتا ہے؟...... وہ ابھی تھکی[۷] نہیں؟ کیا اس نے واقعی دو بار میری طرف مڑ کر دیکھا؟ کیا وہ جانتی ہے کہ میں اُس کی محبت میں گرفتار [ہوگیا؟] ہوں؟ آخری سوال کس قدر مضحکہ خیز تھا...... میں جھینپ گیا، لیکن...... لیکن اِس کے باوجود اُس کو دیکھنے سے خود کو باز نہ رکھ سکا۔

ایک مرتبہ جب میں نے اس کو دیکھنے کے لیے اپنی گردن موڑی، تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس کا منہ میری طرف ہے اور وہ مجھے دیکھ رہی ہے...... میں مخمور ہوگیا۔

میرے اور اس کے درمیان، گو فاصلہ کافی تھا مگر میری آنکھیں جن میں میرے دل کی بصارت بھی چلی آئی تھی، محسوس کر رہی تھیں کہ وہ سپنوں کا گھونگھٹ کاڑھے میری طرف دیکھ رہی ہے...... میری طرف ...... میری طرف!

میرے سینے سے بے اختیار آہ نکل گئی...... عجیب بات ہے کہ سُکھ اور چین کا ہاتھ بھی درد بھرے تاروں ہی پر پڑتا ہے...... اس آہ میں کتنی راحت تھی...... کتنا سکون تھا۔ اُس لڑکی نے جو میرے سامنے

جھونپڑے کی چھت پر بیٹھی تھی، میرے شباب کے ہر رنگ کو شوخ کر دیا تھا۔ میرے روئیں روئیں سے محبت پھوٹ رہی تھی۔ شعریت جو میرے سینے کے کسی نا معلوم کونے میں سوئی پڑی تھی، اب بیدار ہو چکی تھی ......

کیا دوشیزگی اور شعریت، توام بہنیں ہیں؟[۱۸]

اگر اُس وقت وہ مجھ سے ہم کلام ہوتی تو میں ایک لفظ تک اپنی زبان سے نہ نکالتا۔ خاموشی میری ترجمان ہوتی ...... میری گونگی زبان، کتنی باتیں اُس تک پہنچا دیتی۔ میں اُس کو اپنی خاموشی میں لپیٹ لیتا ...... وہ ضرور متحیر ہوتی اور اُس حالت میں بڑی پیاری معلوم ہوتی۔[۱۹] اس خیال سے کہ راستے میں یوں بے کار کھڑے رہنا [؟ بیٹھنا] ٹھیک نہیں، میں دیوار پر سے اُٹھا .... میرے سامنے، ٹیلے پر جانے کے لیے ایک پگڈنڈی تھی۔ اُوپر ٹیلے کے کسی پتھر پر بیٹھ کر میں اُس کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ درختوں کی جڑوں اور جھاڑیوں کا سہارا لے کر میں نے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ راستے میں دو تین بار میرا پاؤں پھسلا اور نوکیلے پتھروں پر گرتے گرتے بچا۔

ٹیلے پر جہاں پتھر نہیں تھے، کہیں کہیں زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں آلو بوئے ہوئے تھے۔ اسی قسم کے ایک تختے سے کھیت کو طے کر کے میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور ٹوپی اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ میرے دائیں ہاتھ کو زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا جس میں گندم اُگ رہی[۲۰] تھی۔

چڑھائی کی وجہ سے میرا دم پھول گیا۔ مگر شام کی ٹھنڈی ہوا نے یہ تکان فوراً ہی دُور کر دی اور میں جس کام کے لیے آیا تھا اُس میں مشغول ہو گیا۔

اب وہ جھونپڑے کی چھت پر کھڑی تھی اور خدا معلوم کیسی کیسی انوکھی آوازیں نکال رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ اُن دونوں بکریوں کو سڑک پر چڑھنے سے روک رہی تھی جو گھاس چرتی ہوئی آہستہ آہستہ اُوپر کا رُخ کر رہی تھیں۔

ہوا تیز تھی۔ گندم کے پکے ہوئے خوشے، خُرخُر کرتی ہوئی بلّی[۲۱] کی مونچھوں کی طرح، تھرتھرا رہے تھے۔ جھاڑیوں میں ہوا کی سیٹیاں، شام کی فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔

مٹی کے ڈھیلوں کے ساتھ کھیلتا ہوا، میں اُس کی طرف بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ وہ اب جھونپڑے پر بڑے عجیب انداز سے ٹہل رہی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے اپنے سر کو جنبش دی تو میں سمجھا کہ وہ میری موجودگی سے باخبر[۲۲] ...... مجھے دیکھ رہی ہے ...... میری ہستی کے سارے دروازے کھل گئے۔

جانے کتنی دیر تک میں وہاں بیٹھا رہا . . ایکا ایکی بدلیاں گھر آئیں اور بارش شروع ہو گئی۔ میرے

کپڑے بھیگ رہے تھے لیکن میں وہاں سے کیونکر جاسکتا تھا جب کہ وہ ...... وہیں چھت پر کھڑی تھی۔ اس خیال سے مجھے بڑی مسّرت حاصل ہوئی کہ وہ صرف میری خاطر بارش میں بھیگ رہی ہے۔

یکا یک بارش تیز ہوگئی۔ وہ اُٹھی اور میری طرف دیکھے بغیر ...... ہاں، میری طرف نگاہ اُٹھائے بغیر، چھت پر سے نیچے اُتری اور دوسرے جھونپڑے میں داخل ہوگئی ...... مجھے ایسا محسوس ہوا کہ بارش کی بوندیں میری ہڈیوں تک پہنچ گئی ہیں۔

پانی سے بچاؤ کرنے[۲۲] کے لیے میں نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں مگر پتھر اور جھاڑیاں پناہ کا کام نہیں دے سکتی تھیں۔

ڈاک بنگلے تک پہنچتے پہنچتے میرے کپڑے اور خیالات سب بھیگ گئے ...... جب وہاں سے سیر کو نکلا تھا تو ایک خشک آدمی تھا، راستے میں موسم نے شاعر بنادیا۔ واپس آیا تو بھیگا ہوا آدمی تھا ...... صرف بھیگا ہوا آدمی ...... بارش ساری شاعری بہالے گئی تھی!

حواشی

(اِن حواشی میں ص سے مراد: منٹو کے افسانے طبع اوّل (۱۹۴۰ء)
کا صفحہ ہے۔ دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ کرلو تو یہ معلوم... ریشمی ساڑھی — ص:۱۴۳
۲۔ جب کہ وہ چلا — ص:۱۴۴
۳۔ لفظ "درخت" کے بعد کا منسوخ شدہ فقرہ: بڑے باوقار انداز میں — ایضاً
۴۔ عقب سے — ایضاً
۵۔ سے یہ کہنا — ص:۱۴۵
۶۔ سوال پوچھنے والی — ایضاً
۷۔ اوڑھے تھی — ایضاً
۸۔ جیسے وہ کسی کا — ایضاً
۹۔ سلیپر جو کہ غالباً... دوڑ کر وہ ایک — ص:۱۴۶
۱۰۔ طبع اوّل میں یہ جملہ اِس طور شائع ہوا ہے: نہ جانے کتنے گھونٹ اُس راگ ملی ہوا کے میں غٹا غٹ پی گیا۔ — ایضاً
۱۱۔ شعاع کس طرح اُس کی پلکوں میں اُلجھی تھی۔ — ایضاً

۱۲۔ جس میں — ص:۱۴۶

۱۳۔ میں کس قدر بے وقوف... گھورتا دیکھ لے — ص:۱۴۷

۱۴۔ فوراً ہی اس... ہاتھ کو میں نے یوں ہی — ایضاً

۱۵۔ نظرِ ثانی شدہ متن کے اِس جملے میں ''دن'' کے بعد لفظ ''اور'' زائد تھا (ص:۲۱۳) جو مدوّن نے حذف کیا ہے، اوّلین متن میں جملہ درست ہے۔ — ایضاً

۱۶۔ اُٹھائیں، مجھے — ایضاً

۱۷۔ اُسے اِس کھیل میں... کیا وہ ابھی تک تھکی — ایضاً

۱۸۔ یہ عجیب بات... تاروں پر ہی... کتنی راحت تھی۔۔ کتنی راحت تھی... کونے میں سوئی تھی... ہینیں ہینیں — ص:۱۴۸

۱۹۔ تو ایک لفظ میں... کس قدر پیاری... آئندہ عبارت: ''اِس خیال... گرتے گرتے بچا'' اوّلین طباعت میں جداگانہ پارے کے طور پر شائع ہوئی ہے۔ — ایضاً

۲۰۔ ٹیلے پر کہیں کہیں جہاں پتھر نہیں تھے... گندم اُگی ہوئی — ایضاً

۲۱۔ خُرخُر کرتی بلّی — ص:۱۴۹

۲۲۔ چھت پر بڑے انداز سے... باخبر ہے — ایضاً

۲۳۔ بچاؤ حاصل کرتے — ایضاً

بیگو

''تسلیاں اور دلاسے بے کار ہیں۔ لوہے اور سونے کے یہ مرکّب، میں چھٹانکوں پھانک چکا ہوں۔ کون سی دوا ہے جو میرے حلق سے نہیں اُتاری گئی۔ میں آپ کے اخلاق کا ممنون ہوں، مگر ڈاکٹر صاحب! میری موت یقینی ہے۔ آپ کیسے کہہ رہے ہیں کہ میں دق کا مریض نہیں۔ کیا میں ہر روز خون نہیں تھوکتا؟ آپ یہی کہیں گے کہ یہ میرے گلے اور دانتوں کی خرابی کا نتیجہ ہے، مگر میں سب کچھ جانتا ہوں۔ میرے دونوں پھیپھڑے خانۂ زنبور کی طرح مُشبّک ہو چکے ہیں۔ آپ کے انجکشن مجھے دوبارہ زندگی نہیں بخش سکتے۔ دیکھیے میں اِس وقت آپ سے باتیں کر رہا ہوں مگر سینے پر ایک وزنی انجن دوڑتا ہُوا محسوس کر رہا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک تاریک گڑھے میں اُتر رہا ہوں ...... قبر بھی تو ایک تاریک گڑھا ہے۔ آپ میری طرف اس طرح نہ دیکھیے ڈاکٹر صاحب! مجھے اس چیز کا کامل احساس ہے کہ آپ اپنے ہسپتال میں کسی مریض کا مرنا پسند نہیں کرتے مگر جو چیز اٹل ہے وہ ہو کے رہے گی۔ آپ ایسا کیجیے کہ مجھے یہاں سے رخصت کر دیجیے۔ میری ٹانگوں میں تین چار میل چلنے کی قوت ابھی باقی ہے۔ کسی قریب کے گاؤں میں چلا جاؤں گا اور ...... مگر میں تو رو رہا ہوں۔ نہیں نہیں۔ ڈاکٹر صاحب! یقین کیجیے میں موت سے خائف نہیں، یہ میرے جذبات ہیں جو آنسوؤں کی شکل میں باہر نکل رہے ہیں۔ آہ! آپ کیا جانیں۔ اس مدقوق کے سینے سے کیا کچھ باہر نکلنے کو مچل رہا ہے۔ میں اپنے انجام سے باخبر ہوں، آج سے پانچ برس پہلے بھی میں اِس وحشت ناک انجام سے باخبر تھا، جانتا تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ کچھ عرصے بعد میری زندگی کی ڈوری ختم ہو جائے گی۔ میں نے اُس گیند کو جسے آپ زندگی کے نام سے پکارتے ہیں، خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار کر کاٹا ہے۔ اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اِس کھیل میں لذّت محسوس کر رہا ہوں۔ لذّت.. ... ہاں لذّت .... میں نے اپنی زندگی کی کئی راتیں حُسن فروش عورتوں کے تاریک اڈّوں پر گزاری ہیں۔ شراب کے نشے میں چور، میں نے کس بے دردی سے خود کو اِس حالت پر پہنچایا۔ مجھے یاد ہے۔ اُن ہی اڈّوں کی سیاہ پیشہ عورت ...... کیا نام تھا اُس کا؟ ...... ہاں، گلزار، مجھے اس بُری طرح اپنی جوانی کو کیچڑ میں لت پت کرتے دیکھ کر، مجھ سے ہمدردی کرنے لگ گئی تھی۔ بے وقوف عورت، اُس کو کیا بتاتا کہ میں اس کیچڑ میں کس کا عکس دیکھنے کی

کوشش کر رہا تھا۔ مجھے گلزار اور اُس کی دیگر ہم پیشہ عورتوں سے نفرت تھی اور اب بھی ہے، لیکن کیا آپ مریضوں کو زہر نہیں کھلاتے، اگر اُس سے اچھے نتائج کی اُمید ہو۔ میرے درد کی دوا ہی تاریک زندگی تھی۔ میں نے بڑی کوششوں اور مصیبتوں کے بعد اس انجام کو بُلایا ہے جس کی کچھ روئداد آپ نے میرے سرہانے ایک تختی پر لکھ کر لٹکا رکھی ہے۔ میں نے اِس کے انتظار میں ایک ایک گھڑی کس بے تابی سے کاٹی ہے، آہ! کچھ نہ پوچھیے، لیکن اب مجھے دلی تسکین حاصل ہو چکی ہے۔ میری زندگی کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ میں دق اور سِل کا مریض ہوں۔ اِس مرض نے مجھے کھوکھلا کر دیا ہے ...... آپ حقیقت کا اظہار کیوں نہیں کر دیتے! بخدا! اُس سے مجھے اور تسکین حاصل ہوگی۔ میرا آخری سانس آرام سے نکلے گا ...... ہاں ڈاکٹر صاحب! یہ تو بتایئے، کیا آخری لمحات واقعی تکالیف دہ ہوتے ہیں؟ میں چاہتا ہوں، میری جان آرام سے نکلے۔ آج میں واقعی بچّوں کی سی باتیں کر رہا ہوں۔ آپ اپنے دل میں یقیناً مسکراتے ہوں گے کہ میں آج معمول سے بہت زیادہ باتونی ہو گیا ہوں ...... دِیا جب بجھنے کے قریب ہوتا ہے تو اُس کی روشنی تیز ہو جایا کرتی ہے۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟ ...... آپ تو بولتے ہی نہیں، اور میں ہوں کہ بولے جا رہا ہوں۔ ہاں، ہاں، بیٹھیے۔ میرا جی چاہتا ہے، آج کسی سے باتیں کیے جاؤں۔ آپ نہ آتے تو خدا معلوم میری کیا حالت ہوتی ..... آپ کا سفید سوٹ آنکھوں کو کس قدر بھلا معلوم ہو رہا ہے! کفن بھی اسی طرح صاف ستھرا ہوتا ہے۔ پھر آپ میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں۔ آپ کو کیا معلوم کہ میں مرنے کے لیے کس قدر بے تاب ہوں۔ اگر مرنے والوں کو کفن خود پہننا ہو تو آپ دیکھتے، میں اُس کو کتنی جلدی اپنے گرد لپیٹ لیتا۔ میں کچھ عرصہ اور زندہ رہ کر کیا کروں گا؟ جب کہ وہ مر چکی ہے۔ میرا زندہ رہنا فضول ہے۔ میں نے اس موت کو بہت مشکلوں کے بعد اپنی طرف آمادہ کیا ہے اور اب میں اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتا۔ وہ مر چکی ہے اور اب میں بھی مر رہا ہوں۔ میں نے اپنی سنگ دلی ...... وہ مجھے سنگ دل کے نام سے پکارا کرتی تھی، کی قیمت ادا کر دی ہے اور خدا گواہ ہے کہ اس کا کوئی بھی سکّہ کھوٹا نہیں۔ میں پانچ سال تک ان کو پرکھتا رہا ہوں۔ میری عمر اِس وقت پچّیس برس کی ہے۔ آج سے ٹھیک سات برس پہلے میری اُس سے ملاقات ہوئی تھی۔ آہ! ان سات برسوں کی روئداد کتنی حیرت افزا ہے۔ اگر کوئی شخص اُس کی تفصیل کاغذوں پر پھیلا دے تو انسانی دلوں کی داستانوں میں کیسا دلچسپ اضافہ ہو۔ دنیا ایک ایسے دل کی دھڑکن سے آشنا ہوگی جس نے اپنی غلطی کی قیمت خون کی اُن تھوکوں میں ادا کی ہے جنہیں آپ ہر روز جلاتے رہتے ہیں کہ ان کے جراثیم دوسروں تک نہ پہنچیں ... ... آپ میری بکواس سنتے سنتے کیا تنگ تو نہیں آ گئے؟ خدا معلوم کیا کیا کچھ بکتا رہا ہوں؟

تکلف سے کام نہ لیجیے، آپ واقعی کچھ نہیں سمجھ سکتے، میں خود کچھ نہیں سمجھ سکا۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ بٹوت سے واپس آکر میرے دل و دماغ کا ہر جوڑ ہل گیا تھا۔ اب یعنی آج، جب کہ میرے جنون کا دورہ ختم ہو چکا ہے اور موت کو چند قدم کے فاصلے پر دیکھ رہا ہوں، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ وزن جو میری چھاتی کو دابے ہوئے تھا، ہلکا ہوگیا ہے اور میں پھر زندہ ہو رہا ہوں۔ موت میں زندگی ...... کیسی دلچسپ چیز ہے! آج میرے ذہن سے دھند کے تمام بادل اُٹھ [چھٹ؟] گئے ہیں۔ میں ہر چیز کو روشنی میں دیکھ رہا ہوں۔ سات برس پہلے کے تمام واقعات اس وقت میری نظروں کے سامنے ہیں...... دیکھیے: میں لاہور سے گرمیاں گزارنے کے لیے کشمیر [جانے؟] کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ سوٹ سلوائے جا رہے ہیں۔ بوٹ ڈبوں میں بند کیے جا رہے ہیں۔ ہولڈال اور ٹرنک کپڑوں سے پُر کیے جا رہے ہیں۔ میں رات کی گاڑی سے جموں روانہ ہوتا ہوں۔ شمیم میرے ساتھ ہے۔ گاڑی کے ڈبے میں بیٹھ کر ہم عرصے تک باتیں کرتے رہتے ہیں۔ گاڑی چلتی ہے۔ شمیم چلا جاتا ہے۔ میں سو جاتا ہوں۔ دماغ ہر قسم کی فکر سے آزاد ہے۔ صبح جموں کے اسٹیشن پر جاگتا ہوں۔ کشمیر کی حسین وادی کی ہونے والی سیر کے خیالات میں مگن، لاری پر سوار ہوتا ہوں۔ بٹوت سے ایک میل کے فاصلے پر لاری کا پہیہ پنکچر ہو جاتا ہے۔ شام کا وقت ہے، اس لیے رات بٹوت کے [ایک؟] ہوٹل میں کاٹنی پڑتی ہے! اُس ہوٹل کا کمرہ مجھے بے حد غلیظ معلوم ہوتا ہے مگر کیا معلوم تھا کہ مجھے وہاں پر پورے دو مہینے رہنا پڑے گا۔ صبح سویرے اٹھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ لاری کے انجن کا ایک پرزہ بھی خراب ہو گیا ہے اس لیے مجبوراً ایک دن اور بٹوت میں ٹھہرنا پڑے گا۔ یہ سُن کر میری طبیعت کس قدر افسردہ ہوگئی تھی! اُس افسردگی کو دور کرنے کے لیے میں اُس روز شام کو سیر کے لیے نکلتا ہوں۔ چیڑ کے درختوں کا تنفس، جنگلی پرندوں کی نغمہ سرائیاں، سیب کے لدے ہوئے درختوں کا حُسن اور غروب ہوتے ہوئے سورج کا دل کش سماں: لاری والے کی بے احتیاطی اور رنگ میں بھنگ ڈالنے والی تقدیر کی گستاخی کا رنج افزا خیال، محو کر دیتا ہے۔ میں نیچر کے مسرت افزا مناظر سے لطف اندوز ہوتا، سڑک کے ایک موڑ پر پہنچتا ہوں ...... دفعتاً میری نگاہیں اُس سے دوچار ہوتی ہیں۔ بیگو مجھ سے بیس قدم کے فاصلے پر اپنی بھینس کے ساتھ کھڑی ہے......

جس داستان کا انجام اس وقت آپ کے پیشِ نظر ہے اُس کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے:

وہ جوان تھی۔ اُس کی جوانی پر بٹوت کی فضا پوری شدت کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ سبز لباس میں ملبوس وہ، سڑک کے درمیان مکئی کا ایک دراز قد بوٹا معلوم ہو رہی تھی۔ چہرے کے تانبے ایسے تاباں رنگ پر اُس کی آنکھوں کی چمک نے ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی جو چشمے کے پانی کی طرح صاف اور شفاف تھیں......

میں اُس کو کتنا عرصہ دیکھتا رہا، یہ مجھے معلوم نہیں۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ میں نے دفعتاً اپنا سینہ موسیقی سے لبریز پایا۔ اور پھر میں مسکرا دیا۔ اس کی بہکی ہوئی نگاہوں کی توجہ، بھینس سے ہٹ کر میرے تبسم سے ٹکرائی۔ میں گھبرا گیا۔ اُس نے ایک تیز تجسّس سے میری طرف دیکھا جیسے وہ کسی بھولے ہوئے خواب کو یاد کر رہی ہے۔ پھر اس نے اپنی چھڑی کو دانتوں میں دبا کر کچھ سوچا اور مسکرا دی۔ اس کا سینہ چشمے کے پانی طرح دھڑک رہا تھا۔ میرا دل بھی میرے پہلو میں انگڑائیاں لے رہا تھا...... اور یہ پہلی ملاقات کس قدر لذیذ تھی، اُس کا ذائقہ ابھی تک میرے جسم کی ہر رگ میں موجود ہے...... وہ چلی گئی ..... میں اس کو آنکھوں سے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔ وہ اس انداز سے چل رہی تھی جیسے کچھ یاد کر رہی ہے۔ کچھ یاد کرتی ہے۔ مگر پھر بھول جاتی ہے۔ اس نے جاتے ہوئے پانچ چھ مرتبہ میری طرف مُڑ کر دیکھا لیکن فوراً سر پھیر لیا۔ جب وہ اپنے گھر میں داخل ہوگئی جو سڑک کے نیچے، مکئی کے چھوٹے سے کھیت کے ساتھ بنا ہوا تھا، میں اپنی طرف متوجہ ہوا۔ میں اس کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اِس احساس نے مجھے سخت متحیر کیا۔ میری عمر اُس وقت اٹھارہ سال کی تھی۔ کالج میں، اپنے ہم جماعت طلبہ کی زبانی، میں محبت کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا۔ عشقیہ داستانیں بھی اکثر میرے زیرِ مطالعہ رہی تھیں، مگر محبت کے حقیقی معانی میرے نظروں سے پوشیدہ تھے۔ اُس کے جانے کے بعد جب میں نے ایک ناقابلِ بیان تلخی اپنے دل کی دھڑکنوں میں حل ہوتی ہوئی محسوس کی تو میں نے خیال کیا شاید اسی کا نام محبت ہے...... یہ محبت ہی تھی...... عورت سے محبت کرنے کا پہلا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ مرد کی ہو جائے، یعنی وہ اُس سے شادی کر لے اور آرام سے اپنی بقایا زندگی گزار دے۔ شادی کے بعد یہ محبت کروٹ بدلتی ہے، پھر مرد اپنی محبوبہ کے کاندھوں پر ایک گھر تعمیر کرتا ہے۔ میں نے جب بیگو سے اپنے دل کو وابستہ ہوتے محسوس کیا تو فطری طور پر میرے دل میں اُس رفیقۂ حیات کا خیال پیدا ہوا جس کے متعلق میں اپنے کمرے کی چار دیواری میں کئی خواب دیکھ چکا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی میرے دل سے یہ صدا اٹھی: ''دیکھو سعید! یہ لڑکی ہی تمہارے خوابوں کی پری ہے۔'' چنانچہ میں تمام واقعے پر غور کرتا ہوا ہوٹل واپس آیا اور ایک ماہ کے لیے ہوٹل کا وہ کمرہ کرایے پر اٹھا لیا جو مجھے بے حد غلیظ محسوس ہوا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہوٹل کا مالک میرے اس ارادے کو سن کر بہت متحیر ہوا تھا۔ اس لیے کہ میں صبح اُس کی غلاظت پسندی پر ایک طویل لیکچر دے چکا تھا۔ داستان کتنی طویل ہوتی جا رہی ہے مگر مجھے معلوم ہے کہ آپ اسے غور سے سن رہے ہیں......

ہاں ہاں، آپ سگریٹ سُلگا سکتے ہیں۔ میرے گلے میں آج کھانسی کے آثار محسوس نہیں ہوتے۔ آپ کی ڈبیا دیکھ کر میرے ذہن میں ایک اور واقعے کی یاد تازہ ہوگئی ہے۔ بیگو بھی سگریٹ پیا کرتی تھی۔ میں نے کئی بار

اُسے گولڈ فلیک کی ڈبیاں لا کر دی تھیں۔ وہ بڑے شوق سے اُن کو منہ میں دبا کر دھوئیں کے بادل اڑایا کرتی تھی۔ دھواں......! میں اُس نیلے نیلے دھوئیں کو اب بھی دیکھ رہا ہوں جو اُس کے گیلے ہونٹوں پر رقص کیا کرتا تھا...... ہاں، تو دوسرے روز، میں شام کو اُسی وقت اُدھر سیر کو گیا جہاں مجھے وہ سڑک پر ملی تھی۔ دیر تک سڑک کے ایک کنارے، پتھروں کی دیوار پر بیٹھا رہا مگر وہ نظر نہ آئی...... اٹھا اور ٹہلتا ٹہلتا آگے نکل گیا۔ سڑک کے دائیں ہاتھ ڈھلوان تھی جس پر چیڑ کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ بائیں ہاتھ بڑے بڑے پتھروں کے کٹے پھٹے سر اُبھر رہے تھے۔ اُن پر جمی ہوئی مٹی کے ڈھیلوں میں گھاس اُگی ہوئی تھی۔ ہوا ٹھنڈی اور تیز تھی۔ چیڑ کے تاگا نما پتوں کی سرسراہٹ کانوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جب موڑ مڑا تو دفعتاً میری نگاہیں سامنے اٹھیں۔ مجھ سے سو قدم کے فاصلے پر وہ اپنی بھینس کو ایک سنگین حوض سے پانی پلا رہی تھی۔ میں قریب پہنچا مگر اُس کو نظر بھر کے دیکھنے کی جرأت نہ کر سکا اور آگے نکل گیا اور جب واپس مڑا تو وہ گھر جا چکی تھی۔ اب ہر روز اُس طرف سیر کو جانا میرا معمول ہو گیا۔ مگر بیس روز تک میں اُس سے ملاقات نہ کر سکا۔ میں نے کئی بار باؤلی پر پانی پیتے وقت، اس سے ہم کلام ہونے کا ارادہ کیا مگر زبان گنگ ہو گئی، کچھ بول نہ سکا۔ قریباً ہر روز میں اُس کو دیکھتا۔ مگر رات کو جب میں تصور میں اس کی شکل دیکھنا چاہتا تو ایک دُھندسی چھا جاتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ میں اُس کی شکل کو، اس کے باوجود کہ اُسے ہر روز دیکھتا تھا، بھول جاتا تھا۔ بیس دنوں کے بعد، ایک روز چار بجے کے قریب، جبکہ میں ایک باؤلی کے اوپر چیڑ کے سائے میں لیٹا تھا، وہ ایک خورد سال لڑکے کو لے کر اُوپر چڑھی۔ اُس کو اپنی طرف آتا دیکھ کر میں سخت گھبرا گیا۔ دل میں یہی آئی کہ وہاں سے بھاگ جاؤں لیکن اس کی سکت بھی نہ رہی۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر آگے نکل گئی۔ چونکہ اس کے قدم تیز تھے اس لیے لڑکا پیچھے رہ گیا۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ دفعتاً لڑکے نے ایک چیخ ماری اور چشم زدن میں چیڑ کے خشک پتوں پر سے پھسل کر نیچے آ رہا۔ میں فوراً اٹھا اور بھاگ کر اُسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔ چیخ سن کر وہ مڑی اور دوڑنے کے لیے بڑھتے ہوئے قدم روک کر آہستہ آہستہ میری طرف آئی۔ اپنی جوان آنکھوں سے مجھے دیکھا اور لڑکے سے یہ کہا: ''خدا جانے تم کیوں گر گر پڑتے ہو؟''

میں نے، گفتگو شروع کرنے کا ایک موقع پا کر، اُس سے کہا: ''بچہ ہے، اس کی انگلی پکڑ لیجیے۔ ان پتوں نے خود مجھے کئی بار اوندھے منہ گرا دیا ہے۔''

یہ سن کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی: ''آپ کے بیٹ نے تو خوب لڑھکنیاں کھائی ہوں گی!''

''آپ ہنستی کیوں ہیں؟ کسی کو گرتے دیکھ کر آپ کی طبیعت اتنی شاد کیوں ہوتی ہے، اور جو کسی روز

آپ گر پڑیں تو...... وہ گھڑا جو ہر روز بھر کر شام کے وقت آپ گھر لے جاتی ہیں، کس بُری طرح زمین پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔"[۳]

"میں نہیں گر سکتی۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے دفعتاً نیچے باؤلی کی طرف دیکھا۔ اُس کی بھینس نالے پر بندھے ہوئے پُل کی طرف خراماں خراماں جا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اُس نے اپنے حلق سے ایک عجیب قسم کی آواز نکالی۔ اُس کی گونج ابھی تک میرے کانوں میں محفوظ ہے۔ کس قدر جوان[۴] تھی یہ آواز! اُس نے بڑھ کر لڑکے کو کاندھے پر اٹھا لیا اور بھینس کو "اے چھلاں، اے چھلاں" کے نام سے پکارتی ہوئی، چشم زدن میں نیچے اُتر گئی۔ بھینس کو واپس موڑ کر اس نے میری طرف دیکھا اور گھر کو چل دی...... اس ملاقات کے بعد اُس سے ہم کلام ہونے کی جھجک دور ہو گئی۔ ہر روز شام کے وقت باؤلی پر، یا چیڑ کے درختوں تلے، مَیں اُس سے کوئی نہ کوئی بات شروع کر دیتا۔ شروع شروع میں ہماری گفتگو کا موضوع بھینس تھا۔ پھر میں نے اس سے اس کا نام دریافت کیا، اور اس نے میرا۔ اس کے بعد گفتگو کا رُخ اصل مطلب کی طرف آ گیا۔ ایک روز دوپہر کے وقت جب وہ نالے میں ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھی اپنے کپڑے دھو رہی تھی، میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے کسی خاص بات کا اظہار کرنے پر تیار دیکھ کر، اس نے جنگلی بلّی کی طرح میری طرف گھور کر دیکھا اور زور زور سے اپنی شلوار کو پتھر پر جھٹکتے ہوئے کہا:

"آپ کشمیر کب جا رہے ہیں؟ یہاں بٹوت میں کیا دھرا ہے جو آپ یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں!"

یہ سُن کر میں نے مستفسرانہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ گویا میں اُس کے سوال کا جواب خود اُس کی زبان سے چاہتا ہوں۔ اس نے نگاہیں نیچی کر لیں اور مسکراتے ہوئے کہا: "آپ سیر کرنے کے لیے آئے ہیں۔ میں نے سُنا ہے کشمیر میں بہت سے باغ ہیں۔ آپ وہاں کیوں نہیں[۵] چلے جاتے؟"

موقع اچھا تھا۔ چنانچہ میں نے دل کے تمام دروازے کھول دیے۔ وہ میرے جذبات کے بہتے ہوئے دھارے کا شور، خاموشی سے سنتی رہی۔ میری آواز نالے کے پانی کی گنگناہٹ میں، جو ننھے ننھے سنگ ریزوں سے کھیلتا ہُوا بہہ رہا تھا، ڈوب ڈوب کر اُبھر رہی تھی۔ ہمارے سروں کے اوپر اخروٹ کے گھنے درخت میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ ہوا اس قدر تر و تازہ اور لطیف تھی کہ اُس کا ہر جھونکا بدن پر ایک خوش گوار کپکپی طاری کر دیتا تھا۔ میں اُس سے پورا ایک گھنٹہ گفتگو کرتا رہا۔ اُس سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں تم سے[۶] محبت کرتا ہوں اور شادی کا خواہش مند ہوں۔ یہ سُن کر وہ بالکل متحیر نہ ہوئی لیکن اس کی نگاہیں جو دور پہاڑیوں کی سیاہی اور آسمان کی نیلاہٹ کو آپس میں ملتا ہوا دیکھ رہی تھی، اس بات کی مظہر تھیں کہ وہ

کسی گہرے خیال میں مستغرق ہے۔ کچھ عرصہ خاموش رہنے کے بعد اُس نے میرے اصرار پر صرف اتنا جواب دیا:

"اچھا، آپ کشمیر نہ جائیں۔"

یہ جواب اختصار کے باوجود حوصلہ افزا تھا...... اس ملاقات کے بعد ہم دونوں بے تکلف ہوگئے۔ اب پہلا سا حجاب نہ رہا۔ ہم گھنٹوں ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے رہتے۔ ایک روز میں نے اُس سے نشانی کے طور پر کچھ مانگا تو اس نے بڑے بھولے انداز میں اپنے سر کے دو کلپ اتار کر میری ہتھیلی پر رکھ دیے اور مسکرا کر کہا: "میرے پاس یہی کچھ ہے۔" یہ کلپ میرے پاس ابھی تک محفوظ ہیں۔ خیر، کچھ دنوں کی طول طویل گفتگوؤں کے بعد میں نے اُس کی زبان سے یہ کہلوالیا کہ وہ مجھ سے شادی کرنے پر رضا مند ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب اُس روز شام کو اُس نے اپنے گھڑے کو سر پر سنبھالتے ہوئے اپنی رضامندی کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ "ہاں، میں چاہتی ہوں۔" تو میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ہوٹل کو واپس آتے ہوئے، میں کچھ گا بھی رہا تھا۔ اُس پُر مسرت شام کے چوتھے روز، جب کہ میں آنے والی ساعتِ سعید کے خواب دیکھ رہا تھا، یکا یک اُس مکان کی تمام دیواریں گر پڑیں، جن کو میں نے بڑے پیار سے استوار کیا تھا۔ بستر میں پڑا تھا کہ صبح [سویرے؟] سیال کوٹ کے ایک صاحب جو بغرضِ تبدیلِ آب و ہوا، بٹوت میں قیام پذیر تھے، اور ایک حد تک بیگو سے میری محبت کو جانتے تھے، [آکر؟] میری چارپائی پر بیٹھ گئے اور نہایت ہی متفکرانہ لہجے میں کہنے لگے:[۷]

"وزیر بیگم سے آپ کی ملاقاتوں کا ذکر، آج بٹوت کے ہر بچّے کی زبان پر ہے۔ میں وزیر بیگم کے کیریکٹر سے ایک حد تک واقف تھا۔ اس لیے کہ سیال کوٹ میں اس لڑکی کے متعلق بہت کچھ سُن چکا ہوں مگر یہاں بٹوت میں اس کی تصدیق ہوگئی ہے۔ ایک ہفتہ پہلے یہاں کا قصائی اس کے متعلق ایک طویل حکایت سنا رہا تھا۔ پرسوں پان والا آپ سے ہمدردی کا اظہار کر رہا تھا کہ آپ عصمت باختہ لڑکی کے دام میں پھنس گئے ہیں۔ کل شام کو ایک اور صاحب کہہ رہے تھے کہ آپ ٹوٹی ہوئی ہنڈیا[۸] خرید رہے ہیں۔ میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ بعض لوگ اس سے آپ کی گفتگو پسند نہیں کرتے، اس لیے کہ جب سے آپ بٹوت میں آئے ہیں، وہ اُن کی نظروں سے اُوجھل ہوگئی ہے۔ میں نے آپ سے حقیقت کا اظہار کر دیا ہے۔ اب آپ بہتر سوچ سکتے ہیں۔"

عصمت باختہ لڑکی، ٹوٹی ہوئی ہنڈیا، لوگ اُس سے میری گفتگو پسند نہیں کرتے! مجھے اپنی سماعت پر

یقین نہ آتا تھا۔ بگو اور ..... اس کا خیال ہی نہیں کیا جا سکتا تھا، مگر جب دوسرے روز مجھے ہوٹل والے نے نہایت ہی رازدارانہ لہجے میں چند باتیں کہیں تو میری آنکھوں کے سامنے تاریک دُھند سی چھا گئی: ''بابو جی، آپ بٹوت میں سیر کے لیے آئے ہیں۔ مگر دیکھتا ہوں کہ آپ یہاں کی ایک حسن فروش لڑکی کی محبت میں گرفتار ہیں۔ اُس کا خیال اپنے دل سے نکال دیجیے۔ میرا اُس لڑکی کے گھر آنا جانا ہے، مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ نے اُس کو کچھ کپڑے بھی خرید دیے ہیں۔ آپ نے یقیناً اور بھی کئی روپے خرچ کیے ہوں گے۔ معاف کیجیے مگر یہ سراسر حماقت ہے۔ میں آپ سے یہ باتیں ہرگز نہ کرتا کیونکہ یہاں بیسیوں عیش پسند مسافر آتے ہیں مگر آپ کا دل ان سیاہیوں سے پاک نظر آتا ہے۔ آپ بٹوت سے چلے جائیں، اس قماش کی لڑکی سے گفتگو کرنا، اپنی عزّت خطرے میں ڈالنا ہے۔'' ظاہر ہے کہ ان باتوں نے مجھے بے حد افسردہ بنادیا ہے [؟ بنادیا]۔ وہ مجھ سے سگریٹ، مٹھائی اور اسی قسم کی دوسری معمولی اشیا طلب کیا کرتی تھی اور میں بڑے شوق اور محبت سے اُس کی یہ خواہش پوری کیا کرتا تھا۔ اس میں ایک خاص لُطف تھ، مگر اب ہوٹل والے کی بات نے میرے ذہن میں مہیب خیالات کا ایک تلاطم برپا کردیا۔ گذشتہ ملاقاتوں کے جتنے نقوش میرے دل و دماغ میں محفوظ تھے اور جنھیں میں ہر روز، بڑے پیار سے اپنے تصور میں لاکر، ایک خاص قسم کی مٹھاس محسوس کیا کرتا تھا، دفعتاً تاریک شکل اختیار کرگئے۔ مجھے اس کے نام ہی سے عفونت آنے لگی۔ میں نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی بہت کوشش کی، مگر بے سود۔ میرا دل جو ایک کالج کے طالب علم کے سینے میں دھڑکتا تھا، اپنے خوابوں کی یہ بُری اور بھیانک تعبیر دیکھ کر چلاّ اٹھا۔ اُس کی باتیں جو کچھ عرصہ پہلے مجھے بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں، ریاکاری میں ڈوبی ہوئی معلوم ہونے لگیں ..... میں نے گذشتہ واقعات، بگو کی نقل و حرکت، اُس کی ہر جنبش اور اپنے گردوپیش کے ماحول کو پیشِ نظر رکھ کر، عمیق مطالعہ کیا تو تمام چیزیں روشن ہوگئیں۔ اُس کا ہر شام کو ایک مریض کے ہاں دودھ لے کر جانا اور وہاں ایک عرصے تک بیٹھی رہنا، باؤلی پر ہر کس و ناکس سے بے باکانہ گفتگو، دوپٹے کے بغیر ایک پتھر سے دوسرے پر اُچھل کود، اپنی ہم عمر لڑکیوں سے کہیں زیادہ شوخی اور آزادروی ..... ''وہ یقیناً عصمت باختہ لڑکی ہے۔'' میں نے یہ رائے مرتب تو کرلی مگر آنسوؤں سے میری آنکھیں گیلی ہوگئیں۔ خوب رویا مگر دل کا بوجھ ہلکا نہ ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ ایک بار، آخری بار، اُس سے ملوں۔ اور اس کے منہ پر اپنے تمام غصّے کو تھوک دوں۔ یہی صورت تھی جس سے مجھے کچھ سکون حاصل ہوسکتا تھا۔ چنانچہ میں شام کو باؤلی کی طرف گیا۔ وہ پگڈنڈی پر انار کی جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھی میرا انتظار کررہی تھی۔ اُس کو دیکھ کر میرا دل کس قدر کُڑھا۔ میرا حلق اُس روز کی تلخی کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ اُس کے قریب پہنچا اور

پاس ہی ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ چھلاّں، اُس کی بھینس، اور اُس کا بچھڑا، چند گزوں کے فاصلے پر بیٹھے جگالی کررہے تھے۔ میں نے گفتگو کا آغاز کرنا چاہا۔ مگر کچھ نہ کہہ سکا۔ غصّے اور افسردگی نے میری زبان پر قفل لگادیا۔[۹] مجھے خاموش دیکھ کر اُس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی، جیسے چشمے کے پانی میں کسی نے اپنے مٹی بھرے ہاتھ دھودیے ہیں۔ پھر وہ مسکرائی۔ یہ مسکراہٹ مجھے کسی قدر مصنوعی اور پھیکی معلوم ہوئی۔ میں نے سر جھکا لیا اور سنگ ریزوں سے کھیلنا شروع کردیا تھا۔ شاید میرا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور کہا: ''آپ بیمار ہیں؟''

اُس کا یہ کہنا تھا کہ میں برس پڑا: ''ہاں بیمار ہوں، اور یہ بیماری تمہاری دی ہوئی ہے۔ تم ہی نے یہ روگ لگایا ہے بیگو! میں تمہارے چال چلن کی سب کہانی سُن[۱۰] چکا ہوں اور تمہارے سارے حالات سے باخبر ہوں۔''

میری چُبھتی ہوئی باتیں سُن کر اور بدلے ہوئے تیور دیکھ کر وہ بھونچکا سی رہ گئی[۱۱] اور کہنے لگی: ''اچھا تو میں اچھی لڑکی نہیں ہوں! آپ کو میرے چال چلن کے متعلق سب کچھ معلوم ہو چکا ہے! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ آپ کیسی بہکی بہکی باتیں کررہے ہیں؟''

میں چلاّیا: ''گویا تم کو معلوم ہی نہیں۔ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو، تو اپنی سیہ کاریوں کا سارا نقشہ تمہاری آنکھوں تلے گھوم جائے گا۔'' میں طیش میں آگیا: ''کتنی بھولی بنتی ہو، جیسے کچھ جانتی ہی نہیں۔ پروں پر پانی ہی نہیں پڑنے دیتیں۔[۱۲] میں کیا کہہ رہا ہوں، بھلا تم کیا سمجھو؟ جاؤ جاؤ بیگو، تم نے مجھے سخت دکھ پہنچایا ہے۔'' یہ کہتے کہتے میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

وہ بھی سخت مضطرب ہوگئی اور جل کر بول اٹھی: ''آخر میں بھی تو سُنوں کہ آپ نے میرے بارے میں کیا کیا سُنا ہے۔ پر آپ تو رو رہے ہیں۔''

''ہاں رو رہا ہوں، اس لیے کہ تمہارے افعال ہی اتنے سیاہ ہیں کہ اُن پر ماتم کیا جائے۔ تم پاک بازوں کی قدر کیا جانو۔ اپنا جسم بیچنے والی لڑکی، محبت کیا جانے۔ تم...... تم صرف اتنا جانتی ہو کہ کوئی مرد آئے اور تمہیں اپنی چھاتی سے بھینچ کر چومنا چاٹنا شروع کردے، اور جب سیر ہوجائے تو اپنی راہ لے۔ کیا یہی تمہاری زندگی ہے؟''[۱۳]

میں غصّے کی شدّت سے[۱۴] دیوانہ ہوگیا تھا۔ جب اس نے میری زبان سے اس قسم کے سخت کلمات سُنے تو اس نے ایسا ظاہر کیا جیسے اس کی نظر میں یہ سب گفتگو ایک مُعمّا ہے۔ اُس وقت طیش کی حالت

میں میں نے اس کی حیرت کو نمائشی خیال کیا۔ اور ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: جاؤ! میری نظروں سے دُور ہوجاؤ،تم ناپاک ہو۔"

یہ سُن کر اس نے ڈری ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا: ''آپ کو کیا ہوگیا ہے؟''

''مجھے کیا ہوگیا ہے...... کیا ہوگیا ہے۔'' میں پھر برس پڑا: ''اپنی زندگی کی سیہ کاریوں پر نظر دوڑاؤ ...... تمہیں سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔تم میری بات اس لیے نہیں سمجھتی ہو کہ میں تم سے شادی کرنے کا خواہش مند تھا۔ اس لیے کہ میرے سینے میں شہوانی خیالات موجود نہیں، اس لیے کہ میں صرف محبت کرتا ہوں۔ جاؤ، مجھے تم سے سخت نفرت ہے۔''

جب میں بول چکا تو اس نے تھوک نگل کر اپنے حلق کو صاف کیا اور تھرتھرائی ہوئی آواز میں کہا: ''شاید آپ یہ خیال کرتے ہوں گے کہ میں جان بوجھ کر انجان بن رہی ہوں۔مگر سچ جانیے، مجھے کچھ معلوم نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک شام آپ سڑک پر سے گزر رہے تھے، آپ نے میری طرف دیکھا تھا اور مسکرا دیے تھے۔ یہاں بیسیوں لوگ، ہم لڑکیوں کو دیکھتے ہیں اور مسکرا کر چلے جاتے ہیں۔ پھر آپ متواتر باؤلی کی طرف آتے رہے۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ میرے لیے آتے ہیں، مگر اسی قسم کے کئی واقعے میرے ساتھ گزر چکے ہیں۔ ایک روز آپ نے میرے ساتھ باتیں کیں اور اُس کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے ملنے لگے۔آپ نے شادی کے لیے کہا، میں مان گئی۔مگر اس سے پہلے اِسی قسم کی کئی درخواتیں سُن چکی ہوں۔ جو مرد بھی مجھ سے ملتا ہے، دوسرے تیسرے روز میرے کان میں کہتا ہے: ''بیگو، دیکھ میں تیری محبت میں گرفتار ہوں، رات دن تو ہی میرے دل ودماغ میں بسی رہتی ہے۔'' آپ نے بھی مجھ سے یہی کہا۔ اب بتایئے محبت کیا چیز ہے؟ مجھے کیا معلوم کہ آپ نے دل میں کیا چھپا رکھا ہے۔ یہاں آپ جیسے کئی لوگ ہیں جو مجھ سے یہی کہتے ہیں: ''بیگو تمہاری آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ صدقے ہو جاؤں۔تمہارے ہونٹ کس قدر پیارے ہیں۔ جی چاہتا ہے ان کو چومے جاؤں'' ...... وہ مجھے چومتے رہے ہیں۔کیا یہ محبت نہیں ہے؟ کئی بار میرے دل میں خیال آیا ہے کہ محبت کچھ اور ہی چیز ہے، مگر میں پڑھی لکھی نہیں، اس لیے مجھے کیا معلوم ہوسکتا ہے۔ میں نے قاعدہ پڑھنا شروع کیا مگر چھوڑ دیا۔ اگر میں پڑھوں تو پھر چھلاں اور اس کے بچھڑے کا پیٹ کون بھرے۔آپ اخبار پڑھ لیتے ہیں، اس لیے آپ کی باتیں بڑی ہوتی ہیں۔ میں کچھ نہیں سمجھ سکتی۔ چھوڑیے اِس قصے کو۔ آیئے کچھ اور باتیں کریں۔ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ میری ماں کہہ رہی تھیں[۱۵] کہ بیگو تو ہیٹ والے بابو کے پیچھے دیوانی ہوگئی ہے۔''

میری نظروں کے سامنے سے وہ تاریک پردہ اٹھنے لگا تھا جو اس انجام کا باعث تھا۔ مگر دفعتاً میرے جوش اور غصّے نے پھر اُسے گرا دیا۔ بیگو کی گفتگو بے حد سادہ اور معصومیت سے پُر تھی۔ مگر مجھے اُس کا ہر لفظ بناوٹ میں لپٹا نظر آیا۔ میں نے ایک لمحہ بھی اس کی اہمیت پر غور نہ کیا۔

''بیگو، میں بچہ نہیں ہوں کہ تم مجھے چکنی چپڑی باتوں سے بے وقوف بنالوگی۔'' میں نے غصّے میں اُس سے کہا: ''یہ فریب کسی اور کو دینا۔ کہتے ہیں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ تم نے ابھی ابھی اپنی زبان سے اِس بات کا اعتراف کیا ہے۔ اب میں کیا کہوں...... ''

''نہیں نہیں، کہیے!'' اُس نے کہا۔

''کئی لوگ تمہارے منہ کو چومتے رہے ہیں۔ تمہیں شرم آنی چاہیے!''

''ہائے آپ تو سمجھتے ہی نہیں۔ اب میں کیا جھوٹ بولتی ہوں۔ میں خود تھوڑا ہی ان کے پاس جاتی ہوں اور منہ بڑھا کر چومنے کو کہتی ہوں۔ اگر آپ اُس روز میرے بالوں کو چومنا چاہتے جبکہ آپ ان کی تعریف کر رہے تھے، تو کیا میں انکار کر دیتی؟ میں کس طرح انکار کرسکتی ہوں۔ مجھے چھلاّں بہت پیاری لگتی ہے اور میں اس کو ہر روز چومتی ہوں۔ اس میں کیا ہرج ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ لوگ میرے بالوں، میرے ہونٹوں اور میرے گالوں کی تعریف کریں۔ اس سے مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ خبر نہیں کیوں؟ میں صبح سویرے اُٹھتی ہوں اور چھلاّں کو لے کر گھاس چرانے کے لیے باہر چلی جاتی ہوں۔ بارہ بجے روٹی کھا کر پھر گھر سے نکل آتی ہوں۔ شام کو پانی بھرتی ہوں، ہر روز میرا یہی کام ہے۔ مجھے یاد ہے، آپ نے مجھ سے کئی مرتبہ کہا تھا کہ میں پانی بھرنے نہ آیا کروں، بھینس نہ چرایا کروں۔ شاید آپ اسی وجہ سے ناراض ہو رہے ہیں۔ مگر یہ تو بتایئے کہ میں گھر پر رہوں تو پھر آپ مجھ سے ملاقات کیونکر کرسکیں گے؟ میں نے سنا ہے کہ پنجاب میں لڑکیاں گھر سے باہر نہیں نکلتیں۔ مگر ہم پہاڑی لوگ ہیں، ہمارا یہی کام ہے۔''

''تمہارا یہی کام ہے کہ ہر رہ گزر سے لپٹنا شروع کر دو۔ تم پہاڑی لوگوں کے چلن مجھ سے چھپے ہوئے نہیں، یہ تقریر کسی اور کو سُنانا۔ گھر پر رہو یا باہر پھرو۔ اب مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ان پہاڑیوں میں رہ کر جو سبق تم نے سیکھا ہے وہ مجھے پڑھانے کی کوشش نہ کرو۔''

''آپ بہت تیز ہوتے جا رہے ہیں، بہت چل نکلے ہیں۔'' اُس نے قدرے بگڑ کر کہا: ''معلوم ہوتا ہے لوگوں نے آپ کے بہت کان بھرے ہیں۔ مجھے بھی تو پتہ لگے کہ وہ کون ''مرن جوگے'' ہیں جو میرے متعلق آپ کو ایسی باتیں سُناتے رہے ہیں۔ آپ خواہ مخواہ اتنے گرم ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ میں

مردوں کے ساتھ باتیں کرتی ہوں۔ ان سے ملتی ہوں مگر...... ''یہ کہتے ہوئے اس کے گال سرخ ہو گئے۔ مگر میں نے اس کی طرف دھیان نہ دیا۔ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولی:'' آپ کہتے ہیں کہ میں بُری لڑکی ہوں۔ یہ غلط ہے۔ میں پگلی ہوں...... سچ مچ پگلی ہوں، کل آپ کے چلے جانے کے بعد، میں پتھر پر بیٹھ کر دیر تک روتی رہی۔ جانے کیوں؟ ایسا کئی دفعہ ہوا ہے کہ میں گھنٹوں رویا کی ہوں، آپ ہنسیں گے مگر اس وقت بھی میرا جی چاہتا ہے کہ یہاں سے اٹھ بھاگوں اور اس پہاڑی کی چوٹی پر بھاگتی ہوئی چڑھ جاؤں اور پھر کودتی پھاندتی نیچے اتر آؤں۔ میرے دل میں ہر وقت ایک بے چینی سی رہتی ہے۔ بھینس چراتی ہوں، پانی بھرتی ہوں، لکڑیاں کاٹتی ہوں لیکن یہ سب کام میں اوپرے دل سے[۱۸] کرتی ہوں۔ میرا جی کسی کو ڈھونڈتا ہے۔ معلوم نہیں کس کو...... میں دیوانی ہوں۔''

بیگو کی یہ عجیب و غریب باتیں جو درحقیقت اُس کی زندگی کا ایک نہایت الجھا ہوا باب تھیں، اور جسے بغور مطالعہ کرنے کے بعد سب راز حل ہو سکتے تھے، اُس وقت مجھے کسی مجرم کا غیر مربوط بیان معلوم ہوئیں۔ بیگو اور میرے درمیان اس قدر تاریک اور موٹا پردہ حائل تھا کہ حقیقت کی نقاب کشائی بہت مشکل تھی۔

''تم دیوانی ہو۔'' میں نے اُس سے کہا:'' کیا مردوں کے ساتھ بیٹھ کر جھاڑیوں کے پیچھے پہروں باتیں کرتے رہنا بھی اس دیوانگی ہی کی ایک شاخ ہے؟ . ... بیگو، تم پگلی ہو مگر اپنے کام میں آٹھوں گانٹھ ہوشیار!''[۱۹]

''میں باتیں کرتی ہوں، اُن سے ملتی ہوں، میں نے اِس سے کب انکار کیا ہے۔ ابھی ابھی میں نے آپ سے اپنے دل کی سچی بات کہی تو آپ نے مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ اب اگر میں کچھ اور کہوں تو اس سے کیا فائدہ ہو گا۔ آپ کبھی مانیں گے ہی نہیں۔''

''نہیں، نہیں، کہو، کیا کہتی ہو۔ تمہارا نیا فلسفہ بھی سن لوں۔''

''سنیے پھر۔'' یہ کہہ کر اس نے تھکی ہوئی ہرنی کی طرح میری طرف دیکھا اور آہ بھر کر بولی:'' یہ باتیں جو میں آج آپ کو سنانے لگی ہوں، میری زبان سے پہلے کبھی نہیں نکلیں۔ میں یہ آپ کو بھی نہ سناتی مگر مجبوری ہے۔ آپ عجیب و غریب آدمی ہیں۔ میں بہت سے لوگوں سے ملتی رہی ہوں، مگر آپ بالکل نرالے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے آپ سے ...... '' وہ ہچکچائی...... ''ہاں آپ سے پیار ہو گیا ہے۔ آپ نے کبھی مجھ سے غیر بات نہیں کہی حالانکہ میں جس سے ملتی رہی ہوں وہ مجھ سے کچھ اور ہی کہتا تھا۔ میری اماں جانتی ہے کہ میں گھر میں ہر وقت آپ ہی کی باتیں کرتی رہتی ہوں۔ میرا منہ تھکتا ہی نہیں۔ آپ نے نہیں کہا، پر میں

نے گاہکوں کے پاس دودھ لے جانا چھوڑ دیا۔ لوگوں سے باتیں کرنا چھوڑ دیں۔ پانی بھرنے کے لیے بھی زیادہ تر چھوٹی بہن ہی کو بھیجتی رہی ہوں۔ آپ کے آنے سے پہلے میں لوگوں سے ملتی رہی ہوں۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میں اُن سے کیوں ملتی تھی...... مجھے کوئی مرد بھی بلاتا تو میں اس سے باتیں کرنے لگتی تھی۔ اس لیے...... نہیں نہیں،" میں نہیں بتاؤں گی...... میرا دل جو چاہتا تھا، وہ اُن لوگوں کے پاس نہیں تھا، میں بُری نہیں، اللہ کی قسم، بے گناہ ہوں، خدا معلوم لوگ مجھے بُرا کیوں کہتے ہیں۔ آپ بھی مجھے بُرا کہتے ہیں۔ جس طرح آپ نے آج میرے منہ پر اتنی گالیاں دی ہیں اگر آپ کے بجائے کوئی اور ہوتا تو میں اُس کا منہ نوچ لیتی مگر آپ...... اب میں کیا کہوں، میں بہت بدل گئی ہوں۔ آپ اچھے آدمی ہیں۔ میں خیال کرتی تھی کہ آپ مجھے کچھ سکھائیں گے۔ مجھے اچھی اچھی باتیں سنائیں گے لیکن آپ مجھ سے خواہ مخواہ لڑ رہے ہیں ...... آپ کو کیا معلوم کہ میں آپ کی کتنی عزت کرتی ہوں۔ میں نے آپ کے سامنے کبھی گالی نہیں دی، حالانکہ ہمارے گھر، سارا دن گالی گلوچ ہوتی رہتی ہے۔"

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب! اُس پہاڑی لڑکی کی گفتگو کس قدر سادہ تھی۔ مگر افسوس ہے کہ اُس وقت میرے کانوں میں روئی ٹھنسی ہوئی تھی۔ اُس کے ہر لفظ سے مجھے عصمت فروشی کی بو آرہی تھی۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔

"بیگو! تم ہزار قسمیں کھاؤ مگر مجھے یقین نہیں آتا۔ اب جو تمہارے جی میں آئے کرو، میں کل بٹوت چھوڑ کر جارہا ہوں۔ میں نے تم سے محبت کی، مگر تم نے اُس کی قدر نہ کی۔ تم نے میرے دل کو بہت دُکھ دیا ہے...... خیر اب جاتا ہوں، مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔"

مجھے جاتا دیکھ کر وہ سخت مضطرب ہوگئی، اور میرا بازو پکڑ کر اور پھر اُسے فوراً ہی ڈرتے ہوئے چھوڑ کر، تھرائی ہوئی آواز میں صرف اِس قدر کہا: "آپ جارہے ہیں؟"

میں نے جواب دیا: "ہاں جارہا ہوں تاکہ تمہارے چاہنے والوں کے لیے میدان صاف ہوجائے۔"

"آپ نہ جائیے، اللہ کی قسم میرا کوئی چاہنے والا نہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں نم ناک ہوگئیں۔ "نہ جائیے، نہ جیئے نہ ...." آخری الفاظ اُس کی گلوگیر آواز میں دب گئے۔ اُس کا رونا میرے دل پر کچھ اثر نہ کرسکا۔ میں چل پڑا۔ مگر اس نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور روتی ہوئی آواز میں کہا: "آپ خفا کیوں ہوگئے ہیں۔ میں آئندہ کسی آدمی سے بات نہ کروں گی۔ اگر آپ نے مجھے کسی مرد کے ساتھ دیکھا تو آپ اس چھڑی سے جتنا چاہیے [چاہیں؟] پیٹ لیجیے گا۔" آئیے گھر چلیں، میں آپ کے لیے حقہ تازہ

کر کے لاؤں گی۔"

میں خاموش رہا اور اس کا ہاتھ چھوڑ کر پھر چل پڑا۔ اُس وقت بگو سے ایک منٹ کی گفتگو کرنا بھی[22] مجھے گراں گزر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ لڑکی میری نظروں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جائے۔ میں نے بمشکل دو گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ وہ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اُس کے بال پریشان تھے، آنکھوں کے ڈورے سرخ اور ابھرے ہوئے تھے، سینہ آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا۔

اس نے پوچھا: "کیا آپ واقعی جا رہے ہیں؟"

میں نے تیزی سے جواب دیا: "تو اور کیا جھوٹ[23] بک رہا ہوں۔"

"جایئے۔"

میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے اشک رواں تھے اور گال آنسوؤں کی وجہ سے میلے ہو رہے تھے مگر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک ناچ رہی تھی۔

"جایئے۔" یہ کہہ کر وہ الٹے پاؤں[24] مڑی۔ اُس کا قد پہلے سے لمبا ہو گیا تھا۔

میں نے نیچے اُترنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دور جا کر میں نے جھاڑیوں کے پیچھے سے رونے کی آواز سنی۔ وہ رو رہی تھی .... وہ تھرّائی ہوئی آواز ابھی تک میرے کانوں میں آ رہی ہے۔[25]

یہ ہے میری داستان ڈاکٹر صاحب! میں نے اُس پہاڑی لڑکی کی محبت کو ٹھکرا دیا۔ اس غلطی کا احساس مجھے پورے دو سال بعد ہوا جب میرے ایک دوست نے مجھے یہ بتایا کہ بگو نے میرے جانے [آنے؟] کے بعد اپنے شباب کو دونوں ہاتھوں سے لٹانا شروع کر دیا۔ اور دِق کے مریضوں سے ملنے کی وجہ سے، وہ خود اس کا شکار ہو گئی۔ پھر بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ اِس مرض نے بالآخر اُسے قبر کی گود میں سلا دیا۔ .... اُس کی موت کا باعث میرے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔ وہ زندگی کی شاہراہ پر اپنا راستہ تلاش کرتی تھی مگر میں اس کو بھول بھلیوں میں چھوڑ کر بھاگ آیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھٹک گئی۔ میں مجرم تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے لیے وہی موت تجویز کی جس سے وہ دوچار ہوئی۔ وہ وزن جو میں پانچ سال اپنی چھاتی پر اٹھائے پھرتا رہا ہوں، خدا کا شکر ہے کہ اب ہلکا ہو گیا ہے۔"[26]

میں، مریض کی داستان خاموشی سے سُنتا رہا۔ وہ بول چکا تو پھر بھی خاموش رہا...... میں نہیں چاہتا تھا کہ اُس کے جذبات پر رائے زنی کروں۔ چنانچہ وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ مجھے کئی مریضوں کی داستانیں سننے کا اتفاق ہوا ہے مگر یہ نہایت عجیب و غریب اور پُر اثر داستان تھی۔[27] گو مریض بیماری کی وجہ سے ہڈیوں

کا ڈھانچا رہ گیا تھا مگر حیرت ہے کہ اُس نے اپنے طویل بیان کو کس طرح جاری رکھا۔

صبح کے وقت میں اُس کا ٹمپریچر دیکھنے کے لیے آیا۔ مگر وہ مر چکا تھا۔ سفید چادر اوڑھے وہ بڑے سکون سے سو رہا تھا۔

جب اُس کو غسل دینے لگے تو ہسپتال کے ایک نوکر نے مجھے بُلایا:[۲۸] ''ڈاکٹر صاحب اس کی مٹھی میں کچھ ہے۔'' میں نے اُس کی بند مٹھی کو آدھا کھول کر دیکھا، لوہے کے دو کلپ تھے۔ اُس کی بیگو کی یادگار!

''ان کو نکالنا نہیں، یہ اِس کے ساتھ ہی دفن ہوں گے۔'' میں نے غسل دینے والوں سے کہا اور دل میں غم کی ایک عجیب و غریب کیفیت لیے[۲۹] دفتر چلا گیا۔

حواشی

(ان حواشی میں ص سے مراد: منٹو کے افسانے طبع اوّل (۱۹۴۰ء)
کا صفحہ ہے۔ دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

نوٹ اس افسانے کے بیشتر پارے، دیگر افسانوں کے مقابلے میں، بہت طویل ہیں۔ لہٰذا حواشی میں، اوّلین متن کے، مقابلتاً زیادہ لفظ درج کیے گئے ہیں تا کہ قاری کی نظر بہ آسانی حتی تبدیلیوں تک پہنچ سکے۔

۱۔ حلق سے اُتاری نہیں گئی... جانتا ہوں کہ میرے دونوں پھیپھڑے... مگر سینے پر مجھے
ایک وزنی انجن دوڑتا محسوس ہو رہا ہے... کسی مریض کی موت کو پسند... ص:۱۵۷
آپ کیا جانیں کہ اِس مدقوق سینے سے کیا کیا کچھ... میں جانتا تھا... تاریک
اڈّوں میں گزاری... مجھے یاد ہے کہ انہی اڈوں... کیچڑ میں لتھڑ تھڑ کرتے...
میں اس کو کیا بتاتا کہ میں... لکھ کر لٹکا چھوڑی ہے... جی چاہتا ہے کہ آج کسی
سے... اگر آپ نہ آتے... کفن خود پہننا ہوتا تو آپ دیکھتے کہ میں... ص:۱۵۸
ہاتھ سے نہیں جانے دے سکتا... اور کیا اب میں نہیں مر رہا... اس کا کوئی سکّہ
بھی کھوٹا... تو یہ انسانی دلوں کی داستانوں میں ایک دلچسپ اضافہ کرے گی، تب
دنیا... میری بکواس کو سنتے سنتے... اور میں موت کو چند قدم... بوٹوں کو ڈبوں
میں بند کیا جا رہا ہے... لاری میں سوار ہوتا ہوں... ایک ہوٹل میں کاٹنا پڑتی ہے۔ ص:۱۵۹
۲۔ آہ! یہ پہلی ملاقات کس قدر... وہ کچھ یاد کرتی مگر پھر بھول... فوراً ہی سر پھیر لیا...
تو میں اپنی طرف... جب میں نے اپنے دل میں ایک ناقابلِ بیان تلخی کو اس کی
دھڑکنوں میں حل ہوتے ہوئے محسوس کیا ص:۱۶۰

واقعے پر غور کرتا ہوٹل کو واپس... گولڈ فلیک کی یہ ڈبیاں ... اس طرف سیر کو گیا۔
جہاں وہ مجھے سڑک پر ملی تھی۔ میں دیر تک ... میں اٹھا اور ... ڈھلان تھی ...
جب میں موڑ مڑا ... سامنے پڑیں... نظر بھر کر دیکھنے... میں کچھ نہ بول سکا۔ ص:۱۶۱
اس کے باوجود کہ میں اُسے ... اُس کے قدم چونکہ تیز تھے ... چشم زدن
میں وہ چیڑ کے ... آئی اور اپنی جوان آنکھوں ص:۱۶۲
۳۔ اگر کسی روز آپ گر پڑیں... گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے ایضاً
۴۔ یہ کس قدر جوان ایضاً
۵۔ زبان سے نکلوانا... سنا ہے کہ ... آپ کیوں نہیں وہاں ص:۱۶۳
۶۔ یہ موقع اچھا... میں نے اُس سے ... کہ میں اُس سے ایضاً
۷۔ بھولے انداز سے ... آنے والی سعید ساعت ... پیار سے تیار کیا تھا۔ میں بستر
پر پڑا... متفکرانہ لہجے میں کہا۔ صص:۱۶۳ تا ۱۶۴
۸۔ آپ ایک عصمت باختہ ... ایک ٹوٹی ہوئی ہنڈیا ص.۱۶۳
۹۔ لہجے میں یہ کہا۔ تو میری آنکھوں ... مگر میں دیکھتا ہوں... یہ ہرگز باتیں نہ کرتا...
تعیش پسند مسافر... اپنے تعزز کو خطرے میں ... افسردہ بنا دیا ہوگا...
دوسری معمولی چیزیں ایضاً
نام ہی سے تعفن آنے لگا... میں خوب رویا... ایک بار اور آخری بار ... اُس روز
کی تلخی میرا حلق ... میں اُس کے قریب ... زبان پر قفل لگا دیا تھا، ص.۱۶۵
۱۰۔ کی کہانی سب سن ایضاً
۱۱۔ بھونچکا سی ہوگئی ایضاً
۱۲۔ ڈال کر دیکھو گی تو اپنی سیہ کاریوں کا نقشہ آنکھوں تلے ... پانی ہی نہیں لیتیں ص ۱۶۶
۱۳۔ محبت کیا جانے۔ کے بعد اضافہ: تم...... ... جب وہ سیر ... زندگی ہے؟ کے بعد کا حذف شدہ
جملہ: لعنت ہے ایسے شوق پر!! ایضاً
۱۴۔ میں فرطِ خشم سے ایضاً
۱۵۔ میں جب بول چکا... تھرتھراتی آواز میں کہا... شادی کے لیے کہا اور میں نے قبول
کیا... مجھ سے یہی کچھ کہا... مجھے کیا معلوم کہ آپ نے ... وہ مجھ سے یہی کہتے
رہتے ہیں کہ "بیگو... شروع کیا تھا... ماں کہہ رہی تھی صص ۱۶۶ تا ۱۶۷
۱۶۔ باعث ہوا ہے کہ ... نے اُسے نہ اُٹھنے دیا ص ۱۶۷
۱۷۔ گھاس چرانے کے لیے لے کر ... نہ بھینس چرایا کروں ص:۱۶۸
۱۸۔ کوئی دھیان نہ دیا... سچ سچ میں پگلی ہوں... مگر اس وقت میرا جی... اپرائے دل سے ایضاً
۱۹۔ دیوانگی کی ایک ... تم دیوانی ہو مگر ... ہوشیار ہو۔ ص:۱۶۹

۲۰۔ گھوڑی کی طرح... پریم ہوگیا ہے... آپ کے آنے پر میں نے...
باتیں کرنا بند کردیں...
''اس لیے'' کے بعد اضافہ: نہیں نہیں (بنیادی نسخہ، صفحہ:۲۳۶) — ص ۱۶۹

۲۱۔ چھڑی کے ساتھ جتنا چاہیں مجھے ماریں — ص.۱۷۰

۲۲۔ چل پڑا۔ بیگو سے ایک منٹ کی گفتگو کرنا بھی اُس وقت — ایضاً

۲۳۔ کیا میں جھوٹ — ایضاً

۲۴۔ وہ پچھلے پاؤں — ص.۱۷۱

۲۵۔ نظرثانی شدہ متن (ص:۲۳۷) میں ''... آرہی ہے۔'' کے بعد بھی عبارت مسلسل ہے
جبکہ طبع اوّل میں ''یہ ہے میری داستان...'' سے نئے پارے کا آغاز ہوا ہے۔ مدوّن
کے نزدیک طبع اوّل کا طریق راجح ہے۔ — ایضاً

۲۶۔ منٹو کے افسانے کی (جعلی) اشاعت بانجہ میں، آئندہ متن سے قبل،
ایک سطر سادی چھوڑی گئی ہے۔

۲۷۔ داستان کو خاموشی سے... جب وہ بول چکا... چنانچہ میں وہاں سے... اور پُر اثر تھی — ایضاً

۲۸۔ ''بابا'' کے بعد کے دو لفظ، اور کہا منٹو نے حذف کردیے۔ — ایضاً

۲۹۔ کیفیت لے کر — ایضاً

منتر

ننھا رام، ننھا تو تھا لیکن شرارتوں کے لحاظ سے بہت بڑا تھا۔ چہرے سے بے حد بھولا بھالا معلوم ہوتا تھا، کوئی خط یا نقش ایسا نہیں تھا جو شوخی کا پتہ دے۔ اُس کے جسم کا ہر عضو، بھدّے پن کی حد تک موٹا تھا۔ جب چلتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فٹ بال لڑھک رہا ہے۔ عمر بمشکل آٹھ برس کی ہوگی مگر بلا کا ذہین اور چالاک تھا لیکن اُس کی ذہانت اور چالاکی کا پتہ اس کے سراپے سے لگانا بہت مشکل تھا۔ مسٹر شنکر آچاریہ ایم اے، ایل ایل بی..... رام کے پتا، کہا کرتے تھے کہ ''منہ میں رام رام اور بغل میں چھری'' والی مثال [کہاوت؟] اس رام ہی کے لیے بنائی گئی ہے۔

رام کے منہ سے رام رام تو کسی نے سنا نہیں تھا مگر اُس کی بغل میں چھری کے بجائے ایک چھوٹی سی چھڑی ضرور ہوا کرتی تھی جس سے وہ کبھی کبھی ڈگلس فیئر بینکس یعنی بغدادی چور کی تیغ زنی کی نقل کیا کرتا تھا۔

جب رام کی ماں یعنی مسز راما شنکر آچاریہ اُس کو کان سے پکڑ کر اُس کے باپ کے سامنے لائیں تو وہ بالکل خاموش تھا۔ آنکھیں خشک تھیں۔ اس کا ایک کان جو اس کی ماں کے ہاتھ میں تھا، دوسرے کان سے بڑا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا مگر اُس کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنی ماں سے کھیل رہا ہے اور اپنے کان کو ماں کے ہاتھ میں دے کر ایک خاص قسم کا لُطف اٹھا رہا ہے جس کو دوسروں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ جب رام، مسٹر شنکر آچاریہ کے سامنے لایا گیا تو وہ آرام کرسی پر جم کر بیٹھ گئے کہ اس نالائق کے کان کھینچیں، حالانکہ وہ اس کے کان کھینچ کھینچ کر کافی سے زیدہ لمبے کر چکے تھے اور اس کی شرارتوں میں کوئی فرق نہ آنے پایا تھا۔ وہ عدالت میں قانون کے زور پر بہت کچھ کر لیتے تھے مگر یہاں اس چھوٹے سے لونڈے کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ چلتی تھی۔

ایک مرتبہ مسٹر راما شنکر آچاریہ نے کسی شرارت پر اُس کو پرمیشور کے نام سے ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا: ''دیکھ رام! تو اچھا لڑکا بن جا، ورنہ مجھے ڈر ہے پرمیشور تجھ سے خفا ہو جائیں گے۔''

رام نے جواب دیا تھا: ''آپ بھی تو خفا ہو جایا کرتے ہیں اور میں آپ کو منا لیا کرتا ہوں۔'' اور پھر تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے یہ پوچھا تھا: ''باپو جی، یہ پرمیشور کون ہیں؟''

مسٹر شنکر آچاریہ نے اُسے سمجھانے کے لیے جواب دیا تھا: ''بھگوان، اور کون ...... ہم سب سے بڑے۔''

''اِس مکان جتنے؟''

''اِس سے بھی بڑے...... دیکھ اب تو کوئی شرارت نہ کیجیو، ورنہ وہ تجھے مار ڈالیں گے!''

مسٹر شنکر آچاریہ نے اپنے بیٹے پر ہیبت طاری کرنے کے لیے پرمیشور کو اس سے زیادہ ڈراؤنی شکل میں پیش کرنے کے بعد یہ خیال کرلیا تھا کہ اب رام سدھر جائے گا اور کبھی شرارت نہ کرے گا۔ مگر رام نے جو اُس وقت [؟ مگر رام جو اُس وقت] خاموش بیٹھا تھا، اپنے ذہن کے ترازو میں پرمیشور کو تول رہا تھا، کچھ دیر غور کرنے کے بعد جب اُس نے [؟ کے بعد اُس نے] بڑے بھولے پن سے کہا تھا: ''باپو جی! آپ مجھے پرمیشور دکھا دیجیے۔'' تو مسٹر راما شنکر آچاریہ کی ساری قانون دانی اور وکالت دھری کی دھری رہ گئی[۳] تھی۔

کسی مقدّمے کا حوالہ دینا ہوتا تو وہ اُس فائل کو نکال کر [؟ اُس کا فائل نکال کر] دکھا دیتے یا اگر کوئی[۴] تعزیراتِ ہند کی کسی دفعہ کے متعلق سوال کرتا تو وہ اپنی میز پر سے وہ موٹی کتاب اٹھا کر کھولنا شروع کر دیتے جس کی جلد پر اُن کے اس لڑکے نے چاقو سے بیل بوٹے بنا رکھے تھے۔ مگر وہ پرمیشور کو پکڑ کر کہاں سے لاتے جس کے متعلق انہیں خود بھی اچھی طرح معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا ہے، کہاں رہتا ہے اور کیا کرتا ہے؟

جس طرح اُن کو یہ معلوم تھا کہ دفعہ ۳۷۹ چوری کے فعل پر عائد ہوتی ہے اُسی طرح ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ مارنے اور پیدا کرنے والے کو پرمیشور کہتے ہیں اور جس طرح ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ جس کے قانون بنے ہوئے ہیں، اُس کی اصلیت کیا ہے [کذا]۔ ٹھیک اسی طرح ان کو پرمیشور کی اصلیت معلوم نہ تھی۔ وہ ایم اے ایل ایل بی تھے مگر یہ ڈگری انہوں نے ایسی الجھنوں[۵] میں پھنسنے کے لیے نہیں بلکہ دولت کمانے کے لیے حاصل کی تھی۔

وہ رام کو پرمیشور نہ دکھا سکے اور نہ اُس کو کوئی معقول جواب ہی دے سکے۔ اس لیے کہ یہ سوال ان سے اس طرح اچانک طور پر کیا گیا تھا کہ اُن کا دل پریشان[۶] ہوگیا تھا۔ وہ صرف اس قدر کہہ سکے تھے: ''جا رام، جا، میرا دماغ نہ چاٹ، مجھے بہت کام کرنا ہے۔''

اِس وقت انہیں کام واقعی بہت کرنا تھا مگر وہ پرانی شکستوں کو بھول کر فوراً ہی اس نئے مقدّمے کا فیصلہ کر دینا چاہتے تھے۔

اُنہوں نے رام کی طرف خشم آلود نگاہوں سے دیکھ کر[۷] اپنی دھرم پتنی سے کہا: ''آج اس نے

کون سی نئی شرارت کی ہے ...... مجھے جلدی بتاؤ۔ میں آج اسے ڈبل سزا دوں گا۔''

مسز آچاریہ نے رام کا کان چھوڑ دیا اور کہا کہ ''اِس موئے نے تو زندگی وبال کر رکھی ہے۔ جب دیکھو ناچنا، تھرکنا، کودنا ...... نہ آئے کی شرم، نہ گئے کا لحاظ ...... صبح سے مجھے ستا رہا ہے۔ کئی بار پیٹ چکی ہوں مگر یہ اپنی شرارتوں سے باز ہی نہیں آتا۔ نعمت خانے میں سے دو کچے ٹماٹر نکال کر کھا گیا ہے۔ اب میں سلاد میں اِس کا سر ڈالوں۔''

یہ سُن کر مسٹر راما شنکر آچاریہ کو ایک دھکا سا لگا۔ وہ خیال کر رہے تھے کہ رام کے خلاف کوئی سنگین الزام ہوگا۔ مگر یہ سُن کر کہ اس نے نعمت خانے سے صرف دو کچے ٹماٹر نکال کر کھائے ہیں، انہیں سخت نا اُمیدی ہوئی۔ رام کو جھڑکنے اور کوسنے کے لیے اُن کی سب تیاری ایکا ایکی سرد پڑ گئی۔ اُن کو ایسا محسوس ہوا کہ ان کا سینہ ایک دم خالی ہو گیا جیسے ایک دفعہ ان کے موٹر کے پہیے کی ساری ہوا نکل گئی تھی۔ کچے ٹماٹر کھانا کوئی جُرم نہیں۔ اِس کے علاوہ ابھی کل ہی مسٹر راما شنکر آچاریہ کے ایک دوست نے جو جرمنی سے طِب کی سند لے کر آئے تھے، اُن سے کہا تھا کہ اپنے بچّوں کو کھانے کے ساتھ کچے ٹماٹر ضرور دیا کیجیے کیونکہ اُن میں کثرت سے وٹامنز ہوتے ہیں۔[۸] مگر اب چونکہ وہ رام کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے اور ان کی بیوی کی بھی یہی خواہش تھی، اس لیے انہوں نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد ایک قانونی نقطہ [؟ نکتہ] سوچا اور اُس انکشاف پر دل ہی دل میں خوش ہو کر اپنے بیٹے سے کہا: ''میرے نزدیک آ، اور جو کچھ میں تجھ سے پوچھوں، سچ سچ بتا۔''

مسز راما شنکر آچاریہ چلی گئیں اور رام خاموشی سے اپنے باپ کے پاس کھڑا ہو گیا۔

مسٹر راما شنکر آچاریہ نے پوچھا: ''تو نے نعمت خانے سے دو کچے ٹماٹر نکال کر کیوں کھائے؟''

رام نے جواب دیا: ''دو کہاں تھے۔ ماتا جی جھوٹ[۹] بولتی ہیں۔''

''تو ہی بتا کتنے تھے؟''

''ڈیڑھ ایک اور آدھا'' رام نے یہ الفاظ انگلیوں سے آدھے کا نشان بنا کر ادا کیے۔ ''دوسرے آدھے سے ماتا جی نے دوپہر کو چٹنی بنائی تھی۔''

''چلو ڈیڑھ ہی[۱۰] سہی، پر تو نے یہ وہاں سے اٹھائے کیوں؟''

رام نے جواب دیا: ''کھانے کے لیے۔''

''ٹھیک ہے، مگر تو نے چوری کی۔'' مسٹر راما شنکر آچاریہ نے قانونی نقطے [؟ نکتے] کو پیش کیا۔

''چوری!..... باپو جی، میں نے چوری نہیں کی، ٹماٹر کھائے ہیں۔ مگر یہ چوری کیسے ہوئی؟'' یہ کہتا ہوا رام[۱] فرش پر بیٹھ گیا اور غور سے اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔

''یہ چوری تھی...... دوسرے کی چیز کو اُس کی اجازت کے بغیر اُٹھالینا چوری ہوتی ہے۔'' مسٹر راما شنکر نے یوں اپنے بچّے کو سمجھایا، اور خیال کیا کہ وہ اُن کا مفہوم اچھی طرح سمجھ گیا ہے۔

رام نے فوراً[۲] کہا: ''مگر ٹماٹر تو ہمارے اپنے تھے ..... میری ماتا جی کے۔''

مسٹر راما شنکر آچاریہ ٹپٹا گئے، مگر فوراً اپنا مطلب واضح کرنے کی کوشش کی: ''تیری ماتا جی کے تھے، ٹھیک ہے، پر وہ تیرے تو نہیں[۳] ہوئے۔ جو چیز اُن کی ہے وہ تیری کیسے ہوسکتی ہے۔ دیکھ سامنے میز پر جو تیرا کھلونا پڑا ہے، اُٹھالا! میں تجھے اچھی طرح سمجھاتا ہوں۔''

رام اُٹھا اور دوڑ کر لکڑی کا گھوڑا اٹھالیا اور اپنے باپ کے ہاتھ میں دے دیا: ''یہ لیجیے۔''

مسٹر راما شنکر آچاریہ بولے: ''ہاں تو دیکھ، یہ گھوڑا تیرا ہے نا؟''

''جی ہاں۔''

''اب اگر میں اسے تیری اجازت کے بغیر اُٹھا کر اپنے پاس رکھ لوں تو یہ چوری ہوگی۔'' پھر مسٹر راما شنکر نے مزید وضاحت سے کام لیتے ہوئے کہا: ''اور میں چور۔''

''نہیں پتا جی آپ اسے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ میں آپ کو چور نہیں کہوں گا...... اور میرے پاس[۴] کھیلنے کے لیے ہاتھی جو ہے ...... کیا آپ نے ابھی تک دیکھا نہیں؟ ... کل ہی منشی دادا نے لاکے دیا ہے...... ٹھہریے، میں ابھی آپ کو دکھاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ تالیاں بجاتا ہُوا دوسرے کمرے میں چلا گیا اور مسٹر راما شنکر آچاریہ آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔

دوسرے روز مسٹر راما شنکر آچاریہ کو ایک خاص کام سے پُونا جانا پڑا۔ اُن کی بڑی بہن وہیں رہتی تھی۔ ایک عرصے سے وہ چھوٹے رام کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھی۔ چنانچہ ایک پنتھ دو کاج کے پیشِ نظر مسٹر راما شنکر آچاریہ اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے گئے۔ مگر اس شرط پر کہ وہ راستے میں کوئی شرارت نہ کرے گا[۵] تھا رام اس شرط پر بوری بندر اسٹیشن کے پلیٹ فارم تک قائم رہ سکا۔ اُدھر دکن کوئین چلی اور ادھر رام کے ننھے سے سینے میں شرارتیں مچلنا شروع ہوگئیں۔

مسٹر راما شنکر آچاریہ سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ کی چوڑی سیٹ پر بیٹھے اپنے ساتھ والے مسافر کا اخبار دیکھ رہے تھے۔ اور سیٹ کے آخری حصّے پر رام کھڑکی میں سے باہر جھانک رہا تھا اور ہوا کا دباؤ دیکھ کر یہ سوچ رہا

تھا کہ اگر وہ اُسے لے اُڑے تو کتنا مزہ آئے۔

مسٹر راما شنکر آچاریہ نے اپنی عینک کے گوشوں سے رام کی طرف دیکھا اور اس کو بازو سے پکڑ کر نیچے بٹھا دیا: ''تو چین بھی لینے دے گا یا نہیں ..... آرام سے بیٹھ جا۔'' یہ کہتے ہوئے اُن کی نظر رام کی نئی ٹوپی پر پڑی جو اُس کے سر پر چمک رہی تھی۔ ''اسے اُتار کر رکھ نالائق، ہوا سے اُڑ جائے گی۔''

انہوں نے رام کے سر پر سے ٹوپی اتار کر اُس کی گود میں[16] رکھ دی۔

مگر تھوڑی دیر کے بعد، ٹوپی پھر رام کے سر پر تھی اور وہ کھڑکی سے باہر[17] سر نکالے، دوڑتے ہوئے درختوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ درختوں کی بھاگ دوڑ، رام کے ذہن میں آنکھ مچولی کے دلچسپ کھیل کا نقشہ کھینچ رہی تھی۔

ہوا کے جھونکے سے اخبار دوہرا ہو گیا اور مسٹر راما شنکر آچاریہ نے اپنے بیٹے کے سر کو پھر کھڑکی سے باہر پایا۔ غصے میں انہوں نے اُس کا بازو کھینچ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور کہا کہ ''اگر تو[18] یہاں سے ایک انچ بھی ہلا تو تیری خیر نہیں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے ٹوپی اُتار کر اُس کی ٹانگوں پر رکھ دی۔

اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے اخبار اُٹھایا اور وہ ابھی اُس میں وہ سطر ہی ڈھونڈ رہے تھے جہاں سے انہوں نے پڑھنا چھوڑا تھا کہ رام نے کھڑکی کے پاس سرک کر، باہر جھانکنا شروع کر دیا۔ ٹوپی اُس کے سر پر تھی۔ یہ دیکھ کر مسٹر شنکر آچاریہ کو سخت غصہ آیا۔ اُن کا ہاتھ بھوکی چیل کی طرح ٹوپی کی طرف بڑھا اور چشم زدن میں وہ اُن کی سیٹ کے نیچے تھی۔ یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے ہُوا کہ رام کو سمجھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ مڑ کر اُس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا، مگر اُن کے ہاتھ خالی نظر آئے۔ اسی پریشانی میں اُس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو اسے ریل کی پٹری پر، بہت پیچھے، ایک خاکی کاغذ کا ٹکڑا اُڑتا نظر آیا...... اُس نے خیال کیا کہ یہ میری ٹوپی ہے۔

اِس خیال کے آتے ہی اس کے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ باپ کی طرف ملامت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے، اُس نے کہا: ''باپو جی...... میری ٹوپی!''

مسٹر شنکر آچاریہ خاموش رہے۔

''ہائے میری ٹوپی۔'' رام کی آواز بلند ہوئی۔

مسٹر شنکر آچاریہ کچھ نہ بولے۔

رام نے روئی آواز میں کہا: ''میری ٹوپی!'' اور اپنے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

مسٹر راما شنکر آچاریہ نے اُس کا ہاتھ جھٹک کر کہا: ''گرادی ہوگی تو نے..... اب روتا کیوں ہے؟''
اِس پر رام کی آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے۔

''پر دھکا تو آپ نے ہی دیا تھا۔'' اُس نے اتنا کہا اور رونے لگا۔

مسٹر راما شنکر آچاریہ نے ذرا ڈانٹ بتائی تو رام نے اور زیادہ رونا شروع کر دیا۔ انہوں نے اسے چپ کرانے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔ رام کا رونا صرف ٹوپی ہی بند کرا سکتی تھی۔ چنانچہ مسٹر راما شنکر آچاریہ نے تھک ہار کر اُس سے کہا: ''ٹوپی واپس آ جائے گی۔ مگر شرط یہ ہے کہ تو اُسے پہنے گا نہیں!''

رام کی آنکھوں میں آنسو فوراً خشک ہو گئے جیسے تپی ہوئی ریت میں بارش کے قطرے جذب ہو جائیں۔ سرک کر آگے بڑھ آیا: ''اُسے واپس لائیے۔''

مسٹر راما شنکر آچاریہ نے کہا: ''ایسے تھوڑی واپس آ جائے گی...... منتر پڑھنا پڑے گا۔''

کمپارٹمنٹ میں سب مسافر، باپ بیٹے کی گفتگو سن رہے تھے۔[19]

''منتر !'' یہ کہتے ہوئے، رام کو فوراً وہ قصہ[20] یاد آ گیا جس میں ایک لڑکے نے منتر کے ذریعے سے دوسروں کی چیزیں غائب کرنا شروع کر دی تھیں۔ ''پڑھیے پتا جی!''

یہ کہہ کر وہ خوب غور سے اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ گویا منتر پڑھتے وقت مسٹر راما شنکر آچاریہ کے گنجے سر پر سینگ اُگ آئیں گے۔

مسٹر راما شنکر آچاریہ نے اُس منتر کے بول یاد کرتے ہوئے جو انہوں نے بچپن میں ''اندر جال مکمل'' سے زبانی یاد کیا تھا، کہا: ''تو پھر شرارت تو نہ کرے گا؟''

''نہیں باپو جی۔'' رام نے جو منتر کی گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا، اپنے باپ سے شرارت نہ کرنے کا وعدہ کر لیا۔[21]

مسٹر راما شنکر آچاریہ کو منتر کے بول یاد آ گئے اور انہوں نے دل ہی دل میں اپنے حافظے کی داد دے کر، اپنے لڑکے سے کہا: ''لے اب تو آنکھیں بند کر لے۔''

رام نے آنکھیں بند کر لیں اور مسٹر راما شنکر آچاریہ نے منتر پڑھنا شروع کیا:

''اونگ نما کا میشری، مدمدیش اوتمادے بھرینگ پر اسواہ'' مسٹر راما شنکر آچاریہ کا ایک ہاتھ سیٹ کے نیچے گیا اور ''سواہ'' کے ساتھ ہی رام کی ٹوپی اُس کی گدگدی رانوں پر آ گری۔

رام نے آنکھیں کھول دیں...... ٹوپی اُس کی چپٹی ناک کے نیچے پڑی تھی اور مسٹر راما شنکر آچاریہ کی

نکیلی ناک کا بانسہ عینک کی سنہری گرفت کے نیچے تھرتھرا رہا تھا...... عدالت میں مقدمہ جیتنے کے بعد اُن پر یہی کیفیت طاری ہوا کرتی تھی۔

''ٹوپی آ گئی۔'' رام نے صرف اس قدر کہا اور چپ ہو رہا اور مسٹر راما شنکر آچاریہ، رام کو خاموش بیٹھنے کا حکم دے کر اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ ایک خبر کافی دلچسپ اور اخباری زبان میں ''بے حد سنسنی خیز'' تھی۔ چنانچہ وہ منتر وغیرہ سب کچھ بھول کر اُس میں ڈوب گئے۔[22]

دکن کوئین بجلی کے پروں پر پوری تیزی سے اُڑ رہی تھی۔ اُس کے آہنی پہیوں کی یک آہنگ گڑگڑاہٹ، اخبار کی سنسنی پیدا کرنے والی خبر کی ہر سطر کو بڑی سنسنی خیز بنا رہی[23] تھی۔ مسٹر راما شنکر آچاریہ یہ سطر پڑھ رہے تھے:

''عدالت پر سناٹا[24] چھایا ہوا تھا۔ صرف ٹائپ رائٹر کی ٹک ٹک سنائی دیتی تھی۔ ملزم ایکا ایکی چلّایا ...... باپو جی! ''

عین اس وقت رام نے اپنے باپ کو زور سے آواز دی: ''باپو جی!'' اور مسٹر راما شنکر آچاریہ کو یوں معلوم ہوا کہ زیرِ نظر سطر کے آخری الفاظ کاغذ پر اُچھل پڑے ہیں۔

رام کے تھرتھراتے ہوئے ہونٹ بتا رہے تھے کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔

مسٹر راما شنکر آچاریہ نے ذرا تیزی سے کہا: ''کیا ہے؟'' اور عینک کے ایک گوشے میں سے ٹوپی کو سیٹ پر پڑا دیکھ کر اپنا اطمینان کر لیا۔

رام آگے سرک آیا اور کہنے لگا: ''باپو جی! وہی منتر پڑھیے!''

''کیوں؟'' یہ کہتے ہوئے مسٹر راما شنکر آچاریہ نے رام کی ٹوپی کی طرف غور سے دیکھا جو سیٹ کے کونے میں پڑی تھی۔

''آپ کے کاغذ جو یہاں پڑے تھے، میں نے باہر پھینک دیے ہیں۔''

رام نے اِس سے آگے کچھ اور بھی کہا مگر مسٹر راما شنکر آچاریہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا ...... بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ اُٹھ کر، انہوں نے کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا، مگر ریل کی پٹری کے ساتھ تتلیوں کی طرح پھڑپھڑاتے ہوئے کاغذ کے پرزوں[25] کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔

''تو نے وہ کاغذ پھینک دیے ہیں جو یہاں پڑے تھے؟'' انہوں نے اپنے داہنے ہاتھ سے سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

رام نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''آپ وہی منتر پڑھیے نا!''

مسٹر راما شنکر آچاریہ کو ایسا کوئی منتر یاد نہ تھا جو سچ مچ کی کھوئی ہوئی چیزوں کو واپس لا سکے۔ وہ سخت پریشان تھے۔ وہ کاغذات جو اُن کے بیٹے نے پھینک دیے تھے، ایک نئے مقدمے کی مِسل تھی جس میں چالیس ہزار کی مالیت کے قانونی کاغذات پڑے تھے۔ مسٹر راما شنکر آچاریہ ایم اے، ایل ایل بی، کی بازی اُن کی اپنی چال ہی سے مات ہوگئی تھی۔ ایک لمحے کے اندر اندر اُن کے قانونی دماغ میں، کاغذات کے بارے میں سیکڑوں خیالات آئے۔ ظاہر ہے کہ مسٹر راما شنکر آچاریہ کے مؤکل کا نقصان اُن کا اپنا نقصان تھا۔ مگر اب وہ کیا کر سکتے تھے؟ ..... صرف یہ کہ اگلے اسٹیشن پر اُتر کر ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیں اور دس پندرہ میل تک اُن کاغذوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہیں۔ ملیں نہ ملیں اُن کی[26] قسمت۔

ایک لمحے کے اندر اندر سیکڑوں باتیں سوچنے کے بعد، آخر میں انہوں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر تلاش پر کاغذات نہ ملے تو وہ مؤکل کے سامنے سرے سے انکار ہی کر دیں گے کہ اُس نے اُن کو کبھی کاغذات دیے تھے۔ اخلاقی اور قانونی طور پر یہ سراسر ناجائز تھا مگر اس کے علاوہ، اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔

اس تسلّی بخش خیال کے باوجود مسٹر راما شنکر آچاریہ کے حلق میں تلخی سی پیدا ہو رہی تھی۔ ایکاایکی اُن کے دل میں آئی کہ کاغذوں کی طرح وہ رام کو بھی اُٹھا کر گاڑی سے باہر پھینک دیں مگر اس خواہش کو سینے میں ہی[27] دبا کر انہوں نے اُس کی طرف دیکھا۔

اُس کے ہونٹوں پر ایک عجیب وغریب سا تبسم[28] منجمد ہو رہا تھا۔

اُس نے ہولے سے کہا: ''باپو جی، منتر پڑھیے!''

''چپ چاپ بیٹھا[29] رہ، ورنہ یاد رکھ گلا گھونٹ دوں گا'' مسٹر راما شنکر آچاریہ بھنا گئے۔

اُس مسافر کے لبوں پر جو غور سے باپ بیٹے کی گفتگو سن رہا تھا، ایک معنی خیز مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

رام آگے سرک آیا۔ ''باپو جی! آپ آنکھیں بند کر لیجیے، میں منتر پڑھتا ہوں۔''

مسٹر راما شنکر آچاریہ نے آنکھیں بند نہ کیں لیکن رام نے منتر پڑھنا شروع کر دیا:

''اونگ میانگ شیانگ ...... لدمداگا ...... فرودما ...... سواہا۔'' اور سواہا کے ساتھ ہی[30] مسٹر راما شنکر آچاریہ کی گوشت بھری رانوں پر کاغذوں کا ایک پلندا آ گرا۔

اُن کی ناک کا بانسہ عینک کی سنہری گرفت کے نیچے زور سے کانپا۔

رام کی چپٹی ناک کے گول اور لال لال نتھنے بھی کانپ رہے تھے۔

حواشی

(اِن حواشی میں ص سے مراد: منٹو کے افسانے طبع اوّل (۱۹۴۰ء) کا صفحہ ہے۔ دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ وہ چہرے... جب وہ چلتا — ص:۱۷۳

۲۔ معلوم ہوتا تھا... ''مسکرا رہا تھا'' کے بعد کے محذوف جملے:
مگر اس مسکراہٹ میں بلا کا بھولا پن تھا۔ اُس کی ماں کا چہرہ غصے سے تمتمایا ہوا تھا۔
... یہ پتہ چلتا تھا... ''نہیں چاہتا'' کے بعد کا متن طبع اوّل میں جداگانہ پارے کے طور پر شائع ہوا ہے۔ — صص:۱۷۳ تا ۱۷۴

۳۔ ''مار ڈالیں گے!'' کے بعد کا متن، طبع اوّل میں سابقہ پارے کا جزو ہے... کوئی شرارت... پرمیشور دکھائیے! ... دھری رہ گئی۔ — ص:۱۷۴

۴۔ اُس کا فائل... کوئی اُن سے تحریریات — ایضاً

۵۔ ایسی اُلجھنوں — ص ۱۷۵
طبع اوّل کے لفظ: ''ایسی'' کی جگہ طبعِ چہارم یعنی بنیادی نسخے (ص:۲۴۱) میں ''نئی'' شائع ہوا ہے جبکہ معنوی لحاظ سے ''ایسی'' راجح ہے۔
منٹو راما (ص:۸۶۸) اور بانجھ (ص:۲۲۱) میں بھی ''ایسی'' طبع ہوا ہے۔ غالب گمان ہے کہ ''نئی'' سہوِ کتابت کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا حتمی متن میں ''ایسی'' لکھا گیا ہے۔

۶۔ یہ سوال ہی کچھ... اُن کا دماغ بالکل خالی — ص:۱۷۵

۷۔ غصے سے بھری ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے — ایضاً

۸۔ انہوں نے ایسا محسوس کیا... خالی ہو گیا ہے... ''نکل گئی تھی'' کے بعد کی عبارت طبع اوّل میں جداگانہ پارے کے طور پر شائع ہوئی ہے... ٹماٹر کھانا کوئی جرم نہیں تھا... طب کی اعلیٰ سند... وٹامنز ہوتی ہیں — ایضاً

۹۔ ماتا جی تو جھوٹ — ص:۱۷۶

۱۰۔ چلو تو ڈیڑھ ہی — ایضاً

۱۱۔ کہتا ہوا وہ — ایضاً

۱۲۔ رام نے فوراً ہی — ایضاً

۱۳۔ فوراً ہی اپنا... تیرے تو نہ — ایضاً

۱۴۔ ''اور میرے پاس'' اس فقرے میں اضافہ شدہ لفظ: اور — طبع چہارم، ص ۲۴۴

۱۵۔ شرارت نہ کرے۔ ص:۱۷۷
۱۶۔ گودی میں ایضاً
۱۷۔ کھڑکی کے باہر ایضاً
۱۸۔ اور کہا۔ ''اگر تو۔ ختمہ اور واوین منسوخ کر کے منٹو نے ''کہ'' لکھا۔ طبع چہارم، ص:۲۴۵
۱۹۔ طبع چہارم (ص:۲۷۴) میں یہ جملہ سابقہ عبارت کے ساتھ لکھا گیا ہے جبکہ طبع اوّل (ص ۱۷۸) منتورامنا (ص:۸۷۲) اور بانجھ (ص:۲۲۶) میں جداگانہ پارے کے طور پر شائع ہوا ہے۔ مدوّن کے نزدیک یہی راجح ہے۔
۲۰۔ فوراً ہی وہ قصہ ص:۱۷۹
۲۱۔ وعدہ کیا ایضاً
۲۲۔ کھو گئے ایضاً
۲۳۔ سطر کو صوتی مدد بخش رہی ایضاً
۲۴۔ عدالت میں سنانا ایضاً
۲۵۔ کاغذی پُرزوں ص:۱۸۰
۲۶۔ 'یہ اُن کی ایضاً
۲۷۔ تخمی پیدا... سینے ہی میں ص:۱۸۱
۲۸۔ رام کے ہونٹوں ... عجیب و غریب تبسم ایضاً
۲۹۔ آرام سے بیٹھا ایضاً
۳۰۔ ''سواہ'' اور سواہ کے ساتھ ہی ایضاً

میرا اور اُس کا انتقام

گھر میں میرے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔ پتا جی کچہری میں تھے اور شام سے پہلے کبھی گھر آنے کے عادی نہ تھے۔ ماتا جی لاہور میں تھیں اور بملا، میری بہن، اپنی کسی سہیلی کے ہاں گئی تھی۔ میں تنہا اپنے کمرے میں بیٹھا، کتاب لیے اونگھ رہا تھا کہ صدر دروازے پر دستک ہوئی۔ اُٹھ کر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ پاربتی ہے۔[1]

دروازے کی دہلیز پر کھڑے کھڑے اُس نے مجھ سے پوچھا: ''موہن صاحب! بملا اندر ہے کیا؟''

جواب دینے سے پیشتر ایک لمحے کے لیے پاربتی کی تمام شوخیاں میری نگاہوں میں پھر گئیں۔ اور جب میں نے سوچا کہ گھر میں کوئی متنفس موجود نہیں تو[2] مجھے ایک شرارت سوجھی، میں نے، جھوٹ بولتے ہوئے، بڑی بے پروائی کے انداز میں کہا:

''اپنے کمرے میں بلاؤز ٹانک رہی ہے۔''

یہ کہہ کر میں دروازے سے باہر گلی میں نکل آیا۔ بملا کا کمرہ بالائی منزل پر تھا۔ جب میں نے گلی کے روشن دان سے پاربتی کو سیڑھیاں چڑھتے دیکھا تو جھٹ سے دروازے میں داخل ہو کر اُس کو بند کر دیا اور کُنڈی چڑھا کر وہ قفل لگا دیا جو پاس ہی دیوار پر ایک کیل سے لٹک رہا تھا۔ دروازے میں تالا[3] لگانے کے بعد، میں اپنے کمرے میں چلا آیا اور صوفے پر لیٹ کر اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنتا رہا۔

پاربتی کے کردار کا ہلکا سا نقشہ یوں کھینچا جا سکتا ہے:

وہ بیک وقت ایک شوخ، چنچل اور شرمیلی لڑکی ہے۔ اگر اِس گھڑی آپ سے بڑی بے تکلفی سے بات کر رہی ہے تو تھوڑے ہی عرصے کے بعد آپ اُسے بالکل مختلف پائیں گے۔ شرارت اُس کی رگ رگ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ لیکن بعض اوقات اتنی سنجیدہ اور متین ہو جاتی ہے کہ اُس سے بات کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ محلّے بھر میں وہ اپنی قسم کی واحد لڑکی ہے، لڑکوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں اُسے خاص لُطف آتا ہے۔ اگر کوئی لڑکا، جواب میں، معمولی سا مذاق بھی کر دے تو اُسے سخت ناگوار گزرتا ہے۔ گلی کے نوجوانوں کے نازک جذبات سے کھیلنے میں اسے خاص لُطف آتا ہے۔ بلّی کی طرح وہ چاہتی ہے کہ چوہا اُس کے پنجوں کے نیچے دبکا رہے اور وہ اُس کو اِدھر اُدھر پٹخ پٹخ کر کھیلتی رہے، جب[4] اُکتا جائے تو چھوڑ کر چلی

جائے۔ کوٹھے پر چڑھ کر محلّے کے لڑکوں کے پتنگ توڑ لینے میں اسے ایک خاص مہارت حاصل ہے۔

ہمارے گھر میں اکثر اُس کا آنا جانا تھا۔ اس لیے میں اس کی شوخ طبیعت سے ایک حد تک واقف تھا۔ میرے ساتھ وہ کئی مرتبہ نوک جھونک کر چکی تھی۔ مگر میں دوسروں کی موجودگی میں جھینپ کر رہ جاتا تھا۔ مجھے اس سے نفرت نہ تھی۔ اس لیے کہ اس میں کوئی شے بھی ایسی نہیں جس سے نفرت کی جاسکے۔ البتہ اس کی طبیعت کسی قدر اُلجھی ہوئی تھی۔ اور اس کی حد سے زیادہ شوخی، بعض اوقات میرے جذبات پر بہت گراں گزرتی تھی۔ اگر میں سب کے سامنے اس کی پھُل جھڑی ایسی زبان کو (جس سے کبھی تیز وتند اور کبھی نرم و نازک شرارے نکلتے تھے) اپنی گویائی کی قوت پر زور دے کر بند کرسکتا تو مجھے یہ شکایت ہرگز[۵] نہ ہوتی، بلکہ اُس میں خاص لطف بھی حاصل ہوتا۔ مگر یہاں، موجودہ نظام کی موجودگی میں، اس قسم کے خواب کیونکر پورے ہوسکتے ہیں!

پاربتی کے متناسب جسم میں جملہ خوبیاں بھری پڑی تھیں۔ دوشیزگی اُس کے ہر عضو میں سانس لیتی تھی۔ آنکھوں میں دھوپ اور بارش کے تصادم ایسی چمک، گدرائے ہوئے جوبن کا دل کش اُبھار، آواز میں: صبح کی خاموش فضا میں مندر کی گھنٹیوں کی صدا ایسی حلاوت، اور چال... ایسے الفاظ نہیں ہیں کہ اُس کے خرام کا نقشہ پیش کیا جاسکے۔

گھر خالی تھا، دوسرے لفظوں میں میدان صاف تھا، اِس لیے میں نے، موقع بہت مناسب خیال کیا اور اُس سے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ میری عرصے سے خواہش[۶] تھی کہ اس پھسل جانے والی مچھلی کو ایک بار پکڑ کر، اتنا ستاؤں، اتنا ستاؤں کہ رو دے اور کچھ عرصے کے لیے اپنی تمام شوخیاں بھُول جائے۔

میں کمرے میں بیٹھا تھا کہ وہ، حسبِ توقع، گھبرائی ہوئی آئی اور[۷] کہنے لگی:

''دروازے میں تالا لگا ہوا ہے!''

میں بناوٹی حیرت سے مضطرب ہوکر، یکا یک اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''کیا کہا؟''

''صدر دروازے میں تالا لگا ہوا ہے!''

''باہر[۸] سے گلی کے اُن گندے انڈوں نے تالا لگا دیا ہوگا!''

یہ کہتا ہوا میں اُس کے پاس آگیا [پہنچ گیا؟]۔

اِس پر پاربتی نے کہا: ''نہیں، نہیں، تالا تو اندر سے لگا ہوا ہے!''

''اندر سے؟......اور بملا کہاں ہے؟''

''اپنے کمرے میں تو نہیں۔ کونے کونے میں دیکھ آئی ہوں۔ کہیں بھی نہیں ملی''۔

''تو پھر اُسی نے یہ شرارت کی ہے۔ جاؤ دیکھو! باورچی خانے، غسل خانے میں، یا ادھر اُدھر کہیں چھپی ہوگی...... تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا''

یہ کہہ کر، میں واپس مڑ کر صوفے پر لیٹ گیا اور وہ بملا کو ڈھونڈنے چلی گئی۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد پھر آئی اور کہنے لگی:

''میں نے تمام گھر چھان مارا، پر ماتما جانے کہاں چھپی ہے۔ آج تک میرے ساتھ اُس نے اس قسم کی شرارت نہیں کی لیکن آج جانے " اُسے کیا سوجھی ہے؟''

پاربتی صوفے کے پیچھے کھڑی تھی۔ میں نے اُس کی بات سُنی اور پاس پڑے ہوئے اخبار کے اوراق کھولتے ہوئے کہا:

''مجھے خود تعجب ہو رہا ہے۔ صحن کے ساتھ والے کمروں میں جا کر تلاش کرو، وہیں کسی پلنگ کے نیچے چھپی بیٹھی ہوگی۔''

یہ سن کر پاربتی یہ کہتی ہوئی چلی گئی:

''اُسے میری شرارتوں کا علم نہیں۔ خیر، سو سُنار کی، ایک " لُہار کی!''

اُس کو مضطرب دیکھ کر میرا جی باغ باغ ہو رہا تھا۔ اس تیتری کو اپنی ہوشیاری پر کتنا ناز تھا! میں ہنسا، اس لیے کہ اُس کے پھڑ پھڑانے والے پر، میری گرفت میں تھے اور میں بڑے مزے سے اُس کے اضطراب کا تماشا کر سکتا تھا۔

میں اپنے ذہن میں اِس ہونے والے ڈرامے کا تمام پلاٹ تیار کر چکا تھا اور اُس پر عمل کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر آئی۔ اس مرتبہ سخت جھلائی ہوئی تھی۔ داہنے کان سے بہت نیچے، بالوں کا ایک گچھا، کلپ کی گرفت سے آزاد ہو کر ڈھلک آیا تھا۔ ساڑی سر پر سے اُتر گئی تھی اور وہ بار بار اپنے گرد بھرے ہاتھوں کو ایک ننھے رومال سے پونچھ رہی تھی۔ کمرے میں داخل ہو کر [وہ] میرے " سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں نے اُس سے لیٹے لیٹے دریافت کیا: ''کیوں کامیابی ہوئی کیا؟''

اُس نے تھکی ہوئی آواز میں جواب دیا: ''نہیں، میں اب یہاں بیٹھ کر اُس کا انتظار کرتی ہوں۔''

''ہاں۔ بیٹھو، میں ذرا اُوپر ہو آؤں۔'' یہ کہہ کر میں اُٹھا اور [اوپر؟] چلا گیا۔

بالائی منزل کی چھت پر میں پندرہ بیس منٹ تک ٹہلتا رہا۔ چابی میری جیب میں تھی۔ اس لیے مجھے معلوم تھا کہ پاربتی کسی صورت میں بھی گھر سے باہر نہیں جاسکتی اور یہ احساس میرے دل میں ایک ناقابل بیان مسرّت پیدا کررہا تھا۔ میدان بالکل صاف تھا اور میں اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ پاربتی کی دوسروں پر ہنسنے والی آنکھوں کی چمک، ایک لمحے کے لیے ماند پڑ جائے اور اُس کو معلوم ہوجائے کہ مرد کے پاس نسوانی شرارتوں کا بہت کڑا جواب موجود ہے۔

یہ کھیل بہت خطرناک تھا کیونکہ اِس بات کا ڈر تھا کہ وہ پتا جی، ماتا جی یا بملا کو تمام بیتے ہوئے واقعات سُنا دے گی۔ اُس صورت میں گھر والوں کی نگاہوں میں میرے وقار کی تذلیل یقینی تھی۔ مگر چونکہ میرے سر پر اُس دلچسپ انتقام کا بھوت سوار تھا جو میں نے اس شوخ لڑکی کے لیے تجویز کیا تھا۔ اس لیے، کچھ عرصے کے لیے یہ تمام چیزیں میری آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تھیں۔ میں اپنے دل سے سوال کرتا تھا کہ نتیجہ کیا ہوگا؟ لیکن اس کا جواب میری پوزیشن کی صحیح تصویر دکھانے کی بجائے پاربتی ..... شکست خوردہ پاربتی، کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا تھا...... میں بے حد مسرور[۱۳] تھا۔

کچھ عرصہ بالائی منزل پر ٹہلنے کے بعد، میں نیچے آیا۔ پاربتی کرسی پر بیٹھی سخت اضطراب کی حالت میں اپنی خوب صورت ٹانگ ہلا رہی تھی جس پر ریشمی ساڑی کا کپڑا ادھر اُدھر تھرک رہا تھا۔

میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اُس سے پوچھا: ''کیوں بملا ملی؟''

''نہیں، میں نے ایک بار پھر سب کمروں کو چھان مارا ہے۔ لیکن وہ ایسی غائب ہوئی ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔''

میں مسکرادیا۔ ''چلو ہم دونوں مل کر اُس کو ڈھونڈیں، تم اس قدر گھبرا گئی ہو، تم تو بڑی نڈر[۱۴] اور بے باک لڑکی ہو۔''

''گھبرانے کی کوئی بات نہیں، لیکن مجھے بہت جلد گھر واپس جانا تھا!'' پاربتی کے لبوں پر ایک نہایت ہی پیارا تبسّم پیدا ہوا۔

ہم دونوں ایک عرصے تک: نیچے صحن میں، پلنگوں کے نیچے، چارپائیوں کے پیچھے، میزوں کے ادھر اُدھر، پردوں کو ہٹا ہٹا کر، بملا کو تلاش[۱۵] کرتے رہے مگر وہ گھر پر ہوتی تو ملتی۔ آخر کار میں نے، خود کو سخت متعجب ظاہر کرتے ہوئے، پاربتی سے کہا: ''حیرت ہے، تم ہی بتاؤ، آخر بملا گئی کہاں؟''

پاربتی جو بار بار جھکنے، اُٹھنے اور بیٹھنے سے بہت تھک گئی تھی، اپنی پیشانی سے پسینے کے ننھے ننھے

قطروں کو پونچھتی ہوئی بولی:

''میں کیا جانوں؟ زمین کھا گئی یا بھوت پریت اٹھا کر لے گئے[16] یہ آپ ہی کی بہن کی کارستانی ہے۔ خیر، کوئی ہرج کی بات نہیں۔ میں بھی ایسا ستاؤں گی کہ عمر بھر یاد رکھے گی! بملا ہزار ہو، مجھ سے اُڑ کر کہاں جائے گی؟''

میں خاموش رہا اور اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس وقت ہم ماتا جی کے کمرے میں تھے۔ پاربتی میرے سامنے ٹائیلٹ میز کے قریب کھڑی تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ قطعی طور پر خالی الذہن ہے۔ غیر ارادی طور پر وہ بار بار میز کے گول آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ رہی تھی اور ٹانگوں پر سے اپنی ساڑی کی شکنیں درست کر رہی تھی۔ دفعتاً کمرے کے مکمل سکوت سے باخبر ہو کر، وہ سخت مضطرب ہو گئی اور مجھ سے کہنے لگی:

''موہن صاحب! مجھے گھر جانا ہے، جتنا جلد جانا چاہتی ہوں، اُتنی دیر ہوتی جاتی ہے۔ بملا کے اب پر لگ گئے ہیں، شاید میرے ہاتھوں[17] اُس کی شامت آئی ہے۔''

''ہاں، ہاں۔ مگر میں کیا کر سکتا ہوں؟ آپ جانیں اور وہ، اس میں میرا کیا قصور ہے اور اگر[18] آپ کو سچ مچ جلدی جانا ہے تو کہیے، میں آپ کی کمر میں رسّی باندھ کر چھت سے لٹکا دوں؟ کہیے تو تالا توڑ دوں؟ اب آپ کی جو رائے ہو؟''

اُس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور جواب دیا: ''مجبوری ہے، تالا تو توڑنا ہی پڑے گا۔''

''لیکن'' میں نے کرسی پر سے اُٹھتے ہوئے کہا: ''تالا بہت بڑا ہے اور اُس کو توڑنے کے لیے بہت سی دِقّتیں پیش آئیں گی۔ اس کے علاوہ ہتھوڑے کی چوٹوں کی آواز سُن کر، لوگ کیا کہیں گے؟''

یہ سُن کر وہ سنجیدہ ہو گئی اور کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی: ''لیکن مجھے گھر بھی تو جانا ہے، لوگ کیا کہیں گے! ہم کسی غیر کے گھر میں سیندھ تھوڑی لگا رہے ہیں! اپنے گھر کا تالا توڑ رہے ہیں۔ بےَ بےَ، آج میں کس ساعت سے[19] آئی تھی؟ اب کیا ہوگا، میں کس طرح گھر جاؤں، ہائے رام کس بلا میں پھنس گئی!!!''

میرا وار خالی گیا، دراصل میں یہ چاہتا تھا کہ وہ اُس ماحول کی نزاکت سے اچھی طرح آگاہ ہو جائے جس میں کہ وہ اِس وقت موجود تھی۔ چنانچہ میں نے بات کو ذرا وضاحت سے بیان کیا: ''ماتا جی لاہور گئی ہیں،[20] پتا جی باہر ہیں اور بملا غائب ہے! اس صورت میں...'' میں یہ کہتے کہتے رُک گیا اور پھر اس فقرے کو یوں پورا کر دیا: ''تالا توڑنا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔''

اب کی دفعہ تیر نشانے پر بیٹھا، پاربتی کے سپید چہرے پر ہلکی سی سرخی چھا گئی اور ایک لمحے کے لیے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے گالوں پر گلاب کی پتیاں بکھر گئی ہیں۔ وہ اپنی ریشمیں ساڑی میں سمٹی، کانپی، تھرّائی، پارے کی طرح تڑپی اور کچھ کہتی کہتی خاموش ہوگئی۔ میں نے اِس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ہمدردانہ لہجہ میں کہا:

''تم خود سوچ سکتی ہو، ویسے مجھے کوئی عذر نہیں!''

وہ پیچ وتاب کھا کر رہ گئی، میں اُس کو مضطرب دیکھ کر بہت مسرور ہو رہا تھا۔ کل کی چلبلی، شوخ وشنگ اور طرّار لڑکی جو بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی بجلی کی طرح چمکا کرتی تھی، آج دِیے کی لَو بن کر رہ گئی تھی جو میری پھونک کے رحم [رحم وکرم؟] پر تھی۔

ساحل کے پتھروں سے ٹکرا کر پلٹتی ہوئی لہر کی طرح، اُس نے اپنے آپ میں نئی تازگی پیدا کر کے کہا:

''میری تو جان پر بنی ہوئی ہے اور آپ ہیں کہ چبا چبا کر باتیں کیے جا رہے[21] ہیں۔''

''کون سی بات؟''

''یہی، یہی کہ لوگ کیا کہیں گے؟'' اُس نے اپنے شرمیلے جذبات پر پوری قوت سے قابو پاتے ہوئے کہا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا اور زیرِ لب گنگنانے [بُد بُدانے؟] لگا:[22]

''ماتا جی لاہور گئی ہیں، پتا جی باہر ہیں اور بملا گم ہے۔''

''آپ کون سی نئی بات کر رہے ہیں! یہ تو مجھے بھی معلوم ہے، سوال تو یہ ہے کہ بملا کہاں ہے؟''[23]

''اوپر ہوگی اور کہاں؟''

''اوپر؟ اُوپر کی خوب کہی، میں اُوپر چپّہ چپّہ ڈھونڈ آئی[24] ہوں۔''

''تم اُسے نیچے ڈھونڈتی ہوگی تو وہ دوسری سیڑھیوں سے اُوپر چلی جاتی ہوگی۔ جب تم اُوپر جاؤ گی تو وہ نیچے آجائے گی۔ یہ ایک بات[25] میرے ذہن میں آتی ہے اور...''

''اس کا علاج ہوسکتا ہے۔'' پاربتی نے اپنے داہنے گال پر انگلی سے ایک نہایت دل کش گڑھا بناتے ہوئے کہا: ''میں اُوپر جاتی ہوں۔ اور آپ ایسا کیجیے کہ دوسری سیڑھیوں پر کھڑے ہوجایئے اور جوں ہی وہ نیچے اُترے اُسے پکڑ لیجیے۔''[26]

''میں نے اُس کی تجویز کو سُنا اور کہا: ''لیکن شاید وہ اصل میں یہاں موجود ہی نہ ہوگی۔''

''یہاں موجود نہ ہو!''[27] میری بات سُن کر پاربتی کا سر ضرور چکرا گیا ہوگا۔

''ہاں، ہوسکتا ہے، اس لیے کہ اگر ہوتی تو مل نہ جاتی؟''

''کیا ہوسکتا ہے؟ وہ یہاں نہ ہو، تو پھر دروازے کو تالا کس نے لگا دیا[۲۸] ہے۔ یہ کہیں آپ کی شرارت تو نہیں، سچ کہیے؟''

''مجھے کیا معلوم، میرا خیال ہے کہ بملا اپنی کسی سہیلی کے ہاں گئی ہوگی۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ صبح اپنی ساڑی اِستری[۲۹] کر رہی تھی!''

''آپ کیا کہہ رہے[۳۰] ہیں؟'' پاربتی کی حیرت لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہی تھی۔ ''اگر وہ کسی سہیلی کے ہاں گئی ہے تو پھر تالا کس نے لگایا ہے...... یہ کیا شرارت ہے؟''

''حیران ہونے کی کوئی بات نہیں، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ اپنی سہیلی ہی کے ہاں گئی ہے۔ اس لیے کہ جاتے وقت وہ سنتو کو ہم راہ لیتی گئی تھی۔ اب مجھے یاد آیا۔ باقی رہا میں، تو آپ ہی بتائیے، میں آپ کو کیوں قید کرنے لگا۔ پر اتنا ضرور کہوں گا، بڑی دلچسپ مچھلی جال میں پھنسی ہے۔''

''آپ کیا کہہ رہے ہیں... تو پھر... تو پھر... یہ شرارت...'' وہ اپنے فقرے کو پورا نہ کرسکی۔

''ہاں، یہ شرارت میں بھی تو کرسکتا ہوں۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''آپ کا خیال ہے کہ[۳۱] میں اس کا اہل نہیں؟...... شاید میں نے آپ سے کسی وقت کا بدلہ لیا ہو؟''

پاربتی کی حالت عجیب و غریب تھی، بند بھاپ کی طرح وہ باہر نکلنے کے لیے بے قرار ہو رہی تھی۔ اُس نے میری طرف تیز نگاہوں سے دیکھا، جیسے میرے سینے میں امرار کر جانا چاہتی ہے لیکن میں ایک کامیاب ایکٹر کی طرح اپنا پارٹ نبھا رہا تھا۔

اُس نے اپنی آنکھ کی پتلیوں کو نچاتے ہوئے دریافت کیا: ''لیکن اس شرارت کی وجہ؟''

''مجھے[۳۲] معلوم نہیں!''

وہ خاموش ہوگئی۔ پھر یکا یک جیسے اسے کچھ یاد آگیا، کہنے لگی:

''موہن صاحب! مجھے گھر جانا ہے!''

''مجھے[۳۳] معلوم ہے، پر یہ تو بتائیے، کیا کسی نے آپ کا ہاتھ پکڑا ہے؟''

''تو دروازہ[۳۴] کھول دیجیے۔'' یہ کہنے کے بعد اس نے کچھ سوچا اور کہا: ''لیکن آپ کس طرح کہہ رہے ہیں کہ تالا آپ نے لگایا ہے، کیا بملا واقعی یہاں نہیں ہے؟''

''مجھے یقین ہے کہ وہ یہاں نہیں ہے، اس لیے کہ میں خود اُسے رام گلی میں چھوڑ کر آیا ہوں اور میں

نے ان ہاتھوں سے قفل لگایا ہے۔'' میری گفتگو کا انداز نہایت متین اور سنجیدہ تھا۔

''آپ نے قفل کیوں لگایا؟'' پاربتی نے نہایت تیزی سے دریافت کیا۔'' دیکھا! میں نہ کہتی تھی، یہ آپ ہی کی کارستانی ہے۔''

''کیوں لگایا، اس لیے کہ میں نے لگا دیا۔ اور میں نے نہیں لگایا۔ اور میں نے نہیں لگایا[۳۵] میرے ہاتھوں نے لگایا ہے۔''

''یہ بھی کوئی بات ہے؟''

''میں کرسی پر سے اُٹھا اور جمائی لے کر کہا: ''رات کو دیر تک باہر رہنے سے پوری نیند نہیں سو سکا۔[۳۶] میرا خیال ہے، اب سونا چاہیے۔''

''چابی دے دیجیے، پھر آپ سو سکتے ہیں۔ ورنہ میں قیامت برپا کر دوں گی۔'' پاربتی نے سخت اضطراب کی حالت میں، چابی کے لیے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

''چابی... چابی۔'' میں نے اپنی قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کہا: ''مگر وہ تو گُم ہو گئی ہو گی۔ نہ معلوم کس نے اُڑن چُھو کر ڈالی۔ اب کیا ہو گا؟''

یہ سن کر پاربتی خشم آلود ہو کر بولی: ''گُم ہو گئی، یعنی آپ کو پہلے سے ہی معلوم تھا کہ گُم ہو جائے گی۔ موہن صاحب! داہنے ہاتھ سے [سیدھے ہاتھ سے؟] چابی نکال کر دے دیجیے، یہ شرارتیں جوان لڑکیوں کے ساتھ اچھی[۳۷] معلوم نہیں ہوتیں، ورنہ میرا نام پاربتی ہے پاربتی، مجھے کوئی ایسی ویسی لڑکی نہ سمجھیے گا۔''

''چابی واقعی گُم ہے!'' میں نے پہلی سی متانت کے ساتھ جواب دیا۔'' اور تمہیں اس قدر تیز ہونے کی ضرورت نہیں، بے کار تم مجھ پر اس قدر گرم ہو رہی ہو۔''

''چابی گُم کہاں ہوئی، مجھے بھی[۳۸] تو معلوم ہو؟'' پاربتی اب ہوا سے لڑنا چاہتی تھی۔'' آخر آپ کی جیب سے کوئی جنات لے گیا۔''

''اگر تمہیں معلوم ہو جائے تو کیا کر لو گی؟ دروازہ بند ہے اور میں نے اُسے گلی میں پھینک دیا ہے۔ لو اب صاف سنو۔ میں نے دروازے کی دراز سے دیکھا کہ جب میں نے گلی میں پھینکی تو کُتّے نے ہڈی سمجھ کر منہ میں دبوچ لی[۳۹] اور نگل گیا۔ اب وہ کُتا ڈھونڈا جائے، اُس کا پیٹ چیرا جائے، تب کہیں ملے۔''

یہ سن کر وہ جھلا کر رہ گئی اور زیادہ تیز[۴۰] آواز میں کہا: ''آپ کو اس شرارت کا جواب دینا ہو گا۔''

''کیسے؟''

''یہ بعد میں معلوم ہو جائے گا۔''

میں نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا: ''تو پھر یہ بعد کی بات ہے۔ اُس وقت دیکھا جائے گا۔ اب ہمیں، حال پر غور کرنا ہے۔ کُتّے کے پیٹ میں کہیں کُنجی گھل نہ گئی ہو۔''

وہ خاموش ہوگئی اور میں بھی چُپ ہوگیا۔ کمرے پر مکمل سکوت[۲۱] طاری تھا۔ وہ ٹائیلٹ میز کے قریب متحیر کھڑی تھی اور غالباً اپنی بے بسی پر کُڑھ رہی تھی۔

''آپ دروازہ[۲۲] نہیں کھولیں گے؟'' اُس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''دیکھیے مجھے نہ ستائیے، ورنہ اِس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔''

''میرے پاس چابی نہیں، اس لیے مجبور ہوں، ہاں البتہ شام کو دروازہ کھولا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ شاید اُس وقت تک تلاش کرنے پر مل جائے''[۲۳]۔

''اور میں اُس وقت تک یہیں قید رہوں گی؟''

''نہیں، تم بڑی خوشی سے صحن میں، کمروں میں، کوٹھوں پر، جہاں چاہو کُود سکتی ہو، گا سکتی ہو، مجھے کوئی عذر نہیں۔''

''پر ماتما[۲۴] جانے، آپ کو کیا ہوگیا ہے؟'' وہ میری گفتگو کے انداز پر سخت حیرت زدہ تھی۔

''میں اچھا بھلا ہوں لیکن کبھی کبھی تفریح بھی تو ہونی چاہیے۔ کیا تم اس کی قائل نہیں ہو؟ کیا تم کبھی ایسا تفریح (تفریحی؟) مذاق[۲۵] نہیں کرتیں؟''

''مجھے گھر جانا ہے موہن صاحب!'' اس نے میرے سوال کا جواب دیا[۲۶]۔

''تم بالکل صحیح کہہ رہی ہو۔ تمہیں گھر جانا ہے۔ گھر گیا پانی سے بھر، اور اُس میں بڑے بڑے بچھوؤں کا ڈر! لیکن بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''چابی دے دیجیے، بہت ستا چکے، اب نہ ستائیے۔''

''دیوی جی، مجھے افسوس ہے کہ وہ کم بخت ناشدنی گُم ہوگئی ہے۔''

''گُم ہوگئی ہے، گُم ہوگئی ہے،[۲۷] آپ نے یہ کیا رٹ لگا رکھی ہے؟ آپ چابی کیوں نہیں دیتے؟''

''میرے پاس نہیں ہے سرکار، کُتّے کے پیٹ میں ہے۔''

''موہن صاحب! لڑکیوں سے اِس طرح کا مذاق روا نہیں، کُتّے کا پیٹ آپ کی جیب ہے۔''

''اچھا تو یوں ہی ہوگا۔''

"یوں ہی ہوگا، چابی لائیے میں جانا چاہتی ہوں۔"

"میں ایک بار نہیں، سو بار کہہ چکا ہوں کہ چابی میرے پاس نہیں ہے، نہیں ہے، نہیں ہے۔"

"چابی آپ کے پاس ہے۔ آپ کے پاس ہے۔ آپ کے پاس ہے!"

"میرے پاس نہیں، نہیں، نہیں ہے۔"

"نہیں، آپ ہی کے پاس ہے، ہے، ہے۔" اس نے "ہے" کو سو مرتبہ دہراتے ہوئے کہا۔

"اچھا نہیں تھی[۴۸] تو ہے۔"

"تو لائیے، جیب سے نکالیے۔"

"میں نہیں دوں گا۔"

"آپ کو دینا پڑے گی۔"

"کوئی زور ہے؟"

"میں چلّانا شروع کردوں گی۔" اس نے مجھ پر رُعب[۴۹] گانٹھا۔

"بصد شوق۔" میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "مگر تم کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ناحق اپنا گلا پھاڑو گی۔ حلق تھکاؤ گی ...... کچھ بھی نہ ہوگا۔ روپیٹ کے دیکھ لو۔ میں جھوٹ نہیں کہتا ...... اِس کمرے میں کوئی روشن دان نہیں۔ دروازوں پر جتنے پردے لٹک رہے ہیں، سب کے سب دبیز ہیں۔ مجھے بچپن ہی میں اس کا کئی مرتبہ تلخ تجربہ ہو چکا ہے کہ یہاں سے بلند سے بلند آواز بھی باہر نہیں جاسکتی۔ ماتاجی، احتیاطاً مجھے اس کمرے میں پیٹا کرتی تھیں۔ میں اُس مار سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے زور سے زور سے چلّایا کرتا تھا کہ پتاجی میری آواز سن لیں[۵۰] مگر بے سود ...... تم بے کار چلّاؤ گی۔"

پاربتی نے میری بات سنی[۵۱] اور ہارے ہوئے انسان کی طرح کہا: "لیکن آپ چابی نہیں دیں گے؟"

"مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ نہیں۔"

"کیوں؟[۵۲] اس کا سبب؟"

"پھر وہی مہمل سوال۔"

"آپ کا مذاق حد سے زیادہ بڑھ رہا ہے۔" اُس نے اپنی ساڑی کے گرتے ہوئے پلّو کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "میں یہ سب معاملہ حرف بحرف، جیسے کا تیسا، بملا کو سُنادوں گی۔"

"بڑے شوق سے، میں آج شام کو دہلی جارہا ہوں۔ اس کے علاوہ، بے چاری بملا کر بھی کیا سکے گی؟"[۵۳]

''وہ آپ کے پتاجی سے شکایت کرے گی۔''

''میری ایک خشم آلود جھڑکی، اُس کی زبان بند کرنے کے لیے کافی ہوگی۔''

''تو میں خود اُن سے سب کچھ کہہ دوں گی۔''

''جو دل میں آئے کر لینا۔ اس وقت اُس کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے۔''

''میں نے کہنے کو تو یہ کہہ دیا مگر دل میں بہت ڈرا، پتاجی گو نرم دل تھے مگر اس قسم کی شرارت کا حال سن کر ان کا رنجیدہ ہونا لازم تھا۔ بہرحال میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر پاربتی نے اُن سے کہہ دیا، تو میں سر جھکا کر اُن کی لعن طعن سُن لوں گا۔ دراصل میں کسی قیمت پر بھی اِس، ادھر اُدھر کی چیزیں کُتر کر، جھٹ سے اپنے بل میں گھُس جانے والی چوہیا کو، اپنے دامِ انتقام سے باہر نہیں نکالنا چاہتا تھا۔

مجھے خاموش دیکھ کر، وہ میرے فرض سے آگاہ کرنے کی خاطر بولی: ''آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے گھر جانا ہے۔ بس دل لگی ہو چکی۔ اب کنجی سیدھے من سے نکال لیے۔''

''تم نہیں جا سکتی ہو۔''

''یہ بھی عجیب سِکھا شاہی ہے!''

''ہاں اِس مکان میں میرا راج ہے اور سامنے والے مکان پر تمہارا۔ اپنے مکان کی چھت پر تم سیواجی ہو اور ہم، تمہاری حکومت تسلیم کرتے رہے ہیں۔ تم نے ہزاروں مرتبہ چڑھے ہوئے پتنگوں کو، کئی کئی ریل ڈور سمیت، توڑ لیا ہے، اور ہم خاموش رہے ہیں۔ آج [تم] ہماری[۵۴] بادشاہت میں ہو، اس لیے تمہیں دم مارنے کی مجال نہ ہونی چاہیے۔''

''میں نے آپ کے پتنگ کبھی نہیں توڑے، آپ غلط کہہ رہے ہیں۔''

''تم جھوٹ بول رہی ہو پاربتی، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اِس وقت میرے ہاتھ بڑے بڑے اختیارات کی ڈور ہے۔ مردوں سے بات بات پر نوک جھونک کرنا تمہاری فطرت میں داخل ہے مگر شاید تمہیں یہ معلوم نہیں کہ ہم لوگ بہت سخت گیر ہوتے ہیں۔ بُری طرح بدلہ لیتے ہیں، سمجھیں!''

یہ سن کر وہ اور بھی گھبرا گئی: ''میں جاتی ہوں۔''

وہ دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ میں نے دوڑ کر دہلیز میں اس کا راستہ روک لیا۔ ''تم کمرے ہی میں رہو گی۔''

''ہٹیے مجھے جانے دیجیے۔'' اس نے میرے بازو کو جھٹکا دیا۔

میں وہیں پر جما رہا۔ یہ دیکھ کر، وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور سخت غصّے کی حالت میں کہا: "آپ زبردستی کررہے ہیں۔"

"ابھی تم نے زبردستی کا[55] نصف بھی نہیں دیکھا۔"

"آپ مجھے نہیں جانے دیں گے؟"

"نہیں۔"

"میں رو دوں گی، موہن صاحب! میں سر پیٹ لوں گی اپنا۔" اور اُس کی آنکھوں سے واقعی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اسی حالت میں، وہ روتی آواز میں دھمکیاں دیتی ہوئی، آگے بڑھی۔ مجھے دھکا دے کر اُس نے[56] دروازے سے باہر نکلنا چاہا۔ اس کشمکش اور پریشانی میں مضطرب دیکھ کر مجھے اُس پر ترس آ گیا۔ اور جب وہ تازہ حملے کے لیے آگے بڑھی، تو میں نے بڑے آرام سے اُس کے گیلے ہونٹوں کو اپنے لبوں سے چھولیا۔

میرے لبوں کا اُس کے ہونٹوں کو چھونا تھا کہ آفت برپا ہوگئی۔ یہ سمجھیے کہ کسی نے آتش بازی کی چھچھوندر کو آگ دِکھا دی ہے۔ اس نے مجھے وہ موٹی موٹی گالیاں دیں کہ تو بہ بھلی، اور میرے سینے کو اپنے ہاتھوں سے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کردیا۔ لُطف یہ ہے کہ آپ روتی جاتی تھی۔ آخر کار جب مجھے[57] مار مار کر تھک گئی تو زمین پر بیٹھ کر، اپنے سر کو گھٹنوں میں چھپا کر اور بھی زیادہ زور سے رونا شروع کردیا۔

نصف گھنٹے کی مِنّت سماجت کے بعد، اُس نے اپنی آنکھوں سے [کذا] آنسو بہانے بند کیے۔ اس کے بعد، میں نے جیب سے چابی نکالی اور صدر دروازہ کھول کر اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا: "دروازہ کھُلا ہے اور آپ جا سکتی ہیں۔"

اُس روز شام کو میں دہلی چلا گیا اور پندرہ روز کے بعد واپس آیا۔ چونکہ گھر میں کسی نے اس شرارت کے متعلق مجھ سے استفسار نہ کیا، اس لیے معلوم ہوا کہ پاربتی نے میرا چیلنج قبول کرلیا ہے۔ ظاہر تھا کہ وہ انتقام[58] ضرور لے گی۔

ایک روز میں نے میز کا دراز کھول کر اپنی بڑی تصویر نکالی۔ اس لیے کہ مجھے اُس کا فریم بنوانا تھا۔ یہ فوٹو خاکستری رنگ کے بڑے لفافے میں بند تھا۔ چنانچہ میں اُس کو، کھول کر دیکھے بغیر، فریم ساز کے ہاں لے گیا۔ اُس کی دکان پر میں نے، ڈیڑھ گھنٹے کے غور و فکر کے بعد، فریم کے لیے ایک لکڑی انتخاب کی، اور کچھ ہدایات دینے کے بعد، تصویر والا لفافہ دُکان دار کو دے دیا۔ اُس نے جب اُسے کھول کر دیکھا تو کھِل کھِلا کر ہنس پڑا۔ میں نے جب تصویر پر نظر دوڑائی تو دیکھا: اُس پر سیاہ پنسل سے مونچھیں اور داڑھی بنی ہوئی

ہے، ناک پر ایک سیاہ گولا سا رکھا ہے اور چشمے کے شیشے بالکل سیاہ کر دیے گئے ہیں۔[۵۹] یہ تصویر میری شبیہ تھی مگر اس مسخ حالت میں اُس کو پہچاننا بہت دشوار تھا۔ پہلے پہل تو میں بہت متحیر ہوا کہ یہ کس کی حرکت ہے! مگر فوراً ہی سب معاملہ صاف ہو گیا۔ . . سیوا جی میری غیر حاضری میں اپنی ہم سایہ سلطنت پر نہایت کامیابی سے چھاپا مار گئے تھے۔

حواشی

(ان حواشی میں ص سے مراد: منٹو کے افسانے طبع اوّل (۱۹۴۰ء)
کا صفحہ ہے۔ دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ پہلے وہ کبھی ... گئی ہوئی تھی ... بیٹھا ایک کتاب ... جب میں نے دروازہ ... ''پارتی ہے'' کے بعد کا حذف شدہ فقرہ: جو بملا سے ملنے آئی ہے! — ص:۱۹۵

۲۔ میں نے یہ سوچا ... موجود نہیں ہے تو — ایضاً

۳۔ تو میں نے جھٹ سے ... دروازے کو تالا — ص:۱۹۶

۴۔ اگر وہ اس گھڑی ... تھوڑے عرصے کے بعد ... اوقات وہ اتنی ... جرأت تک نہیں ... قسم کی ایک لڑکی ... لڑکا اُس کے جواب میں اُسے معمولی مذاق کر دے ... طرح وہ یہ چاہتی ... کھیلتی رہے اور جب — ایضاً

۵۔ گھر میں اُس کا اکثر ... شوخ پسند طبیعت ... نوک جھونک لے چکی تھی ... یہ ہرگز شکایت — ایضاً

۶۔ میں نے یہ موقع ... عرصے سے یہ خواہش — ص:۱۹۶ تا ۱۹۷

۷۔ ''آئی اور'' کے بعد کا حذف شدہ فقرہ: باہر دہلیز پر کھڑی ہو کر — ص:۱۹۷

۸۔ ''باہر'' سے قبل کے حذف کردہ الفاظ: آہ، یہ حرام زادے — ایضاً

۹۔ ردّوبدل سے قبل مکالے کی ساخت: ''وہ اپنے کمرے میں نہیں۔ میں اُس کو کونے کونے میں دیکھ آئی ہوں۔ مگر وہ نہیں ملی۔'' — ایضاً

۱۰۔ وہ کہاں ... نہ جانے — ایضاً

۱۱۔ 'اور ایک — ص:۱۹۷

۱۲۔ آئی اور اس مرتبہ ... اُتری ہوئی تھی ... داخل ہو کر وہ میرے ... آخری جملے کا ''وہ'' حتمی متن میں شامل کیا گیا۔ — ایضاً

۱۳۔ امکان تھا۔ کہ شاید وہ بہاجی ... واقعات سنا دے۔ ... میں مسرور — ص:۱۹۸ تا ۱۹۹

۱۴۔ میں مسکرایا... ایک غرر	ص: ۱۹۹
۱۵۔ بملا کی تلاش	ایضاً
۱۶۔ اُٹھا لے گئے	ایضاً
۱۷۔ اُتنی ہی دیر... پر میرے ہاتھوں	صص: ۱۹۹ تا ۲۰۰
۱۸۔ باقی اگر	ص: ۲۰۰
۱۹۔ کس ساعت سے آج میں	ایضاً
۲۰۔ گئی ہوئی ہیں	ایضاً
۲۱۔ ''ٹکرا کر'' کے بعد کے منسوخ لفظ: واپس مڑ کر پھر... ہیں کہ کیسے چبا چبا کر بات کر رہے	صص: ۲۰۰ تا ۲۰۱
۲۲۔ گنگنانا شروع کر دیا	ص: ۲۰۱
۲۳۔ بات بتا رہے... بملا ہے کہاں	ایضاً
۲۴۔ ''ڈھونڈ آئی'' کے بعد اضافہ: ہوں	طبع چہارم، ص: ۲۵۹
۲۵۔ چلی گئی ہوگی، اور... یہ بات اِک	ص: ۲۰۱
۲۶۔ سیڑھیوں میں کھڑے... اُترے آپ اُسے پکڑلیں	ایضاً
۲۷۔ موہن اور پاربتی کے یہ مکالمے، طبع اوّل میں اِس طور شائع ہوئے ہیں: ''لیکن شاید وہ یہاں اصل میں نہ ہو!''... ''یہاں نہ ہو۔''	ایضاً
۲۸۔ کس نے لگایا	ایضاً
۲۹۔ ساڑی کو استری	ایضاً
۳۰۔ کہہ کیا رہے	ایضاً
۳۱۔ یا آپ کا یہ خیال ہے کہ	ص: ۲۰۲
۳۲۔ یہ مجھے	ایضاً
۳۳۔ یہ مجھے	ایضاً
۳۴۔ تو پھر دروازہ	ایضاً
۳۵۔ جملے کی تکرار، طبع چہارم میں اضافہ ہے۔	ص: ۲۰۳
۳۶۔ نہیں کر سکا	ایضاً
۳۷۔ پہلے ہی سے... یہ گم ہو جائے گی... لڑکیوں سے اچھی	ایضاً
۳۸۔ یہ مجھے بھی	ایضاً
۳۹۔ دروازے کی دراڑ سے... منہ میں روک لی	ایضاً
۴۰۔ ''تیز'' سے پہلے کے حذف شدہ لفظ: بلند اور	ایضاً
۴۱۔ کمرے میں مکمل سکوت	ص: ۲۰۴

۴۲۔ کیا آپ دروازہ — ص:۲۰۴

۴۳۔ چابی مل جائے — ایضاً

۴۴۔ آج پر ماتما — ایضاً

۴۵۔ تفریح ہونی چاہیے ... ایسی تفریح مزاق — ایضاً

۴۶۔ میرے سوال کا جواب اُس نے یہ دیا — ایضاً

۴۷۔ ''گم ہوگئی ہے'' طبع چہارم میں یہ جملہ دو بار لکھا گیا ہے۔ — طبع چہارم، ص:۲۶۳

۴۸۔ اچھا جی ہے نہیں تھی — ص:۲۰۵

۴۹۔ مجھ پر یہ رُعب — ایضاً

۵۰۔ کہ تم ناحق... روشن دان تک نہیں... آواز کو سن لیں — ایضاً

۵۱۔ بات کو سنا — ایضاً

۵۲۔ وہ کیوں؟ — ص ۲۰۶

۵۳۔ کیا کر سکے گی — ایضاً

۵۴۔ آج تم ہماری... حتمی متن میں ''تم'' کا اضافہ، طبع اول کے جملے کی بنا پر کیا گیا۔ — ایضاً

۵۵۔ تم نے اِس زبردستی کا — ص:۲۰۷

۵۶۔ ''پیٹ لوں گی'' کے بعد اضافہ: اپنا... ''آگے بڑھی'' کے بعد اضافہ: اور ... ''دھکا دے کر'' کے بعد اضافہ: اُس نے — طبع چہارم، ص:۲۶۷

۵۷۔ جب وہ مجھے — ص:۲۰۷

۵۸۔ وہ اپنا انتقام — ص:۲۰۸

۵۹۔ دیکھا کہ اُس پر... سیاہ کر دیے ہیں — ایضاً

موم بتّی کے آنسو

غلیظ طاق پر جو شکستہ دیوار میں بنا تھا،[1] موم بتی ساری رات روتی رہی تھی۔

موم، پگھل پگھل کر، کمرے کے گیلے فرش پر اوس کے ٹھٹھرے ہوئے دھندلے قطروں کے مانند بکھر رہا تھا۔ ننھی لاجو، موتیوں کا ہار لینے پر ضد کرنے اور رونے لگی تو اُس کی ماں نے، موم بتی کے اُن جمے ہوئے آنسوؤں کو، ایک کچے دھاگے میں پرو کر اُس کو ہار بنا دیا۔ ننھی لاجو اُس ہار کو پہن کر خوش ہوگئی اور تالیاں بجاتی ہوئی باہر چلی گئی۔

رات آئی میل بھرے طاقچے میں نئی موم بتی روشن ہوئی۔ اور اُس کی کانی کانی آنکھ[2] اُس کمرے کی تاریکی دیکھ کر ایک لمحے کے لیے حیرت کے باعث چمک اُٹھی، مگر تھوڑی دیر کے بعد جب وہ اس ماحول کی عادی ہوگئی تو اُس نے خاموشی سے ٹکٹکی باندھ کر اپنے گرد و پیش کو دیکھنا شروع کر دیا۔

ننھی لاجو ایک چھوٹی سی کھٹیا پر پڑی سو رہی[3] تھی اور خواب میں اپنی سہیلی بندو سے لڑ رہی تھی کہ وہ اپنی گڑیا کا بیاہ اُس کے گڈے سے کبھی نہیں کرے گی، اس لیے وہ بہت بدصورت ہے۔

لاجو کی ماں کھڑکی کے ساتھ لگی، خاموش اور نیم روشن سڑک پر پھیلی ہوئی کیچڑ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔[4] سامنے بھٹیارے کی بند دُکان کے باہر چبوترے پر، انگیٹھی میں سے کوئلوں کی چنگاریاں، ضدّی بچّوں کی طرح مچل مچل کر، نیچے گر رہی تھیں۔

گھنٹہ گھر نے غنودگی میں بارہ بجائے۔ بارہ کی آخری پکار دسمبر کی سرد رات میں تھوڑی دیر تک کانپتی رہی اور پھر خاموشی کا لحاف اوڑھ کر سوگئی لاجو کی ماں کے کانوں میں نیند کا بڑا سہانا پیغام گنگنایا مگر اُس کی انتڑیاں اُس کے دماغ تک کوئی اور بات[5] پہنچا چکی تھیں۔

دفعتاً، سرد ہوا کے جھونکے سے، گھنگھروؤں کی مدھم جھنجھناہٹ اُس کے کانوں تک پہنچی۔ اُس نے یہ آواز اچھی طرح سننے کے لیے کانوں میں اپنی سماعت کی[6] طاقت بھرنی شروع کر دی۔

گھنگھرو، رات کی خاموشی میں مرتے ہوئے آدمی کے حلق میں اٹکے ہوئے سانس کی طرح، بجنا شروع ہوگئے۔ لاجو کی ماں اطمینان سے بیٹھ گئی۔ گھوڑے کی تھکی ہوئی ہنہناہٹ نے رات کی خاموشی میں ارتعاش پیدا

کردیا۔ اور ایک تانگا لالٹین کے کھمبے کی بغل میں آ کھڑا ہوا۔ تانگے والا نیچے اُترا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر تھپکی دے کر اُس نے کھڑکی کی طرف دیکھا جس کی چق اٹھی ہوئی تھی اور تخت پر ایک دھندلا سایہ بھی پھیلا تھا۔

اپنے کھر دُرے کمبل کو جسم کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر، تانگے والے نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ساڑھے تین روپے کا کریانہ تھا۔ اُس میں سے اس نے ایک روپیہ چار آنے اپنے پاس رکھ لیے اور باقی پیسے تانگے کی اگلی نشست کا گدا اٹھا کر اُس کے نیچے چھپا دیے۔ یہ کام کرنے کے بعد وہ کوٹھے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

لاجو کی ماں چندوسنیاری اٹھی اور دروازہ کھول دیا۔

مادھو تانگے والا اندر داخل ہوا اور دروازے کی زنجیر چڑھا کر اُس نے چندوسنیاری کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''بھگوان جانتا ہے، مجھے تجھ سے کتنا پریم ہے اگر جوانی میں تجھ سے ملاقات ہوتی[۹] تو یاروں کا تانگا گھوڑا ضرور بکتا!'' یہ کہہ کر اُس نے ایک روپیہ اُس کی ہتھیلی میں دبا دیا۔

چندوسنیاری نے پوچھا: ''بس؟''

''یہ لے .... اور'' مادھو نے چاندی کی چونّی اس کی دوسری ہتھیلی پر جما دی۔ ''تیری جان کی قسم! بس یہی کچھ تھا میرے پاس!''[۹]

رات کی سردی میں گھوڑا بازار میں کھڑا ہنہناتا رہا۔ لالٹین کا کھمبا ویسے ہی اونگھتا رہا۔

سامنے ٹوٹے ہوئے پلنگ پر مادھو بے ہوش لیٹا تھا۔ اس کی بغل میں چندوسنیاری آنکھیں کھولے پڑی تھی اور پگھلتے ہوئے موم کے اُن قطروں کو دیکھ رہی تھی جو گیلے فرش پر گر کر چھوٹے چھوٹے دانوں کی صورت میں جم رہے تھے۔ وہ ایکا ایکی، دیوانہ وار، اُٹھی[۱] اور لاجو کی کھٹیا کے پاس بیٹھ گئی [پاس جا بیٹھی؟]۔ ننھی لاجو کے سینے پر موم کے دانے دھڑک رہے تھے۔ چندوسنیاری کی دھندلی آنکھوں کو ایسا معلوم ہوا کہ موم بتی کے اُن جمے ہوئے قطروں میں اُس کی ننھی لاجو کی جوانی کے آنسو چھپ کر بیٹھ گئے [ہیں]۔ اُس کا، کانپتا ہوا ہاتھ بڑھا اور لاجو کے گلے سے وہ ہار جدا ہو گیا۔

پگھلے ہوئے موم پر سے موم بتی کا جلتا ہوا دھاگا پھسل کر نیچے فرش پر[۱] گرا اور اس کی آغوش میں سو گیا...... کمرے میں خاموشی کے علاوہ اندھیرا بھی چھا گیا۔

حواشی

(ان حواشی میں ص سے مراد: منٹو کے افسانے طبع اوّل (۱۹۴۰ء)
کا صفحہ ہے۔ دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ بنا ہوا تھا — ص: ۲۱۷
۲۔ اُس کی کانی آنکھ — ایضاً
۳۔ کھٹیا پر سو رہی — ایضاً
۴۔ ''دیکھ رہی تھی۔'' کے بعد کا یہ جملہ منٹو نے حذف کر دیا: کھڑکی کے اُس طرف لوہے کے کھمبے پر ایک لالٹین، دسمبر کی سردی میں مجبور سنتری کی طرح اونگھ رہی تھی۔ — ایضاً
۵۔ اور ہی بات — ص: ۲۱۸
۶۔ جھونکے پر... اپنی بصارت کی — ایضاً
۷۔ بغل میں کھڑا ہو گیا... اُترا، اور گھوڑے... طرف دیکھا...... چق اُٹھی ہوئی ... سایہ بھی نظر آ رہا تھا — ایضاً
۸۔ ملاقات ہوئی ہوتی — ایضاً
۹۔ طبع اوّل میں جملے کی ساخت: بس یہی کچھ ہے میرے پاس تیری جان کی قسم! — ص ص: ۲۱۸ تا ۲۱۹
۱۰۔ ''جم رہے تھے'' کے بعد کا یہ جملہ منٹو نے حذف کر دیا: وہ بہت دیر تک یہ تماشا دیکھتی رہی۔ ... ایکا ایکی وہ دیوانہ وار اُٹھی... ''آنسو چھپ کر بیٹھ گئے'' کے بعد ''ہیں'' کا اضافہ، مدوّن نے طبع اوّل کے جملے کی بنا پر کیا ہے۔ — ص: ۲۱۹
۱۱۔ گیلے فرش پر — ایضاً

دیوالی کے دِیے

چھت کی منڈیر پر دیوالی کے دِیے ہانپتے ہوئے بچّوں کے دل کی طرح دھڑک رہے تھے۔

منّی دوڑتی ہوئی آئی۔ اپنی ننھی سی گھگری کو دونوں ہاتھوں سے اُوپر اٹھائے، چھت کے نیچے گلی میں موری کے پاس کھڑی ہوگئی...... اُس کی روئی ہوئی آنکھوں میں، منڈیر پر پھیلے ہوئے دِیوں نے، کئی چمکیلے نگینے جڑ دیے...... اُس کا ننھا سا سینہ دیے کی لَو کی طرح کانپا، مسکرا کر اُس نے اپنی مٹھی کھولی، پسینے[1] سے بھیگا ہوا پیسہ دیکھا اور بازار میں دِیے لینے کے لیے دوڑ گئی۔

چھت کی منڈیر پر شام کی خنک ہوا میں دیوالی کے دیے پھڑ پھڑاتے رہے۔

سریندر، دھڑکتے ہوئے دل کو پہلو میں چھپائے، چوروں کی مانند گلی میں داخل ہُوا اور منڈیر کے نیچے بے قراری سے ٹہلنے لگا...... اُس نے دِیوں کی قطار کی طرف دیکھا۔ اُسے ہَوا میں اُچھلتے ہوئے یہ شعلے[2] اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کے رقصاں قطرے معلوم ہوئے...... دفعتاً سامنے والی کھڑکی کھلی...... سریندر سرتاپا نگاہ بن گیا۔ کھڑکی کے ڈنڈے کا سہارا لے کر ایک دوشیزہ نے جھک کر گلی میں دیکھا اور فوراً اُس کا چہرہ تمتما اٹھا۔

کچھ اشارے ہوئے۔ کھڑکی، چوڑیوں کی کھنکھناہٹ کے ساتھ، بند ہوئی اور سریندر وہاں سے مخموری کی حالت میں چل دیا۔

چھت کی منڈیر پر دیوالی کے دِیے دلہن کی ساڑی میں ٹکے ہوئے[3] تاروں کی طرح چمکتے رہے۔

سرجو کمھار لاٹھی ٹیکتا ہوا آیا اور دم لینے کے لیے ٹھہر گیا۔ بلغم اُس کی چھاتی میں سڑکیں کوٹنے والی انجن کی مانند پھر رہا تھا...... گلے کی رگیں دمے کے دورے کے باعث دھونکنی کی طرح کبھی پھولتی تھیں، کبھی سکڑ جاتی تھیں۔ اُس نے گردن اٹھا کر جگمگ جگمگ کرتے دِیوں[4] کی طرف اپنی دھندلی آنکھوں سے دیکھا۔ اور اُسے ایسا معلوم ہوا کہ دُور...... بہت دُور...... بہت سے بچّے، قطار باندھے، کھیل کود میں مصروف ہیں۔ سرجو کمھار کی لاٹھی منوں بھاری ہوگئی۔ بلغم تھوک کر وہ پھر چیونٹی کی چال چلنے لگا۔

چھت کی منڈیر پر دیوالی کے دِیے جگمگاتے رہے۔

پھر ایک مزدور آیا، پھٹے ہوئے گریبان میں سے اُس کی چھاتی کے بال، برباد گھونسلوں کی تیلیوں کے مانند، بکھر رہے تھے۔ دِیوں کی قطار کی طرف اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اور اُسے ایسا محسوس ہوا کہ آسمان کی گدلی پیشانی پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے چمک رہے ہیں، پھر اُسے اپنے گھر کے اندھیارے کا خیال آیا اور وہ ان تھرکتے ہوئے شعلوں کی روشنی، کنکھیوں[۵] سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

چھت کی منڈیر پر دیوالی کے دِیے آنکھیں جھپکتے رہے۔

نئے اور چمکیلے بوٹوں کی چرچراہٹ کے ساتھ ایک آدمی آیا اور دیوار کے قریب سگریٹ سلگانے کے لیے ٹھہر گیا۔ اُس کا چہرہ اشرفی پر لگی ہوئی مُہر کے مانند جذبات سے عاری تھا۔ کالر چڑھی گردن اٹھا کر اُس نے دِیوں کی طرف دیکھا۔ اور اُسے ایسا معلوم ہوا کہ بہت سی کٹھالیوں میں سونا پگھل رہا ہے۔ اُس کے چرچراتے ہوئے چمکیلے جوتوں پر، ناچتے ہوئے شعلوں کا عکس پڑ رہا تھا۔ وہ اُن سے کھیلتا ہوا آگے[۶] بڑھ گیا۔

چھت کی منڈیر پر دیوالی کے دِیے جلتے رہے۔

جو کچھ انہوں نے دیکھا، جو کچھ انہوں نے سنا، کسی کو نہ بتایا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور سب دِیے ایک ایک کر کے بُجھ گئے۔

حواشی

(ان حواشی میں ص سے مراد: منٹو کے افسانے طبع اوّل (۱۹۴۰ء)
کا صفحہ ہے۔ دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ کانپا اور مسکراتے ہوئے اُس نے اپنی مٹھی کھول کر پسینے	ص:۲۲۱
۲۔ یہ اُچھلتے ہوئے شعلے	ایضاً
۳۔ ٹانکے ہوئے	ص:۲۲۲
۴۔ ذرا ٹھہر گیا... انجن کے مانند... پھولتی تھیں اور کبھی... کرتے ہوئے دِیوں	ایضاً
۵۔ روشنی کو کنکھیوں	ایضاً
۶۔ کھیلتا آگے	ایضاً

ہتک

دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغۂ صفائی، جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی، ابھی ابھی اُس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور، گھر واپس گیا تھا...... وہ رات کو یہیں ٹھہر جاتا مگر اُسے[1] اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اُس سے بے حد پریم کرتی تھی۔

وہ روپے جو اُس نے اپنی جسمانی مشقت کے بدلے اُس داروغہ سے وصول کیے تھے، اُس کی چُست اور تھوک بھری چولی کے نیچے سے، اوپر کو اُبھرے ہوئے تھے، کبھی کبھی سانس کے اُتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکّے کھنکھنانے لگتے اور ان کی کھنکھناہٹ اُس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھُل مل جاتی۔ ایسا[2] معلوم ہوتا کہ ان سکّوں کی چاندی پگھل کر اُس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے۔

اُس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی کچھ تو اُس برانڈی کے باعث تھی جس کا ادھا[3] داروغہ اپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ اُس ''بیوڑا'' کا نتیجہ تھی جس کا سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا تھا۔

وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اُس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں، پتنگ کی اُس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جُدا ہو جائے۔ دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت اُبھرا ہوا تھا جو بار بار مونڈنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا، جیسے نُچی ہوئی[4] مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں پر رکھ دیا گیا ہے۔

کمرہ بہت چھوٹا تھا جس میں بے شمار چیزیں بے ترتیبی کے ساتھ بکھری ہوئی تھیں۔ تین چار سوکھے سڑے چپل، پلنگ کے نیچے پڑے تھے جن کے اوپر منہ رکھ کر ایک خارش زدہ کُتا سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا تھا۔ اِس کُتے کے بال جگہ جگہ سے خارش کے باعث اُڑے ہوئے تھے۔ دور سے اگر کوئی اِس کُتے کو دیکھتا تو سمجھتا کہ[5] پیر پونچھنے والا پُرانا ٹاٹ، دوہرا کر کے زمین پر رکھا ہے۔

اِس طرف چھوٹے سے دیوار گیر پر سنگار کا سامان رکھا تھا۔ گالوں پر لگانے کی سرخی، ہونٹوں کی سُرخ بتّی، پاؤڈر، کنگھی اور لوہے کے پِن جو وہ غالباً اپنے جوڑے میں لگایا کرتی تھی۔ پاس ہی ایک لمبی کھونٹی کے ساتھ سبز طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا جو گردن کو اپنی پیٹھ کے بالوں میں چھپائے سو رہا تھا۔ پنجرہ: کچے امرود

کے ٹکڑوں اور گلے ہوئے سنگترے کے چھلکوں [سنگترے کے گلے ہوئے چھلکوں؟] سے بھرا ہوا تھا۔ ان بدبودار ٹکڑوں پر چھوٹے چھوٹے کالے رنگ کے مچھر یا پتنگے[۶] اُڑ رہے تھے۔

پلنگ کے پاس ہی بید کی ایک کرسی پڑی تھی جس کی پشت، سر ٹیکنے کے باعث بے حد میلی ہو رہی تھی۔ اس کرسی کے دائیں ہاتھ کو ایک خوب صورت تپائی تھی جس پر ہز ماسٹرز وائس کا پورٹ ایبل گراموفون پڑا تھا۔ اُس گراموفون پر منڈھے ہوئے کالے کپڑے کی بہت بُری حالت تھی۔ زنگ آلود[۷] سوئیاں تپائی کے علاوہ کمرے کے ہر کونے میں بکھری ہوئی تھیں۔ اس تپائی کے عین اوپر، دیوار پر چار فریم لٹک رہے تھے جن میں مختلف آدمیوں کی تصویریں جڑی تھیں۔

ان تصویروں سے ذرا ادھر ہٹ کر، یعنی دروازے میں داخل ہوتے ہی، بائیں طرف کی دیوار کے کونے میں، گنیش جی کی شوخ رنگ تصویر تھی جو تازہ اور سوکھے ہوئے پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ شاید یہ تصویر کپڑے کے کسی تھان سے اتار کر فریم میں جڑائی گئی تھی۔ اس تصویر کے ساتھ چھوٹے سے دیوار گیر پر، جو کہ بے حد چکنا ہو رہا تھا، تیل کی ایک پیالی دھری تھی جو دیے کو[۸] روشن کرنے کے لیے وہاں رکھی گئی تھی۔ پاس ہی دیا پڑا تھا جس کی لَو، ہوا بند ہونے کے باعث، ماتھے کے تلک کے مانند سیدھی کھڑی تھی۔ اس دیوار گیر پر دھوپ کی چھوٹی بڑی مروڑیاں بھی پڑی تھیں۔

جب وہ بوہنی کرتی تھی تو دور سے گنیش جی کی اس مورتی سے روپے چھوا کر اور پھر اپنے ماتھے کے ساتھ لگا کر، اُنہیں اپنی چولی میں رکھ لیا کرتی تھی۔ اُس کی چھاتیاں چونکہ کافی ابھری ہوئی تھیں اس لیے وہ جتنے روپے بھی اپنی چولی میں رکھتی، محفوظ پڑے رہتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی جب مادھو، پونے سے چھٹی لے کر آتا تو اسے اپنے کچھ روپے، پلنگ کے پائے کے نیچے اُس چھوٹے سے گڑھے میں چھپانا پڑتے تھے جو اُس نے خاص اس کام کی غرض سے کھودا تھا۔ مادھو سے روپے محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ، سوگندھی کو رام لال دلّال نے بتایا تھا۔ اُس نے جب یہ سُنا تھا کہ مادھو پونے سے آ کر سوگندھی پر دھاوے بولتا ہے تو کہا تھا...... ''اس سالے کو تو نے کب سے یار بنایا ہے؟ ...... یہ بڑی انوکھی عاشقی معشوقی ہے! ..... سالا ایک پیسہ اپنی جیب سے نکالتا نہیں اور تیرے ساتھ مزے اڑاتا رہتا ہے۔ مزے الگ رہے، تجھ سے کچھ لے بھی مرتا ہے ... سوگندھی! مجھے کچھ دال میں کالا کالا نظر آتا ہے۔ اس سالے میں کوئی بات ضرور ہے جو تجھے بھا گیا ہے..... سات سال سے یہ دھندا کر رہا ہوں۔ تم چھوکریوں[۹] کی ساری کمزوریاں جانتا ہوں۔''

یہ کہہ کر رام لال دلّال نے جو بمبئی شہر کے مختلف حصّوں سے، دس روپے سے لے کر سو روپے تک

والی، ایک سو میں چھوکریوں کا دھندا کرتا تھا، سوگندھی کو بتایا..... ''سالی اپنا دھن یوں نہ برباد کر... تیرے انگ پر سے، یہ کپڑے بھی، اتار کر لے جائے گا، وہ تیری ماں کا یار!... اس پلنگ کے پائے کے نیچے چھوٹا سا گڑھا کھود کر اُس میں سارے پیسے دبا دیا کر، اور جب وہ آیا کرے تو اُس سے کہا کر.... ''تیری جان کی قسم مادھو، آج صبح سے ایک دھیلے کا'' منہ نہیں دیکھا۔ باہر والے سے کہہ کر ایک کوپ چائے اور ایک افلاطون بسکٹ تو منگا، بھوک سے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں.... '' سمجھیں؟ بہت نازک وقت آ گیا ہے میری جان...... اس سالی کانگریس نے شراب بند کرکے بازار بالکل مندا کر دیا ہے۔ پر تجھے تو کہیں نہ کہیں سے پینے کو مل ہی جاتی ہے۔ بھگوان قسم! جب تیرے یہاں کبھی رات کی خالی کی ہوئی بوتل دیکھتا ہوں اور دارو کی باس سونگھتا ہوں تو جی چاہتا ہے تیری جون میں چلا جاؤں۔''

سوگندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔ ایک بار جمنا نے اُس سے کہا تھا ''نیچے سے ان بمب کے گولوں کو باندھ کے رکھا کر، انگیا پہنا کرے گی تو ان کی سختائی ٹھیک رہے گی۔''

سوگندھی یہ سُن کر ہنس دی تھی۔ ''جمنا! تو سب کو اپنے سری کا سمجھتی ہے۔ دس روپے میں لوگ تیری بوٹیاں توڑ کر چلے جاتے ہیں تو تُو سمجھتی ہے کہ سب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا..... کوئی مُوا لگائے تو ایسی ویسی جگہ، ہاتھ... ارے ہاں! کل کی بات تجھے سناؤں: رام لال رات کے دو بجے ایک پنجابی کو لایا۔ رات کا تیس روپے طے ہوا...... جب سونے لگے تو میں نے بتی بجھا دی..... ارے وہ تو ڈرنے لگا!..... سنتی ہو جمنا؟ تیری قسم، اندھیرا ہوتے ہی اُس کا سارا ٹھاٹھ کرکرا ہو گیا..... وہ ڈر گیا! میں نے کہا، چلو چلو دیر کیوں کرتے ہو! تین بجنے والے ہیں، ابھی دن چڑھ آئے گا..... بولا، روشنی کرو..... روشنی کرو..... میں نے کہا، یہ روشنی کیا ہوا؟..... بولا، لائٹ..... لائٹ!..... اُس کی بھنچی ہوئی آواز سُن کر مجھ سے ہنسی نہ رکی۔ ''بھئی میں تو لائٹ نہ کروں گی!'' ..... اور یہ کہہ کر میں نے اُس کی گوشت بھری ران کی چٹکی لی... تڑپ کر اُٹھ بیٹھا اور لائٹ اون کر دی۔ میں نے جھٹ سے چادر اوڑھ لی، اور کہا: ''تجھے شرم نہیں آتی مردُوے!'' وہ پلنگ پر آیا تو میں اُٹھی اور لپک کر لائٹ بجھا دی!..... وہ پھر گھبرانے لگا.... تیری قسم! بڑے مزے میں رات کٹی..... کبھی اندھیرا کبھی اُجالا، کبھی اُجالا کبھی اندھیرا۔ ٹرام کی کھڑ کھڑ ہوئی تو پتلون وتلون پہن کر وہ اٹھ بھاگا..... سالے نے تیس روپے سٹے میں جیتے ہوں گے جو یوں مفت دے گیا.... جمنا! تو بالکل الھڑ ہے۔ بڑے بڑے گُر یاد ہیں مجھے، اِن لوگوں کے ٹھیک'' کرنے کے لیے!''

سوگندھی کو واقعی بہت سے گُر یاد تھے جو اُس نے اپنی ایک دو سہیلیوں کو بتائے بھی تھے۔ عام طور پر

وہ، یہ گُر سب کو بتایا کرتی تھی ...... ''اگر آدمی شریف ہو، زیادہ باتیں نہ کرنے والا ہو، تو اُس سے خوب شرارتیں کرو، اَن گنت باتیں کرو، اُسے چھیڑو، ستاؤ، اس کے گدگدی کرو، اس سے کھیلو..... اگر داڑھی رکھتا ہو تو اس میں انگلیوں سے کنگھی کرتے کرتے دو چار بال بھی نوچ لو [نوچ بھی لو؟]...... پیٹ بڑا ہو تو تھپتھپاؤ ...... اُس کو اتنی مہلت ہی نہ دو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے...... وہ خوش خوش چلا جائے گا اور تم بھی بچی رہوگی...... ایسے مرد جو گُپ چُپ رہتے ہیں،[۱۲] بڑے خطرناک ہوتے ہیں بہن...... ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں، اگر اُن کا داؤ چل جائے!''

سوگندھی اتنی چالاک نہیں تھی، جتنی کہ خود کو ظاہر کرتی تھی۔ اُس کے گاہک بہت کم تھے۔ غایت درجہ جذباتی لڑکی تھی، یہی وجہ ہے کہ وہ تمام گُر جو اُسے یاد تھے، اُس کے دماغ سے پھسل کر اس کے پیٹ میں آ جاتے تھے، جس پر ایک بچہ پیدا کرنے کے باعث کئی لکیریں پڑ گئی تھیں...... ان لکیروں کو پہلی مرتبہ دیکھ کر اُسے ایسا لگا تھا[۱۳] کہ اس کے خارش زدہ کُتے نے اپنے پنجے سے یہ نشان بنادیے ہیں ... .. جب کوئی کُتیا بڑی بے اعتنائی سے اُس کے پالتو کُتے کے پاس سے گزر جاتی تھی تو وہ شرمندگی دُور کرنے کے لیے زمین پر اپنے پنجوں سے اِسی قسم کے نشان بنایا کرتا تھا۔

سوگندھی دماغ میں زیادہ رہتی تھی لیکن جوں ہی کوئی نرم و نازک بات ..... کوئی کومل بول...... اُس سے کہتا تو جھٹ پگھل کر وہ اپنے جسم کے دوسرے حصّوں میں پھیل جاتی۔ گو مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اس کا دماغ بالکل فُضول سمجھتا تھا مگر اس کے جسم کے باقی اعضا، سب کے سب، اُس کے بہت بُری طرح قائل تھے، وہ تھکن چاہتے تھے...... ایسی تھکن جو اُنہیں جھنجھوڑ کر...... انہیں مار کر، سُلانے پر [سونے پر؟] مجبور کردے...... ایسی نیند جو تھک کر چُور چُور ہونے کے بعد آئے، کتنی مزے دار ہوتی ہے...... وہ بے ہوشی جو مار کھا کر بند بند ڈھیلے [ڈھیلا؟] ہو جانے پر طاری ہوتی ہے، کتنا آنند دیتی ہے!...... کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہو اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نہیں ہو! اور اس ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ تم ہَوا میں بہت اونچی جگہ لٹکی ہوئی ہو۔ اوپر ہوا، نیچے ہوا، دائیں ہوا، بائیں ہوا، بس ہوا ہی ہوا! اور پھر اُس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزا[۱۴] دیتا ہے۔

بچپن میں جب وہ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی اور اپنی ماں کا بڑا صندوق کھول کر اُس میں چھپ جایا کرتی تھی، تو ناکافی ہوا میں دم گھٹنے کے ساتھ ساتھ، پکڑے جانے کے خوف سے، وہ تیز دھڑکن جو اس کے دل میں پیدا ہو جایا کرتی تھی، کتنا مزہ دیا کرتی تھی!

سوگندھی چاہتی تھی کہ اپنی ساری زندگی کسی ایسے ہی صندوق میں چھپ کر گزار دے جس کے باہر ڈھونڈنے والے پھرتے رہیں، کبھی کبھی اُس کو ڈھونڈ نکالیں تاکہ وہ بھی اُن کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے۔ یہ زندگی جو وہ پانچ برس سے گزار رہی تھی، آنکھ مچولی ہی تو تھی!...... کبھی وہ کسی کو ڈھونڈ لیتی تھی اور کبھی کوئی اسے ڈھونڈ لیتا تھا...... بس یوں ہی اس کا جیون بیت رہا تھا۔ وہ خوش تھی اس لیے کہ اس کو خوش رہنا پڑتا تھا۔ ہر روز رات کو کوئی نہ کوئی مرد اس کے چوڑے ساگوانی پلنگ پر ہوتا تھا اور سوگندھی جس کو مردوں کے ٹھیک کرنے کے لیے بے شمار گُر یاد تھے، اس بات کا بار بار تہیہ کرنے پر بھی کہ وہ ان مردوں کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں مانے گی اور ان کے ساتھ بڑے روکھے پن کے ساتھ [روکھے پن سے؟] پیش آئے گی، ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جایا کرتی تھی اور فقط ایک پیاسی عورت رہ جایا[۵] کرتی تھی۔

ہر روز رات کو اُس کا پرانا یا نیا ملاقاتی اس سے کہا کرتا تھا ''سوگندھی! میں تجھ سے پریم کرتا ہوں۔'' اور سوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بولتا ہے، بس موم ہو جاتی تھی اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مُچ اس سے پریم کیا جا رہا ہے...... پریم...... کتنا سندر بول ہے! وہ چاہتی تھی، اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگوں پر مل لے، اس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اس کے مساموں میں رچ جائے...... یا پھر وہ خود اس کے اندر چلی جائے، سمٹ سمٹا کر اس کے اندر داخل ہو جائے اور اُوپر سے ڈھکنا بند کر دے [کرلے؟]۔ کبھی کبھی جب پریم کرنے اور پریم کیے جانے کا جذبہ اُس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تو کئی بار اس کے جی میں آتا کہ[۶] اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گود میں لے کر تھپتھپانا شروع کر دے اور لوریاں دے کر اُسے اپنی گود ہی میں سلا دے۔

پریم کر سکنے کی اہلیت اُس کے اندر اِس قدر زیادہ تھی کہ ہر اُس مرد سے جو اُس کے پاس آتا تھا، وہ محبت کر سکتی تھی اور پھر اس کو نباہ بھی سکتی تھی۔ اب تک چار مردوں سے اپنا پریم نباہ ہی تو رہی تھی جن کی تصویریں اس کے سامنے دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ ہر وقت یہ احساس اس کے دل میں موجود رہتا تھا کہ وہ بہت اچھی ہے .... لیکن یہ اچھا پن مردوں میں کیوں نہیں ہوتا؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی...... ایک بار آئینہ دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا تھا'' .... ''سوگندھی!...... تجھ سے زمانے نے اچھا سلوک نہیں کیا!''

یہ زمانہ، یعنی پانچ برسوں کے دن اور ان کی راتیں، اُس کے جیون کے ہر تار کے ساتھ وابستہ تھا۔ گو اس زمانے سے اس کو [وہ] خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی جس کی خواہش اس کے دل میں موجود تھی، تاہم وہ

چاہتی تھی کہ یوں ہی اس کے دن بیتتے چلے جائیں۔ اسے کون سے محل کھڑے کرنا تھے جو روپے پیسے کا لالچ کرتی۔ دس روپے اس کا عام نرخ تھا جس میں سے ڈھائی روپے رام لال اپنی دلالی کے کاٹ لیتا تھا۔ ساڑھے سات روپے اسے روز مل ہی جایا کرتے تھے جو اس کی اکیلی جان کے لیے کافی تھے۔ اور مادھو جب پونے سے، بقول رام لال دلال، سوگندھی پر دھاوے بولنے کے لیے آتا تھا، تو وہ دس پندرہ روپے خراج بھی ادا کرتی تھی۔ یہ خراج صرف اس بات کا تھا کہ سوگندھی کو اُس سے کچھ وہ ہوگیا تھا۔ رام لال دلال ٹھیک کہتا تھا: اُس میں ایسی بات ضرور تھی جو سوگندھی کو بہت بھا گئی تھی۔ اب اس کو چھپانا کیا ہے، بتا ہی کیوں نہ دیں! ... سوگندھی سے جب مادھو کی پہلی ملاقات ہوئی تو اُس نے کہا تھا: ''تجھے لاج نہیں آتی اپنا بھاؤ کرتے! جانتی ہے تُو میرے ساتھ کس چیز کا سودا کر رہی ہے؟...... اور میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں؟ .. چھی چھی چھی ...... دس روپے، اور جیسا کہ تو کہتی ہے ڈھائی روپے دلال کے، باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات؟ .. اب ان ساڑھے سات روپیوں پر تو مجھے ایسی چیز دینے کا وچن دیتی ہے جو تو دے ہی نہیں سکتی اور میں ایسی چیز لینے آیا ہوں جو میں لے ہی نہیں سکتا..... مجھے عورت چاہیے، پر تجھے کیا اس وقت، اسی گھڑی مرد چاہیے؟ ... مجھے تو کوئی عورت بھی بھا جائے گی، پر کیا میں تجھے جچتا ہوں؟...... تیرا میرا ناتا ہی کیا ہے، کچھ بھی نہیں ... بس یہ دس روپے، جن میں سے ڈھائی، دلالی میں چلے جائیں گے اور باقی ادھر اُدھر بکھر جائیں گے، تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے ہیں...... تو بھی ان کا بجنا سن رہی ہے اور میں بھی۔ تیرا من کچھ اور سوچتا ہے، میرا من کچھ اور ..... کیوں نہ کوئی ایسی بات کریں کہ تجھے میری ضرورت ہو اور مجھے تیری .. پونے میں حوالدار ہوں۔ مہینے میں ایک بار آیا کروں گا، تین چار دن کے لیے ..... یہ دھندا چھوڑ ... میں تجھے خرچ دیا کروں گا[۱۸] ...... کیا بھاڑا ہے اِس کھولی کا......؟''

مادھو نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا، جس کا اثر سوگندھی پر اس قدر زیادہ ہوا تھا کہ وہ چند لمحات کے لیے خود کو حوالدارنی سمجھنے لگی تھی۔ باتیں کرنے کے بعد مادھو نے اُس کے کمرے کی بکھری ہوئی چیزیں قرینے سے رکھی تھیں اور ننگی تصویریں جو سوگندھی نے اپنے سرہانے لٹکا رکھی تھیں، بنا پوچھے گچھے پھاڑ دی تھیں اور کہا تھا: ''سوگندھی بھئی میں ایسی تصویریں یہاں نہیں رکھنے دوں گا ..... اور پانی کا یہ گھڑا ... دیکھنا، کتنا میلا ہے[۱۹] اور یہ ..... یہ چیتھڑے ... . یہ چندیاں ... اف کتنی بُری باس آتی ہے، اُٹھا کے باہر پھینک ان کو .. اور تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے .. اور..... اور ... ''

تین گھنٹے کی بات چیت کے بعد سوگندھی اور مادھو دونوں آپس میں گھل مل گئے تھے اور سوگندھی کو تو

ایسا محسوس ہوا تھا کہ برسوں سے حوالدار کو جانتی ہے۔ اُس وقت تک کسی نے بھی کمرے میں" بدبودار چیتھڑوں، میلے گھڑے اور ننگی تصویروں کی موجودگی کا خیال نہیں کیا تھا اور نہ کبھی کسی نے اس کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیا تھا کہ اس کا ایک گھر ہے، جس میں گھریلو پن آسکتا ہے۔ لوگ آتے تھے اور بستر تک کی غلاظت کو محسوس کیے بغیر چلے جاتے تھے۔ کوئی سوگندھی سے یہ نہیں کہتا تھا: ''دیکھ تو آج تیری ناک کتنی لال ہو رہی ہے، کہیں زکام نہ ہو جائے تجھے..... ٹھہر میں تیرے واسطے دوا لاتا ہوں۔'' مادھو کتنا اچھا تھا۔ اُس کی ہر بات باون تولے اور پاؤرتی کی تھی۔ کیا کھری کھری سنائی تھیں اس نے سوگندھی کو!...... اسے محسوس ہونے لگا کہ اسے مادھو کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ان دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

مہینے میں ایک بار مادھو پونے سے آتا تھا اور واپس جاتے ہوئے ہمیشہ سوگندھی سے کہا کرتا تھا: ''دیکھ سوگندھی! اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری نوٹ جائے گی... اگر تو نے ایک بار بھی کسی مرد کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر باہر نکال[۲۱] دوں گا...... دیکھ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا...... ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا......؟''

نہ مادھو نے کبھی پونا سے خرچ بھیجا تھا اور نہ سوگندھی نے اپنا دھندا بند کیا تھا۔ دونوں اچھی طرح جانتے تھے، کیا ہو رہا ہے۔ نہ سوگندھی نے[۲۲] کبھی مادھو سے یہ کہا تھا: ''تو یہ ٹر ٹر کیا کرتا ہے، ایک پھوٹی کوڑی بھی دی ہے کبھی تُو نے؟'' اور نہ مادھو نے کبھی سوگندھی سے پوچھا تھا: ''یہ مال تیرے پاس کہاں سے آتا ہے جبکہ میں تجھے کچھ دیتا ہی نہیں......!'' دونوں جھوٹے تھے۔ دونوں ایک ملمّع کی ہوئی زندگی بسر کر رہے تھے .... لیکن سوگندھی خوش تھی۔ جس کو اصل سونا پہننے کو نہ ملے وہ ملمّع کیے ہوئے گہنوں ہی پر راضی ہو جایا کرتا ہے۔

اس وقت سوگندھی تھکی ماندی سو رہی تھی۔ بجلی کا قمقمہ جسے اوف کرنا[۲۳] وہ بھول گئی تھی، اُس کے سر کے اوپر لٹک رہا تھا۔ اس کی تیز روشنی اس کی مندی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ٹکرا رہی تھی مگر وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی ... رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوگندھی کے خواب آلود کانوں میں دستک کی آواز بھنبھناہٹ بن کر پہنچی۔ دروازہ جب زور سے کھٹکھٹایا گیا تو وہ چونک کر اُٹھ بیٹھی ..... دو ملی جلی شرابوں اور دانتوں کی ریخوں میں پھنسے ہوئے مچھلی کے ریزوں نے اس کے منہ کے اندر ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کسیلا اور لیس دار تھا۔ دھوتی کے پلّو سے اس نے یہ بدبودار لعاب صاف کیا اور آنکھیں ملنے لگی۔ پلنگ پر وہ اکیلی تھی۔ جھک کر اس نے[۲۴] پلنگ کے نیچے دیکھا تو اُس کا کتا سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے

سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا تھا اور طوطا پیٹھ کے بالوں میں سر دیے سو رہا تھا۔

دروازے پر [پھر] دستک ہوئی۔ سوگندھی بستر پر سے اٹھی۔ سر درد[۲۵] کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ گھڑے سے پانی کا ایک ڈونگا نکال کر اس نے کُلّی کی اور دوسرا ڈونگا غٹا غٹ پی کر اس نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور کہا: ''رام لال؟''

رام لال جو باہر دستک دیتے دیتے تھک گیا تھا، بھنا کر کہنے لگا: ''تجھے سانپ سونگھ گیا تھا یا کیا ہو گیا تھا۔ ایک کلاک (گھنٹے) سے باہر کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔ کہاں مر گئی تھی؟'' ...... پھر آواز دبا کر اس نے ہولے سے کہا: ''اندر کوئی ہے[۲۶] تو نہیں؟''

جب سوگندھی نے کہا: ''نہیں'' ...... تو رام لال کی آواز پھر اونچی ہو گئی: ''تو دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟ ...... بھئی حد ہو گئی ہے۔ کیا نیند پائی ہے۔ یوں ایک ایک چھوکری اُتارنے میں دو دو گھنٹے سر کھپانا پڑے تو میں اپنا دھندا کر چکا ...... اب تو میرا منہ کیا دیکھتی ہے؟ جھٹ پٹ یہ دھوتی اتار کر وہ پھولوں والی ساڑی پہن، پوڈر ووڈر لگا اور چل میرے ساتھ[۲۷] ...... باہر موٹر میں ایک سیٹھ بیٹھے تیرا انتظار کر رہے ہیں ...... چل چل ایک دم جلدی کر۔''

سوگندھی آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور رام لال آئینے کے سامنے اپنے[۲۸] بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

سوگندھی نے تپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بام کی شیشی اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا: ''رام لال! آج میرا جی اچھا نہیں۔''

رام لال نے کنگھی دیوار گیر پر رکھ دی اور مڑ کر کہا: ''تو پہلے ہی کہہ دیا ہوتا!''

سوگندھی نے ماتھے اور کنپٹیوں پر بام ملتے ہوئے، رام لال کی غلط فہمی دُور کر دی [دور کی؟]: ''وہ بات نہیں رام لال! ...... ایسے ہی میرا جی اچھا نہیں ...... بہت پی گئی۔''

رام لال کے منہ میں پانی بھر آیا: ''تھوڑی بچی ہو تو، لا ...... ذرا ہم بھی[۲۹] منہ کا مزہ ٹھیک کر لیں۔''

سوگندھی نے بام کی شیشی تپائی پر رکھ دی اور کہا: ''بچائی ہوتی تو یہ مُوا سر میں درد ہی کیوں ہوتا ..... دیکھ رام لال![۳۰] وہ جو باہر موٹر میں بیٹھا ہے اُسے اندر ہی لے آؤ [؟ لے آ]۔''

رام لال نے جواب دیا: ''نہیں بھئی، وہ اندر نہیں آ سکتے، جنٹل مین آدمی ہیں، وہ تو موٹر کو گلی کے باہر کھڑی کرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے ...... تو کپڑے وپڑے پہن لے اور ذرا گلی کی نُکڑ تک چل ...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

ساڑھے سات روپے کا سودا، سوگندھی اس حالت میں جب کہ اُس کے سر میں شدّت کا درد ہو رہا تھا، کبھی قبول نہ کرتی مگر اسے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس کے ساتھ والی کھولی میں ایک مدراسی عورت رہتی تھی جس کا خاوند موٹر کے نیچے آ کر مر گیا تھا۔ اُس عورت کو اپنی جوان لڑکی سمیت اپنے وطن جانا تھا لیکن اس کے پاس چونکہ کرایہ ہی نہیں تھا اس لیے وہ کس مپرسی کی حالت میں پڑی تھی۔ سوگندھی نے کل ہی اُس کو ڈھارس دی تھی اور اُس سے کہا تھا: ''بہن تو چنتا نہ کر۔ میرا مرد پونے سے آنے ہی والا ہے۔ میں اس سے کچھ روپے لے کر تیرے جانے کا بندوبست کر دوں گی۔'' مادھو پونا سے آنے والا تھا، مگر روپوں کا بندوبست تو سوگندھی ہی کو کرنا تھا۔ چنانچہ وہ اُٹھی اور جلدی جلدی کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ پانچ منٹوں میں اس نے دھوتی اُتار کر پھولوں والی ساڑی پہنی اور گالوں پر سرخ پوڈر لگا کر تیار ہو گئی۔ گھڑے کے ٹھنڈے پانی کا ایک اور ڈونگا پیا اور رام لال[۳۱] کے ساتھ ہو لی۔

گلی جو کہ چھوٹے شہروں کے بازار سے بھی کچھ بڑی تھی، بالکل خاموش تھی۔ گیس کے وہ لیمپ جو کھمبوں پر جڑے تھے، پہلے کی نسبت[۳۲] بہت دھندلی روشنی دے رہے تھے۔ جنگ کے باعث ان کے شیشوں کو گدلا کر دیا گیا تھا۔ اس اندھی روشنی میں گلی کے آخری سرے پر ایک موٹر نظر آ رہی تھی۔

کمزور روشنی میں اُس سیاہ رنگ کی موٹر کا سایہ سا نظر آنا اور رات کے پچھلے پہر کی بھیدوں بھری خاموشی ...... سوگندھی کو ایسا لگا کہ[۳۳] اس کے سر کا درد فضا پر بھی چھا گیا ہے۔ ایک کسیلا پن اُسے ہوا کے اندر بھی محسوس ہوتا تھا جیسے برانڈی اور بیوڑا کی باس سے وہ بھی بوجھل ہو رہی ہے۔

آگے بڑھ کر رام لال نے موٹر کے اندر بیٹھے ہوئے آدمیوں [آدمی؟] سے کچھ کہا۔ اتنے میں جب سوگندھی موٹر کے پاس پہنچ گئی تو رام لال نے ایک طرف ہٹ کر کہا: ''لیجیے وہ آ گئی ...... بڑی اچھی چھوکری ہے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں اسے دھندا شروع کیے''...... پھر سوگندھی سے مخاطب ہو کر کہا: ''سوگندھی! اِدھر آ، سیٹھ جی بلاتے ہیں۔''

سوگندھی، ساڑی کا ایک کنارہ اپنی انگلی پر لپیٹتی ہوئی، آگے بڑھی اور موٹر کے دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ سیٹھ صاحب نے بیٹری اس کے چہرے کے پاس روشن کی۔ ایک لمحے کے لیے اُس روشنی نے سوگندھی کی خمار آلود آنکھوں میں چکا چوند پیدا کی۔[۳۴] بٹن دبانے کی آواز پیدا ہوئی اور روشنی بُجھ گئی۔ ساتھ ہی سیٹھ کے منہ سے ''اونہہ!'' نکلا [نکلی؟]۔ پھر ایک دم موٹر کا انجن پھڑ پھڑایا اور کار، یہ جا، وہ جا......

سوگندھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موٹر چل دی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک بیٹری کی تیز روشنی

گھسی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک طرح سے سیٹھ کا چہرہ بھی تو نہ دیکھ سکی تھی۔ یہ آخر ہوا کیا تھا۔ اُس ''اونہہ'' کا کیا مطلب تھا جو ابھی تک[۳۵] اُس کے کانوں میں بھنبھنا رہی تھی۔ کیا؟...... کیا؟

رام لال دلال کی آواز سنائی دی: ''پسند نہیں کیا تجھے!... اچھا بھئی، میں چلتا ہوں۔ دو گھنٹے مفت ہی میں برباد کیے۔''

یہ سُن کر سوگندھی کی ٹانگوں میں، اُس کی بانہوں میں، اُس کے ہاتھوں میں: ایک زبردست حرکت پیدا ہوئی...... کہاں ہے وہ موٹر...... کہاں ہے وہ[۳۶] سیٹھ..... تو ''اونہہ'' کا مطلب یہ تھا کہ اُس نے مجھے پسند نہیں کیا.... اُس کی...

گالی اُس کے پیٹ کے اندر سے اُٹھی اور زبان کی نوک پر آ کر رُک گئی۔ وہ آخر گالی کسے دیتی۔ موٹر تو جا چکی تھی۔ اُس کی دُم کی سرخ بتی اس کے سامنے بازار کے اندھیارے میں ڈوب رہی تھی اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لال لال انگارہ ''اونہہ'' ہے جو اُس کے سینے میں برمے کی طرح اُترا چلا جا رہا ہے۔ اس کے جی میں آئی کہ زور سے پکارے: ''او سیٹھ...[۳۷] ذرا موٹر روکنا اپنی..... بس ایک منٹ کے لیے۔'' پر وہ سیٹھ، تھُڑی ہے اُس کی ذات پر! بہت دُور نکل چکا تھا۔

وہ سنسان بازار میں کھڑی تھی۔ پھولوں والی ساڑی جو وہ خاص خاص موقعوں پر پہنا کرتی تھی، رات کے پچھلے پہر کی ہلکی پھلکی ہوا سے لہرا رہی تھی۔ یہ ساڑی اور اس کی ریشمیں سرسراہٹ، سوگندھی کو کتنی بُری معلوم ہو رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس ساڑی کے چیتھڑے اڑا دے کیونکہ ساڑی ہوا میں لہرا لہرا کر ''اونہہ اونہہ'' کر رہی تھی۔[۳۸]

گالوں پر اُس نے پوڈر لگایا تھا اور ہونٹوں پر سرخی۔ جب اسے خیال آیا کہ یہ سنگار اس نے اپنے آپ کو پسند کرانے کے واسطے کیا تھا تو شرم کے مارے اُسے پسینہ آ گیا۔ یہ شرمندگی دور کرنے کے لیے اس نے کیا کچھ نہ سوچا...... ''میں نے اُس موئے کو دکھانے کے لیے تھوڑی اپنے آپ کو سجایا تھا، یہ تو میری عادت ہے...... میری کیا سب کی یہی عادت ہے...... پر...... پر..... یہ رات کے دو بجے اور رام لال دلال اور.....[۳۹] یہ بازار..... اور وہ موٹر اور بیٹری کی چمک''...... یہ سوچتے ہی روشنی کے دھبّے اس کی حدِ نگاہ تک فضا میں ادھر اُدھر تیرنے لگے اور موٹر کے انجن کی پھڑ پھڑاہٹ اُسے ہوا کے ہر جھونکے میں سنائی دینے لگی۔

اُس کے ماتھے پر بام کا لیپ جو سنگار کرنے کے دوران میں بالکل ہلکا ہو گیا تھ، پسینہ آنے کے باعث اس کے مساموں میں داخل ہونے لگا اور سوگندھی کو اپنا ماتھا، کسی اور کا ماتھا معلوم ہوا۔ جب ہوا کا ایک

جھونکا اس کے عرق آلود ماتھے کے پاس سے گزرا تو اسے ایسا لگا کہ سرد سرد ٹین کا ٹکڑا کاٹ کر اس کے ماتھے کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے۔ سر میں درد ویسے کا ویسا موجود تھا مگر خیالات کی بھیڑ بھاڑ اور اُن کے شور نے اس درد کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا۔ سوگندھی نے کئی بار اس درد کو اپنے خیالات کے نیچے سے نکال کر اوپر لانا چاہا مگر ناکام رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اُس کا انگ انگ دُکھنے لگے، اس کے سر میں درد ہو، اس کی ٹانگوں میں درد ہو، اس کے پیٹ میں درد ہو، اس کی بانہوں میں درد ہو..... ایسا درد کہ وہ صرف درد ہی کا خیال کرے اور سب کچھ بھول جائے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کے دل میں کچھ ہوا... کیا یہ درد تھا؟..... ایک لمحے کے لیے اس کا دل سکڑا اور پھر پھیل گیا...... یہ کیا تھا؟.... لعنت! یہ تو وہی ''اونہہ'' تھی جو اس کے دل کے اندر کبھی[۴۰] سکڑتی اور کبھی پھیلتی تھی۔

گھر کی طرف سوگندھی کے قدم اٹھے ہی تھے کہ رُک گئے اور وہ ٹھہر کر سوچنے لگی..... رام لال دلاّل کا خیال ہے کہ اُسے میری شکل پسند نہیں آئی... شکل کا تو اُس نے ذکر نہیں کیا۔ اُس نے تو یہ کہا تھا: ''سوگندھی! تجھے پسند نہیں کیا!'' اُسے...... اُسے...... صرف میری شکل ہی پسند نہیں آئی... نہیں آئی تو کیا ہوا؟..... مجھے بھی تو کئی آدمیوں کی شکل پسند نہیں آتی...... وہ جو اماوس کی رات کو آیا تھا، کتنی بُری صورت تھی اُس کی... کیا میں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی؟ جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تھا تو مجھے گھن نہیں آئی تھی؟...... کیا مجھے ابکائی آتے آتے نہیں رُک گئی تھی؟..... ٹھیک ہے، پر سوگندھی..... تو نے اُسے دھتکارا نہیں تھا، تو نے اُس کو ٹھکرایا نہیں تھا...... اس موٹر والے سیٹھ نے تو تیرے منہ پر تھوکا ہے... ''اونہہ''..... اس ''اونہہ'' کا اور مطلب ہی کیا ہے؟...... یہی کہ اس چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل.... اونہہ... یہ منہ اور مسور کی دال...... ارے رام لال! تو یہ چھپکلی کہاں سے پکڑ کر لے آیا ہے...... اس لونڈیا کی اتنی تعریف کر رہا ہے[۴۱] تو...... دس روپے اور یہ عورت..... خچر کیا بُری ہے.....

سوگندھی سوچ رہی تھی اور اُس کے پیر کے انگوٹھے سے لے کر سر کی چوٹی تک گرم لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اُس کو کبھی اپنے آپ پر غصہ آتا تھا اور کبھی رام لال دلاّل پر جس نے رات کے دو بجے اُسے بے آرام کیا۔ لیکن فوراً ہی دونوں کو بے قصور پا کر وہ سیٹھ کا خیال کرتی تھی۔ اِس خیال کے آتے ہی اُس کی آنکھیں، اُس کے کان، اُس کی بانہیں، اُس کی ٹانگیں، اُس کا سب کچھ، مڑتا تھا کہ اُس سیٹھ کو کہیں دیکھ پائے ... اُس کے اندر یہ خواہش بڑی شدت سے پیدا ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے، ایک بار پھر ہو..... صرف ایک بار...... وہ ہولے ہولے موٹر کی طرف بڑھے، موٹر کے اندر سے ایک ہاتھ بیٹری نکالے اور اُس کے

چہرے پر روشنی پھینکے۔ ''اونہہ'' کی آواز آئے اور وہ...... سوگندھی...... اندھا دھند اپنے دونوں پنجوں سے اُس کا منہ نوچنا شروع کردے۔ وحشی بلّی کی طرح جھپٹے اور...... اور اپنی انگلیوں کے سارے ناخن جو اس نے موجودہ فیشن کے مطابق بڑھا رکھے تھے، اُس سیٹھ کے گالوں میں گاڑ دے۔ بالوں سے پکڑ کر اُسے باہر گھسیٹ لے اور دھڑا دھڑ مکّے[۴۲] مارنا شروع کردے اور جب تھک جائے...... جب تھک جائے تو رونا شروع کردے۔

رونے کا خیال سوگندھی کو صرف اس لیے آیا کہ اُس کی آنکھوں میں، غصّے اور بے بسی کی شدّت کے باعث، تین چار بڑے بڑے آنسو بن رہے تھے۔ ایکا ایکی سوگندھی نے اپنی آنکھوں سے سوال کیا: ''تم روتی کیوں ہو؟ تمھیں کیا ہوا ہے کہ ٹپکنے لگی ہو؟'' ...... آنکھوں سے کیا ہُوا سوال، چند لمحات تک اُن آنسوؤں میں تیرتا رہا جو اَب[۴۳] پلکوں پر کانپ رہے تھے۔ سوگندھی اُن آنسوؤں میں سے دیر تک اُس خلا کو گھورتی رہی جدھر سیٹھ کی موٹر گئی تھی۔

پھڑ پھڑ پھڑ...... یہ آواز کہاں سے آئی؟...... سوگندھی نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا لیکن کسی کو نہ پایا ...... ارے! یہ تو اس کا دل پھڑ پھڑایا تھا۔ وہ سمجھی تھی موٹر کا انجن بولا ہے...... اس کا دل...... یہ کیا ہوگیا تھا اس کے دل کو!...... آج ہی یہ روگ لگ گیا تھا اسے..... اچھا بھلا چلتا چلتا ایک جگہ رُک کر دھڑ دھڑ کیوں کرتا تھ [کر رہا تھا؟]...... بالکل اُس گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح جو سوئی کے نیچے ایک جگہ آ کے رُک جاتا تھا، ''رات کٹی گن گن تارے'' کہتا کہتا، تارے تارے کی رٹ لگا دیتا تھا۔

آسمان تاروں سے اٹا ہوا تھا۔ سوگندھی نے ان کی طرف دیکھا اور کہا: ''کتنے سُندر ہیں''...... وہ چاہتی تھی کہ اپنا دھیان کسی اور طرف پلٹ دے، پر جب اس نے سندر کہا تو جھٹ سے یہ خیال اس کے دماغ میں کودا: یہ تارے سندر ہیں، پر تو کتنی بھونڈی ہے..... کیا بھول گئی کہ[۴۴] ابھی ابھی تیری صورت کو پھٹکارا گیا ہے؟

سوگندھی بدصورت تو نہیں تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ تمام عکس ایک ایک کر کے اُس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے جو ان پانچ برسوں کے دوران میں وہ آئینے میں دیکھ چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس کا رنگ روپ اب وہ نہیں رہا تھا جو آج سے پانچ سال پہلے تھا جبکہ وہ تمام فکروں سے آزاد اپنے ماں باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ لیکن وہ بدصورت تو نہیں ہوگئی تھی۔ اُس کی شکل وصورت اُن عام عورتوں کی سی تھی جن کی طرف مرد، گزرتے گزرتے گھُور کے دیکھ لیا کرتے ہیں۔ اُس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو سوگندھی

کے خیال میں، ہر مرد اُس عورت میں ضروری سمجھتا ہے جس کے ساتھ اُسے ایک دو راتیں بسر کرنا ہوتی ہیں۔ وہ جوان تھی۔ اس کے اعضا متناسب تھے۔ کبھی کبھی نہاتے وقت جب اُس کی نگاہیں اپنی رانوں پر پڑتی تھیں تو وہ خود اُن کی گولائی اور گدراہٹ کو پسند کیا کرتی تھی۔ وہ خوش خلق تھی۔ ان پانچ برسوں کے دوران میں شاید ہی کوئی آدمی اس سے ناخوش ہو کر گیا ہو...... بڑی ملنسار تھی، بڑی رحم دل تھی۔ پچھلے دنوں کرسمس میں جب وہ گول پیٹھا میں رہا کرتی تھی، ایک نوجوان لڑکا اس کے پاس آیا تھا۔ صبح اُٹھ کر جب اُس نے دوسرے کمرے میں جا کر کھونٹی سے اپنا کوٹ اُتارا تو بٹوا غائب پایا۔ سوگندھی کا نوکر یہ بٹوا لے اُڑا تھا۔ بے چارہ بہت پریشان ہوا، چھٹیاں گزارنے کے لیے حیدرآباد سے بمبئی آیا تھا، اب اُس کے پاس واپس جانے کے لیے دام[۲۵] نہ تھے۔ سوگندھی نے ترس کھا کر اُسے اُس کے دس روپے واپس دے دیے تھے...... ''مجھ میں کیا برائی ہے؟'' سوگندھی نے یہ سوال ہر اُس چیز سے کیا جو اُس کی آنکھوں کے سامنے تھی: گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور سڑک کی اکھڑی ہوئی بجری...... ان سب چیزوں کی طرف اُس نے باری باری دیکھا، پھر آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں جو اُس کے اوپر جھکا ہوا تھا، مگر سوگندھی کو کوئی جواب نہ ملا۔

جواب اُس کے اندر موجود تھا...... وہ جانتی تھی کہ وہ بُری نہیں، اچھی ہے، پر وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کی تائید کرے ..... کوئی ...... کوئی ...... اِس وقت کوئی اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہہ دے: ''سوگندھی! کون کہتا ہے، تو بُری ہے، جو تجھے بُرا کہے، وہ آپ بُرا ہے''...... نہیں! یہ کہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی، کسی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا: ''سوگندھی تو بہت اچھی ہے!''

وہ سوچنے لگی کہ وہ کیوں چاہتی ہے کوئی اُس کی تعریف کرے۔ اس سے پہلے اُسے اس بات کی اتنی شدت سے ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ آج کیوں وہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی نظروں سے دیکھتی ہے [دیکھ رہی ہے؟] جیسے اُن پر[۲۶] اپنے اچھے ہونے کا احساس طاری کرنا چاہتی ہے۔ اُس کے جسم کا ذرہ ذرہ کیوں ''ماں'' بن رہا تھا...... وہ ماں بن کر دھرتی کی ہر شے کو اپنی گود میں لینے کے لیے کیوں تیار ہو رہی تھی؟ .... اُس کا جی کیوں چاہتا تھا کہ سامنے والے گیس کے آہنی کھمبے کے ساتھ چمٹ جائے اور اس کے سرد لوہے پر اپنے گال رکھ دے...... اپنے گرم گرم گال، اور اُس کی ساری سردی چوس لے۔

تھوڑی دیر کے لیے اُسے ایسا محسوس ہوا کہ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور ہر وہ شے جو رات کے سناٹے میں اس کے آس پاس تھی، ہمدردی کی نظروں سے اسے دیکھ رہی

ہے اور اس کے اوپر جھکا ہوا آسمان بھی جو مٹیالے رنگ کی ایسی موٹی چادر معلوم ہوتا تھا جس میں بے شمار سُوراخ ہو رہے ہوں، اس کی باتیں سمجھتا تھا اور سوگندھی کو بھی ایسا لگتا تھا کہ وہ تاروں کا ٹمٹمانا سمجھتی ہے...... لیکن اس کے اندر یہ کیا گڑبڑ تھی؟ ..... وہ کیوں اپنے اندر اُس موسم کی فضا محسوس کرتی [کر رہی؟] تھی جو بارش سے پہلے دیکھنے میں آیا کرتا ہے [آتا ہے؟] ..... اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے جسم کا ہر مسام کُھل جائے اور جو کچھ اس کے اندر اُبل رہا ہے، اُن کے رستے باہر نکل جائے۔ پر، یہ کیسے ہو..... کیسے ہو؟

سوگندھی گلی کے نکڑ پر خط ڈالنے والے لال بھبکے کے پاس کھڑی تھی ... ہوا کے تیز جھونکے سے اس بھبکے کی آہنی زبان جو اس کے کھلے ہوئے منہ میں لٹکی رہتی ہے، لڑکھڑائی تو سوگندھی کی نگاہیں یک بیک اُس طرف اُٹھیں جدھر موٹر گئی تھی مگر اسے کچھ نظر نہ آیا..... اسے کتنی زبردست آرزو[47] تھی کہ وہ موٹر پھر ایک بار آئے اور ... اور ...

"نہ آئے ... بلا سے ...... میں اپنی جان کیوں بے کار ہلکان کروں ...... گھر چلتے ہیں اور آرام سے لمبی تان کر سوتے ہیں۔ ان جھگڑوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ مفت کی دردِسری ہی تو ہے ..... چل سوگندھی گھر چل ...... ٹھنڈے پانی کا ایک ڈونگا پی، اور تھوڑا سا بام مل کر سو جا ... فسٹ کلاس نیند آئے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا...... سیٹھ اور اُس موٹر کی[48] ایسی تیسی......"

یہ سوچتے ہوئے سوگندھی کا بوجھ ہلکا ہو گیا جیسے وہ کسی ٹھنڈے تالاب سے نہا دھو کر باہر نکلی ہے۔ جس طرح پُوجا کرنے کے بعد اس کا جسم ہلکا ہو جاتا تھا اُسی طرح اب بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ گھر کی طرف چلنے[49] لگی تو خیالات کا بوجھ نہ ہونے کے باعث اس کے قدم کئی بار لڑکھڑائے۔

اپنے مکان کے پاس پہنچی تو ایک ٹیس کے ساتھ پھر تمام واقعہ اُس کے دل میں اُٹھا اور درد کی طرح اس کے روئیں روئیں پر چھا گیا... قدم پھر بوجھل ہو گئے اور وہ اس بات کو شدّت کے ساتھ محسوس کرنے لگی کہ گھر سے بُلا کر، باہر بازار میں، منہ پر روشنی کا چانٹا مار کر، ایک آدمی نے اس کی ابھی ابھی ہتک کی ہے۔ یہ خیال آیا تو اس نے اپنی پسلیوں پر کسی کے سخت انگوٹھے محسوس کیے جیسے کوئی اسے بھیڑ بکری کی طرح دبا دبا کر دیکھ رہا ہے کہ آیا گوشت بھی ہے یا بال ہی بال ہیں... اس سیٹھ نے ...... پرماتما کرے ... سوگندھی نے چاہا کہ اُس کو بددُعا دے مگر سوچا، بددُعا دینے سے کیا بنے گا ..... مزا تو جب تھا کہ وہ سامنے ہوتا اور وہ اُس کے وجود کے ہر ذرّے پر اپنی لعنتیں لکھ دیتی ... اس کے منہ پر کچھ ایسے الفاظ کہتی کہ زندگی بھر بے چین رہتا..... کپڑے پھاڑ کر اُس کے سامنے ننگی ہو جاتی اور کہتی: "یہی لینے آیا تھا نا تو؟ ... لے، دام دیے

بنا لے جا اسے ...... پر جو کچھ میں ہوں، جو کچھ میرے[50] اندر چھپا ہوا ہے، وہ تو کیا، تیرا باپ بھی نہیں خرید سکتا ...‘‘

انتقام کے نئے نئے طریقے سوگندھی کے ذہن میں آرہے تھے، اگر اُس سیٹھ سے ایک بار ..... صرف ایک بار...... اس کی مڈ بھیڑ ہو جائے تو وہ یہ کرے۔نہیں، یہ نہیں، یہ کرے...... یوں اس سے انتقام لے، نہیں یوں نہیں، یوں ... لیکن جب سوگندھی سوچتی کہ سیٹھ سے اس کا دوبارہ ملنا محال ہے تو وہ ایک[51] چھوٹی سی گالی دینے ہی پر، خود کو راضی کر لیتی...... بس صرف ایک چھوٹی سی گالی، جو اُس کی ناک پر چپکو مکھی کی طرح بیٹھ جائے اور ہمیشہ وہیں جمی رہے۔

اسی اُدھیڑ بُن میں وہ دوسری منزل پر اپنی کھولی کے پاس پہنچ گئی۔ چولی میں سے چابی نکال کر تالا[52] کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو چابی ہوا ہی میں گھوم کر رہ گئی۔ کُنڈے میں تالا نہیں تھا۔ سوگندھی نے کواڑ اندر کی طرف دبائے تو ہلکی سی چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ اندر سے کسی نے کنڈی کھولی اور دروازے نے جمائی لی۔ سوگندھی اندر داخل ہوگئی۔

مادھو مونچھوں میں ہنسا اور دروازہ بند کر کے سوگندھی سے کہنے لگا ’’آج تو نے میرا کہا مان ہی لیا ...... صبح کی سیر تندرستی کے لیے بڑی اچھی ہوتی ہے۔ ہر روز، اس طرح صبح اُٹھ کر، گھومنے جایا کرے گی تو تیری ساری سُستی دور ہو جائے گی اور وہ تیری کمر کا درد بھی غائب ہو جائے گا جس کی بابت تو آئے دن شکایت کیا کرتی ہے۔ وکٹوریہ گارڈن تک تو ہو آئی ہوگی تو؟...... کیوں؟‘‘

سوگندھی نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ مادھو نے جواب کی خواہش ظاہر کی۔ دراصل جب مادھو بات کیا کرتا تھا تو اُس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ سوگندھی ضرور اس میں حصّہ لے۔ اور سوگندھی جب کوئی بات کیا کرتی تھی تو یہ ضروری نہیں ہوتا تھا کہ مادھو اُس میں حصّہ لے... چونکہ کوئی بات کرنا ہوتی تھی، اس لیے وہ کچھ کہہ دیا کرتے تھے۔

مادھو بید کی کرسی پر بیٹھ گیا جس کی پشت پر اس کے تیل سے چپڑے ہوئے سر نے میل کا ایک بہت بڑا دھبا بنا رکھا تھا، اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اپنی مونچھوں پر اُنگلیاں پھیرنے لگا۔

سوگندھی پلنگ پر بیٹھ گئی اور مادھو سے کہنے لگی: ’’میں آج تیرا انتظار ہی کر رہی تھی۔‘‘

مادھو بڑا اسٹپٹایا۔ ’’انتظار؟...... تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں آج آنے والا ہوں۔‘‘

سوگندھی کے بھنچے ہوئے لب کھلے، اُن پر ایک پیلی مسکراہٹ نمودار ہوئی: ’’میں نے رات تجھے سپنے

میں دیکھا تھا۔[۵۳] اُٹھی تو کوئی بھی نہ تھا۔ سو، جی نے کہا: چلو کہیں باہر گھوم آئیں ... ... اور......"

مادھو خوش ہو کر بولا: "اور میں آگیا...... بھئی بڑے لوگوں کی باتیں بڑی پکّی ہوتی ہیں۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے، دل کو دل سے راہ ہے...... تو نے یہ سپنا کب دیکھا تھا؟"

سوگندھی نے جواب دیا: "چار بجے کے قریب۔"

مادھو کرسی پر سے اُٹھ کر سوگندھی کے پاس بیٹھ گیا۔ "اور میں نے تجھے ٹھیک دو بجے سپنے میں دیکھا ...... جیسے تو پھولوں والی ساڑی .... . ارے! بالکل یہی ساڑی پہنے، میرے پاس کھڑی ہے۔ تیرے ہاتھوں میں ... کیا تھا تیرے ہاتھوں میں؟ ... ہاں، تیرے ہاتھوں میں روپوں سے بھری ہوئی تھیلی تھی! تو نے یہ تھیلی [وہ تھیلی؟] میری جھولی میں رکھ دی اور کہا: "مادھو! تو چنتا کیوں کرتا ہے؟...... لے یہ تھیلی...... ارے تیرے میرے روپے کیا دو ہیں؟" ...... سوگندھی تیری جان کی قسم! فوراً اُٹھا اور ٹکٹ کٹا کر ادھر کا رخ کیا...... کیا سناؤں بڑی پریشانی ہے!...... بیٹھے بٹھائے ایک کیس ہو گیا ہے۔ اب بیس تیس روپے ہوں تو...... انسپکٹر کی مٹھی گرم کر کے چھٹکارا ملے...... تھک تو نہیں گئی تو؟ لیٹ جا، میں تیرے پیر دبا دوں۔ سیر کی عادت نہ ہو تو تھکن ہو ہی جایا کرتی ہے...... اِدھر میری طرف پیر کر کے لیٹ جا۔"

سوگندھی لیٹ گئی۔ دونوں بانہوں کا تکیہ بنا کر وہ اُن پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور اُس لہجے میں جو اُس کا اپنا نہیں تھا، مادھو سے کہنے لگی: "مادھو، یہ کس مُوئے نے تجھ پر کیس کیا ہے؟...... جیل ویل کا ڈر ہو تو مجھ سے کہہ دے .... بیس تیس کیا سو پچاس بھی ایسے موقعوں پر پولیس کے ہاتھ میں تھما دیے جائیں تو فائدہ اپنا ہی ہے...... جان بچی لاکھوں پائے...... بس بس، اب جانے دے، تھکن کچھ زیادہ نہیں ہے...... مٹھی چاپی چھوڑ اور مجھے ساری بات سُنا ... کیس کا نام سُنتے ہی میرا دل دھک دھک کرنے لگا ہے . ... واپس کب جائے گا تو؟"

مادھو کو سوگندھی کے منہ سے شراب کی باس آئی۔ اُس نے یہ موقع اچھا سمجھا اور جھٹ سے کہا: "دوپہر کی گاڑی سے واپس جانا پڑے گا...... اگر شام تک سب انسپکٹر کو سو پچاس نہ تھمائے تو... زیادہ دینے کی ضرورت[۵۴] نہیں، میں سمجھتا ہوں پچاس میں کام چل جائے گا۔"

"پچاس!" یہ کہہ کر سوگندھی بڑے آرام سے اُٹھی اور اُن چار تصویروں کے پاس، آہستہ آہستہ گئی جو دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ بائیں طرف سے تیسرے فریم میں مادھو کی تصویر تھی۔ بڑے بڑے پھولوں والے پردے کے آگے، کرسی پر، وہ دونوں رانوں پر اپنے ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا۔

پاس ہی تپائی پر دو موٹی موٹی کتابیں دھری تھیں۔ تصویر اُتروانے وقت، تصویر اُتروانے کا خیال، مادھو پر اس قدر غالب تھا کہ اس کی ہر شے تصویر سے باہر نکل نکل کر گویا پکار رہی تھی: ''ہمارا فوٹو اُترے گا! ہمارا فوٹو اُترے گا!!'' کیمرے کی طرف مادھو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فوٹو اتروانے وقت اسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔[۵۵]

سوگندھی کھلکھلا کر ہنس پڑی..... اُس کی ہنسی کچھ ایسی تیکھی اور نوکیلی تھی کہ مادھو کے سوئیاں[۵۶] سی چبھیں۔ پلنگ پر سے اٹھ کر وہ سوگندھی کے پاس گیا۔ ''کس کی تصویر دیکھ کر تو اس قدر زور سے ہنس رہی ہے؟''

سوگندھی نے بائیں ہاتھ کی پہلی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو میونسپلٹی کے داروغۂ صفائی کی تھی۔ ''اس کی..... منشی پالٹی کے اِس داروغہ کی..... ذرا دیکھ تو[۵۷] اس کا تھوبڑا..... کہتا تھا، ایک رانی مجھ پر عاشق ہو گئی تھی..... اونہہ! یہ منہ اور مسور کی دال۔'' یہ کہہ کر سوگندھی نے فریم کو اس زور سے کھینچا کہ دیوار میں سے کیل بھی پلستر سمیت اُکھڑ آئی۔

مادھو کی حیرت ابھی دُور نہ ہوئی تھی کہ سوگندھی نے فریم کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ دو منزلوں سے یہ فریم نیچے زمین پر گرا اور کانچ ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی۔ سوگندھی نے اُس جھنکار کے ساتھ کہا ''رانی بھنگن، کچرا اُٹھانے آئے گی تو میرے اس راجا کو بھی ساتھ لے جائے[۵۸] گی۔''

ایک بار پھر، اُسی نوکیلی اور تیکھی ہنسی کی پھوار سوگندھی کے ہونٹوں سے گرنا شروع ہوئی جیسے وہ اُن پر چاقو یا چھری کی دھار تیز کر رہی ہے [کر رہی ہو؟]۔

مادھو بڑی مشکل سے مسکرایا، پھر ہنسا: ''ہی ہی ہی...''

سوگندھی نے دوسرا فریم بھی نوچ لیا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ ''اس سالے کا یہاں کیا مطلب ہے؟..... بھونڈی شکل کا کوئی آدمی یہاں نہیں رہے گا..... کیوں مادھو؟''

مادھو پھر بڑی مشکل سے مسکرایا اور پھر ہنسا: ''ہی ہی ہی...''

ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے کی تصویر اُتاری اور دوسرا ہاتھ اُس فریم کی طرف بڑھایا جس میں مادھو کا فوٹو جڑا تھا۔ مادھو اپنی جگہ پر سمٹ گیا جیسے ہاتھ اُس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں، فریم کیل سمیت، سوگندھی کے ہاتھ میں تھا۔

زور کا قہقہہ لگا کر اُس نے ''اونہہ'' کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیے۔ دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اُس کے اندر

کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر اتنا کہا: ''اچھا کیا...... مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔''

آہستہ آہستہ سوگندھی مادھو کے پاس آئی اور کہنے لگی: ''تجھے یہ فوٹو پسند نہیں تھا...... پر میں پوچھتی ہوں، تجھ میں ہے ایسی کون سی چیز، جو کسی کو پسند آسکتی ہے...... یہ تیری پکوڑا ایسی ناک، یہ تیرا بالوں بھرا ماتھ، یہ تیرے سُوجے ہوئے نتھنے، یہ تیرے مُڑے ہوئے کان، یہ تیرے منہ کی باس، یہ تیرے بدن کا میل؟ ..... تجھے اپنا فوٹو پسند نہیں تھا، اونہہ...... پسند کیوں ہوتا، تیرے عیب جو چھپا رکھے تھے اُس نے...... آج کل زمانہ ہی ایسا ہے، جو عیب[۵۹] چھپائے وہی بُرا.....''

مادھو پیچھے ہٹتا گیا۔ آخر جب وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا تو اس نے اپنی آواز میں زور پیدا کر کے کہا: ''دیکھ سوگندھی! مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا ہے [کر دیا ہے؟]...... اب تجھ سے آخری بار کہتا ہوں...''

سوگندھی نے اس سے آگے مادھو کے لہجے میں کہنا شروع کیا: ''اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا[۶۰] شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے پھر کسی کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر تجھے باہر نکال دوں گا...... اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا...... ہاں، کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟''

مادھو چکرا گیا۔

سوگندھی نے کہنا شروع کیا: ''میں بتاتی ہوں...... پندرہ روپے بھاڑا ہے اس کھولی کا...... اور دس روپے بھ ڑا ہے میرا...... اور جیسا تجھے معلوم ہے، ڈھائی روپے دلاّل کے، باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات؟ ان ساڑھے سات روپیوں میں مَیں نے ایسی چیز دینے کا وچن دیا تھا، جو میں دے ہی نہیں سکتی تھی اور تو ایسی چیز لینے آیا تھا جو تو لے ہی نہیں سکتا تھا...... تیرا میرا ناتا ہی کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ بس یہ دس روپے تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے تھے، سو ہم دونوں نے مل کر ایسی بات کی کہ[۶۱] تجھے میری ضرورت ہوئی اور مجھے تیری...... پہلے تیرے اور میرے بیچ میں دس روپے بجتے تھے، آج پچاس بج رہے ہیں۔ تو بھی ان کا بجنا سُن رہا ہے اور میں بھی اُن کا بجنا سن رہی ہوں...... یہ تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے؟''

یہ کہہ کر سوگندھی نے مادھو کی ٹوپی، انگلی سے ایک طرف اُڑا دی۔ یہ حرکت مادھو کو بہت ناگوار گزری۔ اس نے[۶۲] بڑے کڑے لہجے میں کہا: ''سوگندھی!''

سوگندھی نے مادھو کی جیب سے رومال نکال کر سونگھا اور زمین پر پھینک دیا۔ ''یہ چیتھڑے، یہ چندیاں

......اُف کتنی بُری باس آتی ہے، اُٹھا کے باہر پھینک اِن کو...''

مادھو چلّایا: ''سوگندھی!''

سوگندھی نے تیز لہجے میں کہا: ''سوگندھی کے بچّے! تو آیا کس لیے ہے، یہاں؟...... تیری ماں رہتی ہے اس جگہ جو تجھے پچاس روپے دے گی؟ یا تُو کوئی ایسا بڑا گبرو جوان ہے جو میں تجھ پر عاشق ہوگئی ہوں ...... کتے، کمینے، مجھ پر رعب گانٹھتا ہے! میں تیری دبیل ہوں کیا؟...... بھک منگے، تو اپنے آپ کو سمجھ کیا بیٹھا ہے؟...... میں پوچھتی ہوں تو ہے کون؟.... چور یا گٹھ کترا؟...... اس وقت تو میرے مکان میں کرنے کیا آیا[63] ہے؟...... بلاؤں پولیس کو؟...... پونے میں تجھ پر کیس ہو نہ ہو، یہاں تو تجھ پر ایک کیس کھڑا کر [ہی؟] دوں۔''

مادھو سہم گیا۔ دبے ہوئے لہجے میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا: ''سوگندھی، تجھے کیا ہوگیا ہے؟''

''تیری ماں کا سر...... تو ہوتا کون ہے مجھ سے ایسے سوال کرنے والا؟...... بھاگ یہاں سے، ورنہ...'' سوگندھی کی بلند آواز سُن کر اُس کا خارش زدہ کتا جو سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے[64] سو رہا تھا، ہڑ بڑا کر اٹھا اور مادھو کی طرف منہ اُٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا [بھونکنے لگا؟]۔ کتے کے بھونکنے کے ساتھ ہی سوگندھی زور زور سے ہنسنے لگی۔

مادھو ڈر گیا۔ گری ہوئی ٹوپی اُٹھانے کے لیے وہ جھکا تو سوگندھی کی گرج سنائی دی: ''خبردار......! پڑی رہنے دے وہیں...... تو جا! تیرے پونا پہنچتے ہی میں اس کو منی آرڈر کردوں گی۔'' یہ کہہ کر وہ اور زور سے ہنسی اور ہنستی ہنستی بید کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اُس کے خارش زدہ کتے نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ سیڑھیاں اُتار کر، جب کتا اپنی ٹنڈ منڈ دُم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اُس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑ پھڑانے لگا تو سوگندھی چونکی..... اُس نے اپنے چاروں طرف ایک ہول ناک سناٹا دیکھا..... ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اُسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے...... جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی، سب اسٹیشنوں پر مسافر اتار کر، اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے ... .. یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہوگیا تھا، اُسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی مگر بالکل چھلنی کا سا حساب تھا: اِدھر دماغ کو پُر کرتی تھی، اُدھر وہ خالی[65] ہو جاتا تھا۔

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اُس کو اپنا دِل پرچانے کا کوئی

طریقہ نہ ملا تو اُس نے اپنے خارش زدہ کُتّے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر، اُسے پہلو میں[۶۶] لٹا کر سوگئی۔

حواشی

(ان حواشی میں ص سے مراد: منٹو کے افسانے طبع اوّل (۱۹۴۰ء) کا صفحہ ہے۔ دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ وہ رات یہیں ٹھہرتا پر اُسے — ص: ۲۲۳

۲۔ اُس دار وغے سے... حتمی متن میں فقرہ "ان کی کھنکھناہٹ" اس بنا پر شامل کیا گیا کہ طبع اوّل (ص: ۲۲۳) کے متن اور لذتِ سنگ کے مضمون "سفید جھوٹ" (ص: ۱۰۷) میں درج افسانے کے اقتباس میں، منٹو نے یہی فقرہ لکھا ہے۔ مزید برآں عبارت کے قرینے کی بنا پر بھی مدوّن کے نزدیک یہی فقرہ راجح ہے

... گھل مل جاتی۔ اور ایسا — ایضاً

۳۔ برانڈی کا باعث تھا جس کا ادھیا — ایضاً

۴۔ رات اوس میں... سیاہی مائل نیلی رنگت... ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بُجھی ہوئی — ص: ۲۲۴

۵۔ سوکھے ہوئے چیل اُس کے پلنگ... دیکھتا تو یہ معلوم ہوتا کہ — ایضاً

۶۔ مچھر یا کوئی اور جانور — ایضاً

۷۔ دائیں ہاتھ ایک... گراموفون کی زنگ آلود — ایضاً

۸۔ جو کہ تازہ... ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تصویر... جڑائی گئی ہے... جو کہ دیے کو — ایضاً

۹۔ آتا تھا تو... دھاوے بول دیتا ہے... "نکالتا نہیں" کے بعد کے جملے جن میں منٹو نے تبدیلیاں کیں اور وہ چار روز ٹھہر کر تیرے ساتھ مزے اُڑاتا رہتا ہے۔ بلکہ تجھ ہی سے کچھ لے مرتا ہے... میں تم چھوکریوں... "جانتا ہوں" کے بعد طبع اوّل و سوم وغیرہ میں نیا پارا جو مدوّن کے نزدیک راجح ہے۔ — ص: ۲۲۵

۱۰۔ یوں برباد نہ کر... ایک ادھیلے کا — ایضاً

۱۱۔ اپنی طرح سمجھتی... کہ باقی سب کے ساتھ... جگہ کو ہاتھ... وہ سہم سا گیا

... وہ تڑپ کر... لوگوں کو ٹھیک — صص: ۲۲۵تا۲۲۶

۱۲۔ ہاں تو چ لو... مرد جو کہ چُپ چُپ رہتے ہوں — ص: ۲۲۶

۱۳۔ وہ خود کو... وہ غایت درجہ... باعث لکیریں... اُسے ایسا معلوم ہوا تھا — ایضاً

۱۴۔ تو وہ جھٹ... ایک خاص لطف — ص: ۲۲۷

۱۵۔ کہ وہ اپنی ساری زندگی ایسے ہی صندوق... پھرتے رہیں اور کبھی کبھی... زندگی جو کہ وہ... جس کو بے شمار گر مردوں کو ٹھیک کرنے کے لیے یاد تھے... عورت باقی رہ جایا — ص:۲۲۷
۱۶۔ سوگندھی یہ جانتی بوجھتی کہ... سارے انگ پر... اندر داخل ہوا اور ... جی میں آتا تھا کہ — ص:۲۲۸
۱۷۔ کہ وہ ہر اُس مرد سے جو کہ اُس کے پاس آتا تھا محبت کر سکتی تھی ... وہ اب تک چار... منہ سے نکل گیا... — ایضاً
۱۸۔ زمانے سے اُسے وہ خوشی نصیب... حتمی متن میں ''اُس کو'' کے بعد ''وہ'' کا اضافہ طبع اوّل کے جملے کی بنا پر کیا گیا... جو وہ روپے پیسے... جو کہ اس کی اکیلی... آتا تھا، تو کیا وہ اُسے دس پندرہ روپے خراج ادا نہیں کیا کرتی تھی!... مدقات ہوئی تھی تو... روپلیوں پر تو' مجھے وہ چیز دینے ... میں وہ چیز لینے... خرچ دے دیا کروں گا — صص:۲۲۸تا۲۲۹
۱۹۔ حوالدارنی کہنے لگی تھی... دیکھو تو کتنا میلا ہے — ص:۲۲۹
۲۰۔ محسوس ہوتا تھا... کسی نے کمرے میں — ایضاً
۲۱۔ پکڑ کر تجھے باہر نکال... — ص:۲۳۰
۲۲۔ جانتے تھے کہ کیا کچھ ہو رہا ہے۔ مگر نہ سوگندھی نے — ایضاً
۲۳۔ جس کو اوف کرنا — ایضاً
۲۴۔ اُس نے جھک کر — ایضاً
۲۵۔ دروازے پر پھر دستک... اُس کا سر درد... طبع اوّل کے اوّلین جملے کا لفظ ''پھر'' حتمی متن میں شامل کیا گیا۔ — ایضاً
۲۶۔ تو کہاں مرگئی... اندر کوئی اور — ص ۲۳۱
۲۷۔ اور میرے ساتھ چل — ایضاً
۲۸۔ کے پاس کھڑا ہو کر اپنے — ایضاً
۲۹۔ ہم بھی ذرا — ایضاً
۳۰۔ اگر بچائی ہوئی... دیکھو رام لال — ایضاً
۳۱۔ ساڑھے سات روپے کا سودا تھا... ڈونگا پی کر وہ رام لال — ص ۲۳۲
۳۲۔ لیمپ جو کہ کھمبوں... پہلے کی بہ نسبت — ایضاً
۳۳۔ سوگندھی کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ — ایضاً
۳۴۔ پیدا کر دی — ایضاً
۳۵۔ آخر کیا ہوا... جو کہ ابھی تک — ایضاً
۳۶۔ حرکت کا ارادہ پیدا ہوا۔ کہاں تھی وہ موٹر...... کہاں تھا وہ — ص ۲۳۳

۳۷۔ ٹوک پر آ کے ... موٹر تو چل چکی ... محسوس ہوتا تھا... او سیٹھ — او سیٹھ —	ص ۲۳۳
۳۸۔ سنسان بازار میں وہ کھڑی... ساڑی جو کہ وہ... بری معلوم ہوتی تھی ... اُسے محسوس ہوتا تھا کہ ساڑی ہوا... کہہ رہی ہے	ایضاً
۳۹۔ اِس شرمندگی کو دور... دلّال اور — اور —	ایضاً
۴۰۔ لیپ جو کہ سنگار... محسوس ہوا... اس کا سارا انگ... جو اُس کے اندر بھی	صص:۲۳۳تا۲۳۴
۴۱۔ تعریف کر رہا تھا	ص:۲۳۴
۴۲۔ سوگندھی یہ سوچ... ناخن جو کہ... پکڑ کر وہ اُسے... اُس کو مٹّے	صص:۲۳۴تا۲۳۵
۴۳۔ کیا ہوا ہے کہ تم چکنے... تیر تا رہا جو کہ اب	ص:۲۳۵
۴۴۔ بھول گئی ہے کہ	ایضاً
۴۵۔ اُس کی شکل صورت... جب کہ وہ گول چیتھا... تو بٹوے کو غائب پایا ... وہ چھٹیاں... کے لیے کرائے کے دام	ص:۲۳۶
۴۶۔ چاہتی ہے کہ کوئی... جیسے وہ اُن پر	ایضاً
۴۷۔ اُس کی کتنی زبردست خواہش	ص ۲۳۷
۴۸۔ اُس کی موٹر کی	ایضاً
۴۹۔ سوگندھی کے سینے پر سے بوجھ... ''ہو گیا'' کے بعد کا محذوف فقرہ۔ اور اُس نے ایسا خیال کیا کہ... طرف جب وہ چلنے	ایضاً
۵۰۔ جب وہ اپنے مکان... اُس کے قدم پھر... زندگی بھر وہ بے چین ... پر جو کچھ کہ میں ہوں، جو کچھ کہ میرے	صص ۲۳۷تا۲۳۸
۵۱۔ بالکل محال تھا تو وہ اُسے ایک	ص:۲۳۸
۵۲۔ اُس نے چابی نکالی اور تالا	ایضاً
۵۳۔ سپنے میں دیکھا	ص:۲۳۹
۵۴۔ سو پچاس روپے نہ... دینے کی کوئی ضرورت	ص:۲۴۰
۵۵۔ تصویروں کے پاس گئی جو کہ دیوار... تکلیف محسوس ہو رہی ہے ''فوٹو اُترے گا!'' کے بعد کے جملے طبع اوّل اور دیگر کئی طباعتوں میں جداگانہ پارے کے طور پر شائع ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی تصویر میں مادھو کی کیفیت سے متعلق ہیں لہٰذا مدوّن نے یہ جملے (رسالہ شعور، شمارہ چار، صفحہ ۲۷ کی طرح) سابقہ پارے کے تسلسل میں درج کیے ہیں۔	ایضاً
۵۶۔ مادھو کو سوئیاں	ایضاً
۵۷۔ بائیں طرف کی پہلی... ذرا دیکھو تو	ایضاً

۵۸۔ سُنائی دی تو سوگندھی نے کہا... راجا کو بھی لے جائے — ص ۲۴۰
۵۹۔ ہوں کہ تجھ میں ایک کون سی چیز ہے... عیب جو اس نے چھپا رکھے تھے... ایسا ہے کہ جو عیب — ص ۲۴۱
۶۰۔ پھر اپنا دھندا — ایضاً
۶۱۔ میرا بھاڑا ہے... جیسا کہ تجھے... روپلّیوں میں مَیں نے... وہ چیز دینے
... وہ چیز لینے... بات کی تھی کہ — ص ۲۴۲
۶۲۔ گزری اور اُس نے — ایضاً
۶۳۔ کیا سمجھ بیٹھا... چور ہے یا... کیا کرنے آیا — ایضاً
۶۴۔ کتا جو کہ سو گئے... منہ رکھ کر — ایضاً
۶۵۔ وہیں پڑی رہنے دے — پونا پہنچتے ہی میں... اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر شے
... ادھر وہ دماغ... اور اُدھر خالی — صص: ۲۴۲ تا ۲۴۳
۶۶۔ اُسے اپنے پہلو میں — ص ۲۴۳

ڈرپوک

میدان بالکل صاف تھا۔ مگر جاوید کا خیال تھا کہ میونسپل کمیٹی کی لالٹین جو دیوار میں گڑی ہے، اُس کو گھور رہی ہے۔ بار بار وہ اُس چوڑے صحن کو جس پر نانک شاہی اینٹوں کا اونچا نیچا فرش بنا ہُوا تھا،[1] طے کر کے اُس نکڑ والے مکان تک پہنچنے کا ارادہ کرتا جو دوسری عمارتوں سے بالکل الگ تھلگ تھا مگر یہ لالٹین جو مصنوعی آنکھ کی طرح ہر طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی، اُس کے ارادے کو متزلزل کر دیتی اور وہ اُس بڑی موری کے اس طرف ہٹ جاتا جس کو پھاند کر وہ صحن کو چند قدموں میں طے کر سکتا تھا...... صرف چند قدموں میں!

جاوید کا گھر اس جگہ سے کافی دُور تھا مگر [وہ] یہ فاصلہ، بڑی تیزی سے طے کر کے یہاں پہنچ گیا تھا۔ اُس کے خیالات کی رفتار اس کے قدموں کی رفتار سے زیادہ تیز تھی۔ راستے میں اس نے بہت سی چیزوں پر غور کیا۔ وہ بے وقوف نہیں تھا، اسے اچھی طرح[2] معلوم تھا کہ ایک بیسوا کے پاس جا رہا ہے اور اُس کو اس بات کا بھی پورا شعور تھا کہ وہ کس غرض سے اُس کے یہاں جانا چاہتا ہے۔

وہ عورت چاہتا تھا۔ عورت، خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ عورت کی ضرورت اس کی زندگی میں یک بیک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ایک زمانے سے یہ ضرورت اس کے اندر آہستہ آہستہ شدت[3] اختیار کر رہی تھی اور اب دفعتاً اس نے محسوس کیا تھا کہ عورت کے بغیر وہ ایک لمحہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ عورت اس کو ضرور ملنی چاہیے، ایسی عورت جس کی ران پر ہولے سے طمانچہ مار کر وہ اس کی آواز سن سکے، ایسی عورت جس سے وہ واہیات قسم کی گفتگو کر سکے۔

جاوید پڑھا لکھا ہوش مند آدمی تھا۔ ہر بات کی اُونچ نیچ سمجھتا تھا مگر اس معاملے میں مزید غور و فکر کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اُس کے دل میں ایک ایسی خواہش پیدا ہوئی تھی جو اس کے لیے نئی نہ تھی۔ عورت کی قربت حاصل کرنے کی خواہش اس سے پہلے کئی بار اس کے دل میں پیدا ہوئی اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے، انتہائی کوششوں کے بعد جب اسے ناامیدی کا سامنا کرنا پڑا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی زندگی میں سالم عورت کبھی نہیں آئے گی اور اگر اس نے اُس سالم عورت کی تلاش جاری رکھی تو کسی روز وہ، دیوانے کتے کی طرح، راہ چلتی[4] عورت کو کاٹ کھائے گا۔

کاٹ کھانے کی حد تک، اپنے ارادے میں ناکام رہنے کے بعد، اب دفعتاً اس کے دل میں اس خواہش نے کروٹ بدلی تھی۔ اب کسی عورت کے بالوں میں، اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنے کا خیال، اس کے دماغ سے نکل[۵] چکا تھا۔ عورت کا تصوّر اس کے دماغ میں موجود تھا، اُس کے بال بھی تھے مگر اب اس کی یہ خواہش تھی کہ وہ اُن بالوں کو وحشیوں کی طرح کھینچے، نوچے، اُکھیڑے۔

اب اس کے دماغ میں سے وہ عورت نکل[۶] چکی تھی جس کے ہونٹوں پر وہ اپنے ہونٹ، اس طرح رکھنے کا آرزومند تھا جیسے تیتری پھولوں پر بیٹھتی ہے، اب وہ اُن ہونٹوں کو اپنے گرم ہونٹوں سے داغنا چاہتا تھا .... ہولے ہولے سرگوشیوں میں باتیں کرنے کا خیال بھی اس کے دماغ میں نہیں تھا، اب وہ بلند آواز میں باتیں کرنا چاہتا تھا، ایسی باتیں جو اس کے موجودہ ارادے کی طرح ننگی ہوں۔

اب سالم عورت اس کے پیشِ نظر نہیں تھی...... وہ ایسی عورت چاہتا تھا جو گھِس گھِسا کر شکستہ حال مرد کی شکل اختیار کر گئی ہو، ایسی عورت جو آدھی عورت ہو اور آدھی کچھ بھی نہ ہو۔

ایک زمانہ تھا جب جاوید ''عورت'' کہتے وقت اپنی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی ٹھنڈک محسوس کیا کرتا تھا۔ جب عورت کا تصوّر اُسے چاند کی ٹھنڈی دنیا میں لے جاتا تھا۔ وہ ''عورت'' کہتا تھا، بڑی احتیاط سے، جیسے اس کو اس بے جان لفظ کے ٹوٹنے کا ڈر ہو..... ایک عرصے[۷] تک وہ اس دنیا کی سیر کرتا رہا مگر انجامِ کار اس کو معلوم ہوا کہ عورت جس کی تمنا اس کے دل میں ہے، اس کی زندگی کا ایسا خواب ہے جو خراب معدے کے ساتھ دیکھا جائے۔

جاوید اب خوابوں کی دنیا سے باہر نکل آیا تھا۔ بہت دیر تک ذہنی طور پر وہ اپنے آپ کو بہلاتا رہا مگر اب اس کا جسم خوف ناک حد تک بیدار ہو چکا تھا۔ اس کے تصوّر کی شدّت نے اس کی جسمانی حسیّت کی نوک پلک کچھ اس طور پر نکالی تھی کہ اب زندگی اس کے لیے سوئیوں کا بستر بن گئی، ہر خیال ایک نشتر بن گیا اور عورت اس کی نظروں میں ایسی شکل اختیار کر گئی جس کو وہ بیان[۸] بھی کرنا چاہتا تو نہ کرسکتا۔

جاوید کبھی انسان تھا مگر اب انسانوں سے اسے نفرت تھی، اس قدر کہ اپنے آپ سے بھی متنفر ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ[۹] وہ خود کو ذلیل کرنا چاہتا تھا، اس طور پر کہ ایک عرصے تک اس کے خوب صورت خیال جن کو وہ اپنے دماغ میں پھولوں کی طرح سجا کے رکھتا رہا تھا، غلاظت سے لتھڑے رہیں۔

''مجھے نفاست تلاش کرنے میں ناکامی رہی ہے لیکن غلاظت تو میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اب جی یہ چاہتا ہے کہ اپنی روح اور اپنے جسم کے ہر ذرّے کو اس غلاظت سے آلودہ کردوں۔ میری ناک جو

اس سے پہلے خوشبوؤں کی متجسس رہی ہے، اب بدبودار اور متعفن چیزیں سونگھنے کے لیے بے تاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آج اپنے پرانے خیالات کا چغہ اُتار کر اُس محلّے کا رُخ کیا ہے جہاں ہر شے ایک پُراسرار تعفن میں لپٹی نظر آتی ہے...... یہ دنیا کس قدر بھیانک طور پر حسین ہے!"

نانک شاہی اینٹوں کا ناہموار فرش اُس کے سامنے تھا۔ لالٹین کی بیمار روشنی میں جاوید نے جب اُس فرش کی طرف، اپنی بدلی ہوئی نظروں سے، دیکھا تو اسے ایسا محسوس ہُوا کہ بہت سی ننگی عورتیں اوندھی لیٹی ہیں جن کی ہڈیاں جا بجا اُبھر رہی ہیں۔ اس نے ارادہ کیا کہ اس فرش کو طے کر کے نکڑ والے مکان کی سیڑھیوں تک پہنچ جائے اور کوٹھے پر چڑھ جائے مگر میونسپل کمیٹی کی لالٹین، غیر مختتم تکنکی باندھے، اس کی طرف گھور رہی تھی۔ اس کے بڑھنے والے قدم رُک گئے اور وہ بھنّا سا گیا۔ "یہ لالٹین مجھے کیوں گھور رہی ہے؟...... یہ میرے راستے میں کیوں روڑے اٹکاتی ہے؟"

وہ جانتا تھا کہ یہ محض واہمہ ہے اور اصلیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن پھر بھی اُس کے قدم رُک جاتے تھے اور وہ اپنے دل میں تمام بھیانک ارادے لیے موری کے اس پار کھڑا رہ جاتا تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ "اُس کی زندگی کے ستائیس برسوں کی جھجک جو اُسے ورثے میں ملی تھی، اس لالٹین میں جمع ہوگئی ہے۔ یہ جھجک جس کو پرانی کینچلی کی طرح اتار کر، وہ اپنے گھر چھوڑ آیا تھا، اُس سے پہلے وہاں پہنچ چکی تھی جہاں اُسے اپنی زندگی کا سب سے بھدّا کھیل کھیلنا تھا، ایسا کھیل جو اُسے کیچڑ میں لت پت کردے، اُس کی روح کو مُلوّث کردے۔

ایک میلی کچیلی عورت اس مکان میں رہتی تھی۔ اُس کے پاس چار پانچ جوان عورتیں تھیں جو رات کے اندھیرے اور دن کے اُجالے میں یکساں بھدّے پن سے پیشہ کراتی تھیں۔ یہ عورتیں گندی موری سے غلاظت نکالنے والے پمپ کی طرح دن رات چلتی رہتی تھیں۔ جاوید کو اس قحبہ خانے کے متعلق اس کے ایک دوست نے بتایا تھا جو حُسن وعشق کی لاش کئی مرتبہ اس قبرستان میں دفن کر چکا تھا۔ جاوید سے وہ کہا کرتا تھا: "تم عورت عورت پکارتے ہو...... عورت ہے کہاں؟...... مجھے تو اپنی زندگی میں صرف ایک عورت نظر آئی جو میری ماں تھی...... مستورات البتہ دیکھی ہیں اور ان کے متعلق سُنا بھی ہے لیکن جب کبھی عورت کی ضرورت محسوس ہوئی ہے تو میں نے "مائی جیواں کے کوٹھے کو اپنا بہترین رفیق پایا ہے...... بخدا مائی جیواں عورت نہیں، فرشتہ ہے...... خُدا اس کو خضر کی عمر عطا فرمائے۔"

جاوید مائی جیواں اور اس کے یہاں کی چار پانچ پیشہ کرانے والی عورتوں کے متعلق بہت کچھ سُن چکا

تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ ان میں سے ایک، ہر وقت گہرے رنگ کے شیشوں والا چشمہ پہنے رہتی ہے اس لیے کہ کسی بیماری کے باعث، اُس کی آنکھیں خراب ہو چکی ہیں۔ ایک کالی کلوٹی لونڈیا ہے جو ہر وقت ہنستی رہتی ہے۔ اُس کے متعلق جاوید جب سوچتا تو عجیب وغریب[۳] تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی۔ ''مجھے ایسی ہی عورت چاہیے جو ہر وقت ہنستی رہے..... ایسی عورتوں کو ہنستے ہی رہنا چاہیے۔ ... جب وہ ہنستی ہوگی تو اس کے کالے کالے ہونٹ یوں کھلتے ہوں گے جیسے بدبُودار گندے پانی میں میلے بُلبلے بن بن کر پھٹتے ہیں۔''

مائیں جیواں کے پاس ایک اور چھوکری بھی تھی جو باقاعدہ طور پر پیشہ کرانے سے پہلے گلیوں اور بازاروں میں بھیک مانگا کرتی تھی۔ اب ایک برس سے وہ اس مکان میں تھی جہاں اٹھارہ برسوں سے یہی کام ہو رہا تھا۔ یہ [وہ؟] اب پوڈر اور سرخی لگاتی تھی۔ جاوید اُس کے متعلق بھی سوچتا۔ ''اُس کے سُرخی لگے گال بالکل داغ دار سیبوں کے مانند ہوں گے...... جو ہر کوئی خرید سکتا ہے۔''

اُن چار یا پانچ عورتوں میں سے جاوید کی کسی خاص پر نظر نہیں تھی ۔ ... ''مجھے کوئی بھی مل جائے...... میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے دام لیے جائیں اور کھٹ سے ایک عورت میری بغل میں تھما دی جائے..... ایک سیکنڈ کی دیر نہ ہونی چاہیے، کسی قسم کی گفتگو نہ ہو، کوئی نرم و نازک فقرہ منہ سے نکلنے نہ پائے.. ... قدموں کی چاپ سنائی دے، دروازہ کھلنے کی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہو..... روپے کھنکھنائیں، اور آوازیں بھی آئیں مگر منہ بند رہے، اگر آواز نکلے تو ایسی جو انسانی آواز معلوم نہ ہو..... ملاقات ہو بالکل حیوانوں کی طرح، تہذیب و تمدن کے صندوق میں تالا لگ جائے، تھوڑی دیر کے لیے ایک ایسی دنیا آباد ہو جائے جس میں سُونگھنے، دیکھنے اور سُننے کی نازک حسّیات زنگ لگے اُسترے کے مانند کُند ہو جائیں۔''

جاوید بے چین ہو گیا۔ ایک اُلجھن سی اس کے دماغ میں پیدا ہوگئی۔ ارادہ اس کے اندر اتنی شدت اختیار کر چکا تھا کہ اگر پہاڑ بھی اس کے راستے میں ہوتے تو وہ اُن سے بھڑ جاتا مگر میونسپل کمیٹی کی ایک اندھی لالٹین جس کو ہوا کا ایک جھونکا بُجھا سکتا تھا، اس کی راہ میں بہت بُری طرح حائل ہوگئی تھی۔

اُس کی بغل میں پان والے کی دکان کھُلی تھی۔ تیز روشنی میں اس کی چھوٹی سی دُکان کا اسباب اس قدر نمایاں ہو رہا تھا کہ بہت سی چیزیں نظر نہیں آتی تھیں۔ بجلی کے قمقمے کے اردگرد مکھیاں اس انداز سے اُڑ رہی تھیں جیسے ان کے پَر بوجھل ہو رہے ہیں۔ جاوید نے جب اُن کی طرف دیکھا تو اُس کی اُلجھن میں اضافہ ہو گیا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُسے کوئی سُست رفتار چیز نظر آئے۔ اُس کا کر گزرنے کا ارادہ جو وہ اپنے گھر سے لے کر یہاں آیا تھا، ان مکھیوں کے ساتھ بار بار ٹکرایا، اور وہ اس کے احساس سے اس قدر پریشان ہُوا

کہ ایک ہُلّڑ سا اُس کے دماغ میں مچ گیا:[۱۴] ''میں ڈرتا ہوں..... میں خوف کھاتا ہوں..... اس لالٹین سے مجھے ڈر لگتا ہے...... میرے تمام ارادے اس نے تباہ کردیے ہیں..... میں ڈر پوک ہوں۔ .. میں ڈرپوک ہوں..... لعنت ہو مجھ پر۔''

اُس نے کئی لعنتیں اپنے آپ پر بھیجیں مگر خاطر خواہ اثر پیدا نہ ہُوا۔ اس کے قدم آگے نہ بڑھ سکے۔ نانک شاہی اینٹوں کا ناہموار فرش اس کے سامنے لیٹا رہا۔

گرمیوں کے دن تھے۔ نصف رات گزرنے پر بھی ہوا ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ بازار میں آمدورفت بہت کم تھی۔ گنتی کی صرف چند دکانیں کُھلی تھیں۔ فضا خاموشی میں لپٹی ہوئی تھی۔ البتہ کبھی کبھی کسی کوٹھے سے، ہوا کے گرم جھونکے کے ساتھ، تھکی ہوئی موسیقی کا ایک ٹکڑا اُڑ کر، ادھر چلا آتا تھا اور گاڑھی خاموشی میں گُھل جاتا تھا۔

جاوید کے سامنے یعنی مائی جیواں کے قحبہ خانے سے ادھر ہٹ کر، بڑے بازار میں جو دکانوں کے اوپر کوٹھوں کی ایک قطار تھی، اس میں کئی جگہ زندگی کے آثار نظر آرہے تھے۔ اس کے بالمقابل کھڑکی میں، تیز روشنی کے قمقمے کے نیچے، ایک سیاہ فام عورت بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی، اُس کے سر کے اوپر بجلی کا بلب جل رہا تھا اور ایسا دکھائی دیتا تھا[۱۵] کہ سفید آگ کا ایک گولا ہے جو پگھل پگھل کر اُس ویشیا پر گر رہا ہے۔

جاوید اس سیاہ فام عورت کے متعلق کچھ غور کرنے ہی والا تھا بازار کے اُس سرے سے جو اُس کی آنکھوں سے اوجھل تھا، بڑے بھدّے نعروں کی صورت میں چند آوازیں بلند ہوئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد، تین آدمی جھومتے جھامتے، شراب کے نشے میں چُور، نمودار ہوئے۔ تینوں کے تینوں اُس سیاہ فام عورت کے کوٹھے کے نیچے پہنچ کر کھڑے ہوگئے اور جاوید کے کانوں نے ایسی ایسی واہیات باتیں سنیں کہ اس کے تمام ارادے اس کے اندر سمٹ کر رہ گئے![۱۶]

ایک شرابی نے جس کے قدم بہت زیادہ لڑکھڑا رہے تھے، اپنے مونچھوں بھرے ہونٹوں سے، بڑی بھدّی آواز کے ساتھ، ایک بوسہ نوچ کر اُس کالی ویشیا کی طرف اُچھالا اور ایک ایسا فقرہ کسا کہ جاوید کی ساری ہمت پست ہوگئی۔ کوٹھے پر برقی لیمپ کی روشنی میں، اُس سیاہ فام عورت کے ہونٹ ایک آبنوسی قہقہے نے وا کیے اور اس نے شرابی کے فقرے کا جواب یوں دیا جیسے ٹوکری بھر کوڑا نیچے پھینک دیا ہے۔ نیچے غیر مربوط قہقہوں کا ایک فوارہ سا چھوٹ پڑا اور جاوید کے دیکھتے دیکھتے وہ تینوں شرابی کوٹھے پر چڑھے [چڑھ گئے؟]۔ تھوڑی دیر[۱۷] کے بعد وہ نشست جہاں وہ کالی ویشیا بیٹھی تھی، خالی ہوگئی۔

جاوید اپنے آپ سے اور زیادہ متنفر ہوگیا۔ ’’تم ... تم ... تم کیا ہو؟ ...... میں پوچھتا ہوں، آخر تم کیا ہو ..... نہ تم یہ ہو، نہ تم وہ ہو ...... نہ تم انسان ہو نہ حیوان ...... تمہاری ذہانت و ذکاوت آج سب دھری کی دھری رہ گئی ہے۔ تین شرابی آتے ہیں، تمہاری طرح ان کے دل میں ارادہ نہیں ہوتا لیکن بے دھڑک اُس ویشیا سے واہیات باتیں کرتے ہیں اور ہنستے، قہقہے لگاتے، کوٹھے پر چڑھ جاتے ہیں، گویا پتنگ اڑانے جا رہے ہیں ...... اور تم ... اور تم جو کہ اچھی طرح سمجھتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا ہے، یوں بے وقوفوں کی طرح بیچ بازار میں کھڑے[۱۸] ہو اور ایک بے جان لالٹین سے خوف کھا رہے ہو ...... تمہارا ارادہ اس قدر صاف اور شفاف ہے لیکن پھر بھی تمہارے قدم آگے نہیں بڑھتے ...... لعنت ہو تم پر۔‘‘

جاوید کے اندر ایک لمحے کے لیے خود انتقامی کا جذبہ پیدا ہوا۔ اُس کے قدموں میں جنبش ہوئی اور موری پھاند کر وہ مائی جیواں کے کوٹھے کی طرف بڑھا۔ قریب تھا کہ وہ لپک کر سیڑھیوں کے پاس پہنچ جائے کہ اُوپر سے ایک آدمی اُترا، جاوید پیچھے ہٹ گیا۔ غیر ارادی طور پر اس نے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش بھی کی لیکن کوٹھے پر سے نیچے آنے والے آدمی نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

اُس آدمی نے اپنا ململ کا کُرتا اُتار کر کاندھے پر دھرا تھا اور داہنی کلائی میں موتیے کے پھولوں کا مسلا ہوا ہار لپٹا تھا، اُس کا بدن پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ جاوید کے وجود سے بے خبر، وہ اپنے تہمد کو دونوں ہاتھوں سے گھٹنوں تک اونچا کیے، نانک شاہی اینٹوں کا اُونچا نیچا فرش طے کر کے، موری کے اُس پار چلا گیا اور جاوید نے سوچنا[۱۹] شروع کیا کہ اس آدمی نے اُس کی طرف کیوں نہیں دیکھا؟

اس دوران میں اس نے لالٹین کی طرف دیکھا تو وہ اُسے یہ کہتی معلوم ہوئی: ’’تم کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ تم ڈرپوک ہو ...... یاد ہے تمہیں، پچھلے برس برسات میں جب تم نے اُس ہندو لڑکی اندرا سے، اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہا تھا تو تمہارے جسم میں سکت تک نہیں رہی تھی۔ کیسے کیسے بھیانک خیال تمہارے دماغ میں پیدا ہوئے تھے ...... یاد ہے، تم نے ہندو مسلم فساد کے متعلق بھی سوچا تھا اور ڈر گئے تھے۔ اُس لڑکی کو تم نے اسی ڈر کے مارے بھلا دیا اور حمیدہ سے تم اس لیے محبت نہ کر سکے کہ وہ تمہاری رشتے دار تھی اور تمہیں اس بات کا خوف تھا کہ تمہاری محبت کو غلط نظروں سے دیکھا جائے گا۔ کیسے کیسے وہم تمہارے اوپر اُن دنوں مسلط تھے ...... اور پھر تم نے بلقیس سے محبت کرنا چاہی مگر اُس کو صرف ایک بار دیکھ کر، تمہارے سب ارادے غائب ہوگئے اور تمہارا دل ویسے کا ویسے بنجر رہا .... کیا تمہیں اس بات کا احساس نہیں کہ ہر بار تم نے، اپنی بے لوث محبت کو، آپ ہی شک کی نظروں سے دیکھا ہے! تمہیں اس بات کا کبھی

پوری طرح یقین نہیں آیا کہ تمہاری محبت، ٹھیک فطری حالت میں ہے...... تم ہمیشہ ڈرتے ہو۔[۲۰] اس وقت بھی تم خائف ہو، یہاں گھریلو عورتوں اور لڑکیوں کا سوال نہیں، ہندو مسلم فساد کا بھی اس جگہ کوئی خدشہ نہیں لیکن اس کے باوجود، تم کبھی اس کوٹھے پر نہیں جا سکو گے...... میں دیکھوں گی، تم کس طرح اُوپر جاتے ہو۔''

جاوید کی رہی سہی ہمت بھی پست ہوگئی۔ اس نے محسوس کیا وہ[۲۱] واقعی پرلے درجے کا ڈرپوک ہے... . بیتے ہوئے واقعات، تیز ہَوا میں رکھی ہوئی کتاب کے اوراق کی طرح، اُس کے دماغ میں دیر تک پھڑپھڑاتے رہے اور پہلی مرتبہ اس کو اس بات کا بڑی شدّت کے ساتھ احساس ہوا کہ اس کے وجود کی بنیادوں میں ایک ایسی جھجک بیٹھی ہوئی ہے جس نے اسے قابلِ رحم حد تک ڈرپوک بنا دیا ہے۔

سامنے سیڑھیوں سے کسی کے اُترنے کی آواز آئی تو جاوید اپنے خیالات سے چونک پڑا۔ وہی جو گہرے رنگ کے شیشوں والی عینک پہنتی تھی اور جس کے متعلق وہ کئی بار اپنے دوست سے سُن چکا تھا، سیڑھیوں کے اختتامی چبوترے پر کھڑی تھی۔ جاوید گھبرا گیا۔ قریب تھا کہ وہ آگے سرک جائے کہ اُس نے بڑے بھدے طریقے پر اُسے آواز دی: ''اجی ٹھہر جاؤ...... میری جان گھبراؤ نہیں...... آؤ...... آؤ......'' اس کے بعد اُس نے پچکارتے ہوئے کہا: ''چلے آؤ...... آجاؤ۔''

یہ سن کر جاوید کو ایسا محسوس ہوا کہ اگر وہ کچھ دیر وہاں ٹھہرا تو اس کی پیٹھ میں دُم اُگ آئے گی جو اس ویشیا کے پُچکارنے پر ہلنا شروع کر دے گی۔ اس احساس سمیت، اُس نے چبوترے کی طرف گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ مائی جیواں کے قحبہ خانے کی اُس عینک چڑھی لونڈیا نے کچھ اس طرح اپنے[۲۲] بالائی جسم کو حرکت دی کہ جاوید کے تمام ارادے پکے ہوئے بیروں کے مانند جھڑ گئے۔ اُس نے پھر پچکارا: ''آؤ...... میری جان اب آبھی جاؤ۔''

جاوید اُٹھ بھاگا [بھاگ اُٹھا؟]۔ موری پھاند کر جب وہ بازار میں پہنچا تو اُس نے ایک ایسے قہقہے کی آواز سنی جو خطرناک طور پر بھیانک تھا۔ وہ کانپ اٹھا۔

جب وہ اپنے گھر کے پاس پہنچا تو اُس کے خیالات کے ہجوم میں سے دفعتاً ایک خیال، رینگ کر آگے بڑھا جس نے اُس کو تسکین دی۔ ''جاوید! تم ایک بہت بڑے گناہ سے بچ گئے،[۲۳] خدا کا شکر بجا لاؤ۔''

حواشی

(اِن حواشی میں ص سے مراد: منٹو کے افسانے طبع اوّل (۱۹۴۰ء)
کا صفحہ ہے۔ دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ جاوید کا یہ خیال... فرش ہو رہا تھا، — ص ۲۴۵

۲۔ وہ یہ فاصلہ... ''دور تھا مگر'' کے بعد ''وہ'' کا اضافہ مدوّن نے طبع اوّل کی
بنیاد پر کیا ہے... اُس کو اچھی طرح — ایضاً

۳۔ موجودہ شدّت — ایضاً

۴۔ وہ مزید غور و فکر کے لیے... تلاش میں کوشش جاری... کسی راہ چلتی — ص ۲۴۶

۵۔ کاٹ کھانے کے ارادہ میں ناکام... دماغ میں سے نکل — ایضاً

۶۔ عورت بالکل نکل — ایضاً

۷۔ ڈر ہے ایک عرصے — ایضاً

۸۔ کی کچھ اس طور پر نوک پلک نکالی... بن گئی تھی... اگر وہ بیان — ص ۲۴۷

۹۔ سے بھی وہ متنفر... یہی وجہ ہے کہ — ایضاً

۱۰۔ اوندھی سیدھی لیٹی... کیوں گھور گھور کر دیکھ رہی — ایضاً

۱۱۔ کھڑا کا کھڑا رہ جاتا تھا۔ دراصل اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ — ایضاً

۱۲۔ محسوس ہوئی ہے میں نے — ص ۲۴۸

۱۳۔ سوچتا تو ایک عجیب و غریب — ایضاً

۱۴۔ دماغ میں برپا ہو گیا — ص ۲۴۹

۱۵۔ ایسا معلوم ہوتا تھا — ایضاً

۱۶۔ جو کہ اس کی آنکھوں... کانوں نے ایسی واہیات... سمت سے گئے — ص ۲۵۰

۱۷۔ فقرہ کہا... پھینک دیا ہو... چڑھے اور تھوڑی دیر — ایضاً

۱۸۔ آخر تم ہو کیا... اور نہ تم وہ ہو... بیچ بازار کے کھڑے — ایضاً

۱۹۔ بدن اُس کا... جاوید نے یہ سوچنا — ص ۲۵۱

۲۰۔ کامیاب نہیں ہو گے... سکت نہیں رہی... اور تم ڈر گئے تھے
... مسلّط تھے اور پھر... اور پھر... خود آپ ہی... ڈرتے رہے ہو — ایضاً

۲۱۔ محسوس کیا کہ وہ — ایضاً

۲۲۔ نے اِس طور پر اپنے — ص ۲۵۲

۲۳۔ آگے بڑھا اور اُس کو... بچ گئے ہو، — ایضاً

دس روپے

وہ گلی کے اُس نکڑ پر، چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی اور اُس کی ماں اُسے چالی (بڑا مکان جس میں کئی منزلیں اور کئی چھوٹے چھوٹے کمرے ہوتے ہیں) میں ڈھونڈ رہی تھی۔ کشوری کو اپنی کھولی میں بٹھا کر اور باہر والے سے کافی ملی چائے لانے کے لیے کہہ کر، وہ اس چالی کی تینوں منزلوں میں، اپنی بیٹی کو تلاش کر چکی تھی مگر جانے وہ کہاں مر گئی تھی۔ سنڈاس کے پاس جا کر بھی اُس نے آواز دی: ''اے سریتا...... سریتا!'' مگر وہ تو چالی میں تھی ہی نہیں اور جیسا کہ اُس کی ماں سمجھ رہی تھی، اب اُسے پیچش کی شکایت بھی نہیں تھی۔[1] دوا پیے بغیر اُس کو آرام آ چکا تھا اور وہ باہر گلی کے اُس نکڑ پر جہاں کچرے کا ڈھیر پڑا رہتا ہے، چھوٹی چھوٹی لڑکیوں سے کھیل رہی تھی اور ہر قسم کے فکر و تردد سے آزاد تھی۔

اُس کی ماں بہت متفکر تھی۔ کشوری اندر کھولی میں بیٹھا تھا اور جیسا کہ اُس نے کہا تھا دو سیٹھ، باہر بڑے بازار میں، موٹر لیے کھڑے تھے، لیکن سریتا کہیں غائب ہی ہو گئی تھی۔ موٹر والے سیٹھ ہر روز تو آتے نہیں، یہ تو کشوری کی مہربانی ہے کہ مہینے میں ایک دو بار موٹی اسامی لے آتا ہے ورنہ ایسے گندے محلے میں جہاں پان کی پیکوں اور جلی ہوئی بیڑیوں کی ملی جلی بو سے کشوری [بھی؟] گھبراتا ہے، سیٹھ لوگ کیسے آ سکتے ہیں! کشوری چونکہ ہوشیار ہے اس لیے وہ کسی آدمی کو مکان پر نہیں لاتا بلکہ سریتا کو کپڑے وپڑے پہنا کر باہر لے جایا کرتا ہے اور اُن لوگوں سے کہہ دیا کرتا ہے کہ ''صاحب آج کل زمانہ بڑا نازک ہے۔ پولیس کے سپاہی ہر وقت گھات میں لگے رہتے ہیں۔ اب تک دو سو دھندا کرنے والی چھوکریاں پکڑی جا چکی ہیں۔ کورٹ میں میرا بھی ایک کیس چل رہا ہے۔ اس لیے پھونک پھونک کر قدم[2] رکھنا پڑتا ہے۔''

سریتا کی ماں کو بہت غصہ آ رہا تھا۔ جب وہ نیچے اُتری تو سیڑھیوں کے پاس رام دئی بیٹھی بیڑیوں کے پتے کاٹ رہی تھی، اُس سے سریتا کی ماں نے پوچھا ''تو نے سریتا کو کہیں دیکھا ہے؟ جانے[3] کہاں مر گئی ہے! بس آج مجھے مل جائے، وہ چار چوٹ کی ماردوں کہ بند بند ڈھیلا ہو جائے..... لوٹھ کی لوٹھ ہو گئی ہے پر سارا دن لونڈوں کے ساتھ کُدکڑے لگاتی رہتی ہے۔''

رام دئی بیڑیوں کے پتے کاٹتی رہی اور اُس نے سریتا کی ماں کو جواب نہ دیا۔ دراصل رام دئی سے

سریتا کی ماں نے خاص طور پر کچھ پوچھا ہی نہیں تھا۔ وہ یوں ہی بڑبڑاتی ہوئی اُس کے پاس سے گزر گئی جیسا کہ اُس کا عام دستور تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن اُسے سریتا کو ڈھونڈنا پڑتا تھا اور رام دئی کو جو کہ سارا دن، سیڑھیوں کے پاس، پٹاری سامنے رکھے، بیڑیوں پر لال اور سفید دھاگے لپیٹتی رہتی تھی، مخاطب[۴] کر کے یہی الفاظ دُہرایا کرتی تھی۔

ایک اور بات وہ چالی کی ساری عورتوں سے کہا کرتی تھی: "میں تو اپنی سریتا کا کسی بابو سے بیاہ کروں گی...... اسی لیے تو اُس سے کہتی ہوں کہ کچھ پڑھ لکھ لے...... یہاں پاس ہی، ایک اسکول منسی پالٹی (میونسپلٹی) نے کھولا ہے، سوچتی ہوں اُس میں سریتا کو داخل کرادوں، بہن اس کے پتا کو بڑا شوق تھا کہ میری لڑکی لکھی پڑھی ہو......" اس کے بعد وہ، ایک لمبی آہ بھر کر، عام طور پر اپنے مرے ہوئے شوہر کا قصہ چھیڑ دیتی تھی جو چالی کی ہر عورت کو زبانی یاد تھا۔ رام دئی سے اگر آپ پوچھیں کہ اچھا، جب سریتا کے باپ کو جو ریلوائی میں کام کرتا تھا، بڑے صاحب نے گالی دی تو کیا ہُوا؟ تو رام دئی فوراً آپ کو بتادے گی کہ سریتا کے باپ کے منہ میں جھاگ بھر آیا اور وہ صاحب سے کہنے لگا: "میں تمہارا نوکر نہیں ہوں، سرکار کا نوکر ہوں۔ تم مجھ پر رُعب نہیں جما سکتے، دیکھو! اگر پھر گالی دی تو یہ دونوں جبڑے حلق کے اندر کر دوں گا۔" بس پھر کیا تھا، صاحب تاؤ میں آگیا اور اُس نے ایک اور گالی سنادی۔ اُس پر سریتا کے باپ نے، غصّے میں آکر، صاحب کی گردن پر ایسی دُھول جمائی کہ اُس کا ٹوپ دس گز پرے جا گرا اور اُس کو دن میں تارے نظر آگئے مگر پھر بھی وہ بڑا آدمی تھا، آگے بڑھ کر اُس نے سریتا کے باپ کے پیٹ میں، اپنے فوجی بوٹ سے، اس زور کی ٹھوکر ماری[۵] کہ اُس کی تلّی پھٹ گئی اور وہیں لائنوں کے پاس گر کر اُس نے جان دے دی۔ سرکار نے صاحب پر مقدمہ چلایا اور پورے پانچ سو روپے سریتا کی ماں کو اُس سے دلوائے مگر قسمت بُری تھی، اس کو سٹّا کھیلنے کی چاٹ پڑ گئی اور پانچ مہینے کے اندر اندر سارا روپیہ برباد ہوگیا۔

سریتا کی ماں کی زبان پر ہر وقت یہ کہانی جاری رہتی تھی لیکن کسی کو یقین نہ تھا کہ یہ سچ ہے یا جھوٹ۔ چالی میں سے کسی آدمی کو بھی سریتا کی ماں سے ہمدردی نہ تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ سب کے سب، خود ہمدردی کے قابل تھے۔ کوئی کسی کا دوست نہیں تھا۔ اس بلڈنگ میں اکثر آدمی، ایسے رہتے تھے جو دن بھر سوتے تھے اور رات کو جاگتے تھے کیونکہ انہیں رات کو، پاس والی مل میں کام پر جانا ہوتا تھا۔ اس بلڈنگ[۶] میں سب آدمی بالکل پاس پاس رہتے تھے لیکن کسی کو ایک دوسرے سے دلچسپی نہ تھی۔

چالی میں قریب قریب سب لوگ جانتے تھے کہ سریتا کی ماں اپنی جوان بیٹی سے پیشہ کراتی ہے لیکن

چونکہ وہ کسی کے ساتھ اچھا بُرا سلوک کرنے کے عادی ہی نہ تھے اس لیے سریتا کی ماں کو کوئی جھٹلانے کی کوشش نہ کرتا تھا، جب وہ کہا کرتی تھی: ''میری بیٹی کو تو دنیا کی کچھ خبر ہی نہیں۔'' البتہ ایک روز صبح سویرے، نل کے پاس جب تکارام نے سریتا کو چھیڑا تھا تو سریتا کی ماں بہت چیخی چلائی تھی: ''اس موئے گنجے کو، تو کیوں سنبھال کے نہیں رکھتی، پر ماتما کرے دونوں آنکھوں سے اندھا ہو جائے، جس سے اس نے میری کنواری بیٹی کی طرف بُری نظروں سے دیکھا . . . سچ کہتی ہوں، ایک روز ایسا فساد ہوگا کہ اس تیری سوغات کا مارے جوتوں کے سر پلپلا کر دوں گی ..... باہر جو چاہے کرتا پھرے، یہاں اسے بھلے مانسوں کی طرح رہنا ہوگا۔ سُنا؟''

اور یہ سُن کر، تکارام کی بھینگی بیوی، دھوتی باندھتے باندھتے باہر نکل آئی۔ ''خبردار موئی چڑیل جو تو نے ایک لفظ بھی اور زبان سے نکالا ...... یہ تیری دیوی تو ہوٹل کے چھوکروں سے بھی آنکھ مچولی کھیلتی ہے اور تو کیا ہم سب کو اندھا سمجھتی ہے، کیا ہم سب جانتے نہیں کہ تیرے گھر میں نت نئے ^ بابو کس لیے آتے ہیں۔ اور یہ تیری سریتا آئے دن بن سنور کر باہر کیوں جاتی ہے ..... بڑی آئی عزت آبرو والی ...... جا جا، دور دفان ہو یہاں سے۔''

تکارام کی بھینگی بیوی کے متعلق بہت سی باتیں مشہور تھیں۔ لیکن یہ بات خاص طور پر سب لوگوں کو معلوم تھی کہ گھاسلیٹ والا (مٹی کا تیل بیچنے والا) تیل دینے کے لیے آتا ہے تو وہ اُسے اندر بُلا کر دروازہ بند کر لیا کرتی ہے۔ چنانچہ سریتا کی ماں نے اس خاص بات پر بہت زور دیا۔ وہ بار بار نفرت بھرے لہجے میں اُس سے کہتی: ''اور وہ تیرا یار گھاسلیٹ والا . . . دو دو گھنٹے اُسے کھولی میں بٹھا کر کیا تو اُس کا گھاسلیٹ سُونگھتی رہتی ہے؟''۹

تکارام کی بیوی سے سریتا کی ماں کی بول چال زیادہ دیر تک بند نہ رہی تھی، کیونکہ ایک روز سریتا کی ماں نے رات کو اپنی اس پڑوسن کو گھُپ اندھیرے میں کسی سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے پکڑ لیا تھا۔ اور دوسرے ہی روز تکارام کی بیوی نے، جب وہ رات کو پائے دھونی کی طرف سے آ رہی تھی، سریتا کو ایک ''جنٹل مین آدمی'' کے ساتھ موٹر میں بیٹھے دیکھ لیا۔ چنانچہ ان دونوں کا آپس میں سمجھوتا ہو گیا تھا۔'' اسی لیے سریتا کی ماں نے تکارام کی بیوی سے پوچھا: ''تو نے کہیں سریتا کو [کوتو؟] نہیں دیکھا؟''

تکارام کی بیوی نے بھینگی آنکھ سے گلی کے نکڑ کی طرف دیکھا۔'' ''وہاں گھُورے کے پاس پنواڑی کی لونڈیا سے کھیل رہی ہے۔'' پھر اس نے آواز دھیمی کر کے اس سے کہا: ''ابھی ابھی کشوری اُوپر گیا تھا، کیا تجھ سے ملا؟''

سریتا کی ماں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر ہولے سے کہا: ''اوپر بٹھا آئی ہوں، پر یہ سریتا ہمیشہ وقت پر کہیں غائب ہو جاتی ہے۔ کچھ سوچتی نہیں، کچھ سمجھتی نہیں، بس دن بھر[۱۲] کھیل کود چاہیے۔''

یہ کہہ کر وہ گھُورے کی طرف بڑھی اور جب سیمنٹ کی بنی ہوئی مُوتری (پیشاب گاہ) کے پاس آئی تو [چھوکریوں کے ساتھ کھیلتی] سریتا فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور اُس کے[۱۳] چہرے پر افسردگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ جب اس کی ماں نے خشم آلود لہجے میں، اس کا بازو پکڑ کر، کہا: ''چل گھر میں چل کے مر..... تجھے تو سوائے اُچھل کود کے اور کوئی کام ہی نہیں۔'' پھر راستے میں اُس نے ہولے سے کہا: ''کشوری بڑی دیر سے آیا بیٹھا ہے۔ ایک موٹر والے سیٹھ کو لایا ہے۔ . . . چل تو بھاگ کے اُوپر چل اور جلدی جلدی تیار ہو جا . . اور سُن ...... وہ نیلی جارجٹ کی ساڑی پہنیو ...... اور دیکھ یہ تیرے بال بھی بہت بُری طرح بکھر رہے ہیں ...... تو جلدی تیار ہو، کنگھی میں کر دوں گی۔''

یہ سُن کر کہ موٹر والے سیٹھ آئے ہیں، سریتا بہت خوش ہوئی۔ اُسے سیٹھ سے اتنی دلچسپی نہیں تھی جتنی کہ موٹر سے تھی۔ موٹر کی سواری اسے بہت پسند تھی۔ جب موٹر فرّاٹے بھرتی کھُلی کھُلی سڑکوں پر چلتی اور اُس کے منہ پر ہوا کے طمانچے پڑتے، تو اُس کے دل میں ایک ناقابلِ بیان مسرّت اُبلنا شروع ہو جاتی۔ موٹر میں بیٹھ کر اس کو ہر شے ایک ہوائی چکر دکھائی دیتی اور سمجھتی کہ وہ خود[۱۴] ایک بگولا ہے جو سڑکوں پر اُڑتا چلا جا رہا ہے۔

سریتا کی عمر زیادہ سے زیادہ پندرہ برس کی ہو گی۔ مگر اس میں بچپنا تیرہ برس کی لڑکیوں کا سا تھا۔ عورتوں سے ملنا جُلنا اور ان سے باتیں کرنا بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔ سارا دن چھوٹی چھوٹی[۱۵] لڑکیوں کے ساتھ اُوٹ پٹانگ کھیلوں میں مصروف رہتی۔ ایسے کھیل جن کا کوئی مطلب ہی نہ ہو۔ مثال کے طور پر وہ گلی کے کالے کالے پھرے فرش پر کھریا مٹی سے لکیریں کھینچنے میں بہت دلچسپی لیتی تھی اور اس کھیل میں وہ اس انہماک سے مصروف رہتی جیسے سڑک پر یہ ٹیڑھی بنگی لکیریں اگر نہ کھینچی گئیں تو آمد و رفت بند ہو جائے گی، اور پھر کھولی سے پُرانے ٹاٹ اُٹھا کر وہ اپنی ننھی ننھی سہیلیوں کے ساتھ کئی کئی گھنٹے اُن کو فٹ پاتھ پر جھٹکنے، صاف کرنے، بچھانے اور اُن پر بیٹھنے کے غیر دلچسپ کھیل میں مشغول رہتی تھی۔

سریتا خوب صورت نہیں تھی۔ رنگ اس کا سیاہی مائل گندمی تھا۔ بمبئی کے مرطوب موسم کے باعث اس کے چہرے کی جلد ہر وقت چکنی رہتی تھی اور پتلے پتلے ہونٹوں پر جو چیکو (ایک پھل جس کا رنگ گندمی ہوتا ہے) کے چھلکے دکھائی دیتے تھے، ہر وقت خفیف سی لرزش طاری رہتی تھی۔ اُوپر کے ہونٹ پر پسینے کی تین چار ننھی ننھی

بوندیں ہمیشہ کپکپاتی رہتی تھیں۔

اُس کی صحت اچھی تھی۔ غلاظت میں رہنے کے باوجود اس کا جسم سڈول اور متناسب تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پر جوانی کا حملہ بڑی شدت سے ہُوا ہے جس نے مخالف قوتوں کو دبا کے رکھ دیا ہے۔ قد چھوٹا تھا جو اس کی[۱۶] تندرستی میں اضافہ کرتا تھا۔ سڑک پر پھُرتی سے ادھر اُدھر چلتے ہوئے جب اس کی میلی گھگری اوپر کو اُٹھ جاتی تو کوئی راہ چلنے والے مردوں کی نگاہیں اس کی پنڈلیوں کی طرف اُٹھ جاتی تھیں جن میں، جوانی کے باعث، تازہ رندہ کی ہوئی ساگوان کی لکڑی جیسی چمک دکھائی دیتی تھی۔ ان پنڈلیوں پر جو بالوں سے بالکل بے نیاز تھیں، مساموں کے ننھے ننھے نشان دیکھ کر اُن سنگتروں کے چھلکے یاد آجاتے تھے جن کے چھوٹے چھوٹے خلیوں میں تیل بھرا ہوتا ہے اور جو تھوڑے سے دباؤ پر فوارے کی طرح اُوپر اُٹھ کر آنکھوں میں گھُس جایا کرتا ہے۔

سریتا کی باہیں بھی سڈول تھیں۔ کندھوں پر اُن کی گولائی، موٹے اور بڑے بے ڈھب طریقے پر سلے ہوئے بلاؤز کے باوجود، باہر جھانکتی تھی۔ بال بڑے گھنے اور لمبے تھے، ان میں سے کھوپرے کے تیل کی بو آتی رہتی تھی، ایک موٹے کوڑے کے مانند اُس کی چوٹی، پیٹھ کو تھپکتی رہتی تھی۔ سریتا اپنے بالوں کی لمبائی سے خوش نہیں تھی کیونکہ کھیل کود کے دوران میں اس کی چوٹی اسے بہت تکلیف دیا کرتی تھی[۱۷] اور اسے مختلف طریقوں سے اس کو قابو میں رکھنا پڑتا تھا۔

سریتا کا دل و دماغ ہر قسم کے فکر و تردّد سے آزاد تھا۔ دونوں وقت اسے کھانے کو مل جاتا تھا۔ اس کی ماں گھر کا سب کام کاج کرتی تھی۔ صبح کو سریتا دو بالٹیاں پانی سے بھر کر اندر رکھ دیتی اور شام کو ہر روز لیمپ میں ایک پیسے کا تیل بھروا لاتی۔[۱۸] کئی برسوں سے وہ یہ کام بڑی باقاعدگی سے کر رہی تھی۔ چنانچہ شام کو، عادت کے باعث، خود بخود اس کا ہاتھ اُس پیالے کی طرف بڑھتا جس میں پیسے پڑے رہتے تھے اور لیمپ اٹھا کر وہ نیچے چلی جاتی۔

کبھی کبھی یعنی مہینے میں چار پانچ بار، جب کشوری سیٹھ لوگوں کو لاتا تھا تو ان کے ساتھ ہوٹل میں یا باہر اندھیرے مقاموں پر جانے کو وہ تفریح خیال کرتی تھی۔ اُس نے اِس باہر جانے کے سلسلے کے دوسرے پہلوؤں پر کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ شاید یہ سمجھتی تھی کہ دوسری لڑکیوں کے گھر میں بھی کشوری جیسے آدمی آتے ہوں گے اور اُن کو سیٹھ لوگوں کے ساتھ باہر جانا پڑتا ہوگا، اور وہاں رات کو ورلی کے ٹھنڈے ٹھنڈے بینچوں پر یا جوہو کی گیلی ریت پر، جو کچھ ہوتا ہے، سب کے ساتھ ہوتا ہوگا۔ چنانچہ اُس نے ایک بار اپنی ماں سے کہا

تھا۔ ''ماں اب تو شانتا بھی کافی بڑی ہوگئی'' ..... اس کو بھی میرے ساتھ بھیج دو نا۔ .... یہ سیٹھ جو آپ آئے ہیں مجھے انڈے کھانے کو دیا کرتے ہیں اور شانتا کو انڈے بہت بھاتے ہیں۔'' اس پر اس کی ماں نے بات گول مول کردی تھی ''ہاں ہاں کسی روز اُس کو بھی تمہارے ساتھ بھیج دوں گی، اس کی ماں پونا سے واپس تو آجائے۔''

اور سریتا نے دوسرے روز ہی شانتا کو جب وہ سنڈاس سے نکل رہی تھی، یہ خوش خبری سنائی تھی ''تیری ماں پونا سے آجائے تو سب معاملہ ٹھیک ہوجائے گا، تو بھی میرے ساتھ ورلی جایا کرے گی۔'' اور اس کے بعد سریتا نے اُس کو رات کی بات کچھ اس طریقے پر سُنانا شروع کی تھی جیسے اس نے ایک [بہت] ہی پیارا سپنا دیکھا ہے۔ شانتا کو جو سریتا سے دو برس چھوٹی تھی، یہ باتیں سُن کر ایسا لگا تھا'' جیسے اس کے سارے جسم کے اندر ننھے ننھے گھنگھرو بج رہے ہیں۔ سریتا کی سب باتیں سُن کر بھی اس کو تسلی نہ ہوئی تھی اور اس کا بازو کھینچ کر اس نے کہا تھا: ''چل نیچے چلتے ہیں۔ .. وہاں باتیں کریں گے۔'' اور نیچے اُس مُوتری کے پاس جہاں گردھاری بنیے نے بہت سے ٹاٹوں پر کھوپرے کے میلے ٹکڑے سکھانے کے لیے ڈال رکھے تھے، وہ دونوں دیر تک کپکپی پیدا کرنے والی باتیں کرتی رہی تھیں۔

اس وقت بھی جب کہ سریتا دھوتی کے پردے کے پیچھے نیلی جارجٹ کی ساڑی پہن رہی تھی، کپڑے کے مس ہی سے اس کے بدن پر گدگدی ہورہی تھی اور موٹر کی سیر کا خیال اس کے دماغ میں پرندوں کی سی پھڑ پھڑاہٹیں پیدا کررہا تھا۔ اب کی بار سیٹھ کیسا ہوگا اور اسے کہاں لے جائے گا؟ یہ، اور اسی قسم کے اور سوال، اس کے دماغ میں نہیں آرہے تھے البتہ جلدی جلدی کپڑے بدلتے ہوئے اُس نے ایک دو مرتبہ یہ ضرور سوچا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ موٹر چلے'' اور چند ہی منٹوں میں کسی ہوٹل کے دروازے پر ٹھہر جائے اور ایک بند کمرے میں سیٹھ شراب پینا شروع کردیں اور اس کا دم گھٹنا شروع ہوجائے۔ اُسے ہوٹلوں کے بند کمرے پسند نہیں تھے جن میں عام طور پر لوہے کی دو چار پائیاں اس طور پر بچھی ہوتی تھیں گویا اُن پر جی بھر کے سونے کی اجازت ہی نہیں ہے۔

جلدی جلدی اس نے جارجٹ کی ساڑی پہنی اور اس کی شکنیں درست کرتی ہوئی ایک لمحے کے لیے کشوری کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ ''کشوری، ذرا دیکھو ...... پیچھے سے ساڑی ٹھیک ہے نا؟'' اور جواب کا انتظار کیے بغیر وہ لکڑی کے اس ٹوٹے ہوئے بکس کی طرف بڑھی جس میں اس نے جاپانی سُرخی رکھی ہوئی تھی ...... ایک دُھندلے آئینے کو کھڑکی کی سلاخوں میں اٹکا کر اس نے دوہری ہوکر اپنے گالوں پر پوڈر ملا اور سُرخی لگا کر جب بالکل تیار ہوگئی تو مسکرا کر کشوری کی طرف دادطلب نگاہوں سے دیکھا۔

شوخ رنگ کی نیلی ساڑی میں، ہونٹوں پر بے ترتیبی سے سرخی کی دھڑی جمائے اور سانولے گالوں پر پیازی رنگ کا پوڈر ملے، وہ مٹی کا ایک ایسا کھلونا معلوم ہوئی جو دیوالی پر کھلونے بیچنے والوں کی دکان میں سب سے زیادہ نمایاں دکھائی دیا کرتا ہے۔

اتنے میں اس کی ماں آگئی۔ اس نے جلدی جلدی سریتا کے بال دُرست کیے اور[۲۲] کہا: ''دیکھو بیٹا، اچھی اچھی باتیں کرنا...... اور جو کچھ وہ کہیں مان لینا...... یہ سیٹھ جو آئے ہیں نا بڑے آدمی ہیں، موٹر ان کی اپنی ہے ...... '' پھر کشوری سے مخاطب ہو کر کہا: ''اب تو جلدی سے لے جا اسے ...... بے چارے کب کے کھڑے راہ دیکھ رہے ہوں گے۔''

باہر بڑے بازار میں جہاں ایک کارخانے کی لمبی سی دیوار دُور تک چلی گئی ہے، ایک پیلے رنگ کی موٹر ''یہاں پیشاب کرنا منع ہے'' کے چھوٹے سے بورڈ کے پہلو میں کھڑی تھی اور موٹر میں تین حیدرآبادی نوجوان، اپنی اپنی ناک پر رومال رکھے، کشوری کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ موٹر آگے لے جاتے مگر مصیبت یہ ہے کہ [کذا] دیوار دُور تک چلی گئی تھی اور اُس کے ساتھ ہی پیشاب کا سلسلہ بھی۔[۲۳]

جب گلی کے موڑ سے اس نوجوان کو جو موٹر کا ہینڈل تھامے بیٹھا تھا، کشوری نظر آیا تو اُس نے اپنے باقی دو ساتھیوں سے کہا: ''لو بھئی آگئے ...... یہ ہے کشوری ...... اور ...... اور'' اس نے موڑ کی طرف نگاہیں جمائے رکھیں'' اور ...... اور ...... ارے ...... یہ تو بالکل ہی چھوٹی لڑکی[۲۴] ہے ...... ذرا تم بھی دیکھو نا ...... ارے بھئی وہ ...... وہ نیلی ساڑی میں۔''

جب کشوری اور سریتا دونوں موٹر کے پاس آگئے تو پچھلی سیٹ پر جو دو نوجوان بیٹھے تھے انہوں نے درمیان میں سے اپنے ہیٹ وغیرہ اٹھا لیے اور جگہ خالی کر دی۔ کشوری نے آگے بڑھ کے موٹر کے پچھلے حصے کا دروازہ کھولا اور پھرتی سے سریتا کو اندر داخل کر دیا۔ دروازہ بند کر کے کشوری نے اُس نوجوان سے جو موٹر کا[۲۵] ہینڈل تھامے تھا کہا: ''معاف کیجیے گا دیر ہو گئی ...... یہ باہر اپنی کسی سہیلی کے پاس گئی ہوئی تھی ...... تو ...... تو؟''

نوجوان نے مڑ کر سریتا کی طرف دیکھا اور کشوری سے کہا: ''ٹھیک ہے ...... لیکن دیکھو ......'' سرک کر موٹر کی اُس کھڑکی میں سے اس نے اپنا سر باہر نکالا اور ہولے سے کشوری کے کان میں کہا: ''شور وور تو نہیں مچائے گی؟'' ......

کشوری نے اس کے جواب میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''سیٹھ آپ مجھ پر بھروسا رکھیے۔''

یہ سُن کر اس نوجوان نے جیب میں سے دو روپے نکالے اور کشوری کے ہاتھ میں تھما دیے۔ ''جاؤ عیش کرو۔'' کشوری نے سلام کیا اور موٹر اسٹارٹ ہوئی۔

شام کے پانچ بجے تھے بمبئی کے بازاروں میں گاڑیوں، ٹراموں، بسوں اور لوگوں کی آمد و رفت بہت زیادہ تھی۔ سریتا خاموشی سے دو آدمیوں کے بیچ میں دبکی بیٹھی رہی۔ بار بار اپنی رانوں کو جوڑ کر اُوپر ہاتھ رکھ دیتی اور کچھ کہتے کہتے خاموش ہو جاتی۔ وہ دراصل موٹر چلانے والے نوجوان سے کہنا چاہتی [۲۶] تھی: ''سیٹھ، جلدی جلدی موٹر چلاؤ...... میرا تو یوں دم گھُٹ جائے گا۔''

بہت دیر تک موٹر میں کسی نے ایک دوسرے سے بات نہ کی۔ موٹر والا موٹر چلاتا رہا اور پچھلی سیٹ پر دونوں حیدرآبادی نوجوان اپنی اچکنوں میں وہ اضطراب چھپاتے رہے جو پہلی دفعہ ایک نوجوان لڑکی کو بالکل اپنے پاس دیکھ کر انہیں محسوس ہو رہا تھا..... ایسی نوجوان لڑکی کو جو کچھ عرصے کے لیے ان کی اپنی تھی یعنی جس سے وہ بلا خوف و خطر چھیڑ چھاڑ کر سکتے تھے۔

وہ نوجوان جو موٹر چلا رہا تھا، دو برس سے بمبئی میں قیام پذیر تھا اور سریتا جیسی کئی لڑکیاں دن کے اجالے اور رات کے اندھیرے میں دیکھ چکا تھا۔ اُس کی پیلی موٹر میں مختلف رنگ و نسل کی چھوکریاں داخل ہو چکی تھیں، اس لیے اسے کوئی خاص بے چینی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ حیدرآباد سے اس کے دو دوست آئے تھے۔ ان میں سے ایک جس کا نام شہاب تھا [چونکہ] [۲۷] بمبئی میں پوری طرح سیر و تفریح کرنا چاہتا تھا، اس لیے کفایت نے یعنی موٹر کے مالک نے از راہِ دوست نوازی، کشوری کے ذریعے سے سریتا کا انتظام کر دیا تھا۔ دوسرے دوست انور سے کفایت نے کہا [؟ پوچھا] تھا کہ بھئی تمہارے لیے بھی ایک رہے تو کیا ہرج ہے؟ مگر اُس میں چونکہ اخلاقی قوت کم تھی اس لیے شرم کے مارے وہ یہ نہ کہہ سکا کہ ہاں بھئی میرے لیے بھی ایک رہے۔

کفایت نے سریتا کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ کشوری بہت دیر کے بعد یہ نئی چھوکری نکال کر لایا تھا لیکن اس نئے پن کے باوجود اُس نے ابھی تک اس سے دلچسپی نہ لی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ ایک وقت میں صرف ایک کام کر سکتا تھا۔ موٹر چلانے کے ساتھ ساتھ وہ سریتا کی طرف دھیان نہیں دے سکتا تھا۔

جب شہر ختم ہو گیا اور موٹر مضافات کی ایک سڑک پر چلنے لگی تو سریتا اُچھل پڑی۔ وہ دباؤ جواب تک اُس نے اپنے اوپر ڈال رکھا تھا، ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں اور اُڑتی ہوئی موٹر نے ایک دم اُٹھا دیا اور سریتا کے اندر بجلیاں سی دوڑ گئیں۔ وہ سرتاپا حرکت بن گئی، اُس کی ٹانگیں تھرکنے لگیں، بازو ناچنے لگے، انگلیاں

کپکپانے لگیں اور وہ اپنے دونوں طرف بھاگتے ہوئے درختوں کو دوڑتی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

اب انور اور شہاب آرام محسوس کررہے تھے۔ شہاب نے جو سریتا پر اپنا حق سمجھتا تھا، ہولے سے اپنا بازو اس کی کمر میں [حمائل][۲۸] کرنا چاہا۔ ایک دم سریتا کے گدگدی اُٹھی، تڑپ کر وہ انور پر جا گری اور پیلی موٹر کی کھڑکیوں میں سے دُور تک سریتا کی ہنسی بہتی گئی۔ شہاب نے جب ایک بار پھر اس کی کمر کی طرف ہاتھ بڑھایا تو سریتا دوہری ہوگئی اور ہنستے ہنستے اس کا بُرا حال ہوگیا۔ انور ایک کونے میں دبکا رہا اور منہ میں تھوک پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

شہاب کے دل و دماغ میں شوخ رنگ بھر گئے۔ اس نے کفایت سے کہا: ''واللہ بڑی کراری لونڈیا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے زور سے سریتا کی ران میں چٹکی بھری۔ سریتا نے اس کے جواب میں انور کا ہولے سے کان مروڑ دیا اس لیے کہ وہ[۲۹] اس کے بالکل پاس تھا۔ موٹر میں قہقہے ابلنے لگے۔

کفایت بار بار مڑ مڑ کر دیکھتا تھا حالانکہ اسے اپنے سامنے چھوٹے سے آئینے میں سب کچھ دکھائی دے رہا تھا...... قہقہوں کے زور کا ساتھ دینے کی خاطر اس نے موٹر کی رفتار بھی تیز[۳۰] کردی۔

سریتا کا جی چاہا کہ باہر نکل کر موٹر کے منہ پر بیٹھ جائے جہاں لوہے کی اُڑتی ہوئی پَری لگی تھی۔ وہ آگے بڑھی۔ شہاب نے اسے چھیڑا تو سنبھلنے کی خاطر اس نے کفایت کے گلے میں اپنا باہیں حمائل کردیں۔ کفایت نے غیر ارادی طور پر اس کے ہاتھ چوم لیے۔ ایک سنسنی سی سریتا کے جسم میں دوڑ گئی اور[۳۱] پھاند کر اگلی سیٹ پر کفایت کے پاس بیٹھ گئی اور اس کی ٹائی سے کھیلنا شروع کردیا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟'' اُس نے کفایت سے پوچھا۔

''میرا نام؟'' کفایت نے پوچھا[۳۲] ......''میرا نام کفایت ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے دس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

سریتا نے اس کے نام کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور نوٹ اپنی چولی میں اُڑس کر بچّوں کی طرح خوش ہوکر کہا: ''تم بہت اچھے آدمی ہو..... تمہاری یہ ٹائی بہت اچھی ہے۔''[۳۳]

اس وقت سریتا کو ہر شے اچھی نظر آرہی تھی...... وہ چاہتی تھی کہ جو بُرے بھی ہیں اچھے[۳۴] ہوجائیں اور...... اور...... پھر ایسا ہو، ایسا ہو ... کہ موٹر تیز دوڑتی رہے اور ہر شے ہوائی بگولا بن جائے۔

ایک دم اس کا جی چاہا کہ گائے۔ چنانچہ اس نے کفایت کی ٹائی سے کھیلنا بند کرکے گانا شروع کردیا:

تمھیں نے مجھ کو پریم سکھایا سوئے ہوئے ہردے کو جگایا

کچھ دیر یہ فلمی گیت گانے کے بعد سریتا ایک دم پیچھے مڑی اور انور کو خاموش دیکھ کر کہنے لگی: ''تم کیوں چپ چاپ بیٹھے ہو...... کوئی بات کرو...... کوئی گیت گاؤ۔'' یہ کہتی ہوئی وہ اُچک کر پچھلی سیٹ پر چلی گئی اور شہاب کے بالوں میں اُنگلیوں سے کنگھی کرنے لگی۔ ''آؤ ہم دونوں گائیں..... تمہیں یاد ہے وہ گانا جو دیویکا رانی نے گایا تھا...... میں بَن کی چڑیا بن کے بَن بَن بولوں رے...... دیویکا رانی کتنی اچھی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنی ٹھوڑی کے نیچے رکھ لیے اور آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا: ''اشوک کمار اور دیویکا رانی پاس پاس کھڑے تھے...... دیویکا رانی کہتی تھی..... میں بَن کی چڑیا بن کے بَن بَن بولوں رے...... اور اشوک کمار کہتا تھا...... [وہ؟] تم کہونا!''

سریتا نے گانا شروع کردیا...... ''میں بَن کی چڑیا بن کے بَن بَن بولوں رے۔''

شہاب نے بھدّی آواز بلند کی: ''میں بَن کا پنچھی بن کے بَن بَن بولوں رے۔''

اور پھر باقاعدہ ڈوئٹ شروع ہوگیا۔ کفایت نے موٹر کا ہارن بجا کر تال کا ساتھ دیا۔ سریتا نے تالیاں بجانا شروع کردیں۔ سریتا کا باریک سُر، شہاب کی پھٹی ہوئی آواز، ہارن کی پوں پوں، ہوا کی سائیں سائیں اور موٹر کے انجن کی پھڑ پھڑاہٹ، یہ سب مل جُل کر ایک آرکسٹرا بن گئے۔

سریتا خوش تھی، شہاب خوش تھا، کفایت خوش تھا...... ان سب کو خوش دیکھ کر انور کو بھی خوش ہونا پڑا۔ وہ دل میں بہت شرمندہ ہوا کہ خواہ مخواہ اس نے اپنے آپ کو قید کر رکھا ہے...... اس کے بازوؤں میں حرکت پیدا ہوئی، اس کے سوئے ہوئے جذبات نے انگڑائیاں لیں اور وہ سریتا، شہاب اور کفایت کی شور افشاں خوشی میں شریک ہونے کے لیے تیار ہوگیا۔

گاتے گاتے سریتا نے انور کے سر پر سے اُس کا ہیٹ اُتار کر اپنے سر پر پہن لیا۔ اور یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کے سر پر کیسا لگتا ہے، اُچک کر اگلی سیٹ پر چلی گئی اور تھے سے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے لگی ......

انور سوچنے لگا کہ کیا موٹر میں وہ شروع ہی سے[۳۵] ہیٹ پہنے بیٹھا تھا؟

سریتا نے زور سے کفایت کی موٹی ران پر طمانچہ مارا۔ ''اگر میں تمہاری پتلون پہن لوں اور قمیص پہن کر ایسی ٹائی لگا لوں تو کیا پورا صاحب نہ بن جاؤں؟''

یہ سُن کر شہاب کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ چنانچہ اس نے انور کے بازوؤں کو جھنجوڑ دیا۔ ''واللہ تم بڑے چغد ہو۔'' اور انور نے تھوڑی دیر کے لیے محسوس کیا کہ وہ واقعی بہت بڑا چغد ہے۔

کفایت نے سریتا سے پوچھا: ''تمہارا نام کیا ہے؟''

"میرا نام..." سریتا نے ہیٹ کے فیتے کو اپنی ٹھوڑی کے نیچے جماتے ہوئے کہا: "میرا نام سریتا ہے۔"
شہاب پچھلی سیٹ سے بولا: "سریتا تم عورت [لڑکی؟] نہیں پھُل جھڑی ہو!"
انور نے کچھ کہنا چاہا مگر سریتا نے اونچے سُروں میں گانا شروع کر دیا:

پریم نگر میں بناؤں گی گھر میں تج کے سب سَن سا آ آر

کفایت اور شہاب کے دل میں بیک وقت یہ خواہش[۳۶] پیدا ہوئی کہ یہ موٹر یوں ہی ساری عمر چلتی رہے۔
انور پھر سوچ رہا تھا کہ وہ چغد نہیں ہے تو کیا ہے؟

پریم نگر میں بناؤں گی گھر میں تج کے سب سَن سا آ آر

سنسار کے ٹکڑے دیر تک اُڑتے رہے...... سریتا کے بال جو اس کی چوٹی کی[۳۷] گرفت سے آزاد تھے یوں لہرا رہے تھے جیسے گاڑھا دھواں ہوا کے دباؤ سے بکھر رہا ہے۔ وہ خوش تھی۔
شہاب خوش تھا، کفایت خوش تھا اور اب انور بھی خوش ہونے کا ارادہ کر رہا تھا۔
گیت ختم ہو گیا اور سب کو تھوڑی دیر کے لیے ایسا محسوس ہوا کہ جو زور کی بارش ہو رہی تھی، ایکا ایکی تھم گئی ہے۔
کفایت نے سریتا سے کہا: "کوئی اور گیت گاؤ۔"
شہاب پچھلی سیٹ سے بولا: "ہاں ہاں ایک اور رہے .... یہ سینما والے بھی کیا یاد کریں گے۔"
سریتا نے گانا شروع کر دیا:

مورے آنگنا میں آئے آلی میں چال چلوں متوالی

موٹر بھی متوالی چال چلنے لگی...... آخر کار سڑک کے سارے پیچ ختم ہو گئے اور سمندر کا کنارہ آ گیا ...... دن ڈھل رہا تھا اور سمندر سے آنے والی ہوا خنکی اختیار کر رہی تھی۔
موٹر رُکی، سریتا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور ساحل کے ساتھ ساتھ دور تک بے مقصد دوڑتی چلی گئی۔ کفایت اور شہاب بھی اس دوڑ میں شامل ہو گئے۔ کھُلی فضا میں، بے پایاں سمندر کے پاس، تاڑ کے اونچے اونچے پیڑوں تلے، گیلی گیلی ریت پر، سریتا سمجھ نہ سکی کہ وہ کیا چاہتی ہے؟ اس کا جی چاہتا تھا کہ بیک وقت: فضا میں گھل جائے، سمندر میں پھیل جائے، اتنی اونچی ہو جائے کہ تاڑ کے درختوں کو اوپر سے دیکھے؛ ساحل کی ریت کی ساری نمی پیروں کے ذریعے سے اپنے اندر جذب کر لے اور پھر ...... اور پھر ...... وہی موٹر ہو اور

وہی اُڑانیں، وہی تیز تیز جھونکے اور وہی مسلسل پوں پوں۔ وہ بہت خوش تھی ۔ جب تینوں حیدرآبادی نوجوان، ساحل کی گیلی گیلی ریت پر بیٹھ کر بیئر پینے لگے تو کفایت کے ہاتھ سے سریتا نے بوتل چھین لی۔ ''ٹھہرو میں ڈالتی ہوں۔''

سریتا نے اس طریقے سے گلاس میں بیئر انڈیلی کہ جھاگ ہی جھاگ پیدا ہوگئے۔ سریتا یہ تماشا دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ سانولے سانولے جھاگوں میں اس نے اپنی انگلی کھبوئی اور منہ میں ڈال لی۔ جب کڑوی لگی تو بہت بُرا منہ بنایا۔ کفایت اور شہاب بے اختیار ہنس پڑے۔ جب دونوں کی ہنسی بند ہوئی تو کفایت نے مڑ کر اپنے پیچھے دیکھا۔ انور بھی ہنس رہا تھا۔

بیئر کی چھ بوتلیں، کچھ تو جھاگ بن کر ساحل کی ریت میں جذب ہوگئیں اور کچھ کفایت شہاب اور انور کے پیٹ میں چلی گئیں۔ سریتا گاتی رہی ...... انور نے ایک بار اس کی طرف دیکھا اور خیال کیا کہ سریتا[۳۸] بیئر کی بنی ہوئی ہے۔ اس کے سانولے گال سمندر کی نم آلود ہَوا کے مَس سے گیلے ہو رہے تھے ...... وہ بے حد مسرور تھی۔ اب انور بھی خوش تھا۔ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ سمندر کا سب پانی بیئر بن جائے اور وہ اس میں غوطے لگائے، سریتا بھی ڈبکیاں لگائے۔

دو خالی بوتلیں لے کر سریتا نے ایک دوسرے سے ٹکرا دیں۔ جھنکار پیدا ہوئی اور سریتا نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ کفایت، شہاب اور انور بھی ہنسنے لگے۔

ہنستے ہنستے سریتا نے کفایت سے کہا: ''آؤ موٹر چلائیں۔''

سب اٹھ کھڑے ہوئے ...... خالی بوتلیں گیلی گیلی ریت پر اوندھی پڑی رہیں اور وہ سب بھاگ کر موٹر میں بیٹھ گئے ...... پھر وہی ہوا کے تیز تیز[۳۹] جھونکے آنے لگے۔ . وہی مسلسل پوں پوں شروع ہوئی اور سریتا کے بال پھر دھوئیں کی طرح بکھرنے لگے۔

گیتوں کا سلسلہ پھر شروع ہُوا۔

موٹر ہوا میں آرے کی طرح چلتی رہی ...... سریتا گاتی رہی ... . پچھلی سیٹ پر شہاب اور انور کے درمیان سریتا بیٹھی تھی۔ انور اونگھ رہا تھا۔ سریتا نے شرارت سے شہاب کے بالوں میں کنگھی کرنا شروع کی مگر اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ سوگیا۔ سریتا نے جب انور کی طرف رُخ کیا تو اُسے ویسا ہی سویا ہوا پایا۔ ان دونوں کے بیچ میں سے اٹھ کر وہ اگلی سیٹ پر کفایت کے پاس بیٹھ گئی اور آواز دبا کر ہولے سے کہنے لگی: ''آپ کے دونوں دوستوں کو سُلا آئی[۴۰] ہوں ...... اب آپ بھی سو جایئے۔''

کفایت مسکرایا۔ ''پھر موٹر[۴۱] کون چلائے گا؟''

سریتا بھی مسکرائی۔ ''چلتی[۴۲] رہے گی۔''

دیر تک کفایت اور سریتا آپس میں باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں وہ بازار آگیا جہاں کشوری نے سریتا کو موٹر کے اندر داخل کیا تھا...... جب وہ دیوار آئی جس پر ''یہاں پیشاب کرنا منع ہے'' کے کئی بورڈ لگے تھے تو سریتا نے کفایت سے کہا: ''بس یہاں روک لو۔''

موٹر رُکی۔ پیشتر اس کے کفایت کچھ سوچنے یا کہنے پائے، سریتا موٹر سے باہر تھی۔ اُس نے اشارے سے سلام کیا اور چل دی...... کفایت ہینڈل پر ہاتھ رکھے غالباً سارے واقعے کو ذہن میں تازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ سریتا کے قدم رُکے، مُڑی اور چولی میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر[۴۳] کفایت کے پاس سیٹ پر رکھ دیا۔

کفایت نے حیرت سے نوٹ کی طرف دیکھا اور پوچھا ''سریتا، یہ کیا؟''

''یہ ... یہ روپے میں کسی بات کے لوں؟'' کہہ کر سریتا پھرتی سے دوڑ گئی۔ اور کفایت سیٹ کے گدّے پر پڑے ہوئے نوٹ کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

اُس نے مُڑ کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا۔ شہاب اور انور بھی نوٹ کی طرح سو رہے تھے۔

حواشی

(اِن حواشی میں ص سے مراد: منٹو کے افسانے طبع اوّل (۱۹۴۰ء) کا صفحہ ہے۔ دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ شکایت نہیں تھی — ص: ۲۵۳

۲۔ مہربانی ہے کہ وہ مینے ... پھونک پھونک کے قدم — ص: ۲۵۳ تا ۲۵۴

۳۔ تو نے سریتا کہیں دیکھی ہے، نہ جانے — ص: ۲۵۴

۴۔ بیڑیوں پر لال دھاگہ اور سفید دھاگہ لپیٹتی رہتی تھی وہ مخاطب — ایضاً

۵۔ جو کہ چالی کی ... باپ کو جو کہ ... تو کیا ہوا؟ رام دئی ... جھاگ بھر آئے ...
ایک ایسی دُھول ... پرے جا کر گرا ... مگر وہ پھر بڑا ... پیٹ میں اس زور سے
اپنے فوجی بوٹ سے ٹھوکر ماری — ایضاً

۶۔ دن کو سوتے ... گو اس بلڈنگ — ص: ۲۵۵

۷۔ اچھا یا برا سلوک... میں سچ کہتی... باہر جو چاہے جھک مارے پر یہاں	ص:۲۵۵
۸۔ باہر نکل آئی تھی... گھر میں یہ بنت بنے	ایضاً
۹۔ معلوم تھی کہ جب... بٹھا کر تو اُس کا گھانسلیٹ سونگھتی رہتی ہے کیا	ایضاً
۱۰۔ جب کہ وہ رات کو [ق]... ''سمجھوتا ہو گیا تھا'' کے بعد کے حذف شدہ جملے: سریتا کی ماں کو تکارام کی بیوی چالی کے باہر فٹ پاتھ پر ملی۔ اس لیے اُس نے پوچھا... آخری فقرے کا متبادل: اِسی لیے سریتا کی ماں نے تکارام کی بیوی سے پوچھا (طبع چہارم، ص:۳۲۳)	صص:۲۵۵تا۲۵۶
۱۱۔ ''طرف دیکھا'' کے بعد کا محذوف فقرہ: اور جواب دیا	ص:۲۵۶
۱۲۔ بس اسے تو دن بھر	ایضاً
۱۳۔ طبع اوّل کے وہ جملے، جن میں منٹو نے ردّوبدل کی: جہاں سیمنٹ کی بنی ہوئی مُوتری (پیشاب گاہ) کے پاس سریتا محلّے کی تین چار چھوکریوں کے ساتھ کھیل رہی تھی، ماں کو دیکھ کر سریتا فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی لیکن اُس کے... مدوّن نے بڑے بریکٹ میں جو لفظ، بہ وجوہ، درج کیے، وہ اوّلین متن سے ماخوذ ہیں۔	ایضاً
۱۴۔ طبع اوّل کے وہ جملے، جن میں منٹو نے ردّوبدل کی: شروع ہو جاتی تھی۔ موٹر میں بیٹھ کر اُس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہر شے ایک ہوائی چکّر ہے، وہ خود	ایضاً
۱۵۔ وہ عورتوں سے... باتیں کرنا پسند نہیں... سارا دن وہ چھوٹی چھوٹی	ایضاً
۱۶۔ اُس کا قد چھوٹا تھا جو کہ اُس کی	ص:۲۵۷
۱۷۔ طریقے پر سلے ہوئے... لمبے تھے جن میں سے... تکلیف دیتی تھی	ایضاً
۱۸۔ ایک فقط صبح کو... بھر کے اندر رکھ دیتی تھی... بھروا لاتی تھی	ایضاً
۱۹۔ وہ شاید یہ [ق]... ہوتا ہے وہ سب کے ساتھ... بڑی ہو گئی ہے	صص:۲۵۷تا۲۵۸
۲۰۔ جب کہ وہ سنڈاس... ایک بہت ہی پیارا سپنا... شانتا کو جو کہ... سُن کر ایسا محسوس ہوا تھا	ص:۲۵۸
بنیادی نسخے کے جملے: ''اُس نے ایک ہی پیارا سپنا دیکھا ہے'' (ص:۳۲۷) میں ''ایک'' کے بعد، بہت/نہایت غالباً کتابت میں ترک ہو گیا ہے۔ مدوّن نے طبع اوّل کا لفظ ''بہت'' شاملِ متن کیا ہے حالانکہ دیگر پیشِ نظر اشاعتوں میں ''نہایت'' لکھا گیا ہے۔	
۲۱۔ ایسا نہ ہو موٹر چلے	ایضاً
۲۲۔ اور اُس سے	ص:۲۵۹
۲۳۔ اپنی ناکوں پر... پارے کے اختتام سے محذوف الفاظ: دور تک چلا گیا تھا۔	ایضاً
۲۴۔ یہ تو چھوٹی سی لڑکی	ایضاً

۲۵۔ آگے بڑھ کر... جوکہ موٹر کا	ص ۲۵۹
۲۶۔ سے یہ کہنا چاہتی	ص:۲۶۰
۲۷۔ بنیادی نسخے کے لفظ "جو" (ص ۳۳۱) کی بجائے، اشاعت اوّل کا لفظ "چونکہ" مدوّن کے نزدیک راجح ہے	ایضاً
۲۸۔ جوکہ سرِیتا پر... بنیادی نسخے کے "حائل" (ص:۳۳۱) کی بجائے، طبع اوّل کا "حمائل" مدوّن کے نزدیک راجح ہے	ایضاً
۲۹۔ چونکہ وہ	ص ۲۶۱
۳۰۔ رفتار تیز	ایضاً
۳۱۔ اور وہ بچہ تدکر	ایضاً
۳۲۔ کفایت نے جواب دیا	ایضاً
۳۳۔ ... تمہاری یہ ٹائی ان دونوں کی ٹائیوں سے اچھی ہے .... نہیں تینوں اچھی ہیں۔"	ایضاً
۳۴۔ جو بُرے ہیں وہ بھی اچھے	ایضاً
۳۵۔ بیٹ اُتارا اور اپنے... یہ کیسے معلوم ہوتا ہے وہ اُچک کر... اور انور یہ سوچنے لگا کہ موٹر میں کیا وہ شروع ہی سے	ص۔۲۶۲
۳۶۔ بیک وقت خواہش	ص ۲۶۳
۳۷۔ بال جوکہ چوٹی کی	ایضاً
۳۸۔ اور اُسے ایسا محسوس ہوا کہ سرِیتا	ایضاً
۳۹۔ ہوا کے پھر وہی تیز تیز	ص ۲۶۴
۴۰۔ تو اُسے ایسے ہی سوچتا... دوستوں کو میں سُلا آئی	ایضاً
۴۱۔ اور موٹر	ایضاً
۴۲۔ یہ چیتی	ایضاً
۴۳۔ وہ مُڑی... نوٹ نکال کر اُس نے	ایضاً

مِسز ڈی کوسٹا

نو مہینے پورے ہو چکے تھے۔

میرے پیٹ میں اب پہلی سی گڑ بڑ نہیں تھی۔ پرا مسز ڈی کوسٹا کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ وہ بہت پریشان تھی۔ چنانچہ میں آنے والے حادثے کی تمام انجانی تکلیفیں بھول گئی تھی اور مسز ڈی کوسٹا کی حالت پر رحم کھانے لگی تھی۔

مسز ڈی کوسٹا میری پڑوسن تھی۔ ہمارے فلیٹ کی بالکنی اور اس کے فلیٹ کی بالکنی میں صرف ایک چوبی تختہ حائل تھا جس میں بے شمار ننھے ننھے سوراخ تھے۔ ان سوراخوں میں سے، میں اور اللہ بخشے میرے ساس، ڈی کوسٹا کے سارے خاندان کو کھانا کھاتے دیکھا کرتے تھے لیکن جب اُن کے ہاں سُکھائی ہوئی جھینگا مچھلی پکتی اور اس کی ناقابل برداشت بو ان سوراخوں میں سے چھن چھن کر ہم تک پہنچ جاتی تو میں اور میری ساس بالکنی کا رُخ نہ کرتے تھے۔ میں اب بھی کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اتنی بدبودار چیز کھائی کیونکر جا سکتی ہے۔ پر بابا کیا کہا جائے، انسان بُری سے بُری چیزیں کھا جاتا ہے۔ کون جانے انہیں اس ناقابلِ برداشت بو ہی میں لطف آتا ہو۔

مسز ڈی کوسٹا کی عمر چالیس بیالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اُس کے کٹے ہوئے بال جو اپنی سیاہی بالکل کھو چکے تھے اور جن میں بے شمار سفید دھاریاں پڑ چکی تھیں، اس کے چھوٹے سر پر گھسے ہوئے نمدے کی ٹوپی کی صورت میں پریشان رہتے تھے۔ کبھی کبھی جب وہ نیا، بھڑکیلے رنگ کا، بہت بھونڈے طریقے پر سلا ہوا فراک پہنتی تھی تو سر پر لال لال بُندکیوں والا جال بھی لگا لیتی تھی۔ جس سے اُس کے چھدرے بال اس کے سر کے ساتھ چپک جاتے تھے۔ اس حالت میں وہ درزیوں کا ایسا ماڈل دکھائی دیتی تھی جو نیلام گھر میں پڑا ہو۔

میں نے کئی بار اُسے اپنے ان ہی بالوں میں لہریں پیدا کرنے کی کوشش میں بھی مصروف دیکھا ہے۔ اپنے چار بیٹوں کو جن میں سے ایک تازہ تازہ فوج میں بھرتی ہوا تھا اور اپنے آپ کو ہندوستان کے حکمرانوں کی فہرست میں شامل سمجھتا تھا اور دوسرا جو ہر روز اپنی کلف لگی سفید پتلون استری کر کے پہنتا تھا اور نیچے آ کر چھوٹی چھوٹی کرسچین لڑکیوں کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتا تھا۔۔ ناشتہ کرا دیا کرتی تھی اور اپنے بڈھے خاوند کو جو ریلوے میں ملازم تھا، بالکنی میں نکل کر ہاتھ کے اشارے سے ''بائی بائی'' کرنے کے بعد فارغ

ہو جاتی تھی تو اپنے سر کے ناقابل گرفت بالوں میں، لہریں پیدا کرنے والے کلپ اٹکا دیا کرتی تھی۔ اور اُن کلپوں سمیت سوچا کرتی تھی کہ میرے ہاں بچّہ کب پیدا ہوگا۔

وہ خود آدھے درجن بچّے پیدا کر چکی تھی جن میں سے پانچ زندہ تھے۔ ان کی پیدائش پر بھی وہ یوں ہی دن گنا کرتی تھی یا چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی اور بچے کو خود بخود پیدا ہونے کے لیے چھوڑ[۵] دیتی تھی، اس کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں۔ لیکن مجھے اس بات کا تلخ تجربہ ضرور ہے کہ جو کچھ میرے پیٹ میں تھا، اس سے مسز ڈی کوسٹا کو جس کا داہنا پیر اور اس کے اوپر کا حصہ کسی بیماری کے باعث ہمیشہ سوجا رہتا تھا، بہت گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ دن میں کئی مرتبہ بالکنی میں سے جھانک کر وہ مجھے آواز دیا کرتی تھی اور گرائمر سے بے نیاز انگریزی میں جس کا نہ بولنا اس کے نزدیک شاید ہندوستان کے موجودہ حکمرانوں کی ہتک تھی، مجھ سے کہا کرتی تھی: "میں بولی، آج تم کدھر گیا تھا......"

جب میں اسے بتاتی کہ میں اپنے خاوند کے ساتھ شاپنگ کرنے گئی تھی تو اس کے چہرے پر نااُمیدی کے آثار پیدا ہو جاتے اور وہ انگریزی بھول کر بمبئی کی اردو میں گفتگو کرنا شروع کر دیتی جس کا مقصد مجھ سے صرف اس بات کا پتہ لینا ہوتا تھا کہ میرے خیال کے مطابق بچے کی پیدائش میں کتنے دن باقی رہ گئے ہیں۔[۶]

مجھے اِس بات کا علم ہوتا تو میں یقیناً اسے بتا دیتی۔ اس میں ہرج ہی کیا تھا، اُس بے چاری کو خواہ مخواہ کی اُلجھن سے نجات مل جاتی اور مجھے بھی ہر روز اس کے نت نئے سوالوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ مجھے بچوں کی پیدائش اور اس کے متعلقات کا کچھ علم ہی نہیں تھا۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ نو مہینے پورے ہو جانے پر بچّہ[۷] پیدا ہو جایا کرتا ہے۔

مسز ڈی کوسٹا کے حساب کے مطابق نو مہینے پورے ہو چکے تھے۔ میری ساس کا خیال تھا کہ ابھی کچھ دن باقی ہیں...... لیکن یہ نو مہینے کہاں سے شروع کر کے پورے کر دیے گئے تھے؟ میں نے بہتیرا اپنے ذہن پر زور دیا، پر سمجھ نہ سکی۔[۸]

بچّہ میرے پیدا ہونے والا تھا، شادی میری ہوئی تھی، لیکن سارا بہی کھاتا مسز ڈی کوسٹا کے پاس تھا۔ کئی بار مجھے خیال آیا کہ یہ میری اپنی غفلت کا نتیجہ ہے۔ اگر میں نے کسی چھوٹی سی نوٹ بک میں، چھوٹی سی نوٹ بک میں نہ سہی، اُس کاپی ہی میں جو دھوبی کے حساب کے لیے مخصوص تھی، سب تاریخیں لکھ چھوڑی ہوتیں تو کتنا اچھا تھا۔[۹]

اتنا تو مجھے یاد تھا اور یاد ہے کہ میری شادی ۲۶ر اپریل کو ہوئی۔ یعنی ۲۶ کی رات کو میں اپنے گھر

کے بجائے اپنے خاوند کے گھر میں تھی۔ لیکن اس کے بعد کے واقعات کچھ اس قدر خلط ملط ہوگئے تھے کہ اُس بات کا پتہ لگانا بہت مشکل تھا اور مجھے تعجب اسی بات کا ہے کہ مسز ڈی کوسٹ نے کیسے اندازہ لگا لیا تھا کہ نو مہینے پورے ہو چکے ہیں اور بچہ لیٹ ہوگیا ہے۔

ایک روز اُس نے میری ساس سے اضطراب بھرے لہجے میں کہا: ''تمہارے ڈاٹر ان لاء کا بچہ لیٹ ہوگیا ہے...... پچھلے ویک (ہفتے) میں پیدا ہونا ہی مانگتا[1] تھا۔''

میں اندر صوفے پر لیٹی تھی اور آنے والے حادثے کے متعلق قیاس آرائیاں کررہی تھی۔ مسز ڈی کوسٹا کی یہ بات سن کر مجھے بڑی ہنسی آئی اور ایسا لگا کہ'' مسز ڈی کوسٹا اور میری ساس دونوں پلیٹ فارم پر کھڑی ہیں اور جس گاڑی کا انہیں انتظار تھا، لیٹ ہوگئی ہے۔

اللہ بخشے میری ساس کو اتنی شدت کا انتظار نہیں تھا۔ چنانچہ وہ کئی مرتبہ مسز ڈی کوسٹا سے کہہ چکی تھی: ''کوئی فکر کی بات نہیں، خدا اپنا فضل کرے گا۔ کچھ دن اوپر ہو جایا کرتے ہیں۔'' مگر مسز ڈی کوسٹا نہیں مانتی تھی۔ جو حساب وہ لگا چکی تھی غلط کیسے ہو سکتا تھا۔ جب مسز ڈی سلوا کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا تھا تو اس نے دُور سے ہی دیکھ کر کہہ دیا[2] تھا کہ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ لگے گا۔ چنانچہ چوتھے روز ہی مسز سلوا ہسپتال جاتی نظر آئی، اور خود اس نے چھ بچے جنے تھے جن میں سے ایک بھی لیٹ نہ ہُوا تھا اور پھر وہ نرس تھی۔ یہ علاحدہ بات ہے کہ اس نے کسی ہسپتال میں دایا گیری کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر سب لوگ اُسے نرس کہتے تھے۔ چنانچہ اُن کے [اُس کے؟] فلیٹ کے باہر چھوٹی سے چوبی تختی پر ''نرس ڈی کوسٹا'' لکھا رہتا تھا، اُسے بچّوں کی پیدائش کے اوقات معلوم نہ ہوتے تو اور کس کو ہوتے!

جب کمرہ نمبر ۱۷ کے رہنے والے مسٹر نذیر کی ناک سُوج گئی تھی تو مسز ڈی کوسٹا ہی نے بازار سے روئی کا بنڈل منگوایا تھا اور پانی گرم کر کے ٹکور کی تھی۔ بار بار وہ اس واقعے کو سند کے طور پر پیش کیا کرتی تھی۔ چنانچہ مجھے بار بار کہنا پڑتا تھا: ''ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ ہمارے پڑوس میں ایسی عورت رہتی ہے جو خوش خلق ہونے علاوہ اعلیٰ نرس بھی ہے۔'' یہ سُن کر وہ بہت خوش[3] ہوتی تھی اور اس کو یوں خوش کرنے سے مجھے فائدہ یہ ہُوا تھا کہ جب... صاحب کو تیز بخار چڑھا تھا تو مسز ڈی کوسٹا نے برف لگانے والی ربڑ کی تھیلی فوراً مجھے لا دی تھی۔ یہ تھیلی ایک ہفتے تک ہمارے یہاں پڑی رہی اور ملیریا کے مختلف شکاروں کے استعمال میں آتی رہی۔ یوں بھی مسز ڈی کوسٹا بڑی خدمت گزار تھی لیکن اُس کی اس رضا کاری میں اس کی متجسس طبیعت کو کافی دخل تھا۔ دراصل وہ اپنے تمام پڑوسیوں کے اُن رازوں سے بھی واقف ہونے کی آرزومند تھی جو سینہ

بسینہ چلے آتے ہیں۔

مسز ڈی سلوا چونکہ مسز ڈی کوسٹا کی ہم مذہب تھی اس لیے اس کی بہت سی کمزوریاں اس کو معلوم تھیں۔ مثلاً وہ جانتی تھی کہ اس کی شادی کرسمس میں ہوئی اور بچہ جولائی میں پیدا ہوا۔ جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اس کی اصلی شادی بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اُس کو یہ بھی معلوم تھا کہ مسز ڈی سلوا ناچ گھروں میں جاتی ہے اور یوں بہت سا روپیہ کماتی ہے اور یہ کہ وہ اب اتنی خوب صورت نہیں رہی جتنی کہ پہلے تھی۔ چنانچہ اس کی آمدنی بھی پہلے کی نسبت کم[14] ہو گئی ہے۔

ہمارے سامنے جو یہودی رہتے تھے اُن کے متعلق مسز ڈی سلوا کے مختلف بیان تھے۔ کبھی وہ کہتی تھی کہ موٹی موزیل جو رات کو دیر سے گھر آتی ہے، سٹا کھیلتی ہے اور وہ ٹھنگنا سا بڈھا جو اپنی پتلون کے گیلسوں میں انگوٹھے اٹکائے اور کوٹ کاندھے پر رکھے صبح گھر سے نکل جاتا ہے اور شام کو لوٹتا ہے، موزیل کا پُرانا دوست ہے۔ اس بڈھے کے متعلق اس نے کھوج[15] لگا کر معلوم کیا تھا کہ صابن بناتا ہے جس میں چربی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

ایک دن اُس نے ہمیں بتایا کہ موزیل نے اپنی لڑکی کی جو بہت خوب صورت تھی اور ہر روز نیلے رنگ کا ''جم'' پہن کر اسکول جاتی تھی، اُس آدمی سے منگنی کر رکھی ہے جو ہر روز ایک پارسی کو موٹر میں لے کر آتا ہے۔ اسی پارسی کے متعلق میں اتنا جانتی ہوں کہ اس کی موٹر ہمیشہ نیچے کھڑی رہتی تھی اور وہ موزیل کی لڑکی کے منگیتر سمیت، رات وہیں بسر کرتا تھا۔ مسز ڈی کوسٹا کا بیان یہ تھا کہ موزیل کی لڑکی فلوری کا منگیتر، پارسی کا موٹر ڈرائیور ہے، اور یہ پارسی اپنے موٹر ڈرائیور کی بہن للی کا عاشق ہے جو اپنی چھوٹی بہن وائلٹ سمیت اسی فلیٹ میں رہتی تھی۔ وائلٹ کے متعلق مسز ڈی کوسٹا کی رائے بہت خراب تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ یہ لونڈیا جو ہر وقت ایک تھّے سے بچے کو اٹھائے رہتی ہے، بہت بُرے کیریکٹر کی ہے اور اُس تھّے سے بچّے کے متعلق اس نے ایک دن ہمیں یہ خبر سنائی تھی کہ جیسا مشہور کیا گیا ہے، وہ کسی پارسن کا لاوارث بچہ نہیں بلکہ خود وائلٹ کی بہن للی کا ہے... بس مجھے اتنا ہی یاد رہا ہے کیونکہ جو شجرہ مسز ڈی کوسٹا نے تیار کیا تھا اتنا لمبا ہے کہ شاید ہی[16] کسی کو یاد رہ سکے۔

صرف آس پاس کی عورتوں اور پڑوس کے مردوں تک مسز ڈی کوسٹا کی معلومات محدود نہیں تھی۔ اُسے دوسرے محلّوں کے لوگوں کے متعلق بھی بہت سی باتیں معلوم تھیں چنانچہ جب وہ اپنے سُوجے ہوئے پیر کا علاج کرنے کی غرض سے باہر جاتی تو گھر لوٹتے ہوئے، دوسرے محلّوں کی بہت سی خبریں لاتی تھی[17]

ایک روز جب مسز ڈی کوسٹا میرے بچّے کی پیدائش کا انتظار کر کر کے تھک ہار چکی تھی، میں نے اسے باہر پھاٹک کے پاس اپنے دو بڑے لڑکوں، ایک لڑکی اور پڑوس کی دو عورتوں کے ساتھ باتوں میں مصروف دیکھا۔ یہ خیال کر کے جی ہی جی میں بہت کُڑھی کہ میرے بچّے کے لیٹ ہوجانے کے متعلق باتیں کر رہی ہوگی۔ چنانچہ جب اس نے گھر کا رُخ کیا تو میں جنگلے سے پرے ہٹ گئی مگر اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ سیدھی اوپر چلی آئی۔ میں نے دروازہ کھول کر اسے بالکنی ہی میں مونڈھے پر بٹھا دیا۔ مونڈھے پر بیٹھتے ہی اس نے بمبئی کی اردو اور گرامر سے بے نیاز انگریزی میں کہنا شروع کیا: ''تم نے کچھ سُنا؟...... مہاتما گاندھی نے کیا کیا؟...... سالی کانگریس ایک نیا قانون پاس کرانا مانگتی ہے۔ میرا فریڈرک خبر لایا ہے کہ بمبئی میں پروہشبن ہوجائے گی...... تم سمجھتا ہے پروہشبن [18] کیا ہوتی ہے؟''

میں نے لاعلمی کا اظہار کیا کیونکہ جتنی انگریزی مجھے آتی تھی اُس میں پروہشبن کا لفظ نہیں تھا۔ اس پر مسز ڈی کوسٹا نے کہا: ''پروہشبن شراب بند کرنے کو کہتے ہیں...... ہم پوچھتا ہے، اس کانگریس کا ہم نے کیا بگاڑا ہے کہ شراب بند کر کے ہم کو تنگ کرنا مانگتی ہے...... یہ کیسی گورنمنٹ ہے، ہم کو ایسی بات ایک دم اچھی نہیں لگتی۔ ہمارا تہوار کیسے چلے گا۔ ہم کیا کرے گا۔ وسکی ہمارے تہواروں میں ہونا ہی مانگتا ہے...... تم سمجھتی ہونا؟ کرسمس کیسے ہوگا؟...... کرسچین لوگ تو اس لا کو نہیں مانے گا۔ کیسے مان سکتا ہے...... میرے گھر میں چوبیس کلاک (گھنٹے) برانڈی کی ضرورت رہتی ہے.... یہ لا پاس ہوگیا۔ تو کیسے کام چلے گا۔ یہ سب کچھ گاندھی کر رہا ہے...... گاندھی جو محمڈن لوگ کا ایک دم بَیری ہے.... سالا آپ تو [19] پیتا نہیں اور دوسروں کو پینے سے روکتا ہے اور تمہیں مالوم ہے، یہ ہم لوگوں کا، میرا مطلب ہے گورنمنٹ کا، بہت بڑا اینی می (دشمن) ہے...''

اُس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگلستان کا سارا ٹاپو مسز ڈی کوسٹا کے اندر سما گیا ہے۔ وہ گوا کی رہنے والی، کالے رنگ کی کرسچین عورت تھی مگر جب اس نے یہ باتیں کیں تو میرے تصوّر نے اس پر سفید چمڑی منڈھ دی۔ چند لمحات کے لیے وہ یورپ سے آئی ہوئی تازہ تازہ انگریز عورت دکھائی دی جسے ہندوستان اور اس کے مہاتما جی سے کوئی [20] واسطہ نہ ہو۔

سمندر کے پانی سے نمک بنانے کی تحریک مہاتما گاندھی نے شروع کی تھی۔ چرخا چلانا اور کھادی پہننا بھی اُسی نے لوگوں کو سکھایا تھا۔ اسی قسم کی اور بہت سی اُوٹ پٹانگ باتیں وہ کر چکا تھا۔ شاید اسی لیے مسز ڈی کوسٹا نے یہ سمجھا تھا کہ بمبئی میں شراب صرف اس لیے بند کی جارہی ہے کہ ''انگریز لوگوں'' کو تکلیف ہو... وہ کانگریس اور مہاتما گاندھی کو ایک ہی چیز سمجھتی تھی...... یعنی لنگوٹی۔

مہاتما گاندھی اور اس کی ہشت پشت پر لعنتیں بھیج کر، مسز ڈی کوسٹا [اپنی؟] اصل بات کی طرف متوجہ ہوئی: ''اور ہاں یہ تمہارا بچہ کیوں پیدا نہیں ہوتا؟ چلو! میں تمہیں کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔''

میں نے اُس وقت بات ٹال دی مگر مسز ڈی کوسٹا نے گھر جاتے ہوئے، پھر مجھ سے کہا: ''دیکھو تم کو کچھ ایسا ویسا بات ہو گیا، تو پھر ہم کو نہ بولنا!''

اس سے دوسرے روز کا واقعہ ہے... صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ مجھے خیال آیا: کئی دنوں سے میں نے مسز کاظمی کو ٹیلیفون نہیں کیا، اس کو بھی بچّے کی پیدائش کا بہت خیال ہے۔ اس وقت فرصت ہے اور نذیر صاحب کا دفتر جو اُن کے گھر کے ساتھ ہی ملحق تھا، بالکل خالی ہوگا کیونکہ چھ بج چکے تھے، اٹھ کر ٹیلیفون کر دینا چاہیے۔ یوں سیڑھیاں اُترنے اور چڑھنے سے ڈاکٹر صاحب اور تجربے کار عورتوں کے مشورے پر عمل بھی ہو جائے گا جو یہ تھا کہ چلنے پھرنے سے بچہ آسانی کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ میں اپنے پیدا ہونے والے بچے سمیت اُٹھی اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ جب پہلی منزل پر پہنچی تو مجھے نرس ڈی کوسٹا کا بورڈ نظر آیا اور پیشتر اس کے کہ میں اس کے فلیٹ کے دروازے سے گزر کر دوسری منزل کے پہلے زینے پر قدم رکھوں!؟ مسز ڈی کوسٹا باہر نکل آئی اور مجھے اپنے گھر لے گئی۔

میرا دم پھولا ہوا تھا اور پیٹ میں اینٹھن سی پیدا ہوگئی [تھی؟]۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ربڑ کی گیند ہے جو کہیں اٹک گئی ہے، اس سے بڑی الجھن ہو رہی تھی۔ میں نے ایک بار اس تکلیف کا ذکر اپنی ساس سے کیا تھا تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ بچے کی ٹانگ وانگ ادھر اُدھر پھنس جایا کرتی ہے چنانچہ یہ ٹانگ وانگ ہی ہلنے جلنے سے کہیں پھنس گئی تھی جس کے باعث مجھے بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔

میں نے مسز ڈی کوسٹا سے کہا، مجھے'' ایک ضروری ٹیلیفون کرنا ہے اس لیے میں آپ کے یہاں نہیں بیٹھ سکتی اور بہت سے جھوٹے بہانے [بھی؟] میں نے پیش کیے مگر وہ نہ مانی اور میرا بازو پکڑ کر اس نے زبردستی مجھے اس صوفے پر بٹھا دیا جس کا کپڑا بہت میلا ہو رہا تھا۔

مجھے صوفے پر بٹھا کر جلدی جلدی اس نے دوسرے کمرے سے اپنے دو چھوٹے لڑکوں کو باہر نکالا، اپنی کنواری جوان لڑکی کو بھی جو مہاتما گاندھی کی لنگوٹی سے کچھ بڑی نیکر پہنتی تھی، اس نے باہر بھیج دیا اور مجھے خالی کمرے میں لے گئی۔ اندر سے دروازہ بند کر کے اس نے میری طرف اُس افریقی جادوگر کی طرح دیکھا جس نے الہ دین کا چچا بن کر اسے غار میں بند کر دیا تھا۔

یہ سب کچھ اُس نے اتنی پھرتی سے کیا کہ مجھے وہ بہت پُر اسرار دکھائی دی؟'' سوچے ہوئے پیر کے

باعث اُس کی چال میں خفیف سا لنگڑا پن پیدا ہو گیا تھا جو مجھے اُس وقت بہت بھیانک دکھائی دیا۔
میری طرف گھور کر دیکھنے کے بعد اس نے ادھر دیوار کی تینوں کھڑکیاں بند کیں۔ ہر کھڑکی کی چٹخنی چڑھا کر اس نے میری طرف اس انداز سے دیکھا گویا اسے بات کا ڈر ہے کہ میں اُٹھ بھاگوں گی۔
ایمان کی کہوں اُس وقت میرا جی یہی چاہتا تھا کہ دروازہ کھول کر بھاگ جاؤں۔ اس کی خاموشی اور اس کے کھڑکیاں دروازے بند کرنے سے، میں بہت پریشان ہوگئی تھی۔ آخر اس کا مطلب کیا تھا؟...... وہ چاہتی کیا تھی؟ اتنے زبردست تخلیے کی کیا ضرورت تھی؟...... اور پھر ...... وہ لاکھ پڑوسن تھی، اس کے ہم پر کئی احسان بھی تھے لیکن آخر وہ تھی تو ایک غیر عورت اور اس کے بیٹے ...... وہ مُوا فوجی اور وہ کلف لگی پتلون والا جو چھوٹی چھوٹی کرسچین لڑکیوں [۲۴] سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا تھا...... اپنے، اپنے ہوتے ہیں اور پرائے، پرائے۔ میں کئی عشقیہ ناولوں میں کُٹنیوں کا حال پڑھ چکی تھی، جس انداز سے وہ اِدھر اُدھر چل پھر رہی تھی اور دروازے بند کر کے پردے کھینچ رہی تھی، اُس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ نرس ورس بالکل نہیں بلکہ بہت بڑی کٹنی ہے۔ کھڑکیاں اور دروازے بند ہونے کے باعث، کمرے میں جس کے اندر لوہے کے چار پلنگ پڑے تھے، کافی اندھیرا ہو گیا تھا جس سے مجھے اور بھی وحشت ہوئی، مگر اس نے فوراً ہی بٹن دبا کر روشنی کر دی۔
سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا کرے گی۔ پُراسرار طریقے پر اُس نے آتش دان سے ایک بوتل اٹھائی جس میں سفید رنگ کا سیال مادّہ تھا، اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی ''اپنا بلاؤز اُتارو...... میں کچھ دیکھنا مانگتی ہوں''۔[۲۵]
میں گھبرا گئی۔ ''کیا دیکھنا چاہتی ہو؟''
اُوپر سے سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ پھر بلاؤز اُتروانے کا کیا مطلب تھا اور اسے کیا حق حاصل تھا کہ وہ دوسری عورتوں کو یوں گھر کے اندر بُلا کر بلاؤز اُتروانے [اُتارنے] پر مجبور [۲۶] کرے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا: ''مسز ڈی کوسٹا، میں بلاؤز ہرگز نہیں اُتاروں گی۔'' میرے لہجے میں گھبراہٹ کے علاوہ تیزی بھی تھی۔
مسز ڈی کوسٹا کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ''تو... تو... پھر ہم کو مالوم کیسے پڑے گا کہ تمہارے گھر بچہ کب ہوگا ...... اس بوتل میں کھوپرے کا تیل ہے۔ یہ ہم تمہارے پیٹ پر گرا کر دیکھے گا...... اس سے ایک دم مالوم ہو جائے گا کہ بچہ کب ہوگا...... لڑکی ہوگی یا لڑکا۔''
میری گھبراہٹ دور ہو گئی۔ مسز ڈی کوسٹا پھر مجھے مسز ڈی کوسٹا نظر آنے لگی۔

کھوپرے کا تیل بڑی بے ضرر چیز ہے۔ پیٹ پر اگر اُس کی پوری بوتل بھی انڈیل دی جاتی تو کیا ہرج تھا۔ اور پھر ترکیب کتنی دلچسپ تھی۔ اس کے علاوہ اگر میں نہ مانتی تو مسز ڈی کوسٹا کو کتنی بڑی نا اُمیدی کا سامنا کرنا پڑتا۔ مجھے ویسے بھی کسی کی دل شکنی منظور نہیں ہوتی، چنانچہ میں مان گئی...... بلاؤز اور قمیص اُتارنے میں مجھے کافی کوفت ہوئی مگر میں نے برداشت کر لی۔ غیر عورت کی موجودگی میں جب میں نے اپنا پھولا ہوا پیٹ دیکھا جس کے نچلے حصے پر اس طرح کے لال لال نشان بنے ہوئے تھے جیسے ریشمی کپڑے میں چڑسیں پڑ جائیں[۲۷] تو مجھے ایک عجیب قسم کا حجاب محسوس ہوا۔ میں نے چاہا کہ فوراً کپڑے پہن لوں اور وہاں سے چل دوں۔ لیکن مسز ڈی کوسٹا کا وہ ہاتھ جس میں کھوپرے کے تیل کی بوتل تھی، اُٹھ چکا تھا۔

میرے پیٹ پر ٹھنڈے ٹھنڈے تیل کی ایک لکیر دوڑ گئی۔ مسز ڈی کوسٹا خوش ہو گئی۔ میں نے جب کپڑے پہن لیے تو اس نے مطمئن لہجے میں کہا: ''آج کیا ڈیٹ ہے؟ اگیارہ؟ (گیارہ) بس پندرہ کو بچہ ہو جائے گا اور لڑکا ہوگا۔''

بچہ ۲۵ تاریخ کو ہُوا لیکن[۲۸] تھا لڑکا۔ اب جب کبھی وہ میرے پیٹ پر اپنے ننھے ننھے ہاتھ رکھتا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسز ڈی کوسٹا نے کھوپرے کے تیل کی ساری بوتل اُنڈیل دی ہے۔

حواشی

(اِن حواشی میں ص سے مراد: منٹو کے افسانے طبع اوّل (۱۹۴۰ء)
کا صفحہ ہے۔ دیگر کتاب کا صفحہ نمبر اُس کے نام کے ساتھ درج ہوا ہے)

۱۔ تھی، مگر	ص: ۲۶۵
۲۔ رُخ تک نہ کرتے... کیا پتا ہے کہ اُنہیں	ایضاً
۳۔ جو نیلام میں آیا ہو	ص: ۲۶۶
۴۔ کرستان لڑکیوں... جو کہ ریلوے	ایضاً
۵۔ پیدا ہونے پر چھوڑ	ایضاً
۶۔ کہ بچے کی پیدائش میں میرے خیال کے مطابق کتنے دن باقی رہ گئے ہیں	ایضاً
۷۔ اگر مجھے اِس بات... علم نہیں تھا... کہ جب تو مہینے پورے ہو جائیں تو بچہ	ایضاً
۸۔ ساس کا یہ خیال... زور دیا لیکن ناکام رہی	ایضاً
۹۔ کتنا اچھا ہوتا	ص: ۲۶۷
۱۰۔ پیدا ہونا مانگتا	ایضاً

۱۱۔ ہنسی آئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ	ص:۲۶۷
۱۲۔ دُور سے دیکھ کر ہی کہہ دیا	ایضاً
۱۳۔ کی تھی، یہ وہ بار بار سند کے طور پر... وہ خوش	ایضاً
۱۴۔ وہ یہ جانتی تھی... بہ نسبت کم	ص ۲۶۸
۱۵۔ کبھی وہ یہ کہتی... گھر آیا کرتی تھی... اُس نے یہ کھوج کہ	ایضاً
۱۶۔ جیسا کہ مشہور... ''بہن لبلی کا ہے'' کے بعد منٹو کا حذف کردہ فقرہ: اور جو لبلی ہے...... ... تیار کیا تھا بہت لمبا ہے جو شاید ہی	ایضاً
۱۷۔ خبریں لے آتی تھی	ایضاً
۱۸۔ جب کہ مسز... میں یہ خیال... وہ سیدھی اوپر... اور میں نے... باہر بالکونی... اُس مونڈھے پر... یہ کہنا شروع... مہاتما گاندھی... پاس کرنا مانگٹی... تم سمجھتی ہو پروہشین ... واضح رہے کہ ''پروہشین'' انگریزی لفظ Prohibition کا، کردار کی زبان سے، بگڑا ہوا تلفظ ہے۔ اِس بگڑے تلفظ کی درست کتابت، مجموعے کی صرف اوّلین اشاعت میں پائی گئی۔	ص:۲۶۹
۱۹۔ بند کردینے کو... وہ شراب بند کر کے... ہم کیا کریں گے... اگر یہ لایاس ... یہ سالا آپ تو	ایضاً
۲۰۔ کرسٹان عورت... اور وہ مجھے [ق] چند لمحات کے لیے یورپ ... مہاتما گاندھی سے [ق] کوئی	ایضاً
۲۱۔ اُس کو بھی تو بچے... دفتر [ق] جو کہ اُن کے... چھپ چکے ہیں... جو کہ یہ تھا... زینے پر قدم [ق] رکھ سکوں	ایضاً
۲۲۔ کہا کہ مجھے	ایضاً
۲۳۔ بنیادی نسخے میں اس جملے کے اختتامی لفظ اِس طور شائع ہوئے ہیں مجھے وہ...۔ ایک بہت پُر اسرار دکھائی دی۔ (ص:۳۳۸) جبکہ طبع اوّل میں شائع شدہ لفظ یہ ہیں: مجھے وہ ایک پُر اسرار عورت معلوم ہوئی۔	ص ۲۷۱
۲۴۔ لاکھ ہماری پڑوسن... کرسٹان لڑکیوں	ایضاً
۲۵۔ مانگتی ہوں	ایضاً
۲۶۔ اُتارنے پر مجبور	ایضاً
۲۷۔ بلا وزاور شمیض... میں نے یہ برداشت... جُرسیں پڑ جائیں... بنیادی نسخے میں ''پڑ پڑ جائیں'' شائع ہوا ہے۔ مدوّن کے نزدیک اشاعتِ اوّل میں مطبوعہ ''پڑ جائیں'' راجح ہے۔	ص:۲۷۲
۲۸۔ ہُوا تھا لیکن	ایضاً

ضمیمہ

دیباچہ

آج سے چند برس پہلے میری زندگی میں ایک ایسا دن آیا کہ مجھے اپنی ناداری کا احساس ہوا۔ اس احساس نے مجھے بہت پریشان کیا لیکن میں نے سنبھل [کر] اپنے اندر کا جائزہ لیا کہ دیکھوں میری رہی سہی جائیداد کیا ہے۔ بیتے ہوئے دنوں کا ایک انبار لگا تھا۔ اُن میں کچھ دن ایسے تھے [جو؟] بہت اُجلے تھے اور کچھ ایسے تھے کہ اُن کی تاریکی پر چاند سے محروم راتیں بھی رشک کرتیں۔ کچھ واقعات تھے بڑے میٹھے اور کچھ ایسے کڑوے کہ اگر آج میں اُنہیں لکھ دوں تو کاغذ کی زبان تھوکتی تھوکتی تھک جائے مگر اُن کی کڑواہٹ دُور نہ ہو۔ ایک جگہ میرا اخلاص سہا بیٹھا تھا۔ دوسری جگہ میری طبیعت کی تیزی، اضطراب کی حالت میں کھڑی تھی...... کام کی ایک چیز بھی نہ تھی...... میرا مطلب ایسی چیز سے ہے جو کہ اس دنیا میں میرے کام آتی۔

میں جب اچھی طرح دیکھ بھال کر چکا اور کام کی ایک چیز بھی مجھے اپنے اندر نظر نہ آئی تو میں مایوس ہوگیا۔ مایوسی کی اُس حالت میں ہمیشہ کے لیے میں اپنے مکان کا دروازہ بند کرنے ہی والا تھا کہ مجھے ایک کمزور آواز سنائی دی۔ کوئی کہہ رہا تھا: ''میں تمہارے کام آسکتا ہوں۔''

میں نے پوچھا: ''تم کون ہو؟''

جواب ملا: ''میں افسانہ ہوں۔''

''میں نے حیرت سے پوچھا: ''افسانہ؟ ..... تم کہاں چھپے بیٹھے تھے؟...... نہیں، پہلے یہ بتاؤ تم مُیرے اندر داخل کیسے ہوئے؟''

افسانہ کمزور آواز میں بولا: ''میں اندر کیسے داخل ہوا، اس کی مجھے خبر نہیں، البتہ اتنا جانتا ہوں کہ بہت دیر سے تمہارے اندر ایک اندھیری کوٹھری میں قید ہوں...... قیاس کہتا ہے کہ میری پیدائش یہیں اسی اندھیرے میں ہوئی ہے۔''

افسانے کی باتیں مجھے دلچسپ معلوم ہوئیں۔ اندھیری کوٹھری میں سے نکال کر، میں اُسے ذرا روشنی میں لایا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے اُس کو اپنا ہم شکل پایا۔ ''بھئی تم تو میرے ہم شکل نکلے...... کہو، کہو تمہیں کیا کہنا ہے؟''

افسانے کے لبوں پر ایک پتلی سی مسکراہٹ تیری: ''مجھے بہت کچھ کہنا ہے لیکن میری قوتِ گویائی کمزور ہے، پھر کہوں گا...... تم یہ بتاؤ کہ میں اتنی دیر تمہیں نظر کیوں نہ آیا؟...... اگر تم سچ مچ دروازہ بند کر کے چلے جاتے تو جانتے ہو، کیا ہوتا؟''

میں نے بے پروائی سے پوچھا: ''کیا ہوتا؟''

جواب ملا: ''ایک بہت بڑی جائیداد سے تم محروم ہو جاتے۔''

میں ہنس دیا: ''جائیداد!''

آواز آئی: ''تمہاری جائیداد میں ہوں...... مجھے سنبھالو اور اپنے مصرف میں لاؤ...... مجھے باہر نکالو اور میری نمائش کرو...... تمہارے حساس دل کی دھڑکنوں نے مجھے اپنی گود میں کھلایا ہے...... تمہارے اخلاص نے مجھے اپنا دودھ پلایا ہے...... تمہاری زندگی کے بیتے ہوئے دن، مجھے جھولا جھلاتے رہے ہیں...... تمہاری طبیعت کا اضطراب، میرا بستر ہے...... میں اگر تمہارے اندر سے نکل جاؤں تو تمہاری مثال اُس سیپی کے مانند ہوگی جس میں سے موتی باہر لڑھک جائیں...... ادھر آؤ مجھے سہارا دو، میں باہر نکلنا چاہتا ہوں۔''

.. ... میں افسانہ نگار بن گیا...... بُرے دنوں نے مجھے اچھا افسانہ نگار بنا دیا۔

میرے افسانے میری جائیداد ہیں۔ میں یہ جائیداد آپ لوگوں کو دکھانے کے لیے پیش کر رہا ہوں۔ مجھے کسی بات کا ڈر نہیں اس لیے کہ یہ جائیداد غیر منقولہ ہے...... اس کو اپنی جگہ سے کوئی بھی نہیں ہلا سکتا۔

سعادت حسن منٹو

بمبئی، ۳۰ راگست ۱۹۴۰ء

شرابی

"جواہر لال نہرو کے نام"

(یاد رکھو، جب تک لوگ خائف ہیں، دلدل میں برچ کے درختوں کی طرح گلتے سڑتے رہیں گے۔ ہمیں حوصلہ مند ہونا چاہیے..... گورکی)

"کام ختم ہو چکا ہے آؤ چلیں۔ لیکن بھئی بارش ہو رہی ہے۔ تانگا منگوا لیتے ہیں۔"

رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ حلیم صاحب نے اپنے دفتر کے نوکر سے تانگا منگوایا اور ہم اُس میں سوار ہو گئے۔ پشاور کے بازار میرے لیے بالکل نئے تھے۔ حلیم صاحب یہاں موجود نہ ہوتے تو شاید مجھے کبھی یہاں آنے کا اتفاق نہ ہوتا۔ میں پشاور میں پہلی مرتبہ آیا تھا۔ اس لیے فطری طور پر میری نگاہیں سڑک کے ہر زاویے کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ مکانوں کی ساخت اور دُکانوں کی شکل وصورت میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ البتہ فضا کسی قدر غیر مانوس تھی۔

ہمارا تانگا مختلف بازاروں سے ہوتا ہوا ایک خاموش اور نیم تاریک بازار کے موڑ پر پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ میں پچھلی نشست پر بیٹھا تھا اور حلیم صاحب تانگے کا توازن قائم رکھنے کے لیے کوچوان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ جب تانگا ایک خفیف جھٹکے کے ساتھ ٹھہرا تو میں نے مُڑ کر حلیم صاحب کی طرف دیکھا، وہ تانگے والے کو کرایہ ادا کر رہے تھے۔ میں نے تانگے پر سے اُترنے کے لیے اپنی ٹوپی اُٹھاتے ہوئے اُن سے پوچھا:

"آپ نے اِسی بازار میں اپنے قیام کا بندوبست کیا ہے؟"

حلیم صاحب تانگے والے کی طرف دیکھ کر مسکرائے: "آپ آج ہی یہاں تشریف لائے ہیں۔" پھر میری طرف مخاطب ہو کر کہا: "چلو بھئی چلیں۔"

ہم دونوں تانگے پر سے اُتر پڑے اور پیدل چلنا شروع کیا۔ بارش تیز نہ تھی۔ ننھی ننھی بوندیں سڑک کی پتلی کیچڑ پر گر کر ایک مدھم گنگناہٹ پیدا کر رہی تھیں۔ اُس پتلی کیچڑ میں جو سڑک کے سینے پر سوئی ہوئی معلوم ہوتی تھی، آس پاس کی دُکانوں کی اندھی لالٹینوں اور بجلی کے کمزور قمقموں کا عکس پڑ رہا تھا، اُس عکس کو دیکھ کر جو سڑک پر دھبّوں کی صورت میں بکھرا ہوا تھا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ مٹیالے رنگ کی لمبی دری جگہ جگہ پر

سُلگ رہی ہے۔ بجلی کے تاروں پر جو بازار کے بیچوں بیچ تنے ہوئے تھے، بہت سے کبوتر بیٹھے تھے۔ سڑک کے اختتام پر ایک بلند عمارت کی بالائی منزل میں روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ عجیب بات ہے کہ اُس کو دیکھ کر مجھے وہ کانا سنتری یاد آ گیا، جو جیل میں ہماری کوٹھری کے باہر پہرہ دیا کرتا تھا۔ شاید اس لیے کہ اُس عمارت کی روشن کھڑکی بھی اُس کانے سنتری کی آنکھ کی طرح چمک رہی تھی اور رحم کے جذبے سے عاری معلوم ہوتی تھی۔ بازار میں آمد و رفت کم تھی۔

میں سڑک کے کیچڑ بھرے گڑھوں سے بچتا، مختلف خیالات میں غرق چلا جا رہا تھا کہ حلیم صاحب کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ وہ ایک دُکان کے چھپر کے نیچے کھڑے اپنے ہاتھ سے مجھے بُلا رہے تھے۔ میں واپس مُڑا اور تیز قدم اُٹھاتا ہوا اُن کے پاس پہنچ گیا۔ جس دُکان کے پاس وہ کھڑے تھے، اُس کے باہر مٹی سے لپے ہوئے چبوترے پر ایک آدمی لوہے کی میلی کڑاہی میں مچھلی کے ٹکڑے تل رہا تھا۔ اُس کے دائیں ہاتھ، دُکان میں داخل ہونے کا راستہ چھوڑ کر، پان والے کی چھوٹی سی دُکان تھی۔ یوں کہیے کہ چیڑ کے چند تختوں کا ایک صندوق تھا جس میں پنواڑی نے اپنی دُکان سے متعلقہ سامان ٹھونس رکھا تھا۔

حلیم صاحب نے دُکان کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معنی خیز لہجہ میں کہا:

''یہ چینیوں کا غار ہے...'' میں ان کا مطلب سمجھ گیا اور مسکرا کر کہا: ''کچھ پینے کا ارادہ ہے؟''

ہم دونوں دُکان کے اندر داخل ہوئے۔ حلیم صاحب میرے آگے تھے۔ میں نے جوں ہی دہلیز پر قدم رکھا، بھاپ کا ایک جھونکا میرے نم آلود گالوں کے ساتھ مس ہوا، اُس کے ساتھ ہی دیسی شراب کی تیز بو میری ناک میں گھس گئی۔ کمرے کے اندر دس پندرہ آدمی شغلِ مے نوشی میں مصروف تھے۔

حلیم صاحب اور میں سرکنڈوں سے بنے ہوئے مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔ اُن پر ٹاٹ کے میلے ٹکڑے منڈھے ہوئے تھے جس سے وہ بہت غلیظ معلوم ہوتے تھے۔ چوبی تختہ بھی بے حد میلا تھا۔ اُس پر جا بجا میل اُبھر رہا تھا۔ میرے سامنے سبز پتوں پر پیاز کے ٹکڑے اور چٹنی بکھری ہوئی تھی۔ پاس ہی بوتلوں سے اُچھلے ہوئے سوڈے کے چھینٹے، سقفی لیمپ کی دُھندلی روشنی میں چمک رہے تھے اور کسی مزدور کی میلی اور عرق آلود پیشانی کا منظر پیش کرتے تھے۔

ٹھیکے کے ایک پہاڑی نوکر کے آنے پر حلیم صاحب نے اُسے ادھیا لانے کو کہا۔ اُس کو چند اور ہدایات دینے کے بعد وہ میری طرف مخاطب ہوئے:

''میں اور رتن چند عام طور پر یہیں آیا کرتے ہیں۔ ہماری اکثر شامیں اسی چھت کے نیچے گزرتی

ہیں۔'' پھر مسکرا کر کہا: ''کیا یہ جگہ تمھیں پسند ہے؟''

میں نے کمرے کو ایک نظر دیکھا اور جواب دیا: ''خاصی دلچسپ ہے۔''

''رتن چند اس جگہ کو 'چینیوں کے غار' کے نام سے پُکارتا ہے۔'' پھر حلیم صاحب نے مجھ سے پوچھا: ''تم بھی پیو گے نا؟''

مجھے کوئی انکار نہ تھا لیکن مجھے جیل سے رہا ہوئے ابھی ایک ہی مہینہ ہوا تھا اور وہاں کی تکلیف دہ زندگی نے مجھے بہت کمزور کر دیا تھا۔ اس لیے شراب میرے لیے مُضر تھی۔

''آپ جانتے ہیں کہ بڑے گھر نے میرے معدے کے تمام پُرزے ہلا دیے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ابھی کچھ دن مجھے پرہیز کرنا چاہیے۔''

حلیم صاحب نے مزاحیہ لہجے میں کہا: ''آہ! ہمارے آقاؤں کی مہمان نوازیاں، میں بھول ہی گیا تھا کہ تم زندانی پرندے ہو۔ ہم ایک دوسرے سے ایک عرصے کے بعد مل رہے ہیں۔ یہ کس قدر افسوس ناک امر ہے کہ تم نہ پیو گے۔''

خدا معلوم میں دفعتاً مغموم کیوں ہو گیا۔ حلق میں میری آواز گُھٹ گئی اور میں صرف اس قدر کہہ سکا: ''حلیم صاحب! میرا دل بوڑھا ہو گیا ہے۔''

وہ میرے اندرونی جذبات کو سمجھ گئے اور ہمدردانہ لہجے میں کہنے لگے: ''مگر کیا ہو سکتا ہے، مجبوری ہے!''

''مجبوری ہے، واقعی مجبوری ہے!'' میں نے سرد آہ بھری: ''کاش کہ اس اندھیرے میں روشنی کی ننھی سی شعاع بھی نظر آسکتی!''

ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ نوکر شراب، سوڈے کی دو بوتلیں، گلاس اور مچھلی لے کر آ گیا اور یہ تمام چیزیں تختے پر رکھ کر حلیم صاحب سے کہنے لگا: ''کیا سوڈے کی بوتل کھول دوں؟''

حلیم صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ چنانچہ نوکر سوڈے کی ایک بوتل اپنے انگوٹھے سے کھول کر باہر چلا گیا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا: ہم سے کچھ فاصلے پر، ایک ٹوٹی ہوئی میز کے اردگرد چار آدمی جو شکل وصورت اور خاکی لباس سے تانگے والے معلوم ہوتے تھے، شراب نوشی میں مشغول تھے۔ اُن کے پاس ہی ان کا پانچواں ساتھی صراحی نما حقے کی نے منہ میں لیے دھوئیں کے بادل چھوڑ رہا تھا۔ میرے دائیں ہاتھ، کمرے کے کونے میں، ایک لمبی داڑھی والا سکھ اپنی کرپان کو ٹانگوں پر رکھے، کانپتے ہوئے ہوئے ہاتھوں سے دہی کی پلیٹ صاف کرنے میں مشغول تھا۔ دوسرے کونے میں، دیوار کے

ساتھ دو صاحب اپنے مخمور سروں کو ہلا ہلا کر خدا معلوم کس بات پر آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ ایک آدمی برابر والی دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے ایک سال خوردہ آہنی کرسی پر بیٹھا اپنے سامنے رکھے ہوئے گلاس میں ختم ہوتی ہوئی شراب کو دیکھ کر آپ ہی آپ مسکرا رہا تھا، اُس کا چہرہ خوف ناک طور پر خالی تھا، یوں معلوم ہوتا تھا کہ قدرت اُس پر کسی جذبے یا خواہش کو نقش کرنا بھول گئی ہے۔ اُس کے چوبی چہرے کو دیکھ کر میں نے دل میں کہا:

''یہ ہیں ہمارے بھائی جن سے وطن کا مستقبل وابستہ ہے۔''

کمرے کی فضا سخت غم افزا تھی۔ شراب کی تیز بُو نے اس تکدر میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔

حلیم صاحب نے گلاس میں سے چند گھونٹ شراب کے پی کر اپنی مونچھوں کو ایک میلے رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا: ''تم اُداس ہو..... میرا خیال ہے کہ تم بھی تھوڑی سی پی لو۔ کیوں؟''

''نہیں حلیم صاحب میں نہیں پیوں گا۔ میری طبیعت ایک عرصے سے اُداس ہے اور ہمیشہ اُداس رہے گی۔''

''مگر اِس یاس وقنوط کی وجہ؟..... چھوڑو یار اِن خیالوں کو!''

''میں قطعی طور پر نااُمید ہو چکا ہوں۔ جیل نے میرے اعضا پر ایک ناقابلِ بیان اضمحلال طاری کر دیا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید زنداں کا دروازہ مجھے میرے خوابوں کی دُنیا میں لے جائے گا۔ مگر میں اُس میں داخل ہو کر بھول بھلیوں میں پھنس گیا ہوں۔ اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جیل اور گھر کی چار دیواری انسان کو کچھ نہیں سکھا سکتی..... لیکن پھر اُن لوگوں کے مضطرب اور متجسّس سینوں کو کون قرار بخش سکتا ہے جو وطن کو آزاد دیکھنے کے آرزومند ہیں؟ یہ سوال ہے، جس کا جواب مجھے نہیں ملتا اور یہی وجہ ہے کہ میں مغموم ہوں۔ آہ آزادی..... خدا معلوم اس کا ذائقہ کس قدر لذیذ ہوگا۔ میں آزاد لوگوں کے حالات پڑھتا ہوں تو وہ مجھے ایک افسانہ سا معلوم ہوتے ہیں۔ میں اپنے دل سے پوچھتا ہوں: کیا ہم بھی کبھی آزاد ہوں گے؟..... اس کا جواب مجھے نہیں ملتا۔''

''وطن کو لیڈروں کی ضرورت ہے۔'' حلیم صاحب نے اپنی رائے ظاہر کی: ''ہندوستان اب بڑی حد تک بیدار ہو چکا ہے۔''

''درست، مگر وہ لیڈر کب اور کہاں سے آئیں گے؟ ہم نوجوانوں کو ایسے قائد کی ضرورت نہیں جس کی ادنیٰ سیاسیات کے اسٹیج پر فرقہ وارانہ مفاد ناچ رہا ہے اور جو ہم وطنوں کے تعلقات کو اور بھی کشیدہ کرتا ہے۔ ہمیں لیڈروں کی ضرورت ہے، لیکن ایسے لیڈروں کی نہیں جو اس وقت ہماری آنکھوں کے سامنے مضحکہ خیز حرکات کر رہے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ ہندوستان بیدار ہو چکا ہے، کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ اس بیداری کے پیدا کرنے والے ہمارے یہ نام نہاد لیڈر ہیں؟ ہرگز نہیں، ان دوزخی لیڈروں نے ہندوستان کے جسم پر

فالج گرانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، اگر ہندوستان نے تھوڑی بہت آنکھیں کھولی ہیں تو صرف بھوک کی شدت کی وجہ سے۔ ہمارے وطن کو صرف ایک قائد کی ضرورت ہے جو سر سے ننگا ہو، جس کے پاس پہننے تک کے لیے کپڑا نہ ہو، جو برہنہ پا اور گرسنہ شکم ہو اور جس کے دماغ اور سینے میں چنگاریاں بھری ہوئی ہوں۔ موکیت کے خس و خاشاک کو جلانے کے لیے نرم و نازک آہوں کی ضرورت نہیں، شعلوں کی ضرورت ہے..... !''

ایک صاحب کی آمد نے ہماری گفتگو کے سلسلے کو منقطع کر دیا۔ اُنہوں نے آتے ہی پوچھا۔

''حلیم صاحب کیا گفتگو ہو رہی ہے؟''

نووارد، حلیم صاحب کی پیٹھ کے پیچھے کھڑا تھا۔ اُس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف گھور کر دیکھا اور مونڈھا لے کر ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ اس کی داڑھی تازہ منڈی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ اس کے گالوں پر صابن کے دھبّے صاف نظر آرہے تھے۔ اس کی بڑی بڑی مونچھوں کے بل اور اس کی چوڑی پیشانی سے آہنی عزم کے آثار مترشح تھے۔ قد لمبا، چھاتی اُبھری ہوئی، بازو جو کہنیوں تک ننگے تھے، گوشت سے بھرے ہوئے تھے۔

حلیم صاحب نے نووارد سے کہا: ''آج آپ دیر سے آئے ہیں، شاید بارش کی وجہ سے!''

نووارد نے جواب دیا: ''میں وقت پر آیا تھا۔ آدھی خوراک پی کر ذرا داڑھی منڈانے چلا گیا تھا۔'' پھر پاس کھڑے ہوئے نوکر سے مخاطب ہو کر کہا: ''ہاں باقی لے آؤ۔''

حلیم صاحب نے نووارد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا: ''آپ کا اسمِ گرامی گُل زماں خان ہے۔ آپ بیدار مغز اور جوان ہمت نوجوان ہیں۔ آپ کے خیالات سننے کے قابل ہیں اور آپ (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) میرے عزیز دوست ہیں، جو حال ہی میں سیاسی وجوہ کی بنا پر دو سال کی قید کاٹ کر آرہے ہیں۔''

تعارف کے ساتھ جیل کی زندگی کا پیوند خوب تھا، میں دل ہی دل میں ہنسا۔ مجھے جیل سے آئے ایک مہینہ ہو چکا تھا مگر افسوس کہ وہ اب بھی میرے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ میں نے نووارد سے ہاتھ ملایا۔ اُس کے ہاتھ کی گرفت میں فولاد کی سی سختی تھی۔

اس نے ہاتھ ملا کر مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے کہا: ''آپ غالباً پہلی مرتبہ پشاور تشریف لائے ہیں؟''

''جی ہاں۔'' یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔ حلیم صاحب نے گلاس میں شراب اور سوڈے کو ملایا اور گل زماں کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اُسے بلا تکلف ایک ہی گھونٹ میں چڑھا گیا اور اپنی مونچھوں کو کُرتے کے بازو سے پونچھتے ہوئے بولا: ''حلیم صاحب سے آپ کی گفتگو کے چند آخری فقرے میں نے سُن لیے تھے۔ آپ کا دل

سچائی کے قریب معلوم ہوتا ہے۔''

میں نے جواب دیا: ''کاش مجھے بھی ایسا معلوم ہوتا! میں تو خود کو ایک بھٹکا ہوا مسافر خیال کرتا ہوں جسے کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ ممکن ہے آپ کو میری باتوں میں کچھ جان نظر آئی ہو، مگر میں بے جان ہوں۔''

شراب خانے کی گدلی فضا میں اب تھوڑی سی رونق پیدا ہوگئی تھی۔

اُس نے نوکر سے شراب کی بوتل، گلاس اور سوڈے کی بوتل لے کر اُن کو باری باری تختے پر رکھتے ہوئے کہا: ''یہ کیونکر ہوسکتا ہے، یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ آپ جوان ہیں پھر یہ نااُمیدی کیوں؟''

یہ کہہ کر اس نے گلاس میں شراب انڈیلی اور اس میں سوڈا ڈال کر بوتل کو ایک طرف رکھتے ہوئے، اپنے پہلے الفاظ دُہرائے: ''یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟''

اُس کی آنکھیں اب سرخ تھیں۔

''مجھے معلوم نہیں کیوں؟ شاید اس کا جواب آپ کو ہندوستان کے ماضی اور حال میں مل سکے۔''

''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ماضی یعنی جو کچھ کہ گزر چکا ہے، ہمیں اُس سے کیا تعلق؟ وہ ہماری ملکیت نہیں۔ ہاں، حال، بے شک ہمارا ہے۔ مگر آپ اس سے نااُمید کیوں ہیں؟''

گل زماں کی سرخ آنکھیں تپے ہوئے لوہے کی طرح میرے سینے میں داخل ہو رہی تھیں۔ اُس کا سوال کرنے کا انداز اس قدر بے باک اور تلوار کی دھار کی طرح تیز تھا کہ میں گھبرا گیا۔

میں نے جلدی سے اپنے فقرے کو پورا کرتے ہوئے جواب دیا: ''ظلم کی فراوانی اور مظلوموں کی بے چارگی، یہ ہے ہمارے حال کی تصویر..... اسے دیکھ کر کون مایوس نہ ہوگا؟''

گل زماں نے گلاس سے مُنہ لگا کر لمبے لمبے پانچ چھ گھونٹ بھرے۔ وہ بڑبڑایا. ''ظلم اور مظلوم درست ہے مگر میں مایوس نہیں ہوں۔''

میں نے حیرت سے پوچھا: ''کیوں؟''

اُس نے میرا سوال سنا لیکن آرام سے اپنی شراب کے آخری گھونٹ بھرنے شروع کر دیے۔ گلاس خالی کر دینے کے بعد اس نے اسے اطمینان سے ایک طرف رکھ دیا۔ اور دونوں کہنیاں چوبی تختے پر ٹیک کر مجھ سے مخاطب ہوا:

''اس لیے کہ میں مظلوم نہیں ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے شراب کی بوتل سے منہ لگایا اور چشم زدن میں اُسے خالی کر دیا۔

میں نے اُس سے پوچھا: ''اس لیے کہ آپ مظلوم نہیں ہیں؟...... یہ کیسی منطق ہے۔''

''منطق صاف ہے۔ میں مظلوم نہیں ہوں۔ اِس لیے کہ میں کسی کو اپنی ذات پر ظلم کرنے نہیں دیتا...... ٹھہریے، آپ مظلوم کس کو کہتے ہیں؟''

اُس کا رُک رُک کر سوال کرنے کا یہ انداز کسی کامیاب وکیل کی جرح سے زیادہ پریشان کن تھا۔ اس کی آنکھیں مجھے نکلتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا:

''مظلوم...... مظلوم وہ ہے جو کام کرے مگر اُسے پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہ ہو۔ مظلوم وہ ہے جو اپنے حقوق کے لیے آواز نکالے مگر یہ آواز اُس کے حلق ہی میں دبا دی جائے۔ مظلوم وہ ہے جس پر زندگی کے تمام دروازے بند کر دیے جائیں...''

''غلط!''

اس مختصر اور ہتھوڑے کی ضرب ایسے جواب سے میں جھلا گیا۔ ''آپ نے بغیر سوچے سمجھے یہ رائے پیش کر دی ہے...... ہم پھر کسی وقت گفتگو کریں گے۔''

وہ میرے آخری فقرے کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے اپنی مخمور آنکھوں کو جو نشے کی شدت کی وجہ سے خواب آلود ہو رہی تھیں، کھولا اور اپنی زبان کی لکنت پر قابو پاتے ہوئے کہا ''شراب اعضا کی حرکت پر قفل لگا سکتی ہے مگر اس کا ہاتھ رُوح تک نہیں پہنچتا...... میں دیکھتا ہوں کہ آپ بہت مضطرب ہیں۔ آپ کی ہر بات میں مجھے ایک تلخی سی محسوس ہوتی ہے۔ بُرا نہ مانیے، میرا خیال ہے کہ آپ کے جذبات کا تیز دھارا آپ کو ایک غلط مقام پر لے گیا ہے، مظلوم اور ظالم کے درمیان کیا چیز ہے، آپ بتا سکتے ہیں؟''

''لاٹھیوں اور کلہاڑیوں کی ضربات، بندوقوں کی گولیاں، قانون کا آہنی پنجہ، شیطنت...... قصابی ......'' میں نے از خود رفتہ ہو کر کہا۔

گل زماں نے بڑی متانت سے کہا: ''ٹھہریے، ٹھہریے! اتنے جوش کی ضرورت نہیں، آپ پھر غلط کہہ رہے ہیں...... ہمیں غور سے سوچنا چاہیے۔''

میں نے حلیم صاحب کی طرف مایوس نگاہوں سے دیکھ کر کہا: ''آپ ہی فرمایئے!'' اس وقت وہ اپنی شراب ختم کر کے، خاموشی سے ہماری گفتگو سُن رہے تھے۔

گل زماں زیرِ لب گنگنایا: ''مظلوم اور ظالم'' اور پھر بلند آواز میں کہا: ''اِن کے درمیان کیا شے ہے؟ ...... ایک گلاس پانی سے بھرا ہوا ہے اور دُوسرا شراب سے۔ اب غور یہ کرنا ہے کہ شراب والے گلاس میں سے کون

سی چیز نکال لی جائے کہ وہ بھی سادہ پانی ہو جائے! مظلوم اور ظالم دونوں انسان ہیں، یہ تو آپ مانتے ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''ایک ظلم کرتا ہے اور دوسرا اُس کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اس پر ظلم کرے۔ ایک طرف طاقت ہے اور دوسری طرف رضا یعنی کمزوری۔ اگر یہ رضا اور کمزوری نہ ہو تو ظلم کا وجود ناممکن ہے۔ پھر نہ ظالم ہوگا اور نہ مظلوم، ٹھیک ہے نا؟''

میں نے شرابی کے نظریے میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا: ''آپ گفتگو جاری رکھیے۔''

''ظاہر ہے کہ مظلوم اور ظالم کے درمیان کمزوری اور قوت برسرِ پیکار ہے [ہیں؟]۔ اربابِ حکومت اُن جلسوں پر گولیاں برساتے ہیں جو اُن کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ وہ اُس آواز کو یقیناً دبائیں گے، جو اُن کے مفاد کے منافی ہو۔ اس میں وہ حق بجانب ہیں۔ وہ لوگ جو حکومت کرتے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں، اُن کے دماغوں کی تخلیق کسی اور ہی آب و گِل سے ہوئی ہوتی ہے، وہ اپنے محکوم جسم کی باغی رگ کا علاج، صرف دولت سے کرنا جانتے ہیں۔ آرام، عیش اور سکون اُن کے بازوؤں سے وہ تمام قوت چھین لیتا ہے جو ہماری باہوں میں زندہ ہے۔ وہ مردہ ہیں اور ہم زندہ، یہ کس قدر تعجب ہے کہ وہ اپنے پیلے چہروں سے ہمیں ڈراتے ہیں اور ہم ڈر جاتے ہیں، وہ اپنے استخوانی بازو نکال کر ہماری چوڑی چھاتیوں میں خوف پیدا کرنا چاہتے ہیں اور ہم خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ کس کا قصور ہے؟ وہ لوگ جن کا خون سرمائے اور ہوس نے خشک کر دیا ہوتا ہے، وہ لوگ جو مستعار ہاتھوں سے کام کرتے ہیں، اُن لوگوں کو ڈرا لیتے ہیں جن کی جوانیوں میں بغاوت کے شعلے ہوتے ہیں...... یہ کس کا قصور ہے؟''

میں نے جواب دیا: ''قصور وار ہر حالت میں وہ لوگ ہیں جو ہماری گردنوں پر ظلم کی تلوار لیے کھڑے رہتے ہیں، ہندوستان کے ۳۵ کروڑ باشندے اپنی چھنی ہوئی آزادی حاصل کر لیتے، اگر ظلم کا کڑا ہاتھ ان کی گردنوں کو نہ دبائے ہوتا۔ وہ ڈراتے ہیں اور ہم اس لیے ڈر جاتے ہیں کہ ہمارے جسم کا ہر عضو اُن کے ظلم سے مفلوج ہو چکا ہے، ہم اُن سے خائف ہیں اس لیے کہ استبداد نے ہمیں بچوں کی طرح کمزور بنا دیا ہے۔ آپ کا نظریہ قابلِ قبول نہیں ہوسکتا!''

اس پر گل زماں کی مونچھیں تھرائیں اور اس نے اپنی اُبھری ہوئی چھاتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''ہوسکتا ہے کہ میرا نظریہ قابلِ قبول نہ ہو۔ مگر ہمیں سوچنا چاہیے ...... استبداد، جور، ظلم یہ ایک عذر کے تین نام ہیں جسے کمزور لوگ اپنے ارتعاش کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں۔ کتنی مضحکہ خیز غلطی ہے ...... اپنی کمزوریوں

کو دوسروں کے ستم سے تعبیر کرنا، یہ کہاں کی دانش مندی ہے ......؟ ایک، عورتوں کی طرح آنسو بہاتا ہوا آتا ہے اور فریاد کرتا ہے: فلاں شخص نے میرے گھر پر قبضہ جما لیا ہے! اُس فریادی کے ہاتھ سلامت ہیں، اس کی انگلیوں میں گرفت زندہ ہے، اس میں مقابلے کی قوت موجود ہے، وہ اچھا بھلا سانس لے رہا ہے...... میں پوچھتا ہوں کیا یہ آدمی زمین کے سینے پر بدنما دھبا نہیں؟ ...... خوف ..... خوف .. ! خدا معلوم یہ بے معنی سی چیز لوگوں کی رگوں میں کیوں سرایت کر گئی ہے ...... کیا کہا تھا آپ نے؟ ...... ہندوستان میں ۳۵ کروڑ باشندے آباد ہیں۔ کیا آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس ٹڈی دَل پر کتنے لوگ حکومت کر رہے ہیں؟ آپ اُن کو انگلیوں پر گن سکتے ہیں ...... حاکم ہرگز ملعون و مطعون نہیں ہو سکتے۔ ہمارا وطن خوف میں لپٹا ہوا ہے۔ اس دُھند کو دُور کر دیجیے، پھر آپ کو ہر چیز روشن نظر آئے گی۔''

یہ کہہ کر گل زماں نے اُٹھ کر میرے سامنے پڑی ہوئی سگریٹ کی ڈبیا اُٹھائی اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر اس کو سُلگایا۔ دیا سلائی کے کانپتے ہوئے شعلے کی سُرخ روشنی میں اس کا تمتمایا ہوا چہرہ ہر قسم کے خوف و ہراس سے ناآشنا معلوم ہوتا تھا۔

''آپ کے خیال میں صرف خوف ہی ہمارے وطن کے مصائب کا باعث ہے؟''

یہ پوچھتے ہوئے میں نے خود کو ایک کم سن بچہ محسوس کیا۔

گل زماں نے بلند آواز میں جواب دیا: ''یقیناً۔ خوف باعث ہے اُس اضمحلال کا جو آپ پر طاری ہے اور یہ اضمحلال باعث ہے اُن مصائب کا جو ہندوستان پر چھائے ہوئے ہیں۔ اپنی تیرہ بختی کو حکام کے جور و استبداد سے تعبیر نہ کیجیے۔ ان کی زندگی صرف اسی وقت تک ہے جب تک آپ خائف ہیں، اس خوف کو دُور کر دیجیے، ان کا وجود باقی نہ رہے گا۔ سورج جب طلوع ہوتا ہے تو تمام تاریکیاں بھاگ جاتی ہیں۔ اپنے سُورج یعنی اپنی قوت کو خوف کے بادلوں میں نہ چھپائیے۔ اس کی تپش کو اپنی ناتوانی کی سردی سے ٹھنڈا نہ کیجیے .. ... خوف! ...... خوف! خدا معلوم آپ نے اس شیطان کو اپنے کاندھوں پر کیوں چڑھا رکھا ہے۔ اپنی جھولی میں اس خوف کو مارنے والے جراثیم بھر لیجیے اور انہیں بکھیرتے جائیے۔ جب یہ ختم ہو جائیں تو مڑ کر دیکھیے، آپ کا ہندوستان ایک نئی فضا میں سانس لیتا ہوگا، آپ کو ایک چھوٹی سی کھائی پھاندنا ہے۔ کود جائیے۔ اگر آپ جھجکتے رہے، تو ممکن ہے کہ زمانے کا ہاتھ اس کھائی کو اور بھی وسیع کر دے ...... آپ سُن رہے ہیں نا!''

''جی ہاں۔''

''تو جائیے، اپنے سوتے ہوئے بھائیوں کو جھنجھوڑیے اور ان میں سے ہر ایک کو جگا کر کہیے: خدا کی قسم!

تمہارے بازوؤں میں ہاتھیوں سے بھڑ جانے کی قوت موجود ہے۔تم لوگ اپنی طاقت سے غافل ہو۔تمہارے پنجے جو سخت سے سخت لوہے کو مروڑ سکتے ہیں، کیا وہ چند گھوڑوں کی باگیں نہیں مروڑ سکتے؟ اُٹھو، ایک انگڑائی لو اور اپنے جسم سے تمام سُستی کو پرے پھینک دو۔ پھر ان سے کہیے کہ وہ اپنی چھاتیوں کی طرف دیکھیں، ان میں سالہا سال کا جمع شدہ عزم و خشم موجود ہے ..... وہ یہ سُن کر حیران ہوں گے، مگر ابھی ان کی حیرانی دُور نہ ہوئی ہوگی کہ وہ ایک نئی دنیا میں آباد ہوں گے..... جائیے، اپنے سوتے ہوئے بھائیوں کو جھنجھوڑیے!''

یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور ایک سگریٹ سُلگا کر اسے اپنے مُنہ میں دباتے ہوئے کہا: ''میں اب رُخصت چاہتا ہوں، مجھے صبح کام پر جانا ہے۔ اچھا حلیم صاحب اجازت؟''

حلیم صاحب نے گہری نیند سے بیدار ہوتے ہوئے انسان کی طرح آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا: ''ہاں، ہاں...... کل پھر ملاقات ہوگی۔''

میں نے بڑھ کر اُس سے ہاتھ ملایا اور وہ چلا گیا۔

اُس کے جانے کے بعد حلیم صاحب اور میں دیر تک شراب خانے کی گدلی فضا میں خاموش بیٹھے رہے۔ میں دوسرے ہی دن پشاور سے واپس آ گیا۔ چند دنوں کے بعد وہاں کچھ سیاسی وجوہ کی بنا پر حکومت اور عوام کے تعلقات کشیدہ ہو گئے جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہاں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔

ایک صبح میں نے غسل سے فارغ ہو کر تازہ اخبار اُٹھایا تو اس کے پہلے صفحہ پر یہ خبر جلی حروف کی تین سُرخیوں کے نیچے درج تھی:

''پشاور: آج صبح فوجیوں کا ایک دستہ، آرمرڈ کار کے ساتھ شہر میں امن قائم کرنے کے لیے گشت لگا رہا تھا۔ ایک چوک میں اُس دستے کی عوام کے گروہ سے مُڈبھیڑ ہوگئی۔ فوجیوں نے ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے گولیاں برسائیں جس سے کئی آدمی زخمی ہوئے۔ اس اثنا میں جب کہ لوگ گولیوں کی زد سے بچنے کے لیے بھاگ رہے تھے، ایک نوجوان اپنے ساتھیوں کی بُزدلی پر اظہارِ نفرت کرتا ہوا آگے بڑھا، اُس کا رُخ آرمرڈ کار کی طرف تھا۔ اس تک پہنچتے ہوئے اس کے سینے میں کئی گولیاں لگیں مگر وہ اپنی زخمی چھاتی کی پروا نہ کرتے ہوئے بڑھا اور اُس موٹر کے پیٹرول ٹینک کو آگ لگا دی۔ یہ سب کچھ چشم زدن میں ہوا، آرمرڈ کار بھک سے اُڑ گئی اور نوجوان کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ شہر کی فضا سخت مضطرب ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آرمرڈ کار کو آگ لگانے والے نوجوان کا نام گُل زماں خان تھا۔''

''گُل زماں خان۔'' اخبار میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

خودکُشی کا اقدام

اقبال کے خلاف یہ جرم تھا کہ اُس نے اپنی جان اپنے ہاتھوں ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ گو وہ اس میں ناکام رہا۔ جب عدالت میں اس کو پہلی مرتبہ پیش کیا گیا تو اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موت سے مُڈبھیڑ ہوتے وقت اس کی رگوں میں تمام خون خشک ہو کر رہ گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس میں بالکل سکت نہیں رہی۔

اقبال کی عمر بیس بائیس برس کے قریب ہوگی، مگر رنگت کی غیر معمولی زردی اور مرجھائے ہوئے چہرے نے اس کی عمر میں دس سال کا اضافہ کر دیا تھا۔ اور جب وہ اپنی کمر کے پیچھے ہاتھ رکھتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ واقعی بوڑھا ہے۔ سُنا گیا ہے کہ جب شباب کے ایوان میں غربت داخل ہوتی ہے تو تازگی بھاگ جایا کرتی ہے۔ اس کے پھٹے پُرانے اور میلے کچیلے کپڑوں سے یہ عیاں تھا کہ وہ غربت کا شکار ہے اور غالباً حد سے بڑھی ہوئی مفلسی ہی نے اُسے اپنی پیاری جان ہلاک کرنے پر مجبور کیا تھا۔

اُس کا قد کافی لمبا تھا جو کاندھوں کے مقام پر ذرا آگے کی طرف جھکا ہوا تھا، اُس جھکاؤ میں اس کے وزنی سر کو بھی دخل تھا جس پر سخت اور موٹے بال جیل خانے کے سیاہ اور کُھردرے کمبل کا نمونہ پیش کر رہے تھے، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں جو بہت گہری اور اتھاہ معلوم ہوتی تھیں۔ جُھکی ہوئی نگاہوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ عدالت کے سنگین فرش کی موجودگی کو غیر یقینی سمجھ رہا ہے اور یہ ماننے سے مُنکر ہے کہ وہ زندہ ہے۔ ناک پتلی اور تیکھی، اس کے بانسے پر تھوڑا سا چکنا میل جما ہوا تھا جس کو دیکھ کر زنگ آلود تلوار کا تصور آنکھوں میں پھر جاتا تھا۔ ہونٹ پتلے پتلے جو کناروں پر ایک لکیر بن کر رہ گئے تھے، آپس میں سلے ہوئے معلوم ہوتے تھے شاید اُس نے اُن کو اس لیے بھینچ رکھا تھا کہ وہ اپنے سینے کی آگ اور دھوئیں کو باہر نکلنا نہیں چاہتا تھ۔

میلے پائجامے میں اس کی سُوکھی ہوئی ٹانگیں اُوپر کے دھڑ کے ساتھ اس طرح جڑی ہوئی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا دو خشک لکڑیاں، تنور کے مُنہ میں ٹُھنسی ہوئی ہیں۔ سینہ چوڑا چکلا تھ مگر ہڈیوں کا ڈھانچا، جس کی پسلیوں پر گوشت سانولے رنگ کی جھلّی معلوم ہوتا تھا جو سانس کے زیر و بم سے ارتعاش پذیر تھی۔

پیروں میں کپڑے کا جاپانی جوتا تھا جو بے حد میلا ہو رہا تھا۔ دونوں پیر انگوٹھوں کے مقام پر سے پھٹے

ہوئے تھے۔ اُن سوراخوں میں سے اُس کے بڑھے ہوئے ناخن نمایاں طور پر نظر آرہے تھے۔ وہ کوٹ پہنے تھا جو اس کے بدن پر بہت ڈھیلا تھا۔ اُس میلے اور سال خوردہ کوٹ کی خالی اور پھٹی ہوئی جیبیں بے جان مُردوں کی طرح مُنہ کھولے ہوئے تھیں۔

وہ کٹہرے کے ڈنڈے پر ہاتھ رکھے اور سر جھکائے جج کے سامنے بالکل خاموش اور ساکت کھڑا تھا۔

''تم نے بیس جون بروز ہفتہ شام کے قریب مانا توالہ اسٹیشن کے قریب ریل کی پٹڑی پر لیٹ کر اپنی جان ہلاک کرنے کی کوشش کی اور اس طرح ایک شدید جُرم کے مرتکب ہوئے...... '' جج نے ضمنی کے کاغذات پڑھتے ہوئے کہا: ''بتاؤ کہ یہ جُرم جو تم پر عاید کیا گیا ہے، کہاں تک درست ہے؟''

''جُرم!'' اقبال اپنے گہرے خواب سے گویا چونک سا پڑا۔ لیکن فوراً ہی اس کا وزنی سر جو ایک لمحے کے لیے اُٹھا تھا، پھر بیل کی پتلی ٹہنی کے بوجھل پھل کی طرح لٹک گیا۔

جج نے اسکول کے اُستاد کی طرح وہی سوال دُہرایا جو وہ اس سے پہلے ہزار ہا لوگوں سے پوچھ چکا تھا: ''بتاؤ کہ یہ جرم جو تم پر عاید کیا گیا ہے، کہاں تک درست ہے؟''

اقبال نے اپنا سر اُٹھایا اور جج کی طرف اپنی ویران آنکھوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد دھیمے لہجے میں کہا: ''میں نے آج تک کسی جُرم کا ارتکاب نہیں کیا۔''

عدالت کے کمرے میں مکمل سکوت طاری تھا، شاید اس کا باعث اقبال کا دشت نما سراپا تھا جس میں بلا کی ہیبت تھی۔ جج اس کی نگاہوں کے خوف ناک خلا سے خوف کھا رہا تھا۔ کورٹ انسپکٹر نے جو جنگلے سے باہر بلند کرسی پر بیٹھا تھا، کمرے کے سکوت کے دہشت ناک اثر کو دُور کرنے کے لیے یوں ہی دو تین مرتبہ اپنا گلا صاف کیا۔ ریڈر نے جو پلیٹ فارم پر بچھے ہوئے تخت پر جج کے قریب بیٹھا تھا، مسلوں کے کاغذات ادھر اُدھر رکھ کر اپنی پریشانی اور ڈر دور کرنے کی سعی کی۔

جج نے ریڈر کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور ریڈر نے کورٹ انسپکٹر کی طرف اور کورٹ انسپکٹر نے جواب میں اپنا حلق صاف کرنے کے لیے دو مرتبہ کھانسا۔ جب کمرے کا خوف آمیز سکوت ٹوٹا تو جج نے میز پر کہنیاں ٹیک کر، سامنے پڑے ہوئے قلم دان کے ایک خانے میں سے لوہے کی ایک چمکتی ہوئی پن نکال کر، اپنے دانتوں کی ریخ میں گاڑتے ہوئے، اقبال سے کہا:

''کیا تم نے خودکشی کا اقدام کیا تھا؟''

''جی ہاں!'' اقبال نے ایسے لہجے میں جواب دیا کہ اُس کی آواز ایک لرزاں سرگوشی معلوم ہوئی۔

جج نے فوراً ہی کہا: ''تو پھر تم اپنے جُرم کا اقبال کرتے ہو۔''

''جُرم!'' وہ پھر چونک پڑا اور تیز لہجے میں بولا: ''آپ کس جُرم کا ذکر کر رہے ہیں؟ اگر کوئی خدا ہے تو وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میں اِس سے ہمیشہ پاک رہا ہوں۔''

جج نے اپنے لبوں پر زور دے کر ایک بیمار مسکراہٹ پیدا کی۔ ''تم نے خودکشی کا اقدام کیا اور یہ جُرم ہے، اپنی یا کسی غیر کی جان لینے میں کوئی فرق نہیں، ہر صُورت میں وار انسان ہی پر ہوتا ہے۔''

''اور اس جُرم کی سزا کیا ہے؟'' اقبال کے پتلے ہونٹوں پر ایک طنزیہ تبسم ناچ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سان پر چاقو کی دھار تیز کرتے وقت، چنگاریوں کی پھوار گر رہی ہے۔

''دو، تین، چار، پانچ یا اس سے زیادہ مہینوں کی قید۔'' جج نے جلدی سے اپنے جملے کو پُورا کیا۔

اقبال نے یہی لفظ تول تول کر دُہرائے گویا وہ اپنے پستول کے میگزین کی تمام گولیاں بڑے اطمینان سے ایک نشانے پر خالی کرنا چاہتا ہے: ''دو، تین، چار، پانچ یا اس سے زیادہ مہینوں کی قید۔'' یہ لفظ دُہرا کر وہ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد، تیز و تند لہجے میں بولا: ''آپ کا قانون صریحاً موت کو طویل بنانا چاہتا ہے۔ ایک آدمی جو چند لمحات کے اندر اپنی دُکھ بھری زندگی کو موت کے سکون میں تبدیل کر سکتا ہے، آپ اُس کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ چند برس تک اور دُکھ کے تلخ جام پیتا رہے، جو آسمان سے گرتا ہے آپ اُسے کھجور پر لٹکا دیتے ہیں، آگ سے نکال کر کڑاہی میں ڈال دیتے ہیں۔ کیا قانون اسی ستم ظریفی کا نام ہے؟''

جج نے بارُعب لہجے میں کہا: ''عدالت اِن فضول سوالات کا جواب نہیں دے سکتی۔''

''تو بتایئے وہ کن متین اور سنجیدہ سوالوں کا جواب دے سکتی ہے؟'' اقبال کے ماتھے پر پسینے کے سرد قطرے لرزنے لگے۔ ''کیا عدالت بتا سکتی ہے کہ ججوں اور مسجد کے مُلّاؤں میں کیا فرق ہے، جو مرنے والوں کے سرہانے رٹی ہوئی سورۂ یٰسین کی تلاوت کرتے ہیں؟ کیا عدالت بتا سکتی ہے کہ اُس کے قوانین اور مٹی کے کھلونوں میں کیا فرق ہے؟ عدالت اگر اُن فضول سوالات کا جواب نہیں دے سکتی تو اُس سے کہیے کہ وہ اِن معقول سوالوں کا جواب دے!''

جج کے تیوروں پر خفگی کے آثار نمودار ہوئے، اور اس نے تیزی سے کہا: ''اس قسم کی بے باکانہ گفتگو عدالت کی توہین ہے جو ایک سنگین جُرم ہے۔''

اقبال نے درخواست کی: ''تو گفتگو کا کوئی ایسا انداز بتایئے جس سے آپ کی نیک چلن عدالت کی توہین نہ ہو!''

جج نے جھلّا کر کہا: ”جو سوال تم سے کیا جائے، اُسی کا جواب دو۔ عدالت تم سے تقریر کروانا نہیں چاہتی۔“

”پوچھیے، آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“ اقبال کے چہرے پر یاس کی دُھند چھا رہی تھی اور اُس کی آواز اُس گھنٹے کی ڈوبتی ہوئی گونج معلوم ہوتی تھی جو رات کی تاریکیوں میں لوگوں کو وقت سے باخبر رکھتا ہے۔

یہ سوال کچھ اس انداز سے کیا گیا تھا کہ جج کے چہرے پر گھبراہٹ سی پیدا ہوگئی اور اس نے ایسے ہی میز پر سے کاغذات اُٹھائے اور پھر وہیں کے وہیں رکھ دیے اور دانت کی ریخ میں سے پن نکال کر ”پن کشن“ میں گاڑتے ہوئے کہا: ”تم نے اپنی جان لینے کی کوشش کی، اس لیے تعزیراتِ ہند کی رُو سے تم سزا کے حق دار ہو، کیا اپنی صفائی میں تم کوئی بیان دینا چاہتے ہو؟“

”بیان!“ اقبال کے بے جان اور نیلے ہونٹ فرطِ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ”آپ کس قسم کا بیان لینا چاہتے ہیں؟ کیا میں سراپا بیان نہیں ہوں؟ کیا میرے گالوں کی اُبھری ہوئی ہڈیاں یہ بیان نہیں دے رہیں کہ غربت کی دیمک میرے گوشت کو چاٹتی رہی ہے؟ کیا میری بے نور آنکھیں یہ بیان نہیں دے رہیں کہ میری زندگی کی بیشتر راتیں لکڑی اور تیل کے دھوئیں کے اندر گزری ہیں؟ کیا میرا سُوکھا ہوا جسم یہ بیان نہیں دے رہا کہ اس نے کڑا سے کڑا دُکھ برداشت کیا ہے۔ کیا میری زرد، بے جان اور کانپتی ہوئی اُنگلیاں یہ بیان نہیں دے رہیں کہ وہ سازِ حیات کے تاروں میں اُمید افزا نغمہ پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے [؟ ہیں]......؟ بیان!......بیان!......صفائی کا بیان؟...... میں اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہا تھا......اس لیے کہ مجھے جینے کی خواہش نہ تھی اور جسے جینے کی خواہش نہ ہو، جو ہر جینے والے کو تعجب کی نگاہوں سے دیکھتا ہو، کیا آپ اُس سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ اس سنگین عمارت میں آ کر دو، تین مہینے کی قید سے بچنے کے لیے جُھوٹ بولے؟...... جج صاحب آپ اُس سے بات کر رہے ہیں جس کی زندگی قید سے بدتر رہی ہے!“

جج پر، زرد رُو اقبال کی بے جوڑ جذباتی گفتگو کچھ اثر نہ کر سکی اور چار پانچ پیشیوں کی یک آہنگ سماعت کے بعد اُسے تین مہینے کی سزا کا حکم سُنا دیا گیا۔ سزا کا حکم مجرم نے بڑے اطمینان سے سُنا لیکن یکایک اُس کے استخوانی چہرے پر زہریلے طنز کے آثار نمودار ہوئے اور اس کے باریک ہونٹوں کے اختتامی سرے بھنچ گئے۔ مُسکراتے ہوئے اُس نے جج کی طرف مخاطب ہو کر کہا:

”آپ نے مقدّمے کی تمام کارروائی میں بہت محنت کی ہے جس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ مقدّمے کی روئیداد کو آپ نے جس نفاست سے ان لمبے لمبے کاغذوں پر اپنے ہاتھوں سے ٹائپ کیا

ہے، وہ بھی داد کے قابل ہے۔ اور آپ نے بات بات میں تعزیراتِ ہند کی بھاری بھرکم کتاب سے دفعات کا حوالہ جس پھرتی سے دیا ہے اُس سے آپ کے حافظے کی رفعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ قانون، جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے، ایک پردہ نشین خاتون ہے جس کی عصمت کے تحفظ کے لیے آپ لوگوں کو مقرر کیا گیا ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ آپ نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ آپ ایک ایسی عورت کی حفاظت کر رہے ہیں جسے ہر چالاک آدمی اپنی داشتہ بنا کر رکھ سکتا ہے۔''

یہ لفظ عدالت کی توہین خیال کیے گئے اور اس جُرم کے ارتکاب میں اقبال کی زندانی زندگی میں دو مہینے اور بڑھا دیے گئے۔ اس دفعہ حکم سُن کر اقبال کے پتلے ہونٹوں پر پھر مُسکراہٹ پیدا ہوئی۔

''پہلے تین مہینے تھے، اب پانچ ہوگئے۔'' اقبال نے زیرِ لب کہا، اور پھر جج سے مخاطب ہو کر اس نے پوچھا: ''آپ کو تعزیراتِ ہند کی تمام دفعات از بر یاد ہیں، کیا آپ مجھے، کوئی اسی توہین کی قسم کا، بے ضرر جُرم بتا سکتے ہیں جس کے ارتکاب سے آپ کی عدالت میری گردن جلاّد کے حوالے کر سکے؟ میں اس دُنیا میں زندہ رہنا نہیں چاہتا جہاں غریبوں کو جینے کے لیے ہوا کے چند جھونکے بھی نصیب نہیں ہوتے اور جس کے بنائے ہوئے قانون میری سمجھ سے بالاتر ہیں، کیا آپ کا وہ قانون عجیب وغریب نہیں جس نے اس بات کی جستجو کیے بغیر کہ میں نے خودکشی کا اقدام کیوں کیا، مجھے جیل میں ٹھونس دیا ہے؟ مگر ایسے سوال کرنے سے فائدہ ہی کیا؟ تعزیراتِ ہند میں غالباً ان کا جواب نہیں ہے۔''

اقبال نے اپنے جھکے ہوئے کاندھوں کو مُردہ جنبش دی اور خاموش ہوگیا۔

عدالت نے اُس کے سوال کا کوئی جوب نہ دیا۔

اسٹوڈنٹ یونین کیمپ

اسٹوڈنٹ یونین کیمپ، باغ کے وسط میں پلیٹ فارم سے پرے ہٹ کر نصب تھا۔ کیمپ کے باہر ایک لمبے بانس پر کانگریس کا ترنگا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ہوا میں کھادی کے اُن ترنگے ٹکڑوں کا لہرانا جو ایک دوسرے کے ساتھ سلے ہوئے تھے، یوں معلوم ہوتا تھا کہ مختلف رنگ و بو کی ٹہنیاں آپس میں گلے مل رہی ہیں۔ کیمپ کے پاس والی دیوار پر عشقِ پیچاں کی گھنی بیل جھالروں کی طرح لٹک رہی تھی۔

اسٹوڈنٹ یونین کیمپ کے آس پاس اور بہت سے خیمے نصب تھے۔ مگر اس کی شان اُن سے بالکل جدا تھی، اس کے سپید کپڑے اور رسیوں کے تناؤ سے جوانی مترشح تھی، باقی خیموں پر بوڑھوں کی سی سنجیدگی اور اضمحلال چھایا ہوا تھا۔ اُن میں لوگوں کی اچھی چہل پہل تھی، مگر شباب کی وہ جھلک نہ تھی جو اسٹوڈنٹ یونین کیمپ میں جلوہ گر تھی۔ طلبہ کے تمتمائے ہوئے چہروں کا نظارہ، اُن کے خدمتِ وطن کے جذبے سے دھڑکتے ہوئے سینوں کا اُبھار، اُن کا پارے کی طرح مچلتا ہوا اضطراب!..... بے جان کیمپ، آگ کے ان جلتے پھرتے شعلوں کی تپش سے بہت مسرور معلوم ہوتا تھا۔

شہر کی فضا سخت مضطرب تھی۔ قانون کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ گرفتاریوں پر گرفتاریاں ہو رہی تھیں۔ جو شخص بھی جلیاں والا باغ کے پلیٹ فارم پر حکومت کے خلاف آواز نکالتا، دوسرے ہی دن جیل میں دھکیل دیا جاتا۔ پانچ چھ دنوں میں کئی ڈکٹیٹر باغ کی فضا سے زندان کی تاریکیوں میں منتقل کر دیے گئے تھے، شہر کے طلبہ نے بھی اپنے آقاؤں کی اس غیر شاعرانہ مہمان نوازی کو خندہ پیشانی سے قبول کیا تھا۔

چندرا کشور کی گرفتاری کے بعد اسٹوڈنٹ یونین کی ڈکٹیٹر شِپ کے فرائض خالد کے سپرد کر دیے گئے تھے۔ خالد ایک مقامی کالج کا نہایت ذہین اور طبّاع طالب علم تھا۔ وہ جوان تھا۔ یونین میں داخل ہونے سے پیشتر اس کے لبوں پر ہمیشہ مُسکراہٹ ناچتی رہتی تھی۔ مگر اب اس مسکراہٹ میں ایک قسم کا کھنچاؤ اور اُداسی پائی جاتی تھی۔ اس کے خوب صورت چہرے کو دیکھ کر جو اَب زرد رنگ اختیار کر گیا تھا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ گرد و پیش کی فضا میں کسی خواب کی تعبیر ڈھونڈنا چاہتا ہے۔ غالباً اسی جستجو نے اُس کی جوانی پر ایک تکان سی طاری کر رکھی تھی۔

خالد کے خلوص میں کسی کو کلام نہ تھا۔ یونین کی یک سالہ زندگی میں اُس کا ہر ممبر خالد کی آزاد اسپرٹ

سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اگر اس میں کوئی کمزوری تھی تو یہ کہ وہ غایت درجہ جذباتی تھا۔ اس کی طبیعت کے اس پہلو کو یونین کے صرف چند ممبر جانتے تھے جو اس کے دوست تھے۔ لوگ اسے بڑی احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے، اس لیے کہ اُس کی تقریریں بہت سُلجھی ہوئی اور اثر پیدا کرنے والی ہوتی تھیں۔ تقریر کرنے کے لیے جب وہ اپنے کھادی کے سپید کپڑے پہنے اور آنکھوں پر سینگ کے فریم کا چشمہ چڑھائے، پلیٹ فارم پر کھڑا ہوتا تو اس کے ساتھی اپنے سینوں میں ایک عجیب قسم کا فخر کروٹیں لیتا ہوا محسوس کرتے تھے۔ سامعین پر اس کا گورا اور خوب صورت چہرہ اور سر کے سیاہ اور چمکیلے بالوں کا ہجوم، بہت اثر پیدا کرتا۔ جب وہ بولتا تو اس کے ہاتھوں اور اس کے سر کی حرکات میں ایک عجیب شان ہوتی تھی۔

خالد جانتا تھا کہ لوگ اس کا احترام اور اس پر اعتماد کرتے ہیں۔ مگر وہ مغموم تھا۔

ایک دن جب وہ یونین کے اجلاس میں ایک طویل تقریر کرنے کے بعد فارغ ہو کر ضروری کاغذات سنبھال رہا تھ، اس کے سینے سے بے اختیار ایک آہ نکل گئی۔ کیمپ میں خالد کے صرف دو دوست موجود تھے، باقی ممبر اجلاس ختم ہونے پر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ کرشن نے جو خالد کا بغلی دوست اور ہم جماعت تھا اور جس کی طبیعت میں مزاح کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا تھ، اپنے دوست سے کہا:

''شاید ڈوما کے شاندار ہیرو آرگنٹن کی طرح، لڑائی میں جاتے ہوئے تم بھی اپنا نصف دل یہاں کسی حسینہ کی گود میں ڈالے جا رہے ہو؟''

خالد نے میز کے دراز میں چند کاغذات رکھ کر، تھکی ہوئی آواز میں کہا: ''کاش کہ ایسا ہوتا۔''

''شکر ہے کہ کیوپڈ کو ہندوستان کی فضا راس نہیں آئی، ورنہ معاملہ ضرور دگرگوں ہو جاتا۔ وہ منظر یقیناً قابلِ دید ہوتا جب گرفتاری کے وقت، تم سپاہیوں سے اجازت لے کر باغ کی کسی جھاڑی کے پیچھے، اپنی محبوبہ کی جھولی میں آنسو ٹپکا رہے ہوتے...... کیوپڈ کو کسی نہ کسی طرح یہاں بُلوا لو۔ مجھے فلموں میں اس قسم کے سین دیکھے ایک مدت ہو گئی ہے''.... یہ کہتے ہوئے وہ کیمپ کے فرش پر لیٹ گیا۔

خالد کا چہرہ اور مغموم ہو گیا۔ اس نے صرف اس قدر کہا: ''کرشن، تُم... نہیں سمجھ سکتے!''

''جی ہاں......! کرشن نے شبیر کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا جو اُس کے پاس خاموشی سے بیٹھا ہوا تھا...... ''سنتے ہو ڈکٹیٹر صاحب کیا فرما رہے ہیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے حال ہی میں کسی فرانسیسی رُومان کا مطالعہ کیا ہے!''

خالد نے میز کے دراز کو بند کیا اور خاموشی سے کرشن کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے کی

تازگی غائب تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تالاب کے شفاف پانی پر گدلے بادلوں کا عکس چھا گیا ہے۔ اُس کی آنکھیں اس بھونرے کی طرح پریشان تھیں جسے بیٹھنے کے لیے آس پاس کوئی پھول نظر نہ آتا ہو۔

کیمپ سے باہر باغ میں دوپہر کی اُداس دُھوپ چھائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی ہوا کا تھکا ہوا جھونکا خیمے کے پاس والے درختوں میں رونی آواز پیدا کرتا ہوا گزر جاتا تھا۔ عشق پیچاں کی گھنی بیل جو سامنے دیوار سے لٹک رہی تھی، سوئی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ خیمے اور اس کے باہر کی فضا پر خاموشی طاری تھی۔ کبھی کبھی باغ پر منڈلاتی ہوئی چیلوں کی غم آفرین چیخیں اس خاموشی کو توڑ دیتی تھیں۔

کرشن غور و فکر کا عادی نہ تھا۔ اس کا مطمحِ نظر دوسرے لوگوں سے بالکل جُدا تھا، اس کی نگاہیں ہر چیز میں مزاح تلاش کرتی تھیں مگر فضا کا غیر معمولی سکون اور خالد کے چہرے پر انتہائی سنجیدگی دیکھ کر وہ گھبرا گیا، اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اُٹھ بیٹھا۔

اُس نے خالد سے مخاطب ہو کر کہا: ''تم نے مجھے بھی اُداس کر دیا ہے خالد، آؤ کچھ باتیں کریں۔''

خالد اپنے خواب سے بیدار ہوا اور اس نے کرشن کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ''میں سوچتا ہوں کہ میری زندگی بے کیف ہے۔ میں اُس سپاہی کے مانند ہوں جو اندھیرے میں لڑ رہا ہے۔ کیا تم نے بھی کبھی اِس کے متعلق سوچا ہے؟''

کرشن نے متانت سے جواب دیا: ''اگر ہم سب یہی سوچنا شروع کر دیں تو پھر وطن کی خدمت ہو چکی، مجھے حیرت ہے کہ تم کیسے عجیب و غریب خیالات میں غرق ہو!''

''تمہیں حیرت نہیں ہونی چاہیے، اِس لیے کہ تم جوان ہو اور تمہارے پہلو میں برف کا ٹکڑا نہیں، جس پر شباب کے پیدا کردہ نقوش نہ بیٹھ سکیں۔ تمہیں ایک جوان دل کی گہرائیوں سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے۔ یہ عجیب خیالات نہیں کرشن، اس لیے کہ محبت عجیب و غریب نہیں۔ یہ ایک ایسا عُنصر ہے جو مرد سے کبھی جُدا نہیں کیا جاسکتا۔ اگر مرد کے دل کے قریب عورت کا دل نہ دھڑکتا ہو تو اُس کی زندگی پھیکی ہے، عبث ہے — آہ! تم کیا جانو کہ میرے خواب کیا ہیں؟''

کرشن نے اپنے دوست کے خیالات سے متحیر ہو کر کہا: ''شاید تم بُھول گئے ہو کہ تم طلبہ کی ایک جماعت کے ڈکٹیٹر ہو، خالد تمہیں غور کرنا چاہیے۔''

خالد نے اپنی آواز کو بلند کرتے ہوئے جواب دیا: ''میں اپنے فرائض سے غافل نہیں۔ وطن کے لیے میری جان تک حاضر ہے اور تم جانتے ہو کہ میں مبالغے سے کام نہیں لے رہا ہوں۔ میرا مطمحِ نظر وہی ہے

جو وطن کو آزاد کرانے والوں کا ہوتا ہے۔ میں اِس جنگ میں جو ہم لوگوں نے شروع کر رکھی ہے، آخری دم تک لڑوں گا۔ اِس لیے کہ میں سمجھتا ہوں، وطن کے مصائب کا واحد علاج آزادی ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے کانگریس اپنے وسیع خیمے سے کئی ہزار نوجوانوں کو قربان کر چکی ہے...... میرے اخلاص پر شک نہ کرو۔ میری موت یقیناً اُس دیو سے لڑتے ہوئے واقع ہوگی جس کو ملوکیّت کے نام سے پکارا جاتا ہے...... لیکن ... لیکن مجھے افسوس ہے کہ میرے دل کی ایک تمنا پوری نہ ہوگی...... وطن کی راہ میں جان دینے والے خوش نصیب ہیں، لیکن اگر اُن کے دل عورت کی محبت کا ذائقہ چکھے بغیر سو گئے ہیں تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اُن کی رُوح ایک عظیم الشان کارنامہ کرنے کے بعد بھی پیاسی ہوگی...... میں جوان ہوں میرے تنفس کے ہر جھونکے میں جوانی ہے اور تم جانتے ہو کہ محبت اور جوانی دو جدا چیزیں نہیں ہیں۔''

کرشن نے خالد کی طرف دیکھا، وہ واقعی خوب صورت جوان تھا۔

کرشن نے کہا: ''لیکن...... سپاہی کو عشق و محبت سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ ہم سپاہی ہیں۔''

''یہ غلط ہے۔ سپاہی اپنا سینہ محبت سے کیوں خالی کر دے؟ یہ میدانِ جنگ میں اُسے بزدل نہیں بناتی بلکہ اس میں ایک نئی رُوح پھونک دیتی ہے۔ اگر دُنیا میں عورت کا وجود نہ ہوتا تو مردوں میں شجاعت ہرگز پیدا نہ ہوتی، وہ ایک ایسا ساز ہوتے جس سے مضراب علاحدہ کر دی گئی ہو...... سپاہی کی وہ تلوار زیادہ آب دار ہو جاتی ہے جس پر رُخصت کے وقت اس کی محبوبہ کے آنسو چمک رہے ہوں۔ زنداں کی تاریکیوں میں اگر کوئی شے مرد کی افسردگی دُور کر سکتی ہے تو وہ عورت ہے۔ تم عورت کو انقلاب کی ہنگامہ آفرینیوں اور جنگ کی ہولناکیوں سے ہرگز جدا نہیں کر سکتے۔ عورت زندگی کے ہر شعبے کی رُوح و رواں ہے، اگر اس کو علاحدہ کر دیا جائے تو دُنیا ایک کابُوس بن کر رہ جاتی ہے۔''

کرشن اور شبیر خاموش رہے۔ تھوڑی دیر چُپ رہنے کے بعد خالد نے بولنا شروع کیا:

''جب ہیوگو نے یہ لکھا تھا کہ غمزدہ ہے وہ رُوح جو غمزدۂ محبت نہیں تو اُس کا قلم یقیناً سچائی کے قریب تھا۔ میں ایک قوت سے برسرِ پیکار ہوں۔ میرے بازوؤں میں طاقت موجود ہے۔ میرے سینے میں آگ سُلگ رہی ہے، میں سر سے کفن باندھے ہوئے ہوں، یہ سب کچھ ہے مگر وہ نہیں، اگر وہ نہیں ہے تو پھر میں یہی کہوں گا کہ میں تاریکی میں لڑ رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میں چند روز کے بعد جیل بھیج دیا جاؤں گا۔ میں اس سے خائف نہیں، لیکن ... لیکن ... اگر ہتھکڑی پہننے سے قبل ہمارے درمیان سے میری محبوبہ بڑھتی اور میرے لبوں کو چومتی ہوئی کہتی: ''خالد جاؤ، تمہارے زندان کی تاریکیوں کو میری محبت منوّر رکھے گی۔'' تو خدا

کی قسم اگر میں ایک ہزار سال قید رہتا، تو بھی تم مجھے اسی طرح جوان دیکھتے...... مگر یہ خواب ہیں!...... ہمیں اس گفتگو کو بند کر دینا چاہیے۔"

یہ کہہ کر خالد اُٹھ کھڑا ہوا، اور کیمپ میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر ٹہلنے کے بعد اُس نے اپنے بوجھل افکار کو دُور کر دیا۔ اور شبیر اور کرشن سے اپنی اُس تقریر کے متعلق گفتگو شروع کر دی جو اُسے صبح جلیاں والا باغ کے مشہور پلیٹ فارم پر کرنی تھی۔ گفتگو ختم ہونے پر شبیر اور کرشن خیمے سے باہر نکلنے لگے تو کرشن نے اپنے مخصوص انداز میں خالد سے کہا:

"کل کی تقریر تمہاری گرفتاری کا وارنٹ ہوگی۔ میری دُعا ہے کہ قید ہونے سے پیشتر تمہاری عجیب و غریب تمنا پوری ہو جائے۔"

خالد مسکرا دیا اور اپنے دوستوں کو رُخصت کر کے کام میں مشغول ہو گیا۔

صبح خالد کی تقریر ہوئی۔ سُننے والوں کا بیان ہے کہ کالج کے اِس نوخیز لڑکے کی زبان سے فاضل مقرر ایسے الفاظ نکل رہے تھے۔ اُس کی تقریر کا ہر ہر لفظ ایک لپکتا ہوا شعلہ تھا۔ اُس نے حکومت کے فرسودہ نظام کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنے وطن کے معاشری مرض کی ایسے حکیمانہ طور پر تشریح کی کہ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے بڑے بڑے لیڈر حیرت سے اس کا مُنہ تکنے لگے۔ جب تقریر ختم ہوگئی تو جلیاں والا باغ، انقلاب زندہ باد کے جوان نعروں اور تالیوں سے گُونج اُٹھا۔

کیمپ میں آ کر خالد یونین کے ممبروں سے مِلا اور دیر تک اُن سے یونین کے آئندہ پروگرام سے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ اس گفتگو سے فارغ ہو کر وہ رات کے گیارہ بجے تک کرشن کے ساتھ مل کر یونین کے گذشتہ اجلاس کی جملہ کارروائی لکھتا رہا۔ جب سب کام ختم ہو گیا تو وہ اُٹھا اور اپنے دوست کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگا: "آؤ دماغ تازہ کرنے کے لیے ذرا باہر چلیں، دیکھو تو کیسی خوشگوار ہوا چل رہی ہے اور چاندنی کیسی بھلی معلوم ہوتی ہے!"

دونوں دوست کیمپ سے باہر نکلے اور باغ کی ایک روش پر ٹہلنا شروع کر دیا۔

چاندنی رات میں اسٹوڈنٹ یونین کا سپید خیمہ، ایک مخروطی مینار معلوم ہوتا تھا جو ٹھوس چاندی کا بنا ہو۔ ہوا جو دن کے گرد و غبار اور ہنگاموں سے آزاد ہو کر ہولے ہولے چل رہی تھی، بہت تازہ اور خنک تھی، کبھی کبھی اُس کے کاندھوں پر چنبیلی اور موتیا کی زندگی بخش خوشبو تیرتی ہوئی آنکلتی تھی۔ آسمان کی کالی ساڑی میں تارے پوری تابانی سے چمک رہے تھے۔

چلتے چلتے خالد دفعتاً ٹھہر گیا اور اپنے دوست کرشن کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا:

"کرشن، ایک کام کرو گے؟"

کرشن نے متحیر ہو کر پوچھا: "کیوں، کیا کام ہے؟"

"صبح کی تقریر پر، میں کل ضرور گرفتار کر لیا جاؤں گا اور شاید پھر میں جیل سے دوبارہ زندہ واپس نہ آؤں۔ میں چاہتا ہوں کہ گرفتاری کے بعد شانتا تک میرا ایک پیغام پہنچا دیا جائے۔"

کرشن نے حیرت زدہ ہو کر کہا: "شانتا؟"

"ہاں، شانتا۔ اُس سے یہ کہہ دینا کہ خالد کو تجھ سے محبت تھی۔" یہ کہہ کر خالد خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر ٹہلنے کے بعد کرشن اور خالد دونوں کیمپ میں آئے اور سو گئے۔ کرشن نے خالد سے کچھ دریافت نہ کیا، اس لیے کہ اُسے معلوم تھا کہ وہ اس معاملے پر مزید گفتگو نہ کرے گا۔

دوسرے دن ۱۲ بجے کے قریب رضا کاروں نے خالد کو کیمپ میں اطلاع دی کہ حسب توقع پولیس کے سپاہی اُس کے وارنٹ لے کر آ گئے ہیں۔ اس اطلاع کو خالد نے خندہ پیشانی سے سُن، اور والنٹیروں کو حکم دیا کہ وہ میدان میں جمع ہو جائیں، اس لیے کہ وہ جیل خانے جانے سے قبل قومی جھنڈے کو سلامی دینا چاہتا تھا چنانچہ بگل بجنے پر چشم زدن میں تمام والنٹیر جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔

کیمپ میں یونین کے ممبروں کو چند ہدایات دینے کے بعد وہ باہر نکلا اور جھنڈے کے عین نیچے کھڑا ہو گیا...... اُس سے دور پلیٹ فارم کے قریب، پولیس کے سپاہی کھڑے تھے۔ اُن کے ایک طرف دو ڈھائی سو کے قریب والنٹیر قطار باندھے کھڑے تھے اور پیچھے لیڈی والنٹیرز کی قطار تھی۔

جھنڈے کو فوجی انداز میں سلامی دینے کے بعد، خالد نے ایک مختصر مگر پُر جوش الوداعی تقریر کی۔ تقریر ختم ہونے پر رضا کاروں کا سالار آگے بڑھا اور خالد کے گلے میں ہار ڈال دیا۔ اس کے بعد پچھلی قطار سے ایک لیڈی والنٹیر بڑھی جو کھدر کی سپید ساڑی میں ملبوس تھی۔ اُس نے خالد کے قریب جا کر، اُس کے گلے میں نہایت ہی خوش نما پھولوں کا ہار ڈال کر، تھرتھرائے ہوئے لہجے کہا "خالد جایئے، آپ کے زندان کو میری محبت منوّر رکھے گی۔"

"شانتا؟......" خالد نے کچھ اور کہنا چاہا مگر اس کی زبان گنگ ہو گئی۔

"مجھے کرشن کی زبانی سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔" اس جُملے کو جلدی سے پورا کرتی ہوئی شانتا مڑی اور جلدی سے اپنی قطار میں شامل ہو گئی . . . خالد جب حراست میں لے لیا گیا تو اُس کے چہرے سے تمام تکان غائب تھی، اور وہ پہلے سے زیادہ جوان معلوم ہوتا تھا۔

اِشارِیے

ایک : افسانے

دو : پیش لفظ، دیباچے

اِشاریہ: ایک

افسانے

اِشاریہ: دو

پیش لفظ، دیباچے